

مجموعہ کہانیاں آپ کی دنیا میں

سنگرزِ زشتِ کپڑی

مارچ 2014

کراچی
معارف پبلشرز

پاک سوسائٹی

ویسے بڑا ایک دل ہلا دینے والی سچ بیانی

بابائے ادب: دنیا کے مقبول ترین قلم کار کی کہانی

شہزادی: ہر شے کی اس جادو اور شخصیت کا رمدی نامہ جسے انگریزوں کی اہمیت دینے پر مجبور تھے

www.paksociety.com

گفت و شنید 16

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

سرگزشت 15

عہد ساز

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

سفر کہانی 69

ترکی نمی دہنم

علی سفیان آفاقی

ادب انکشیہ 51

بابائے ادب

ابن کبیر

شخصیت 24

شہزادی

ڈاکٹر ساجد امجد

اچھے سفر نامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے
شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی

اس کے قلم کی کاٹ ایسی تھی کہ آج
بھی لوگ اس کی تحریر پسند کرتے ہیں

وہ ایک سلطنت کی شہزادی تھی مگر
سب پہلات مار کر پاکستان آگئی

شکار و شکار 106

گڑھی کا شیطان

خالد قریشی

فلم و صحافت 87

فلمی اقلیلہ

علی سفیان آفاقی

معلومات 83

عجائب شاہانہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اس سیاہ عفریت نے پورے
علاقے میں موت کا طوفان اٹھادیا تھا

فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں،
معروف قلم کار کے حقیقی شب و روز

وفاح دنیا بننے کا خواب دیکھتا تھا مگر اس
کے دل کو فتح کسی اور نے کر لیا

معاشرت 138

سراب

کاشف زبیر

تحریر خاص 129

ماریج

منظر امام

شہریت 112

جہاز بیٹی

حسن رزاقی

بلند حوصلوں اور بے مثل دلوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

مستلاشیانِ علم کے لیے یہ
تحریر سوغات کا درجہ رکھتی ہے

ملازمست کے دوران، کیسے کیسے
ماحرلے گزرنا پڑتا ہے

انعامی مقابلہ 183

علمی آزمائش

ادارہ

شعر و ادب 181

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی
تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

تیسری سچ بیانی 222

روگ

نازنین

دوسری سچ بیانی 205

خزاں کی فصل

سونیا اسحاق

پہلی سچ بیانی 186

یسی پیزا

امیمہ سلیم

مرد کی کمانی کا ایک یوپیہ
بھی عورت کے لیے خزانہ

اس سچ بیانی میں ایک
دشمن ماں کا چہرہ نظر آئے گا

زندگی کے تلخ تجربے بات
سے ابھری دلپذیر سچ بیانی

چوتھی سچ بیانی 262

مہربانی

عافیہ

پانچویں سچ بیانی 253

میرا والا کیس

اصغر شاہ

ششویں سچ بیانی 237

دو پھول

ارشاد حسین

بیٹی کا رشتہ لڑکھانے والی
ماں نے اسی شخص کو شوہر بنا لیا

شگفتہ پیرائے میں
مسکراہٹ لبوں پر لاوینے والا قصہ

دو لڑکیوں کی زندگی کا احاطہ
کرتی ہوئی اثر انگیز سچ بیانی

اٹھویں سچ بیانی 285

پارو

سجاد حسین

انہویں سچ بیانی 276

روحوں کا شرکامی

جنید

ساتویں سچ بیانی 269

عاشق

جاوید

وہ عورت کے نام پر کلنگ
کہے جانے کے لائق ہے

پراسرار تحریریں
پسند کرنے والوں کے لیے

نعلین پاک نے ایک
جعل سازی دنیا بدل دی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے
کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح فیس وارنہ ہوگا۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

مدیرہ اعلیٰ: عذرارسل

مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات محمد نواز خان 0333-2256789

نمایندہ کراچی محمد ضامن خان 0333-2168391

رانا محمد عید 0323-2895528

نمایندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400



قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ فرو سالانہ 700 روپے

پبلشر و پریپر انشر: عذرارسل

مقام اشاعت: C-63، فیز 11، ایف ٹیشن

ڈیفنس کراچی ایریا مین کورنگی روڈ

کراچی 75500

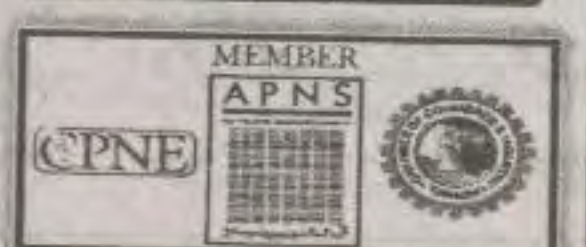
پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



آج مجھے مقبول حسین کی یاد شدت سے آ رہی ہے جو آزاد کشمیر رجمنٹ کا ایک سپاہی تھا۔ 1965ء میں وہ آپریشن جبرالٹر کے سلسلے میں، وطن عزیز کی پہریداری میں مقبوضہ علاقے تک چلا گیا تھا، اور اسے مکار دشمن نے گھیر لیا۔ پھر اس پر کیا گزری اسے خود بھی یاد نہیں۔ اذیت ناک نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ ہاتھ پیر بیکار کر دیے۔ زبان تک کاٹ دی۔ 2004ء میں جب وہ رہا ہو کر آیا تو فقط گوشت کا ایک لوٹھڑا تھا۔ اس کی زندگی کے چالیس سال غائب ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دشمن ہمارے بارے میں کس قدر سفاک سوچ رکھتا ہے۔ اگر بغور دیکھیں تو مقبول حسین آج کے عوام کی تصویر ہے۔ دشمن عوام الناس کا بھی ذہن تاریک کر دینے کی کوشش میں مصروف ہے، مقبول حسین کے ذہن کو تاریک کرنے کے لیے اذیت ناک کا سہارا لیا گیا، عوام کا ذہن تاریک کرنے کے لیے دہشت گردی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ مگر عوام دشمن کے مقاصد کو سمجھ رہے ہیں، وہ ان کے جھانے میں نہ آئے ہیں اور نہ آئیں گے۔ ہمارے دشمن کچھ بھی کر لیں پاکستان کا نہ کچھ بگڑا ہے نہ بگڑے گا۔ یہ شب قدر کو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ملک ہے، تا ابد قائم و دائم رہے گا۔

معراج رسول

داؤد ہاشمی لٹ پیٹ کر پاکستان آئے تھے مگر دل میں یہ امنگ ضرور تھی کہ اللہ کا عطا کردہ یہ تحفہ خاص پاکستان کو سنوارنا ہے۔ ان کا تعلق ایک تاجر خاندان سے تھا مگر انہوں نے تعلیم کو اولیت دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بچوں کی تعلیم پر پوری توجہ دی تھی، اللہ تعالیٰ نے بچوں سے گھر بھر دیا تھا۔ غار ہاشمی۔ شفیع ہاشمی۔ غلام محمد عارف ہاشمی۔ عبد الحمید ہاشمی، محمد اسلم ہاشمی اور شریف ہاشمی..... تاجر پیشہ افراد اپنی دولت تجارت میں ہی لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے تاجر جو نیا نیا کاروبار سیٹ کر رہے ہوں وہ تو اپنی دولت کو خاص طور پر تجارت سے ہٹانا ہی نہیں چاہتے۔ ان کے بچے بھی تجارت کی جانب راغب تھے۔ زیورات سازی کی جانب توجہ تھی۔ شہر کے کئی حصوں میں شوروم کھولنے کا پروگرام تھا۔ مگر غلام محمد اور اس سے چھوٹے کو علم کی شدید پیاس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میری دولت تعلیم کے لیے ہے۔ یہی وجہ تھی دونوں تعلیم کی طرف زیادہ راغب تھے۔ بھرپور توجہ ہی کی وجہ سے تعلیمی میدان میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ مچھلے نے تو سوچ لیا تھا کہ وہ تعلیمی میدان میں کچھ ایسا کر دیکھائے گا کہ لوگ اس کے والد کو شاباشی دیں گے۔ کہیں گے کہ واقعی تم نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اس مچھلے بیٹے نے اسی شہر کراچی میں 1951ء میں آنکھ کھولی۔ اس وقت داؤد ہاشمی کا کاروبار اتنا بڑھا ہوا بھی نہیں تھا مگر آنکھوں میں خواب بہت اونچے تھے۔ مچھلے کو بھی ابتدائی تعلیم کے لیے دینی تعلیم دی جانے لگی۔ پھر جب وہ کچھ ہوشمند ہوا تو اسے کے ایم اے اسکول میں داخلہ دلا دیا۔ یہیں سے اس نے 1969ء میں میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ وہ ڈاکٹر بنے گا۔ کہنا آسان ہے مگر اپنی بات کو ثابت کرنا بہت مشکل۔ لوگوں نے کہا بھی کہ ڈاکٹر بن کر کوئی تیر نہیں مار لے گا۔ لوگوں کی بات اس تک بھی پہنچی اور اس نے کہا کہ ڈاکٹر بننا کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے مگر میں ایسا ڈاکٹر بنوں گا کہ لوگ مجھے یاد رکھیں گے۔ اپنے اس عزم کے لیے اس نے کوشش تیز کر دی۔ نیشنل کالج میں انٹرنیشنل میں داخلہ لے لیا۔ انٹر کرنے کے بعد اس نے ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تا کہ ڈاکٹری کی مروجہ تعلیم حاصل کر سکے۔ بالآخر اس نے ایم بی بی ایس کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ڈاکٹر بن گیا اور ہاؤس جاب کے بعد مسلم ایسوسی ایشن میں ڈیوٹی دینے لگا لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ بہت آگے جانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اسی کوشش میں تھا کہ 1981ء میں اس کے پیروں میں شادی کی زنجیر ڈال دی گئی۔ پھر وہ بچوں کا باپ بھی بن گیا مگر ابھی تک اسے اپنا عہد یاد تھا اس لیے وہ مزید سے مزید ترستی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے امراض چشم کی جانب توجہ دی اور آنکھوں کے امراض پر ریسرچ کے لیے وہ امریکا چلا گیا۔ وہاں سے اعلیٰ سند حاصل کر کے معاشرے میں عزت کا حامل بن گیا۔ اب لوگ اسے ادب سے یاد کرنے لگے تھے، امریکا سے وہ لوٹے تو مسلم ایسوسی ایشن کے آئی اسپتال میں بغیر معاوضہ کے کام کرنے لگے۔ آئی سرجن کالج فزیشن اینڈ سرجن سے سرجری کی سند بھی حاصل کر رکھی تھی۔ انہی کی کوششوں سے مسلم ایسوسی ایشن آئی اسپتال نے کام شروع کیا اور نیو کراچی میں چالیس بستروں والا عالی شان اسپتال قائم ہوا، پھر صدر میں اپنی والدہ کے نام پر خدیجہ آئی کلینک قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد ایم اے جناح روڈ پر ہاشمی آئی اینڈ میڈیکل کمپلیکس قائم کیا۔ ہر کچھ دن بعد اندرون سندھ میں جا کر مفت آئی کیپ کاروائی ڈالا جو آج بھی اسی خلوص سے جاری ہے۔ اس نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دیکھا یا کہ لوگ اسے یاد رکھیں گے۔ اس ڈاکٹر کا نام ہے شریف ہاشمی۔

شہر خیال



☆ وحید ریاست بھی کا نامہ کلر سداں، راولپنڈی سے ”معراج انگل آپ کو کیا عرض کروں وہ تو پتہ چارہ زخمی تھا جو جان پہ کھیل کر ڈاکٹرز کے ہاتھوں کھلتا رہا۔ انہوں نے تو صرف FIR کی نقل طلب کی تھی۔ ہمارے شہر راولپنڈی میں ایک کڈنی سینٹر ہے جہاں ”مریض گردہ“ کے علاج کی بجائے ”انتقال گردہ“ کا کردہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ مریض جب ہوش میں آتا ہے تو کئی ماہ بعد پتا چلتا ہے کہ وہ تو ایک مدت سے ایک گردے سے محروم کیا چکا ہے اور یہ جان کر اور بھی تکلیف بڑھ جاتی ہے کہ کارنامہ امریکا، بھارت، برطانیہ کے ڈاکٹرز نے نہیں بلکہ وطن عظیم کے ”مسجاؤں“ نے سرانجام دیا ہے، یک جہی سرگزشت میں علامہ تاجور نجیب آبادی کے متعلق مختصر مگر جامع انداز میں جاننے کا موقع ملا۔ بہت خوب، آگے چل کر پڑاؤ شہر خیال میں ہوا۔ سب سے پہلے محمد عمران جوانی صاحب کو کرسی صدارت کی مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا اور جوانی صاحب کا مشکور ہوں جو انہوں نے مجھ ناچیز کی سالانہ رپورٹ کو سراہا۔ منشی محمد عزیز مئے کے بھی ہم مشکور ہیں جنہوں نے خالد کبیر اور ناصر حسین کے ساتھ اس حقیر کی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ حاجی اعجاز حسین شمار کا خط سامان دلچسپی لیے ہوئے تھا حاجی صاحب سے

گزارش ہے کہ سفر حج کے حوالے سے کوئی عقیدت بھری تحریر قارئین سرگزشت کریں تو از حد نوازش ہوگی۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے ہماری رپورٹ کو سراہا ہم ان کے دل سے احسان مند ہیں لیکن اس واقعہ ان کی حاضری کچھ مختصر رہی۔ شاہد احمد خان صاحب نے درست سمت میں رہنمائی فرمائی کہ مقامات و کرداروں کے نام انگریزی میں بھی درست ہجوں کے ساتھ لکھے جائیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب کی اس تجویز کی میں پُر زور حمایت کرتا ہوں کہ گزشتہ یادگار تحاریر میں سے کلاسک کے نام سے ”مکرر اشاعت“ ہو جائے تو کیا کہنے، جناب محی الدین نواب کی سرگزشت کو اگر گزشتہ سے پیوستہ کے حوالے سے شائع کر دیا جائے تو یہ ایک خصوصی نظر عنایت ہوگی۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب بھی ہمیشہ کی طرح جو بن پہ نظر آئے، انہیں قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا رکھا ہے آپ سے گزارش ہے کہ شاہد صاحب کا حقیقی مقالہ مرزا عبدالقادر بیدل کے حوالے سے شائع کر کے ہمیں ممنون ہونے کا موقع فراہم کریں۔ بشری افضل صاحبہ کا بھی از حد شکریہ جو انہوں نے خالد کبیر اور ناصر حسین کے مقابلے میں میری مرتب کردہ رپورٹ کو اولیت کا درجہ بخشا۔ طاہر الدین بیگ کا بھی شکریہ اڑھوں جو انہوں نے میرے تجزیاتی جائزہ کو نظر پسندیدگی سے دیکھا۔ منترمی احمد خان تو حیدری کا بھی بے حد مشکور ہوں۔ میرے شہر خیال کے پیارے پیارے ساتھیو... آپ کی حوصلہ افزائی شامل حال رہی تو ہم آپ کے لیے اس سے بھی بہتر رپورٹ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ معراج صاحب آپ سے ایک ضروری التماس ہے۔ اس التماس کے حوالے سے آپ قارئین سرگزشت سے بھی مشاورت فرما سکتے ہیں کہ شہر خیال میں کرسی صدارت پہ براجمان ہونے والے خوش نصیب کی ان کے خط کی اشاعت کے ساتھ اگر ان کی تصویر بھی ساتھ میں لگا دیں تو مزہ آجائے ہمیں خط پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس خوش نصیب کی زیارت بھی ہو جائے گی اور وہ بھی حالت بیداری میں۔ ایک اور گزارش کہ ہمارے پیارے سرگزشت کے معزز مقابلہ نگار و مضامین نگار اراکین کے شہ پاروں کے ساتھ ان کی بھی تصویر لگادی جائے تو ہمارے سرگزشت کا معیار انشا اللہ مزید بلند ہونے کی قوی امید ہے۔ میری رائے پر ضرور نظر عنایت فرمائیے گا۔ چند صفحات اٹھنے کے بعد طلوع مہر کے حوالے سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے حق تحقیق ادا کر دیا۔ بہت عرصے سے شدید خواہش تھی کہ مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے پڑھا جائے۔ پورا مقالہ بھر پور سامان دلچسپی لیے ہوئے تھا صرف ایک چیز ڈاکٹر صاحب مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے لکھنا بھول گئے کہ اردو کے سب سے جامع انسائیکلو پیڈیا، اردو جامع انسائیکلو پیڈیا جو کہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور والوں نے جنس ایس

اسے رحمن کی چیز میں شب میں کئی سالوں کی تحقیق کے بعد شائع کیا تھا اس عظیم انسائیکلو پیڈیا کی دو جلدیں ہیں اور اس میں جتنے بھی تاریخی و مذہبی مقالے شامل کیے گئے ہیں زیادہ تر مولانا غلام رسول مہر کے قلم کا ہی شاخسانہ ہیں۔ حریت ہوئی یہ پڑھ کر کہ امریکا میں جناح و سہ بھی ہے اور ہمارے ہاں بلوچستان میں زیارت کے مقام پر قائد اعظم رینڈیڈی کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ تمام اہل وطن کے لیے باعث شرم ہے۔ امین بھائی مختصر مگر خوبصورت تحریر پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ نے کھرے کا قہر، لکھ کر اس ماہ کی بہترین تحریر لکھنے کا شرف حاصل کر لیا۔ ہماری جانب سے ہدیہ تہنیت پیش کر دیجئے گا۔ ابن کبیر صاحب نے ہمیشہ کی طرح ہمارے ذوق مطالعہ کو حریت تقویت بخشی، پایا رازی کی عجیب شخصیت کے حوالے سے نادر معلومات فراہم کر کے قابلِ داد ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ ویل ڈن ابن کبیر جی۔ ٹھیل صدیقی صاحب نے والٹ ڈزنی کے حوالے سے قلم اٹھایا تو اٹھاتے چلے گئے ہمارے بچپن کے خوابوں کے امین کے حوالے سے پڑھ کر نہایت خوشگوار یادیں قلب مضطرب کو سکون بخشی نظر آئیں، ٹھیل بھائی بہت بہت شکریہ۔ منترمی علی سفیان آفاقی صاحب کا ترکی نمی دائم بہت خوبصورت چل رہا ہے۔ بٹ صاحب تو مشتاق یوسفی کے کردار مرزا کا عکس نظر آ رہے ہیں۔ منظر امام صاحب نے جنوری کے بعد فروری کی لاج خوب رکھی، امید ہے ان کا قلم دبیر تک بھر پرواز رہے گا۔ منظر صاحب کا یہ اعزاز ہمیں بہت بھایا ہے۔ کاشف زبیر کی ”سراب“ روز اول سے سامانِ تسکین ہے۔ بیت بازی میں زیادہ تر اشعار ادبی معیار پر پورا اترنے میں کامیاب ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ناصر عزیز صاحب کی دل کی دنیا، پڑھی یقین مانیں مزہ آ گیا اللہ پاک آپ کو ایسی ہی رہنما تحاریر شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مجموعی طور پر فروری کا شمارے پر برتری لیے نظر آیا۔ آخر میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ شہر خیال میں پرانے لکھنے والے غیر حاضر پائے جا رہے ہیں مثلاً محمد شاہد پورے والا، رانا سجاد، انجم فاروق ساحلی، سعید چاند وغیرہ دوستو آپ حاضر ہو جائیں اتنی بھی دوری نہیں اچھی۔“

☆ انجم فاروق ساحلی کا خط لاہور سے ”تذکرہ عجم شائع کرنے کا شکریہ جن قارئین نے تحریر کو سراہا، پسند کیا خاص طور پر وحید ریاست بھی کا مشکور ہوں کہ انہوں نے حوصلہ افزائی سے نوازا۔ فروری کے مضامین تقریباً سبھی اچھے ہیں۔ جلاوطن، بعد قید، پایا رازی زیادہ بہتر معلوم ہوئے۔ کھرے کا قہر بھی خوب تھی۔ فلمی الف لیلہ اور ترکی کا سفر نامہ حسب معمول بہتر تھے۔ قلم کا دھنی ایک بڑی شخصیت کا اچھا احوال قلم بند ہوا چوہدری کی املا چوہدری ٹھیک ہے۔ مدیر سرگزشت بڑی محنت سے پرچہ ترتیب دیتے ہیں۔ تاکہ جدت کے موتی ہر طرف بکھرے ہوئے ہوں۔ پہاڑیوں کا آدم خور شائع کرنے کا شکریہ۔ آپ بیتیوں میں نفسیاتی، کاروانِ زیست، چاند کا داغ اچھی معلوم ہوئیں۔ سراب بھی زیر مطالعہ ہے۔ خونی شیرنیاں، کی طرف توجہ فرمادی جائے۔ اور اکرم اللہ آبادی کے مضمون کا بھی انتظار ہے۔ اسے مختصر یا کسی رائٹر سے اصلاح کروا کے دے دیا جائے۔ (سرگزشت میں حالات زندگی شائع ہوتی ہے، تبصرے نہیں، اس مضمون میں اس چیز کا فقدان ہے) ایک طرف مہنگائی کا طوفان ہے اور دوسری طرف ملکی حالات بگڑے ہوئے ہیں۔ ابھی آج صبح ہی جنگ اخبار میں پڑھا کہ کراچی سے لاہور آنے والی ٹرین کی کئی بوگیاں الٹ گئیں اور پشاور قصبہ خوانی بازار میں دھماکا ہو گیا، اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔“

☆ بشری افضل کا تہنیت نامہ بہاولپور سے ”یک صلی سرگزشت میں سمندر کو کوزے میں بند کرنا بڑی بات ہے، اپنی محفل میں پیچھے تو محمد عمران کو کرسی صدارت سنبھالتے دیکھا، سنبھل کے خوشی سے گرنے جانا! دیے تیرہ اچھا تھا ہتھار کو حق تو ملنا چاہئے سو آپ کو مل گیا ہماری طرف سے مبارک ہو۔ وحید ریاست بھی اپنی اپنی قسمت ہے۔ اعجاز حسین Thanks خدا (دل کی دنیا) کیسے بدلتا ہے اس کے انوکھے رنگ ہیں، اس کو انسان کی کوئی ادا پسند آجائے تو اس کو معاف کر دیتا ہے۔ (سبحان اللہ) خرم واقعی انوکھے لوگوں میں شامل ہوتا ہے۔ خرم کی اعلیٰ ظرفی ہی تو تھی تحرش کے لیے اتنی بڑی قربانی دی۔ چاند کا داغ اس جھلے میں تو واقعی سچائی ہے کہ ماں کی خوشیاں بیٹی کی تقدیر سے جڑی ہوتی ہیں اگر سکندر میں یہ داغ نہ ہوتا تو شاید رشتہ نہ ہوتا۔ انصار احمد نے بہت اچھا قدم اٹھایا، جوڑے تو خدا نے آسمانوں پر بنائے ہیں ہم۔ کون ہوتے ہیں ان میں رکاوٹ ڈالنے والے۔ اس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ کامیاب، اس کہانی کے انجام نے دل کے تاروں کو چھو لیا۔ خدا چاہے تو برے انسان کو راست پر لا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اگر خدا چاہے تو! یوسف پر قسمت کی دیوی مہربان تھی، اس کی نیک نیتی کی وجہ سے ہر کام سیدھا ہوتا چلا گیا واقعی قسمت نے اس کا بڑا ساتھ دیا نیک لوگوں کو ضرور صلہ ملتا ہے۔“

☆ قیصر عباس خان، بکھرے لکھتے ہیں ”ادارہ کے بارے میں اتنا ہی کہتا ہے، ڈاکٹر صاحبان کی ساری غلطی سے کیونکر رپورٹ بعد میں بھی درج ہو سکتی ہے لیکن جان واپس نہیں ملتی۔ پولیس کی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ تھانیدار کو اطلاع تو مل جاتی ہے لیکن وہ موقع پر دیر سے اس لیے پہنچتا ہے کہ ایک ساتھ بہت سے کیسوں پر کام کرنا ہوتا ہے۔ میڈیکل رپورٹ سے پتا چل جاتا ہے اصل مسئلہ کیا ہے۔ محمد

عمران جو نانی صاحب پہلے نمبر پر تھے اور اچھا تبصرہ تھا پڑھ کر اچھا لگا، منشی محمد عزیز نے صاحب کو بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ رسالہ وقت پر نہیں ملتا اور تبصرہ لکھنا اور پڑھنا مسئلہ ہے۔ مئے صاحب نے پرانے ساتھیوں کو یاد کیا بہت اچھا کیا۔ اللہ کرے وہ سب خوش ہوں۔ محمد عامر ساحل صاحب غائب تھے۔۔۔ سردی کی وجہ سے نہیں لکھ سکے کیونکہ ڈی آئی خان کے حالات اللہ کے فضل سے اب اچھے ہیں۔ وحید ریاست بھی صاحب کی یہ بات کہ ”وہ مسئلہ نہ لکھیں“ سے اتفاق نہیں کرتا لیکن یہ بات قابل تعریف ہے۔ شہر خیال والے غلط بیچ یا تنگ نہیں کرتے اپنے دوستوں کو۔ احمد خان تو حیدری نے اچھا تبصرہ لکھا اور پرانی تحریروں کا ذکر کیا ہے اچھی تجویز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ مختصر تھا لیکن حاضر تھیں۔ حاجی اعجاز حسین سٹار کو سال کا بہترین تبصرہ نگار پر مبارک باد اور حج کی سعادت کی بہت مبارکباد ہو۔ میں تھوڑا لیٹ ہو گیا اللہ پاک آپ کو خوش خرم رکھے آمین۔“

☆ رانا محمد شاہد، گلستان کالونی بورے وال سے ”30 جنوری کو ابوبکالاہور کے پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں دل کا آپریشن تھا۔ 26 سے ابوالہشمال میں ایڈمٹ تھے۔ ڈاکٹر نے 29 تاریخ دی تھی۔ الحمد للہ 30 کو ابوبکالاہور آپریشن کامیاب ہوا اور ہماری جان میں جان آئی۔ تمام پڑھنے والوں سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔ معراج صاحب کا ادارہ یہ معاشرے کی ایک حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ ہمارے ہاں یہ روایت عام ہے کہ فحشی مریض کو ڈاکٹر ز پولیس کیس کہہ کر دیر کر دیتے ہیں اور یوں مریض تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ اس میں کچھ قصور یقیناً سسٹم کا بھی ہے مگر پھر بھی انسانی جان سے زیادہ قیمتی تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ سیاحتی جب مجرم بن جائیں تو پھر کسی سے کیا گلہ کرے کوئی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کی مختصر سرگزشت ہمت وجد بے کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے تھی۔ منشی محمد عزیز آپ کی سرگزشت سے محبت قابل ستائش ہے کہ اتنے پیسوں اور چکروں کے بعد منزل ملی۔ وحید ریاست بھی آپ کا نئے سال کا تجزیہ بھی اچھا تھا۔ قیصر عباس خان! ہمارے ذہن میں تو دو باتیں آ رہی ہیں یا تو کوریئر نہیں پہنچا ہوگا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادارے والے کہتے ہوں، اب اس بندے کو تھوڑا وقفہ لینا چاہیے، (بروقت موصول خطوط ہر حال میں شامل کیے جاتے ہیں، خواہ پوائنٹ چھوٹا کیوں نہ کرنا پڑے) آفتاب احمد نصیر کی نواب محی الدین کی آپ جتنی والی تجویز معقول ہے۔ یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ شاہد جہانگیر اور عبدالقیوم خان، یاد رکھئے کا شکر یہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ اردو کے معروف قلم کار غلام رسول مہر کی سرگزشت کے ساتھ موجود تھے۔ غلام رسول مہر اپنے عہد کے ایک عظیم رائٹر تھے۔ ”جناح وے“ امریکا میں ایک سڑک کا نام ہے یقین کیجئے ہمیں بالکل نہیں معلوم تھا۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ امریکا میں کوئی چھوٹا علاقہ ہے، جس کا نام لاہور ہے۔ امین بھائیانی کا یہ مضمون انفرادیت کا حامل تھا۔ ابن کبیر کی پاپارازی، ایک دلچسپ تحریر تھی۔ ابن کبیر کا انداز بیاں الگ ہے۔ بچوں کے عظیم حسن والٹ ڈزنی پہ بھی مضمون اس دفعہ خاتم کی چیز تھی۔ منظر امام صاحب کا سلسلہ بہت منفرد اور معلوماتی ہے۔ امید ہے دسمبر تک یہ سلسلہ پڑھنے کو ملے گا۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے لاہور سے لکھا ہے ”ادارہ ہمیشہ کی طرح دردمندانہ تھا چیف صاحب کی فطرت کی طرح، معروف شاعر، قلم کار اور ڈراما نگار امیرندیم سید کا حادثہ میں بچ جانا احسان خداوندی ہے، جہاں تک بات ہے اسپتال والوں کی بے حسی کی تو یہ ہمیشہ کا المیہ ہے۔ کئی مرتبہ ٹی وی اور اخبارات میں پولیس کے اعلیٰ افسران نے وضاحت کی ہے کہ اسپتالوں میں جان بچانا اولین فرض ہے قانونی کارروائی بعد میں کی جاتی رہے گی لیکن حادثاتی مریضوں کے ساتھ ڈاکٹر کا امتیازی سلوک مجرمانہ غفلت ہے۔ اب تو ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ تھانہ والے اپنے اپنے علاقہ کے اسپتال میں ایک ہدایت نامہ آویزاں کرنے کا بندوبست کریں جس میں مریض کی جان بچانے کو اولیت دینے کا حکم درج ہو۔ تاجور نجیب آبادی بھی اکثر بڑی شخصیات کی طرح دیگرگوں حالات سے گزر کر کامیاب و کامران ہوئے۔ شہر خیال میں مسند صدارت پر براجمان ہونے کے باوجود محمد عمران جو نانی سرورق پر خواتین کے قبضے سے نالاں دکھائی دیئے۔ شاید گھر اور دل و دماغ پر قبضہ کرنے والی ابھی تک ان کی زندگی میں آئی نہیں ورنہ ایسی گستاخی نہ کرتے۔ منشی محمد عزیز صاحب کو سرگزشت ہرگز تین سو روپے میں نہ پڑتا اگر یکم تاریخ کو مارکیٹ میں آنے کی وضاحت پڑھ لیتے۔ وحید ریاست بھی آپ لاکھ شکوہ کریں معراج رسول صاحب ہر ماہ تلخ چٹائیاں لکھنے سے باز نہیں آئیں گے۔ آپ بھی ہماری طرح فشارخون بلند ہونے سے روکنے کا کوئی بندوبست کر لیں۔ قیصر عباس خان، روبینہ نقیس انصاری کو ملنے والے میسج پر برم تھے۔ واقعی یہ تکلیف دہ عمل تھا جس نے بھی کیا ہے۔ اعجاز حسین صاحب خط رجسٹری نہ کیا کریں ار جنت میل سروس سے استفادہ کر لیا کریں آپ کا خط دوسرے دن ہی شہر خیال پہنچ جایا کرے گا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ ہم بھی آپ کی طرح بشری افضل صاحبہ کی صحت اور روبینہ نقیس صاحبہ کی مشکلات کے لیے دعا گو رہے ہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد ہم آپ کے مضمون بیدل کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں امید ہے شائع ہو جائے گا۔ (انشاء اللہ اپریل کے شمارے کی زینت ہوگا) عبدالقیوم خان صاحب فرماتے ہیں کہ بیٹیاں والدین کے بڑھاپے میں کام آتی ہیں۔ بیٹے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ بیٹیاں بیٹوں سے کم نہیں ہوتیں۔ اگر بیٹے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو پھر وہ بیٹیوں کے برابر کیسے ہو گئے۔ رائے دینے سے پہلے کنفیوژن دور کر لیتے تو

اچھا تھا۔ بشری افضل اور طاہر الدین کے تبصرے مناسب تھے۔ پوہری مدثر حسین اس سلسلے کا رونا روئیں گے، یہاں تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہم شاعر گھر بنوا لیتے ہیں لیکن گلی میں موجود گٹر کا ڈھکن نہیں لگواتے۔ سب کچھ ہماری انفرادی غیر ذمہ داریوں کا ساختہ ہے۔ عبدالخالق بھی جاپانی ہنری فورڈ سے ہم بہت عرصہ پہلے بھی محفوظ ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ نقیس انصاری صاحبہ آپ کے دکھ درد اس لیے زیادہ ہیں کہ آپ انہیں محسوس زیادہ کرتی ہیں۔ خدا را اپنا خیال کیجئے، اتنا ڈپرس ہونا اچھا نہیں۔ اس مرتبہ ہم صرف ساتھیوں سے مذاکرات کرنا چاہتے تھے لہذا کہانیوں کے بارے میں اتنا ہی کہیں گے کہ ”طلوع مہر“ کو جناح وے سے دیکھا تو کہہ کرے کا قہر، دکھائی دیا، پاپارازی جلا وطن ہو کر بعد قید ہو گئے۔ ترکی کی نئی دہائی فلمی الف لیلہ کی طرح ڈزنی تھی۔ پپاڑیوں کے آدم خور فروری میں سراب کے پیچھے بھاگنا نفسیاتی تلافی تھی۔ چاند کا داغ اگر قسمت میں ہو تو بھی کامیاب اور انوکھے لوگ، دل کی دنیا میں صندل بھر کر کاروان زیست کو پار چوں کی طرح منفرد اور خوشبودار بنا دیتے ہیں۔“

☆ محمد اشفاق نے گجرات سے لکھا ہے ”کاشف زیر کی سراب، بہت اچھی جارہی ہے عرض صرف یہ کرنی ہے کہ اس کہانی کو زبردستی ختم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بے شک 200 قسطیں ہو جائیں۔ سرگزشت میں کہانیاں خوب معلوماتی ہوتی ہیں۔ میری ایک درخواست ہے کہ ایک مضمون دیا جائے کہ جس میں بتایا جائے کہ دنیا میں کئی زبانیں ہیں اور اتنی زیادہ زبانیں کیسے بن گئیں۔ میری معلومات کے مطابق صرف پاکستان میں 33 اور انڈیا میں 850 مختلف زبانیں ہیں۔ امید ہے توجہ دیں گے۔ میرا ایک بہت پرانا مطالبہ ہے کہ ہر سال تینوں پرچوں کے خاص شمارے دیے جائیں صفحات 350 سے اوپر ہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔“

☆ احمد خان تو حیدری کراچی سے لکھتے ہیں ”معراج رسول صاحب آپ نے دل کی بات چھین لی، تھکے ماندے ذہن کو تفریح فراہم کرنے والے امیرندیم سید کی کسی سے کیا دشمنی تھی؟ قانون و معاشرہ کی بے حسی، ہماری میڈم قائد آباد پبل پر حادثہ کا شکار ہوئیں۔ چند قدم فاصلے پر اسپتال تھا مگر وہی جواب کہ پولیس کیس ہے جناح اسپتال لے جائیں نتیجہ یہ کہ زیادہ خون بہہ جانے سے راستہ میں زندگی کی ڈور کٹ گئی۔ ایسا ہی حادثہ ناظم آباد پبل پر ہوا جہاں نیچے اسپتال موجود تھا۔ حکومت تمام پرائیویٹ اسپتال کو ایسے موقع پر فوری طبی امداد کا پابند کرے۔ ملکی حالات دیکھ کر سوال اٹھتا ہے کہ دشمنی آپ کی اور میری ہو تو معصوم کلیوں کا کیا جرم؟ اللہ ہوس پرستوں کو ہدایت دے۔ جتنی نیس بجلی ایک سال میں ہماری ضرورت ہے۔ اس سے کروڑ گنا زیادہ چوری اور دھماکوں سے اڑا کر قوم و ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے، اف ہائے ازلی دشمن نائن الیون کی آگ خود لگا کر ہمیں تباہ کر رہے ہیں۔ نا عاقبت اندیش سیاسی لیڈرے لڑاؤ حکومت کرو والے ہی اصل مجرم ہیں۔“

☆ عبدالخالق بھٹی، صدر پولیس کلب اللہ آباد رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ”قلم کے دھنی نے دل موہ لیا۔ مختصری مگر ہر بار کی طرح جامع تحریر جس نے پوری زندگی کا احاطہ کر لیا۔ طلوع مہر میں مہر علم و ادب غلام رسول مہر کی داستان زندگی پڑھی۔ مزہ آیا۔ جناح وے پڑھ کر حریت سے تقریباً اچھل پڑے۔ بابائے قوم کے نام پر امریکا میں سڑک، اور ہمارے ہاں؟ ایک نئی چینل پر رپورٹ دیکھی بابائے قوم کے مزار کا ایک کمر صرف پانچ ہزار میں گھنٹے دو گھنٹے کے لیے چوکیدار فراہم کر رہا ہے۔ اف، سر شرم سے جھک گیا۔ کہہ کرے کا قہر اور پاپارازی بھی معلومات بھری تحریر تھی۔ نفسیاتی کے کیا کہتے، بہت برا، آیا، ایسی آپ بیٹیاں ہر ماہ دیا کریں۔ چاند کا داغ بھی لا جواب رہی۔ اس ماہ جس اتنا اگلے ماہ تفصیل، عمران جو نانی کا تبصرہ اچھا لگا، منشی عزیز مئے، کو دوبارہ سے اپنے درمیان دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“

☆ ڈاکٹر روبینہ نقیس انصاری کا خلوص نامہ بھکرے ”اس ماہ کا شمارہ پڑھ نہیں سکی ہوں۔ صرف جناح وے پڑھا جو بہت پسند آیا۔ عمران جو نانی کو مبارکباد، عزیز مئے اور وحید ریاست بھی کو سلام۔ ہماری پیاری بہنا سدرہ بانو ناگوری کیسی ہے؟ اعجاز حسین سٹار، قیصر عباس خان، آفتاب احمد نصیر اشرفی کو سلام، بشری افضل کا مختصر سا مگر جامع خط اچھا لگا۔ احمد خان تو حیدری کے خط میں گرامر کی بہت غلطیاں ہوئی ہیں درست کریں۔“

☆ عزیز اللہ کا مکتوب ”آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ دور خالص بے حیائی بے غیرتی بے شرمی کا دور ہے۔ مظہر حسین کی نفسیاتی میں جس طرح غزالہ کے ساتھ پے در پے واقعات پیش آتے رہے۔ وہ تو ہم نے ٹائٹل کی تصویر دیکھ کر اندازہ

سید فصیح اقبال، سابق صدر APNS، سابق صدر CPNE اور سابق سینئر ممبر 20 فروری 2014ء کو علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

لگا لیا تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ پہلے تو غزالہ کے لئے کافسوس ہوا لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی خیریت سے شہرہ
نفرت ہو گئی۔ مردوں کو خود دعوت گناہ دے کر داد عیش میں گزارنا ہمیشہ پسند کرتی رہی۔ غزالہ تم نے دولت تو بہت کمائی، لیکن یاد رکھو
سکون نام کو ترسوگی پر دیں میں۔ عورت بہت مظلوم ہوتی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ مظہر حسین میں آپ کی ہمت کو داد
دیتا ہوں۔ آپ نے بہت اچھی کہانی ہمیں پڑھنے کو دی۔ ویسے آپس کی بات ہے، آپ بھی غزالہ پر مرے تھے۔ سرگزشت کی
دوسری سچ بیانی تلافی نے بہت متاثر کیا۔ کہانی کے ہیرو جلیل نے نوشاہہ کے سامنے اپنے گھر کی اسٹوری سچ سچ زبان میں سنائی انداز
بہت پیارا لگا۔ تلافی کے دلن راشد کو ہر موڑ پر منہ کی کہانی پڑی۔ راشد جیسے بلیک میل لوگوں پر ہر روز تھپڑوں کی بارش کی جائے پھر بھی
کم ہے۔ اب کچھ ذکر ہو جائے نوشاہہ کے شوہر نامہ اسٹراشرف کا۔ مسٹر اشرف کیا سوچ کر تم نے اپنی پاک دہن کو اپنے سچ گھٹیا باس
خالد چغتائی کو ٹھیکہ دینے پر مجبور کیا۔ لعنت ہو تمہاری شکل پر۔ روزانہ اپنی نحوس شکل شیشے میں دیکھ کر کپڑوں پر اچھا پرندہ لگا کر آتش
جالتے ہو گے۔ کیا فائدہ اتنا میک اپ کرنے کا تم تو سدا کے بے غیرت لکے۔ آفرین ہے نوشاہہ پر، ہر موڑ پر ثابت قدم رہی۔ مجھے فخر
ہے ایسی وفادار بیویوں پر میں سلام پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حالات کا مقابلہ کرنے والی عورتوں کو۔ لعنت ہے باس خالد چغتائی پر کہ
حسین عورتوں کو دیکھ کر منہ سے رال چکنے لگتی ہے۔ اتفاق سے یہ باس ڈھیٹ بھی بہت ہوتے ہیں۔ خواہواہ پرانے گھر میں زبردستی
روٹی افرور ہوتے ہیں۔ ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔“

☆ احسان سحر کا خلوص نامہ میانوالی سے ”نیا سال شروع ہے اور حالات اور سیاست دان وہی ہیں۔ پریشانیاں سائے کی طرح
ہمارے وجود کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ غم مٹتے ہیں، اور نہ ہی برسات کی بارش میں آنسو کم ہوتے ہیں۔ عجیب قوم ہیں ہم۔ خود ہی کیکر
کا درخت اگا کر اور امید لگائے بیٹھے ہیں کہ پھل دے گا۔ واہ..... معراج النکل کے ادارے میں ہمارے نام نہاد ڈاکٹروں کے بارے میں
پڑھا جس ملک کے لوگوں اور اس کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کا یہ حال ہے تو پھر حالات کیسے اور کیوں تبدیل ہوں؟ ان لوگوں کو روپے
سے مطلب ہے۔ فیس لے کر ہی ڈاکٹر بنے ہیں اور اب بھاری فیس کمار ہے ہیں۔ قلم کا وحشی، مختصر تعارف میں اور احسان اللہ خان عرف
تا جو نجیب آبادی کے بارے میں پڑھا۔ باہمت انسان جہاں بھی رہے کچھ کر ہی دکھاتا ہے۔ افسوس ہم مسلمانوں کو ایسے ایسے شاہکار لوگ
نصیب ہوئے جن کی ہم نہ تو قدر حیات میں کر سکے اور نہ ہی موت کے بعد۔ لیکن پھر بھی ایسے باہمت لوگ ہمیں ملتے رہیں گے اور اپنا نام
روشن کرتے جائیں گے۔ کیونکہ ہیرا کوئلوں کی ہی کان سے نکلتا ہے۔ طلوع مہر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس ماہ ہمارے ملک کا ایک اور کوہ
نور ہیرا ڈھونڈ کر لائے۔ امریکا جیسے شہر میں جناح دے کاسن کر خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔ یہ واقعی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مسلمانوں اور
خاص کر پاکستانی مسلمانوں سے متاثر ہیں۔

☆ محمد عامر ساحل کا خلوص نامہ ڈیرہ اسماعیل خان سے ”محمد عمران جو ثانی کا اظہار خیال پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ میرا خط
پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ وحید ریاست بھٹے کی بات دل کو لگی کہ قتل نمبر، انٹرنیٹ نمبر، کتاب نمبر، دنیا نمبر، قرآن وحدیث نمبر ضرور شائع
کریں، یہ ہماری ضرورت ہے۔ قیصر عباس خان آپ کا بہت شکریہ کہ مبارک یاد دی ویسے آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ آفتاب احمد نصیر
اشرفی کی بات دل کو لگی کہ پاکستانی حکومت کو اور انتظام کو پاکستانی جیلوں پر چین اور ترکی کے حیا باختہ ڈرامے بند کرنے چاہئیں اور میری
خود کی بھی درخواست ہے کہ ان کے خلاف سخت ایکشن لیں۔ اس کے علاوہ بھی سبھی دوستوں کے خطوط پسند آئے جن میں محمد عمران جو ثانی
فشٹی محمد عزیز مئے، قیصر عباس خان، بھکر، اعجاز حسین سنہار، شاہد احمد خان، آفتاب احمد خان، نصیر اشرفی، شاہد جہانگیر شاہد، احمد خان توحیدی
وغیرہ وغیرہ کے خطوط شامل تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی محبوب شمارہ ریٹ ملا اب اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ کہانیاں پڑھ کر تبصرہ کریں۔
ادارہ سے ایک شکایت ہے کہ جنوری کے شمارے والے خط میں میں نے درود شریف پڑھنے کے بارے میں کچھ اچھی باتیں لکھی تھیں کہ ریٹ
الاول کا موقع ہے تو تمام قارئین اس کو پڑھ کر درود شریف کو اور کثرت سے پڑھ لیتے لیکن ادارہ نے وہ بات سرے سے ہی گول کر دی اور
تجبی میں نے ناراض ہو کر فروری 2014 کے شمارے میں اپنا خط شامل نہیں کیا اور اس بار سب دوستوں کے پر خلوص خطوط پڑھنے تو اک
بار پھر میرے دل کی آواز پر میرے ہاتھ قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔“

☆ قرۃ العین نے اسلام آباد سے لکھا ہے ”پہلی مرتبہ آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ میں 2005ء سے سرگزشت
قاری ہوں۔ یہ ایک انتہائی معیاری رسالہ ہے۔ اس کا ہر شمارہ میں نے سنبھال کر الماری میں تالا لگا کر رکھا ہوا ہے کیونکہ میں ان کو دوبارہ
بھی پڑھتی ہوں۔ فروری 2014 کا شمارہ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ صرف ایک دن میں پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ ہر کہانی لا جواب تھی۔ نفسیاتی
بہت اچھی کہانی تھی۔ اس میں غزالہ کا کردار بہت پیچیدہ ہے۔ اس نے تین بندوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ مظہر صاحب کے ساتھ
یقیناً ان کے والدین کی دعائیں ہمیں جو اس فتنے سے بچ گئے۔ تلافی، میں نوشاہہ کا انجام بخیر ہوا جس سے بہت خوشی ہوئی۔ جلیل نے بہت

اچھی کردار کا مظاہرہ کیا اور اپنے کس و بابت کی کیا۔ صحت، ایمان، جدوجہد، مصورت سچ بیانی، یوسف اور نوری کا بندھن قسمت میں لکھا
تھا۔ سودوئوں کا ملن ہو گیا۔ یوسف نے بہت ایثار سے کام لیا۔ ویسے اس کہانی پر بہت اچھی فلم بن سکتی ہے۔ تیسری سچ بیانی، کامیاب تھی۔
اس میں ف الف نے اپنی بے پناہ خوش قسمتی کا ماجرا بیان کیا ہے۔ حیرت انگیز سچ بیانی ہے۔ یہ بغیر کسی محنت کے اللہ پاک کی عنایت کی
داستان ہے۔ ف الف سے گزارش ہے کہ اپنا کوئی اتا پتا بتائیں۔ اس کے علاوہ ان سے عاجزانہ درخواست ہے کہ میرے بچوں، بہن اور
بھائی کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملات سنوارے۔ اللہ اپنے دوستوں کی دعا واپس نہیں لوٹاتا۔ صندل، میں ان کے والد
صاحب نے سندھی وڈیا ہونے کے باوجود ایک بے حد مثبت کردار ادا کیا۔ اور اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے مال و دولت اور جائیداد کی قربانی
دے ڈالی۔ بلاشبہ بہت بڑی بات ہے۔ چاند کا داغ کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی۔ البتہ ”انوکھے لوگ“ اور ”دل کی دنیا“ خاصی متاثر کن
کہانیاں تھیں۔ سب سے آخری سچ بیانی ”کاروان زیت“ بہت شاندار رہی۔ بہت دلچسپ کہانی تھی۔ نسرین نے ایثار کی مثال قائم کی۔
شو بیزنس میں ہونے کے باوجود اتنے اعلیٰ کردار کی مالک ہیں۔ وہ یقیناً حسین کی مستحق ہیں۔ مضامین میں طلوع مہر اور جناح دے خاصی
معلوماتی ہیں۔“

☆ اکرم اللہ خان لکھتے ہیں ”راقم الحروف کا تعلق سپنس اور جاسوسی سے ان کی پہلی اشاعت سے لے کر آج تک ہے۔ میں
نے سپنس، جاسوسی کا کوئی شمارہ مس نہیں کیا۔ سرگزشت میں بھی میری لکھی ہوئی دو کہانیاں 2002ء اور 2003ء میں چھپ چکی ہیں۔
2002 اور 2003 میں آپ کی ہومیو پیٹھی پر نشستوں میں بھی شامل ہوتا رہا ہوں اور مرزا طاہر احمد کی ہومیو پیٹھی کی کتاب میں نے ہی
لا کر تمام دوستوں کو دی تھیں۔ آپ نے میری عبید اللہ علم سے قربت کی بنا پر مجھ سے ان کے حالات زندگی لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی جو میں
یوجوہ پوری نہیں کر سکا۔ آج کل جاسوسی سپنس اور سرگزشت کی اشاعت میں بے قاعدگی سے پیدا ہونے والا خلا کسی بھی رسالے کے بس
میں نہیں کہ اسے پُر کر سکے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ رسالے کی اشاعت Strictly مقررہ تاریخ پر ہو۔ دوسری بات یہ کہ آپ
کے پرانے لکھنے والے جن میں محمود احمد مودی اور چند دیگر پرانے لکھنے والے جن کی کہانیاں خصوصاً سرورق کی کہانیاں جو جاسوسی کی جان
ہوتی تھیں۔ اچھے لکھنے والے ادارے کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ آج کل لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، اسما قادری، طاہر جاوید مغل،
کاشف زبیر اور سرور اکرام اچھا کام کر رہے ہیں۔ 2003ء تک مجھے آپ کے ادارے کے چاروں پرچے اعزازی ملا کرتے تھے پھر میں
پاکستان سے باہر چلا گیا 2011ء میں واپس آیا۔ اب چونکہ ڈیفنس کی طرف آنا بہت کم ہوتا ہے اس لیے پرچے خرید کر پڑھ رہا ہوں خیر
کوئی مسئلہ نہیں۔“

☆ چوہدری بدر حسین نے دید رکھاریاں سے لکھا ہے ”پاکستان میں گزشتہ چند برسوں سے بے روزگاری اور غربت میں انتہائی
اضافہ ہوا ہے زندگی کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے لوگوں کے لیے جینا بھی دشوار کر دیا ہے۔ لوگ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں۔ بعض
اوقات حالات زندگی اس سچ پر پہنچ جاتے ہیں کہ لوگ مرنے کو جینے سے آسان سمجھتے ہیں جس وجہ سے خودکشی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خودکشی کا
اسبب معمولی گھریلو جھگڑے اور غربت ہیں۔ بے روزگاری، غربت اور دہشت گردی نے لوگوں کو اتنا اپ سیٹ کر دیا ہے کہ اب چھوٹی
بھوٹی باتیں بھی کسی بڑے عذاب سے کم نہیں لگتیں۔ مسلمان ہونے کے ناتے سب یہ جانتے ہیں کہ خودکشی اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس
کے باوجود خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان ظاہر کرتا ہے کہ عوام کے پاس مسائل سے نجات کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ سیاست کو ”عبادت“ کہنے
لے سیاست دان عوام کا تو راہبورا، بنانے پر تلے ہوئے ہیں یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ملک معاشی بحران کا شکار ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ
رپشن اور وسائل کا غلط استعمال حالات خراب کر رہا ہے۔ اگر وسائل درست استعمال کیا جائے تو عوام کو ریلیف ملے گا۔ اس طرح جرائم پر
یو پایا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قلمس ہو کر حکمران عوام کی فلاح کے لیے کام کریں۔ تبصرے سے پہلے میں آپ کو بتاتا
ہوں کہ میں ایک چھوٹا سا رائٹر ہوں، روزنامہ دنیا اور ہفت روزہ فیملی میگزین میں میری تحریریں گاہے بگاہے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب
تحریریں کی طرف آتا ہوں۔ سب سے پہلے شہر خیال کی زیارت کی اپنا تبصرہ فیملی پھرے بغیر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد جو لکھتے
ہیں وہ اگرچہ بھرپور تحقیقی کام ہوتا ہے، لیکن ہر دفعہ وہ ہر ایک کے حالات زندگی ایک ہی طرز کی دکھاتے ہیں۔ قائد اعظم سے منسوب امریکا
میں ایک سڑک کے بارے میں پڑھ کر احساس فخر ہوا سچ بیانی، چسکے دار ہوتی ہیں، باقی میگزین بھرپور تحقیقی ہوتا ہے۔ فلمی الف لیلہ کچھ
میں پسند نہیں ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔“

☆ کستانی فلمی دنیا کا ایک معتبر نام، سرگزشت میں عربیے تک لکھنے والے لکھاری، کئی مشہور و کامیاب فلموں کے رائٹر جناب عزیز میر بھی
رضائے الہی سے انتقال کر گئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

اس نے برصغیر کے ایک بڑے شاہی خاندان میں آنکھیں کھولیں، وہ تخت و تاج کی وارث ٹھہری مگر اس کے مزاج میں ٹھہراؤ نہ تھا۔ اس وقت جب برصغیر کے مسلم گھرانوں میں پردے کی سخت پابندی تھی وہ اس حدود و قیود سے آزاد ہو کر گھڑ سواری کرتی، پولو کھیلتی، سائیکل چلاتی اور شیروں کا شکار کرنے گھنے جنگلوں میں جایا کرتی۔ اس وقت تک برصغیر کے ایک تہائی لوگوں نے ہوائی جہاز کو دیکھا بھی نہیں تھا اور وہ اس دور میں ہوا بازی کی تربیت لینے بمبئی کے ائر کلب جا پہنچی۔ مزید ٹریننگ کے لیے گھر سے فرار ہو کر کلکتہ چلی گئی اور برصغیر کی دوسری ہوا باز خاتون کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اسے شوہر کا دباؤ بھی پسند نہ تھا کہ وہ فطرتاً آزادی پسند تھی۔ ذرا سی بات پر اس نے شوہر کو ایسا سبق دیا کہ پھر شوہر نے مڑ کر اس کے بیٹے پر حق نہ جتایا۔ جب پاکستان آزاد ہوا تو حکومت ہند نے سر توڑ کوشش کی کہ وہ ہندوستان میں رک جائے مگر اسے تو آزادی پسند تھی، وہ ہندوئوں کی غلامی میں کیسے رہ جاتی۔ اس نے پنڈت نہرو کے التماس کو ٹھکرا دیا۔ پاکستان کی آزاد سرزمین پر یہ یارو مددگار رہنا قبول کر لیا مگر تخت و تاج کی طرف نظر نہ ڈالی۔ کراچی کی مضافاتی بستی ملیر میں اپنا آستانہ خود تعمیر کیا اور ملک کی ترقی کے لیے کوشاں ہو گئی۔

کراچی میں دفن ایک باعزم شہزادی کا زندگی نامہ

جدا کیا جا رہا ہے۔ وہ صرف دیکھ سکتی تھی، سرکار اماں کے فیصلے سے اختلاف کی ہمت کہاں تھی جبکہ وہ ابھی صرف تیرہ سال کی تھی لیکن سوچ ضرور رہی ہوگی کہ جب وہ پیدا کر سکتی ہے تو نگہداشت کیوں نہیں کر سکتی۔

”حمید اللہ کو بذریعہ تار اطلاع کر دی جائے کہ سرکار اماں کے پوتے پوتیوں میں آٹھویں بچے کا اضافہ ہوا ہے جو لڑکی ہے اور ہم اسے اپنی نگرانی میں لے رہے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور واپسی کے لیے کمرے سے نکل گئیں۔

نواب سلطان جہاں کے تین بیٹے تھے۔ عبید اللہ خاں، نصر اللہ خاں اور سب سے چھوٹے حمید اللہ خاں۔ سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے حمید اللہ خاں، سرکار اماں کے نہایت چہیتے تھے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ دو بڑے بھائیوں کی موجودگی میں وہ ان کا جانشین نہیں بن سکتا۔ اسے اپنا مقام بنانے کے لیے جدید تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے انہوں نے بھوپال میں الیگزینڈر بوائز اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں ایک انگریز کو ہیڈ ماسٹر مقرر کیا۔ حمید اللہ خاں کو اسی اسکول میں داخل کروایا اور میٹرک کے بعد انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقامتی طالب علم کے طور پر داخل کروادیا گیا۔ حمید اللہ خاں بھوپال

نماز فجر کی اذانوں کی آوازیں بھوپال کے قصر سلطانی کی سنگین دیواروں سے آ کر ٹکرائی تھیں کہ ان کی آوازوں میں ایک بچی کے رونے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ذرا دن چڑھا تو ریاستی روایت کے مطابق توپوں کی سلامی دی گئی۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہ سلامی تو سربراہ ریاست کے ہر پوتے یا پوتی کے لیے دی جاتی تھی۔ معمول سے ہٹ کر تو یہ بات بھی کہ ہزبائی کس سلطان جہاں بیگم سربراہ ریاست بھوپال نو مولود بچی کی دادی نے بچی کو دیکھنے کے لیے اپنے حضور طلب نہیں کیا بلکہ خود اسے دیکھنے کے لیے تشریف لائیں۔ اس سے بھی بڑھ کر غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے اسی وقت حکم جاری کیا۔

”یہ بچی پل بڑھ کر میری نگرانی میں جوان ہوگی۔ اس لیے کہ میرا بیٹا حمید اللہ خاں اور اس بچی کی ماں میمونہ سلطان نو عمر ہیں اور اس کی دیکھ بھال کا حق ادا نہیں کر سکتے۔“

بستر پر لیٹی میمونہ سلطان نے جو سلطان جہاں بیگم (سرکار اماں کہلاتی تھیں) کو دیکھ کر کیے کمرے... کے نیچے رکھ کر قدرے بیٹھنے کے انداز میں لیٹی ہوئی تھیں، چونک کر سرکار اماں کی طرف دیکھا کہ پہلی بچی ہے اور اسی کو مجھ سے



کے شاہی خاندان کے پہلے رکن تھے جو یونیورسٹی تک پہنچے تھے۔ بچی کی پیدائش کے وقت وہ علی گڑھ میں ہی تھے۔ سرکار... اماں کے لیے یہ پیدائش اس لیے بھی خوشی کا باعث تھی کہ ان کے دونوں بڑے بیٹے اپنی اپنی شادیوں کے بعد اپنے خاندانوں کے ساتھ اپنے اپنے محلوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہ شہزادی ان ہی کے گھر یعنی قصر سلطانی میں پیدا ہوئی۔

نواب سلطان جہاں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس شہزادی کا نام عابدہ سلطان تجویز کیا اور شاہی رجسٹر میں اس کی تاریخ پیدائش 28 اگست 1913ء درج کروائی۔ نجو بوانامی ایک عورت دودھ پلانے کے لیے مقرر ہوئی اور دیکھ بھال کے لیے زاہدہ بیگم کا تقرر کیا گیا جو ایک تربیت یافتہ دانی اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں۔ ان سب کاموں سے نمٹنے کے بعد ریاست کے جوٹی کو طلب کیا۔ وہ بے چارہ تو پہلے ہی انعام و خلعت کی آرزو میں تیار بیٹھا تھا۔ نولومود بچی کا زائچہ بھی تیار کر لیا تھا۔ جلی کا منتظر تھا کہ بلاوا آگیا۔ وہ شاداں و فرحاں نواب سلطان کے حضور پیش ہو گیا۔ ریاستی آداب بجالانے کے بعد زائچہ پیش کر دیا۔

وہ ہر بچے کی پیدائش پر زائچہ تیار کرتا تھا اور انعام وصول کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی انعام کی آرزو میں کھڑا تھا۔ آداب شاہی سے خوف زدہ نظریں پچی کیے۔ نواب سلطان نے زائچہ پڑھا۔ قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر زائچے کے پرزے کر کے اس کے منہ کی طرف اچھال دیے۔ جوٹی کے منہ پر ہوائیاں تو پہلے ہی اڑ رہی تھیں اب اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کاٹنے لگا۔

”میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں برخاست کرتی ہوں۔“

انعام تو کیا ملتا تو کوری بھی گئی۔ اس کے بعد اور نہ جانے کیا عتاب نازل ہو۔ وہ اٹنے قدموں باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب سلطان کا غصہ آہستہ آہستہ کم ہو گیا تھا لیکن ماتھے کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں پھر وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اس نجوی نے زائچے میں یہ کیا لکھ دیا کہ حمید اللہ خاں میرا جانشین ہوگا۔ اگر وہ جانشین ہوگا تو میرے دو

بڑے بیٹے؟ اس جاہل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جانشینی بڑے بیٹے کو نصیب ہوتی ہے چھوٹے کو نہیں پھر اس نے ننھے حمید (وہ اسے اس نام سے ہی پکارتی تھیں) کا نام کیوں لیا۔ شاید مجھے خوش کرنے کے لیے، اسے معلوم تھا کہ ننھے حمید میرے بہت لاڈلے ہیں۔ میں یہ سن کر خوش ہو جاؤں گی۔ اس بے وقوف کو اتنا معلوم نہیں کہ لاڈلا ہونا اور بات ہے اور ریاست سوئپ دینا دوسری بات۔ میں اگر ننھے حمید کو جانشین بنانا بھی چاہوں تو نہیں بنا سکتی۔ برطانوی قانون اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ اب ہم اتنے آزاد نہیں رہے کہ جس کو چاہیں جانشینی سوئپ دیں۔“

وہ بہت دیر تک چچ و تاب کھاتی رہیں۔ شاید ان کے دل میں وہ بات آگئی ہو جس کی طرف جوٹی نے اشارہ کیا تھا لیکن وہ کسی پر کیا خود پر بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے زائچے کے اس گورکھ دھندے سے نکل کر ایک ملازمہ کو آواز دی اور حکم جاری کیا کہ شہزادی عابدہ کو اس کے پنگوڑے سمیت ان کے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل فوراً ہوئی۔ پنگوڑا ان کے کمرے میں آگیا۔

انہوں نے بڑے اشتیاق سے پنگوڑا اپنے کمرے میں منگوا دیا تھا۔ ملازمین تو یہ بھی بیٹھی تھیں کہ شہزادی کے آتے ہی وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ جائیں گی۔ چٹ چٹ پیار کریں گی لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پنگوڑا ان کے پٹنگ کے قریب لا کر رکھ دیا گیا۔ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ پنگوڑے میں کون لیٹا ہے۔

”نجو سے کہو اسے آکر دودھ پلائے۔ اس سے پہلے کہ یہ روئے۔ مجھ سے بچوں کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔“

تھوڑی دیر میں ایک جوان عورت کمرے میں آگئی۔ یہ نجو بوا تھیں جنہیں عابدہ کو دودھ پلانے پر رکھا گیا تھا۔ یہ اتنی صحت مند اور طاقت ور عورت تھی کہ ہر سال ایک بچہ پیدا کرتی تھی۔ اسی لیے اسے بکری بوا کہا جاتا تھا جو بکری بکری بکری ہو گیا تھا۔ اس کا دودھ بھی بہت اترتا تھا اسی لیے اس خدمت کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔

”اسے دودھ پلانے لے جاؤ۔“ نجو کو دیکھتے ہی نواب سلطان نے کہا۔ ”دودھ پلانے کے فوراً بعد اسے یہاں لے آنا کیونکہ ہم زیادہ دیر اسے خود سے الگ نہیں کر سکتے اور ہاں دودھ پلانے میں ذرا خست نہ برتا۔ یہ بھوک سے رونے نہ پائے۔ دودھ کے اوقات مقرر کر لو تاکہ اسے بھوک نہ ستائے۔“

”جی حضور۔“ نجو نے کہا اور شہزادی عابدہ کو اٹھا کر اپنے محل میں لے آئی جو اسے رہنے کے لیے دیا گیا تھا۔ دودھ پلانے کے بعد وہ اسے پھر سرکار اماں کے پاس لے آئی اور پنگوڑے میں لٹا دیا۔

اس کے جانے کے بعد نواب سلطان اپنے پٹنگ سے اتریں اور دو زانو ہو کر اس کے پنگوڑے کے پاس بیٹھ گئیں۔ اس وقت وہ فرماں روا بھوپال نہیں محض ایک دادی تھیں جو اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اسے ہنسانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ ہنسنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھول کر دادی کو دیکھ لیتی پھر آنکھیں بند کر لیتی۔

نجو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عابدہ کو کتنی دیر بعد بھوک لگتی ہے۔ وہ دودھ پلانے لے جاتی اور پھر لا کر سلطان جہاں کے پاس چھوڑ جاتی۔

نواب سلطان بھی اس کی ایسی دیوانی تھیں کہ ذرا سی دوری برداشت نہیں تھی۔ جہاں کہیں وہ جاتی تھیں شہزادی کا پنگوڑا ان کے ساتھ جاتا تھا۔

جب وہ پنگوڑے سے اتر کر گھٹنوں چلنے لگی تو نواب سلطان نے اسے ایک خاتون زاہدہ بیگم کے حوالے کر دیا۔ یہ خاتون پڑوس کی ریاست پر تاج گڑھ سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف بائیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس نے دانی کی باقاعدہ تربیت لی تھی اور بھوپال آکر ملازم ہو گئی تھی۔

نواب سلطان نے اسے بھی وہی نصیحت کی جو وہ نجو بوا کو کر چکی تھیں۔

”یہ شہزادی نہیں آگینہ ہے۔ اسے ذرا بھی نہیں پہنچی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ آج گھٹنوں چل رہی ہے کل چلنا سیکھے گی۔ اگر یہ گری تو زاہدہ تو میری نظروں سے گر جائے گی۔“

”جی حضور۔“ اس محل میں ان دو لفظوں کے سوا کوئی اور کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

نواب سلطان نے مزید احتیاط یہ کی کہ محل کے پورے... دالان میں گدے بچھوادیے تاکہ اگر وہ کبھی گرے تو اسے چوٹ نہ آئے۔

زاہدہ خاتون اس کی پرورش پر مقرر ہوئی تھی لہذا جتنی دیر وہ پنگوڑے سے باہر ہوتی زاہدہ خاتون اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ عابدہ نے گھٹنوں چلنے کا سفر بڑی جلدی طے کر لیا۔ زاہدہ خاتون اسے ہاتھ پکڑا کر چلنے کی مشق کروانے

لگی۔

وہ دو سال کی تھی کہ اس کی بہن ساجدہ پیدا ہوئی۔ شاہی خاندان میں دوسری بار بھی لڑکی! محل میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس بار بھی لڑکی ہوئی۔ دوسری بڑی بیویں بھی تو ہیں پانچ صحت مند بیٹوں کو جنم دے چکی ہیں۔

میمونہ بیگم تیسری مرتبہ حاملہ ہوئی تو پیدائش سے پہلے ہی کاٹا پھوسی شروع ہو گئی۔ شاید اب لڑکا ہو جائے۔ ہونا ہوتا تو پہلے ہی ہو جاتا۔ دیکھنا اس مرتبہ بھی لڑکی ہی ہوگی۔ عابدہ سے بھی کہا جاتا کہ وہ اپنے ننھے منے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے کہ اس مرتبہ لڑکا ہو۔ وہ ابھی کچھ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن لوگوں کے کہنے سے دعا کر دیا کرتی تھی۔

جب بہت ہو گئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔ ”اللہ میاں مجھے ایک بہن اور دے دے۔“ یہ معصومیت کی دعا تھی لیکن اس سے اس کی فطرت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہوتا تھا وہ آئندہ اپنی مرضی چلائے گی۔ جس کام سے روکا جائے گا وہی کرے گی۔

یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس نے دعا کی، قبول بھی ہو گئی اور تیسری بہن آگئی۔ اس کا نام رابعہ رکھا گیا۔ اسی سال حمید اللہ خاں علی گڑھ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے بھوپال واپس آگئے۔ نواب سلطان جہاں نے ان کی انگریزی دانی اور اعلیٰ تعلیم کو دیکھتے ہوئے اپنا چیف سیکریٹری مقرر کر دیا۔ یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ ان سے پوچھے بغیر اضافی اختیارات بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ اختیارات دیے جانے پر ان کے دونوں بڑے بھائیوں اور ان کے سرالی گھرانوں میں کچھ ناراضی پیدا ہو گئی۔ یہ اس وقت تو کوئی تنازع نہ بن سکا لیکن کشیدگی کا احساس خاموشی سے سفر کرتا رہا جو بعد میں ان خاندانوں میں دوریوں کا سبب بنا۔

اسی سال یعنی 1916ء میں پہلی جنگ عظیم کے بادل گہرے ہونے لگے تھے۔ اس وقت ہر ہندوستانی کو یہ سوچنا پڑ رہا تھا کہ برطانیہ کا ساتھ دیا جائے یا جرمنی کا یا پھر دونوں کا نہیں۔ ہندوستان پر برطانیہ حکومت کر رہا تھا۔ یہاں کی ریاستوں کی بقا اس میں تھی کہ برطانیہ کی مدد کی جائے۔

ریاست بھوپال نے برطانیہ کی مالی مدد کی اور ریاست کا ایک عسکری دستہ جرمنی سے لڑنے کے لیے بھیج

دیا۔ یہ ریاست کے چیف سیکریٹری اور نواب سلطان جہاں کا فیصلہ تھا لیکن اس فیصلے نے بھوپال کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑادی کیونکہ اتحادی فوجیں ترکوں کے خلاف لڑ رہی تھیں جن سے ہندوستانی مسلمانوں کو خاص انس تھا۔ اس کے علاوہ سارے ہندوستان میں خلافت تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے بھی آزادی کی مہم میں برطانوی حکومت کے خلاف زور پکڑ لیا تھا۔ اس لیے نواب سلطان اور حمید اللہ خاں کو برطانیہ کے ضمن میں نہایت احتیاط سے قدم اٹھانا تھا۔ احتیاط یہی تھی کہ اس وقت یہ مجبوری تھی برطانیہ کا ساتھ دیا جائے۔

عابدہ سلطان اس عمر کو پہنچ گئی تھی جب مسلمان گھرانوں میں باضابطہ تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہوا کرتا تھا اور اس آغاز کے لیے ایک تقریب منعقد ہوتی تھی جسے بسم اللہ کہا جاتا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی بھوپال جیسی ریاست کی شہزادی تھی۔ ایسی دھوم دھام سے تقریب ہوئی کہ بھوپال بھر نور بن گیا۔

وہ اب اتنی بڑی ہوئی تھی کہ ایسی تقاریب سے لطف اندوز ہو سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تقریب اس کے لیے کس مشقت کا سامان لے کر آئی ہے۔ اسے تو اس وقت احساس ہوا جب بسم اللہ کے بعد اس کی دادی نے اسے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے طلوع آفتاب سے قبل اٹھانا شروع کر دیا۔ اسے بخیر فیلے پانی سے وضو کرنا پڑتا تھا اور نماز کے بعد قرآن پڑھنے کے لیے دادی کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا۔ وہ ایسی سخت گیر تھیں کہ پڑھنے کا عمل چٹکی نوچنے، ناک مروڑنے، کان کھینچنے یا پھر اس کا سر دیوار سے ٹکرانے کی صورت میں برآمد ہوتا۔ اس سے بھی کام نہیں چلتا تو جائے نماز چھوڑ کر مرکزی دالان میں فرش پر بچے ہوئے چھوٹے سے سفید گدے پر منتقل ہو جاتی تھیں۔ یہیں وہ ملاقاتیوں سے ملاقاتیں کرتی تھیں۔ سرکاری کام نمٹاتی تھیں۔ عابدہ کا سبق بھی سنتی جاتی تھیں۔ اس مصروفیت کے باوجود اس کی ذرا سی غلطی پر اس کے منہ پر زور دار طمانچہ مار دیا کرتی تھیں۔ وہ جتنا روتی اتنے ہی اسے طمانچے پڑتے۔

سبق جلدی یاد ہو جاتا تو اسے بہنوں کے پاس جانے کی اجازت مل جاتی ورنہ سسکیاں اور رونا اس کا مقدر بننا رہتا۔ اس کے دل میں دادی کے خلاف نفرت سی ابھرتی لیکن اور زیادہ رونے کے سوا وہ کیا کر سکتی تھی۔ دوپہر کا کھانا اسے دادی کے ساتھ ہی کھانا پڑتا تھا۔ کھانے کے دوران

بھی اسے نصیحتوں کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملتا تھا۔ اس کے بعد جبری سونے کے لیے لیٹ جانا، تمام ملازماؤں کو حکم تھا کہ عابدہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھینے نہ پائے۔ رات کو نو بجے بستر پر چلے جانا۔

یہ کتنی غلامی اور مشقت کی زندگی جسے اس کا بچپن سزا کی طرح کاٹ رہا تھا۔ اس کی تربیت کے لیے جو عورتیں رکھی گئی تھیں وہ اس پر رحم کھانے کے سوا کیا کر سکتی تھیں۔

سخت مشقت اور مار پیٹ سے اس کے سر میں درد رہنے لگا۔ شاہی ڈاکٹر جو اکثر سزا کے وقت موجود ہوتا تھا اس نے کئی مرتبہ سلطان جہاں کو باور کروایا کہ پانچ سال کی بچی کو اتنے سخت قواعد و ضوابط میں نہیں رکھنا چاہیے ورنہ اس کی صحت کو سنگین خطرہ پہنچنے کا اندیشہ ہے لیکن سرکار اماں اسے بھی بہانہ بازی سے تعبیر کر رہی تھیں۔

نواب سلطان کی یہ سختی بھی دراصل اس سے بے پناہ محبت ہی کا نتیجہ تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر دوسرے بچوں سے ممتاز ہو جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے محض چھ سال کی عمر میں ناظرہ قرآن پاک ختم کر لیا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جو پورے خاندان میں صرف اسے حاصل ہوا تھا۔

نواب سلطان جہاں کا سرخرو سے بلند ہو گیا۔ انہوں نے عابدہ کو ایک دن کی چھٹی سے نوازا اور پیار سے اسے چوم لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے اپنی پوتی کو پیار کیا تھا۔

ایک روز وہ اپنی مگراں زابدہ بیگم کے پاس بیٹھی تھی کہ زابدہ نے اس کے بچپن کی باتیں چھیڑ دیں۔ بچی تو وہ اب بھی تھی یعنی صرف آٹھ سال کی۔ زابدہ اس وقت کی بات کر رہی تھی جب وہ چلنا سیکھ رہی تھی۔

”ایک دن آپ کی والدہ آپ سے کھیل رہی تھیں اور آپ کو ہاتھ پکڑ کر چلواری تھیں۔ ایک دم انہوں نے پلٹ کر دیکھا کہ سرکار اماں ان کے پیچھے کھڑی گھور رہی ہیں۔ آپ کی ماں ڈر کے مارے بھاگ گئیں اور آپ گر پڑیں۔ یہ دیکھ کر سرکار اماں سخت غصے میں چہنچہ چلائے گئیں۔ ”وہ کیوں بھاگ گئیں؟“ عابدہ نے پوچھا۔

”سرکار اماں کی اجازت نہیں تھی کہ کوئی آپ کو ہاتھ لگائے۔“

”کیا بیوا (وہ اپنی ماں کو بیوا کہتی تھی) کو بھی اجازت نہیں تھی؟“

”در اصل بات یہ ہے کہ سرکار اماں کو لڑکیوں سے بہت لگاؤ رہا ہے۔ ان کی اپنی دو بچیوں کا نوعمری میں انتقال ہو گیا۔ اپنی ایک پوتی برجیس جہاں کو گود لیا وہ بھی دس سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ تب سے سرکار اماں لڑکیوں کے معاملے میں بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں۔“ زابدہ نے وضاحت تو کر دی تھی لیکن عابدہ مطمئن نہیں ہوئی۔ اسے یہ دکھ ہوا کہ سرکار اماں نے مجھے میری ماں کے پیار سے محروم رکھا۔ یہی شکوہ آگے چل کر بغاوت میں بدلنے والا تھا۔

نواب سلطان جہاں اسے سخت گیر ملانی کی طرح پڑھاتی رہیں۔ تین سال بعد اسے یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ اس نے قرآن پاک کا لفظی ترجمہ زبانی یاد کر لیا۔ نواب سلطان احساسِ فخر سے پھٹ پڑیں۔

”میری عابدہ بے مثال ہے۔“

انعام کے طور پر نشر کی تقریب منعقد ہوئی۔ ایسی تقریب کہ بڑی سے بڑی شادی بھی اس کے سامنے بیچ تھی۔ پورے ایک ہفتے کی چھٹی بھی ملی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سخت اندھیرے سے روشنی میں آگئی ہو۔ یہ روشنی بس نشر کی چالیس روزہ تقریبات تک تھی۔ تقریبات ختم ہوتے ہی اندھیرا مزید گہرا ہو گیا۔ قرآن کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم کے لیے مزید ٹیوٹر آگئے۔ حدیث، فقہ اور فارسی کے لیے مولوی عنایت اللہ۔ عربی کے لیے مولوی علاؤ الدین۔

مس کوہن اور مسز وہیلر انگریزی، فرانسیسی، تاریخ، جغرافیہ پڑھانے کے لیے مقرر کی گئیں۔ رات بھی کیوں خالی جائے۔ اس لیے رات کے کھانے کے بعد موسیقی کی تربیت دی جانے لگی۔

کچھ دن بعد گھڑسواری کی مشقیں بھی ہونے لگیں پھر نشانہ بازی میں بھی حصہ لینے کا حکم صادر ہو گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ کھلے میدان کے کھیل ہی اس کی روح کا حصہ ہیں۔ وہ گھڑسواری کے لیے بنی ہے یا شکار کے لیے۔ اس کی دادی نے اس کے اندر نسائی جوہر کوٹ کوٹ کر پھرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مردانہ کھیلوں کی طرف متوجہ تھی۔ اسے ضد بھی کہا جاسکتا تھا اور دادی کے خلاف بغاوت بھی۔

ٹھاکر چمن سنگھ نامی ایک راجپوت اسے گھڑسواری سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

ہر صبح تین ٹٹو، ان کے تین رکھوالے، تین پیغام

رساں، تین کم عمر خدمت گار اور ٹھاکر چمن سنگھ، قصر سلطانی کے مرکزی دروازے پر اس کے برآمد ہونے کے منتظر رہتے تھے۔ کم از کم ایک خاتون ملازمہ کے بغیر دروازے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ جلد ہی اپنے گھوڑے کو سر پیٹ دوڑانے لگی۔ ایک روز اس نے اپنے گھوڑے کو... ایسا سر پیٹ دوڑایا کہ ٹھاکر چمن سنگھ چیخا کرنے کے باوجود اسے نہ پکڑ سکا پھر ایسے واقعات بار بار پیش آنے لگے۔ گھڑسواری کا نشہ اس پر ایسا طاری تھا کہ گھڑسواری کے اوقات کے علاوہ بھی کسی گھوڑے کو تانگے سے الگ کر کے دن کے کسی بھی حصے میں گھوڑے کی نگہ پیٹھ پر اچک کر بیٹھتی اور اسے دوڑانے لگتی۔

ان واقعات کی اطلاع حمید اللہ خاں کو ہوئی تو انہوں نے کوئی وجہ بتائے بغیر چمن سنگھ کی تربیت سے اچانک اسے علیحدہ کر دیا اور اپنی ذاتی تربیت گاہ بھیج دیا۔

یہاں اسے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں پر سوار ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ پولو کے کھیل کی تربیت بھی حاصل کی۔ والدین کی نگرانی میں شکار کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ہرن، سانپ، چیتل اور چیتے سے ہوتی ہوئی شیر کے شکار تک پہنچی۔ اب تعلیم کہیں پیچھے رہ گئی تھی اور وہ مردوں کی طرح مردوں کے ہر کھیل میں شریک ہو رہی تھی۔

☆☆☆

”کچھ سنا تم نے ہنزل صاحب...“

”کیا ہوا ہنزل صاحب کو؟“

”ان کا انتقال ہو گیا۔“

”کیسے؟“

”کیسے کیا، جیسے ہوتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ وہ تو اتنے دہشت ناک اور غصیلے تھے کہ موت ان تک پہنچی کیسے؟“

”سرکار اماں، شملہ والی کوٹھی پر ہی ہیں۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے۔“

”وہ اچانک مر کیسے گئے؟“

”اچانک نہیں مرے۔ ہم میں سے دو ایک کوئی معلوم ہوگا کہ انہیں کینسر تھا۔ سب سے چھپایا جا رہا تھا لیکن موت نے افشا کر دیا۔“

ملازم آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے پھر زابدہ اور انگریز نرس جو میا کھلائی تھی آپس میں اس پر بحث کرنے لگیں کہ اس موقع پر عابدہ، راجہ اور ساجدہ کو کیا بتایا جائے

اور انہیں کس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے کو کہا جائے۔
”بچو! تمہارے تایا کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کا سوگ
منایا جا رہا ہے اس لیے ادھر ادھر بٹتے کھیتے نہ پھرو۔“
سب بچے تو چپ ہو گئے لیکن عابدہ سوال کرنے لگی۔
زیادہ اصرار اس سوال پر تھا کہ جنرل صاحب کو کس نے قتل
کیا ہے۔ دراصل قتل کے سوا مرنے کی کوئی اور صورت اسے
معلوم ہی نہیں تھی۔

”انہیں کسی نے قتل نہیں کیا۔ وہ آپ ہی مر گئے۔
مزید سوال مت کرو اور کتاب پڑھنے بیٹھ جاؤ۔“
”میں کتاب کیوں پڑھوں؟“

”اس لیے کہ جنرل صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ تم
اگر کھیاتی ہوئی پکڑی گئیں تو سرکار ماں ناراض ہوں گی۔“
”میں کتاب نہیں پڑھوں گی، میں فٹ بال کھیلوں
گی۔“

”تم مجھے نوکری سے نکلوا دو گی۔“
”پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ جنرل صاحب کو کس
نے قتل کیا؟“

”وہ بیمار تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔“ تنگ آ کر زائدہ
نے جسے وہ غلو کہتی تھی اس پر یہ انوکھا انکشاف کیا۔ ”جنرل
صاحب کو کس نے قتل کیا؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ان پر کالا
جادو کیا گیا تھا جس سے وہ مر گئے۔“ عابدہ یہ سوال کر سکتی تھی
کہ کالا جادو کیا ہوتا ہے لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

عابدہ ہمیشہ کالا جادو کے بارے میں تجسس رہی۔ یہ
جاننے کے بعد بھی جنرل عبید اللہ، اس کے تایا اور سرکار ماں
کے بیٹے کو جگر کا کینسر تھا جس سے وہ مر گئے۔

قصر سلطانی کی فضا سوگوار تھی۔ ہنسنا تو بڑی بات
مسکرانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ عابدہ کو سنبھالنا بہت
مشکل تھا اس لیے اسے باہر ہی رکھا جاتا تھا۔ نواب سلطان
جہاں چالیس دن بعد شملے والی کوشی سے واپس قصر سلطانی
آئیں۔

ابھی پانچ مہینے گزرے تھے کہ قصر سلطانی میں زلزلہ
آ گیا۔ نواب سلطان کی کار عید گاہ والی کوشی کی طرف جاری
تھی جہاں ان کے بڑے بیٹے نصر اللہ خاں اپنے خاندان
کے ساتھ رہتے تھے۔ انہیں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ خبر
آگئی۔ ”نواب نصر اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔“

”انہیں کیا ہوا تھا؟“
”ذیابیطس کا پرانا مرض تھا جسے خفیہ رکھا گیا تھا۔“

موت نے اس راز کو افشا کر دیا۔ ”پھر وہی سوگ اور ماتم۔
جوتی کا زائچہ درست ہو گیا تھا۔ عابدہ کی پیدائش
کے وقت عابدہ کا زائچہ بنا کر جوتی نے یہ خوش خبری یا بدخبری
سنائی تھی کہ نواب سلطان کے سب سے چھوٹے بیٹے حمید اللہ
خاں ان کے جانشین ہوں گے۔ یہ امکان نظر ہی نہیں آتا تھا
کیونکہ ان کے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے اور
اب.....؟ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ حمید اللہ خاں
کے لیے راستہ بالکل صاف تھا۔ کوئی قانونی پیچیدگی اگر تھی تو
حل کی جاسکتی تھی۔

عمر رسیدہ حکمران بھوپال کے دو مضبوط سہارے پانچ
ماہ کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے اس سے چھین لیے
گئے تھے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی روتی رہتی تھیں۔ سلطنت کے
کاموں..... سے تقریباً دور ہو گئی تھیں کہ اچانک انگریز
ریزیڈنٹ (ایک برطانوی نمائندہ جو نگرانی کے لیے
ہندوستان ریاست میں موجود رہتا تھا)

”حکومت کو ہڑبائی نس نواب سلطان جہاں آف
بھوپال کے جانشین کے باضابطہ اعلان کا انتظار رہے گا۔“
”حمید کے علاوہ میرا جانشین اور کون ہو سکتا ہے۔“
انہوں نے بلند آواز میں تقریباً چیخے ہوئے کہا اور جائے نماز
سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

ہندوستان جب باضابطہ طور پر برطانوی حکومت کا
تابع دار بن گیا تو کوئی بھی شاہی ریاست حکومت برطانیہ کی
منظوری اور رضامندی کے بغیر نہ تو حکمران مقرر کر سکتی تھی
اور نہ ہی وارث کا اعلان کر سکتی تھی۔

سرکار ماں کا دو ٹوک جواب ”حمید اللہ کے سوا کون
میرا جانشین ہو سکتا ہے؟“ وائسرائے تک پہنچا تو قانونی
موشگافیاں شروع ہو گئیں۔

ایک اور خط قصر سلطانی میں پہنچا۔ ”جانشینی کے
مقدمات میں برطانوی قانون وراثت کا اطلاق 1857ء
سے ہندوستان کی تمام مسلم اور ہندو ریاستوں پر ہوا ہے اور
اس قانون کے تحت آپ کے بڑے بیٹے نصر اللہ خاں کے
بیٹے حبیب اللہ خاں کو جانشین مقرر کیا جانا چاہیے۔“

سرکار ماں کا اصرار تھا کہ اعلیٰ تعلیم اور اہل بھوپال
میں مقبولیت رکھنے کی وجہ سے وہ اپنے واحد بیٹے کو اپنا
جانشین مقرر کرنے کا حق رکھتی ہیں۔

وائسرائے کا عملہ اس دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں
تھا۔ خط و کتابت کا ایک سلسلہ تھا جو چل نکلا تھا۔ اس نے

ناامیدی کی شکل اس وقت اختیار کر لی جب گورنر جنرل لارڈ
ریڈنگ بھی وائسرائے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ برطانوی
انتظامیہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ریزیڈنٹ نواب سلطان کے
حق میں تھا اور وائسرائے مخالف۔

اس وقت صورت حال دلچسپ ہو گئی جب خود بھوپال
میں دو گروہ بن گئے۔ ایک طرف نصر اللہ خاں کے سرالی
تھے جو حبیب اللہ خاں کے حق میں تھے، دوسری طرف وہ
لوگ تھے جو حمید اللہ خاں کی حمایت کر رہے تھے۔ اندرونی
سازشوں کا جال بچھ گیا تھا۔ ایسے غدار نواب سلطان کے
قریب پہنچ گئے جو دراصل حبیب اللہ خاں کے حق میں تھے۔
مطلب یہ تھا کہ یہاں جو بھی قدم اٹھایا جائے اس کی اطلاع
حبیب اللہ خاں کو پہنچا دی جائے۔

یہ صورت حال اس وقت دلچسپی سے گزر کر سنگین
صورت اختیار کر گئی جب حمید اللہ خاں پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ
اس حملے میں بال بال بچ گئے لیکن خطرہ بہر حال خطرہ تھا۔ یہ
قدم پھر بھی اٹھایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ
جب تک کیس کا فیصلہ نہ ہو بھوپال سے دور دور رہا جائے۔
انہوں نے عابدہ کے والدین اور بہنوں کو ساتھ لیا اور طویل
سیاحت پر نکل گئیں۔ دہلی، بمبئی، کلکتہ، بنگلور، میسور، لکھنؤ،
کانپور، آگرہ اور جیمیر شریف گھومتی پھرتی رہیں۔

نواب سلطان جہاں کو کچھ نہیں چاہیے تھا، اپنے بیٹے
کی زندگی اور جانشینی چاہیے تھی۔ دو بیٹوں کو کھودینے کے بعد
ایک ہی تمنا دل میں کروٹیں لے رہی تھی کہ حمید اللہ خاں
نواب آف بھوپال کہلائیں۔ یہ آرزو فطری تھی لیکن
برطانوی قانون کی موجودگی میں ناممکن نظر آ رہی تھی۔

جب دوانا کام ہو جائے تو دعاؤں کا سہارا رہ جاتا
ہے۔ وہ جس شہر میں جاتیں وہاں کے مزارات پر اپنے بیٹے
کے لیے دعا مانگنے جاتیں۔ ایسے پیروں فقیروں سے ملتیں
جن کی روحانیت کے قصے مشہور تھے۔ عابدہ ان کی چہیتی تھی
اس لیے ہر جگہ وہ ان کے ساتھ جاتی۔ اس کی دوسری بہنیں،
والد اور والدہ کے ساتھ تفریحات سے محظوظ ہوتیں اور وہ
سرکار ماں کے ساتھ جانے پر مجبور تھی۔ عابدہ نے جان بوجھ
کر ایسی حرکتیں شروع کر دیں جو سرکار ماں کو ناراض کر سکتی
تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سرکار ماں اس سے ناراض
ہو جائیں اور اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیں۔

وہ بڑودہ میں تھی کہ مہارانی بڑودہ کے اکسانے پر فلم
دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ اس کی والدہ میمونہ بیگم سخت پردہ

کرتی تھیں۔ انہیں بھی فلم دیکھنے کے لیے تیار کر لیا گیا۔
عابدہ کو دادی کے ساتھ جانا تھا لیکن وہ ان خواتین کے ساتھ
فلم دیکھنے چلی گئی۔ دل میں خوش بھی ہو رہی تھی کہ دادی کو
پریشان کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔

فلم شروع ہو چکی تھی سب آرام سے فلم دیکھ رہے تھے
کہ ایک دم افراتفری سی مچ گئی۔ بجلی روشن ہو گئی اور شو ختم
ہو گیا۔ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ دیکھا تو منیجر کے ساتھ ایک برقع
پوش عورت کھڑی تھی جس کے سر پر ہیرے کا تاج چمک رہا
تھا۔ یہ نواب سلطان جہاں تھیں۔ عابدہ کی والدہ پردہ کرتی
تھیں لیکن اس وقت شاندار ساڑی میں ملبوس تھیں۔ بس پھر
کیا تھا سرکار ماں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

یہ آخری فلم بنی تھی۔ نواب سلطان نے واپسی کا
اعلان کر دیا۔ یہ تمام لوگ نواب سلطان کے ریلوے سیلون
میں پہنچ کر شرمندگی سے بیٹھ گئے۔ یہ سیلون بھوپال کی طرف
واپس جا رہا تھا۔

بھوپال پہنچ کر اصل وجہ معلوم ہوئی کہ آخر نواب
جہاں نے غفلت میں واپسی کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ دہلی سے
اطلاع ملی تھی وائسرائے نے حتیٰ فیصلہ حمید اللہ خاں (عابدہ
کے والد) کے خلاف کیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کاغذات
انگلستان کے راستے میں ہیں جہاں اعلان سے قبل محض رسمی
کارروائی مکمل کی جائے گی۔

نواب سلطان نے بھوپال پہنچتے ہی بمبئی جانے کا
اعلان کر دیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ بمبئی کیوں جا رہی
ہیں لیکن دبی دبی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں کہ سرکار
ماں جانشینی کا مقدمہ لے کر انگلستان جا رہی ہیں۔

اس سفر میں عابدہ، اس کی دونوں بہنیں اور والدہ بھی
ساتھ تھیں۔ جب یہ لوگ بمبئی پہنچ کر بحری جہاز قیصر ہند میں
سوار ہوئے تو بھوپال میں سنی جانے والی سرگوشیاں حقیقت
میں بدل گئیں۔

لندن کے کرائے کے مکان میں ایک دن سرخ
قالین بچھائے جا رہے تھے۔ تمام وردی پوش ملازمین اپنی
اپنی مقررہ ذمے داریاں سنبھالنے کسی کے استقبال کے لیے
تیار کھڑے تھے۔ نواب سلطان تمام کام بڑی رازداری سے
کر رہی تھیں۔ کرپٹ نے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے وزیر
برائے انڈیا، لارڈ برکن ہیڈ کو چائے پر مدعو کیا ہے تاکہ ان
سے ریاست کے اہم امور پر تبادلہ خیال کر سکیں۔

معزز مہمان کو تفصیلات بتانے کے بعد کاغذی

کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ نواب سلطان ایسی مصروف ہوئیں کہ لڑکیوں کو کھلی آزادی مل گئی۔ تفریح گاہیں آباد ہو گئیں۔ بال روم کے رقص اور ڈرم کی آوازوں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم ہونے لگے۔ نواب حمید اللہ خاں ان تمام تفریحات میں ان کے ساتھ تھے۔

کئی مہینے بعد مقدمے کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہاں بھی ناکامی ہوگی۔

نواب سلطان جہاں نے آخری کوشش کے طور پر کنگ جارج پنجم کے دور بار میں جا کر التجا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا لیکن سرکار ماں ایسی خاتون تھیں کہ وہ یہ فیصلہ کر سکتی تھیں۔ یہ ہمت انہیں اس لیے ہو گئی کہ شاہ جارج پنجم اور ملکہ میری سے دورہ ہندوستان کے موقع پر خصوصی تعلق قائم کر لیا تھا جبکہ وہ اس وقت صرف پرنس آف ویلز تھے۔ اس تعلق کے باوجود ہر میٹنگ کے عملے نے انہیں آگاہ کر دیا کہ ہر میٹنگ کے قیمتی وقت میں سے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ملیں گے۔

شاہ جارج پنجم نہایت مہربانی سے ملے۔ نواب سلطان جہاں کے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنا مقدمہ پیش کیا۔

”میرے پانچ بچوں میں سے میرے پاس صرف ایک ہی بیٹا بچا ہے جو جانشینی کے لیے مسلم قانون کے مطابق میرے پوتوں سے زیادہ حق دار ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ میرا بیٹا ہے اور اس لیے بھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربے کا رہے کیونکہ اس کے پاس ریاست کی مختلف وزارتوں کے قلمدان ہیں۔ پولو کا مشہور کھلاڑی اور آل راولپنڈی اسپورٹس مین ہے جبکہ میرے پوتے لاڈ پیار میں بگڑ چکے ہیں۔ ان کی تعلیم میٹرک بھی نہیں۔ انہیں گھوڑوں سے ڈر لگتا ہے اور کھلے میدان کا کوئی کھیل انہوں نے نہیں کھیلا۔“

کنگ جارج نے ان کے بیان کو محل سے سنا لیکن بار بار یہ بھی کہتے رہے کہ وہ صرف آئینی بادشاہ ہیں اور حکومتی فیصلوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔

”عالی جاہ! آپ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اور آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ میری طرف دیکھیے میرے جہریوں بھرے چہرے کو دیکھیے۔ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میرا جان بحق مجھے نہیں دے سکتے۔“

کنگ جارج نے انہیں ایک مرتبہ پھر دلیلوں سے قائل کرنا چاہا لیکن سلطان جہاں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔ پندرہ منٹ کی ملاقات سوا گھنٹے میں تبدیل ہو گئی کیونکہ انہیں ہوش میں لانے کے لیے اتنا ہی وقت لگا تھا۔

وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچیں تو نہایت مطمئن نظر آ رہے تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ملاقات بہت کامیاب رہی ہے۔ اس ملاقات کا نتیجہ بہت اچھا نکلے گا۔

اس کے بعد بھی وہ برطانیہ کے اہم لوگوں سے ملاقاتیں کرتی رہیں بالآخر مطلع کیا گیا کہ حکومت برطانیہ ان کے بیٹے (حمید اللہ خاں) کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ اس اعلان کے بعد پڑنے والی رات کو نواب سلطان نے جائے نماز بچھائی اور بے شمار نوافل شکرانہ پڑھے۔ ایک ناممکن فیصلہ تھا جو ممکن ہو گیا تھا۔

نواب سلطان جہاں نے لندن ہی میں رہتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو رہے ہیں۔

بھوپال کی خواتین میں یہ آخری خاتون تھیں جنہوں نے بھوپال پر حکومت کی۔ اب لندن میں رکنے کا کوئی جوا نہیں تھا۔ اس شاہی قافلے نے واپسی کا سفر اختیار کیا پھر وہ بمبئی اور خصوصی ٹرین کے خصوصی ڈبے کے بندر وازے۔

”تم اپنی ماں کے برقعوں میں سے ایک برقع چن لو۔“ دادی نے کہا۔

”اس لیے کہ آج سے تم پردہ کیا کرو گی۔“

عابدہ پردے کا نام سنتے ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دواں کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تیرہ سال کی ہوئی تھی اور پھر وہ راستے بھر اپنے گھوڑوں، پولو اور بندوق کے کھیلوں کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ پردے کا نام سنتے ہی تمام خواب چرچور ہو گئے۔ عابدہ کو برقع پہننا پڑا۔

جب بھوپال قریب آیا تو ایک جگہ رکنے پر رقعے میں اسے والد اور دادی کے ساتھ کھڑا کیا گیا اور مستقبل کی جانشین کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا۔ اسی موقع پر اسے گوہر تاج کے خطاب سے نوازا گیا۔ نواب سلطان جہاں نے اپنا تاج اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ عابدہ کا منہ بدست پھولا ہوا تھا۔ تاج سر پر رکھ کر بھی اسے خوشی نہیں ہوئی۔ بھوپال شہر میں منائی جانے والی خوشیاں، توپوں

سلاخی، بندوقوں کی فائرنگ، دربار کی گیمپا گہمی، والد کی تخت نشینی۔ اس کے لیے کوئی خوشی، خوشی نہیں تھی۔

ابھی حمید اللہ کی تاج پوشی کا جشن منایا جا رہا تھا کہ عابدہ کو ایک اور آفت نے گھیر لیا۔ شاہی گھرانوں میں حکم چلتے ہیں اطلاع نہیں دی جاتی۔ اسے بھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ بس اس کی ایک مصاحبہ کنیز نے آکر اسے یہ اطلاع دی کہ نواب سلطان جہاں کے حکم کے مطابق وہ غسل کر کے کوئی بھاری جوڑا پہن لے۔

”صرف مجھ سے ہی کیوں کہا جا رہا ہے؟“

”اس لیے کہ تم بہنوں میں بڑی ہو۔“

”یہ کوئی ایسا گناہ نہیں کہ میں بھاری جوڑا پہن لوں۔“ یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ سلطان جہاں بذات خود تشریف لے آئیں۔

”نکاح والے دن وہن کو بھاری جوڑا پہننا پڑتا ہے۔ قاضی صاحب آگئے ہیں اور تم نے کپڑے تک نہیں بدلے۔“ اسے زبردستی غسل خانے میں دھکیل دیا گیا۔

وہ تیار ہو کر نکلی تو اسے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک جالی دار پردے کے عقب میں قاضی اور خاندان کے دوسرے مرد اور دو دلہا بیٹھا تھا۔

”عابدہ سلطان! کیا آپ نواب آف کوروا کی، نواب سرور علی خاں کو اپنا شوہر قبول کرتی ہیں؟“

سرور علی خاں اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ انہیں وہ ایک ہمدرد انسان بھی سمجھتی تھی لیکن نکاح اور شادی کے مفہوم سے ہنوز واقف نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان مواقع پر شرم کی جاتی ہے۔ اس نے فوراً کہا۔ ”ہاں مجھے قبول ہے۔“

اس وقت وہ شادی کے مفہوم سے واقف نہیں تھی۔ تیرہ سال سے بھی کم عمر تھی۔ اسے تو بس یہ خوشی تھی کہ خوف ناک دادی اماں سے نجات ملے گی۔ وہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوگی۔

اس نے اس خود مختاری کی مشق کا آغاز نکاح کے فوراً بعد کر دیا۔ یہ ایک بڑی بغاوت تھی جو وہ دادی کے خلاف کرنے جا رہی تھی۔ اس نے ماضی کو آواز دی۔ ایک صبح پہلے کی طرح گھڑ سواری کا لباس پہنا، برقع کو خیر باد کہا اور دروازے پر اپنے والد کا انتظار کرنے لگی۔ لندن جانے سے ایک سال پہلے اس کی یہی عادت تھی۔ نواب سلطان جہاں کے اسے ڈی سی نے اسے سرزنش کی۔ ”اب آپ پردہ کرنی

ہیں۔ پولو گراؤنڈ جانے اور مرد کھلاڑیوں سے گھٹنے ملنے کی اجازت نہیں۔ سلطان حضور سخت خفا ہوں گی۔“

اس نے اس سرزنش کی پروا نہیں کی اور پورچ میں کھڑی والد کا انتظار کرتی رہی تاوقتیکہ اس کے والد ہڑبائی نس حمید اللہ خاں کی گاڑی پورچ میں آکر لگی اور نواب صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور حیران بھی ہوئے۔ اس عرصے میں وہ پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ جب سرکار کو معلوم ہوگا تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گی؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف کندھے اچکا کر رہ گئی۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ پولو گراؤنڈ پہنچ گئی۔

والد کی اس حوصلہ افزائی نے اسے پہلے جیسی بنادیا۔ وہ نہ صرف گھڑ سواری میں والد کے ساتھ ہونی بلکہ دوسرے کھیل کھیلنے کی جسارت بھی کرنے لگی۔

اب وہ بے باکی سے بائیسکل، پولو، ٹینس اور فٹ بال وغیرہ کھیل رہی تھی۔ گھڑ سواری کا شوق جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ محل کے باغوں میں کھڑے تانگے اس کا خاص ہدف تھے۔ گھوڑے کو تانگے سے نکالتی اور اس کی ٹانگی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے میدانوں اور وادیوں میں دوڑاتی پھرتی۔

نواب سلطان جہاں اب حکمران نہیں رہی تھیں اس لیے ملازمین کی ترجیحات بھی بدل گئی تھیں۔ جب وہ حکمران تھیں تو انہیں ایک ایک بات کی اطلاع دی جاتی تھی۔ اب عابدہ کی شکایت کوئی ان تک نہیں پہنچا رہا تھا۔

جب تک سلطان جہاں کو اطلاع ہوتی اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے بہت واویلا کیا، بڑا شور مچایا اور بالآخر ہتھیار ڈال کر اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرنے لگیں۔

اس کی باغیانہ فطرت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے اپنے کمر تک لمبے بالوں کو کٹوا دیا۔ اس کے پیچھے کئی جذبات کا فرما تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ دادی کی طرف سے عائد کردہ بندشوں کو توڑنے پر کمر بستہ تھی۔ دادی کی طرف سے باغیانہ جذبات اس کے دل میں پل رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ جذبہ تھا کہ لوگ اسے مردوں سے کم نہ سمجھیں۔ ریاست کی جانشین تھی اور اسے فوجی تربیت دی جا رہی تھی تاکہ وہ فوجی پریڈ کی سلاخی لے سکے۔ اسے یہ احساس ہوا تھا

کہ اس کے لیے بال علامتی طور پر کاوٹ بن رہے ہیں۔
سرکار ماں نے جب اس کے کٹے ہوئے بال دیکھے تو
انہوں نے شدید غصے کے عالم میں چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھالیا
پھر انہوں نے اعلان کیا کہ وہ بھوپال چھوڑ کر جارہی ہیں۔
”عابدہ نے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے۔ میں اس
کی یہ شرم ناک حرکتیں نہیں دیکھ سکتی۔“

حمید اللہ خاں نے انہیں سمجھا بھجا کر روک لیا۔ وہ اب
حکمران نہیں رہی تھیں ورنہ وہ نہ جانے کیا کرتیں۔ اب
انہوں نے صرف اتنا کیا کہ خاموشی اختیار کر لی۔

1928ء میں عابدہ کو وائسرائے کی جانب سے
باقاعدہ جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ اب ایک ولی عہد کی حیثیت
سے اس کی تربیت شروع ہو گئی۔ وہ دیہی علاقوں کے
سرکاری دوروں میں والد کے ساتھ جانے لگی۔ دن بھر کے
سرکاری کاموں کے بعد شامیں اور راتیں شکار میں صرف
ہوتی تھیں۔

سلطان جہاں اب خاندان کی سربراہ کی حیثیت سے
قابل احترام تو ضرور تھیں لیکن اب وہ حکمران نہیں رہی تھیں۔
حمید اللہ خاں اپنے فیصلوں میں آزاد تھے۔ انہوں نے
اپنے انداز کا نیا طرز حکومت اور طرز زندگی متعارف کروایا۔
سادگی اور قناعت قصہ پارینہ بن گئی۔ سرکار ماں بڑبڑانے
کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ عابدہ ہر پابندی سے آزاد تھی۔
والد اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور ہر وقت اپنی مددگار
کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

وہ بھوپال کو تبدیل ہوتے دیکھتی رہیں اور کڑھتی
رہیں اور بالآخر 1930ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مرتے
وقت وہ یہ دعا مانگ رہی تھیں۔ ”میری آخری خواہش یہ ہے
کہ میں اپنی عابدہ کی شادی تک زندہ رہوں۔“

عابدہ اب سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ سسرال والوں کی
طرف سے رخصتی کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا۔ سلطان جہاں
کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شادی سے پہلے ہی
ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے کچھ عرصے بعد
عابدہ کی رخصتی نہایت شان و شوکت سے عمل میں آ گئی۔

شادی تو ہو گئی لیکن عابدہ سلطان کی فطرت میں
مردانہ اوصاف تھے جو ترقی پا چکے تھے۔ نسائی انداز نہ ہونے
کے برابر تھے۔ ابتدا ہی میں اس نے ایسا طرز عمل اختیار کیا
کہ نواب سرور علی خاں (شوہر) کا رویہ اس کی طرف سے

تلخ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان ایک قسم کی سرد جنگ کا آغاز
ہو گیا۔ اس نے اپنے معمولات ایسے بنا لیے کہ وہ آہستہ
آہستہ شوہر سے دور ہوتی چلی گئی۔ سورج طلوع ہونے سے
پہلے اٹھ جاتی۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہوتی واپس آ کر باکی
تھیلی۔ شوہر اگر موجود ہوتے تو ان سے سرسری باتیں کرتی
پھر شکار کے لیے نکل جاتی۔ شام کو واپس آتی۔ رات کا کھانا
کھا کر ستارے کر بیٹھ جاتی۔

ان معمولات نے رنگ دکھایا۔ وہ بھوپال واپس چلی
آئی۔ سب سمجھ گئے تھے کہ اس کی شادی ناکام ہو چکی ہے۔
حمید اللہ خاں نے بھوپال میں اس کی رہائش کا جواز پیدا
کرنے کے لیے اسے اپنی چیف سیکریٹری مقرر کر لیا۔ کبھی
کبھی اپنی سسرال کا دورہ بھی کر لیتی تھی ورنہ مستقل قیام
بھوپال ہی میں تھا۔

وہ سرکاری کاموں، پولو، تیراکی، ہاکی اور شکار میں
مشغول تھی۔ اسے اپنی حالت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اچانک
اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔ جب بہنوں اور
دوسرے گھر والوں کو معلوم ہوا تو اس کی غیر محتاط سرگرمیوں کو
زبردستی بند کروا دیا گیا۔ دائیوں، نرسوں اور ڈاکٹروں کے
دورے ہونے لگے۔

1934ء میں وہ ماں بن گئی۔ اس نے ایک خوب
صورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا جس کا نام شہریار محمد خاں
رکھا گیا۔ بھوپال شہر دہن کی طرح بج گیا۔ کئی ہفتوں تک شہر
اور گاؤں سے لوگ تحفوں اور مبارک بادوں کے پیغامات
لے کر آتے رہے۔ اس خوشی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ
بھوپال نے اب تک صرف خواتین وارث تحت دیکھی تھیں
اب مرد ولی عہد پیدا ہوا تھا۔

عابدہ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنے بیٹے کی
اچھی پرورش کے لیے وقف کر دے گی۔ روایت کے
برخلاف اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو خود دودھ
پلائے گی۔

شوہر کی طرف سے مسلسل دھمکیاں آرہی تھیں کہ جیسے
ہی بچے کو دودھ پلانے کی مدت ختم ہوگی وہ اپنے بچے
کو حاصل کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کریں گے۔
عابدہ نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ برطانوی یا اسلامی
قوانین کے جو بھی فیصلے ہوں گے وہ اپنے بیٹے کو خود سے
جدا نہیں ہونے دے گی۔

جب شوہر کی دھمکیاں بڑھنے لگیں اور شہریار ایک
سال کا ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے شوہر نے
وائسرائے سے مل کر اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے
کوششیں تیز کر دی ہیں تو عابدہ نے آخری فیصلہ کر لیا۔ یہ
فیصلہ وہی کر سکتی تھی۔ رات دس بجے شہریار کو دودھ پلا کر
سلا یا، اپنا ریوالور لوڈ کیا اور ڈرائیور کے بغیر ہی گاڑی میں
بیٹھ گئی۔ اس کی کار کو روانی جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔
”میں یہ قصہ آج ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گی۔“ اس
نے اپنے آپ سے کہا اور ممکنہ رفتار پر گاڑی کو دوڑا دیا۔
اسے سوئیل کا فاصلہ طے کرنا تھا اور پھر کلہروائی کر کے واپس
آنا تھا۔ اتنی جلدی آتا تھا کہ بھوک کی وجہ سے شہریار کی آنکھ
نہ کھل جائے۔

رات کا ایک بج رہا تھا کہ وہ کوروا کی محل کے
سامنے پہنچ گئی۔ محل کی بتیاں جل رہی تھیں۔ یہ بات اس کے
لیے قابل اطمینان تھی۔ اس نے اپنی کار ڈیوڑھی میں روکی۔
اس کے شوہر کا ڈرائیور گاڑی کی طرف لپکا کہ دروازہ
کھولے۔ عابدہ نے اپنی گاڑی کی چابیاں اس کی طرف
اچھال دیں۔

”گاڑی کی ٹنگی قل کر دو۔ مجھے ابھی واپس بھی
جانا ہوگا۔ گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔“

”جی حضور۔“ ڈرائیور نے چابیاں لے لیں۔

”نواب صاحب کہاں ہیں؟“

”کچھ دیر پہلے سونے کے لیے چلے گئے۔“

اس کے لیے نہ ملا زمین تھے نہ گھر کا ماحول اجنبی
تھا، نہ وہ کسی کے لیے غیر تھی جو کوئی روکتا۔ اس نے خواب گاہ
تک جانے والی سیڑھیاں طے کیں اور کمرے میں داخل
ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کیا اور لائٹ جلا دی۔ نواب
کوروا کی یعنی اس کا شوہر رضائی میں منہ چھپائے لیٹا تھا۔
اس نے گہرا کر رضائی سے منہ سے ہٹایا۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو۔ تم تو کہتی تھیں کہ
کبھی آؤ گی نہیں۔“

”میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ میں اپنے
بیٹے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی۔ تم اگر چاہو تو اس وقت مجھے قل
کر سکتے ہو۔“

”میں شہریار کا باپ ہوں، اپنے بیٹے پر میرا حق
ہے۔“

کیخسرو

کیانی خاندان کا افسانوی بادشاہ جس
نے ساٹھ سال تک ایران پر حکومت کی۔
اس کا باپ سیاوش تھا اور ماں (فرنگیس)
توران کے روایتی بادشاہ افراسیاب کی بیٹی
تھی۔ باپ کے قتل کے بعد ختن میں پیدا ہوا
اور خفیہ طور پر دہقانوں میں پلا بڑھا۔ بڑا ہوا تو
گیواسے اور اس کی ماں کو کیکاؤس کے پاس
لے آیا۔ اس کی دلیری کے کارناموں سے
کیکاؤس اتنا خوش ہوا کہ اس نے تاج و تخت
اس کے حوالے کر دیا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔
کیخسرو نے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے
لیے افراسیاب سے مقابلے کی ٹھانی اور رستم کو
اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ متعدد لڑائیوں
کے بعد رستم نے توران پر قبضہ کر لیا۔
افراسیاب قتل کیا گیا۔ کیخسرو آخری عمر میں
سلطنت کیکاؤس کے داماد لہراسپ کے سپرد
کر کے سفر پر روانہ ہو گیا اور پھر واپس نہیں
آیا۔ اکثر ایرانی اور مغربی مصنفین کا خیال
ہے کہ کیخسرو اور کورش یا سائرس (Cyrus)
ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں مگر یہ خیال
درست نہیں۔ کیخسرو ہندو آریائی دیو مالاکا
واہستر دا ہے اور کورش یا سائرس چھٹی صدی
قبل مسیح کی ایک تاریخی شخصیت ہے۔
مرسلہ: شاہد حفیظ کیانی، ملتان

”یہ حق تم مجھے مار کر ہی حاصل کر سکتے ہو۔“ اس نے
کہا اور ہاتھ پائی پر اتر آئی۔ اب حال یہ تھا کہ نواب صاحب
ایجاد قلع کر رہے تھے اور وہ ان پر گھونسوں کی بارش کر رہی
تھی۔ نواب صاحب نہیں چاہتے ہوں گے کہ آوازیں
ملازموں تک جائیں۔ یہ بھی ڈر ہوگا کہ اس پر جنون سوار ہے

کہیں وہ پستول چلائی نہ دے۔
”تم یہاں سے چلی جاؤ میں اپنے بیٹے پر کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ جو تمہارا جی چاہے کرو۔“ عابدہ نے اپنا ریوالتورجیب میں رکھا اور کمرے سے نکل آئی۔ ڈیوڑھی میں سرور علی خاں کا ڈرائیور محمد حسین اس کا منتظر تھا۔
”پیٹرول کی ٹینکی فل کر دی؟“
”جی حضور۔“

”اب تم مجھے بھوپال لے چلو۔“ اس نے کہا اور خود کچھلی نشست پر سونے کے لیے لیٹ گئی۔
وہ بھوپال پہنچی تو دن اُٹھ گیا تھا۔ شہر یار ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس نے اسے صبح کے وقت کا دودھ پلایا اور اس طرح پرسکون ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔
ایک دن خیریت سے گزر گیا لیکن اگلے دن ہزہائی نس حمید اللہ خاں نے اسے طلب کیا۔ یہ بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن جب انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”تم کو روائی گئی تھیں؟“
”وہ میری سسرال ہے، میں وہاں کسی بھی وقت جاسکتی ہوں۔“
”سرور علی خاں سے ملی تھیں؟“
”جی ہاں، ملی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ ابھی تک میرے شوہر ہیں۔“

”جو کچھ تم نے وہاں کیا اس کا احوال سناؤ۔“
”جب آپ کو اتنا کچھ معلوم ہو گیا ہے تو جو میں نے وہاں کیا اس کا علم بھی ہو گیا ہوگا۔“
”میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“
عابدہ نے جو کچھ وہاں کیا تھا تفصیل سے بیان کر دیا۔
”مجھے امید ہے کہ تم آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔“

”اپنے بچے کی خاطر میں یہ سب کچھ بار بار کر سکتی ہوں۔ نواب کو روائی کو چاہیے میرے راستے سے ہٹ جائے۔“
”مجھے معلوم تھا تم نہیں مانو گی۔“ حمید اللہ خاں نے کہا لیکن اس وقت ان کے چہرے پر غصہ نہیں ہونٹوں پر تبسم تھا۔
اس دن کے بعد سے اس کی اپنے شوہر سے تعلقات کی بحالی کی امید ختم ہو گئی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ طلاق

کا مطالبہ نہیں کرنے گی کیونکہ اسے دوسری شادی نہیں کرنی ہے لیکن شوہر کے ساتھ نہیں رہے گی۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ میرے شوہر دوسری شادی کر لیں۔
باپ بیٹے کی ملاقات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ بھوپال آتے تھے اور بیٹے سے ملاقات کے بعد چلے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ حالات بہتر ہونے لگے۔ سرور علی خاں نے بھی چپ اختیار کر لی۔ حالات معمول پر آ گئے تھے کہ کچھ کر گزرنے کے جذبے نے اسے ایک مرتبہ پھر اکسایا۔ وہ اپنی دانست میں زمین کے ہر کھیل کو فتح کر چکی تھی۔ اب اس نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہم جو طبیعت نے فیصلہ کیا کہ وہ پائلٹ کی تربیت حاصل کرے گی۔ اس نے اپنے والد سے اجازت مانگی جو ظاہر ہے سختی سے رد کر دی گئی۔
”بھوپال کی وارث تخت کے لیے یہ بہت خطرناک ہے۔“

اس کی فطرت میں اس قدر باغیانہ جوہر موجود تھا کہ وہی کرتی تھی جس سے منع کیا جاتا تھا۔ وہ ایک دن خریداری کا بہانہ کر کے محل سے نکلی اور ریل کے ذریعے بمبئی آ گئی اور اپنا نام بمبئی فلائنگ کلب میں بطور زیر تربیت پائلٹ درج کروالیا۔ وہ اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی لہذا اپنا نام مس اے سلطان درج کروایا۔

وہ ابھی تربیت حاصل کر رہی تھی کہ فلائنگ کلب میں ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک معلم پائلٹ کا جہاز تباہ ہو گیا اور اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ انکواری ہونے تک اس کلب کو عارضی طور پر بند کر دیا گیا۔
اس عرصے میں اس کے گھر سے غائب ہونے کا راز ظاہر ہے کھل گیا تھا۔ حمید اللہ خاں کو اس کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو گیا۔ انہوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ انڈیا میں موجود تمام فلائنگ کلبوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ عابدہ سلطان کو رجسٹر نہ کریں۔

اسے بھوپال واپس آنا پڑا لیکن ہوا بازی کی تربیت کا جذبہ خاموش نہیں ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس شوق کو دہرائی رہتی تھی اور موقع کے انتظار میں تھی۔ اسے یہ موقع کئی سال بعد چاکر 1939ء میں ملا۔ اس وقت تک وہ اپنے بیٹے شہریار کی تعلیم کی طرف سے مطمئن ہو چکی تھی۔ انگلینڈ

سے ایک استانی اسے تعلیم دینے کے لیے آچکی تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پرواز کے شوق نے اس کے دل میں پھر سر اٹھایا۔ اس مرتبہ بھی اسے اپنے اس شوق کو خفیہ رکھنا تھا۔ اس نے شکار کے لیے ایک طویل سفر کا بہانہ بنایا اور بذریعہ کار سیدھی کلکتہ پہنچ گئی۔ اس نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں مس اے سلطان کے نام سے قیام کیا اور اسی نام سے مقامی فلائنگ کلب میں داخلہ لے لیا۔ انڈیا کے تمام فلائنگ کلبوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ وارث تخت بھوپال کو اس کی حفاظت کے پیش نظر داخلہ نہ دیں لیکن نام کی تبدیلی نے اس کا کام آسان کر دیا۔ کوئی بھی اسے شناخت نہ کر سکا کہ وہ عابدہ سلطان ہے یا مس اے سلطان۔ اس نے ہوا بازی کی تربیت لینی شروع کر دی۔

جب بھوپال میں اس کی غیر حاضری نے طول کھینچا تو یہ افواہیں پھیل گئیں کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔ اخباروں نے تو کھل کر لکھ دیا کہ وہ کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔

اس سے ایک غلطی یہ ہو گئی کہ اس نے اپنے عملے کے افراد کو بھوپال بھیجا کہ وہ اس کے بیٹے کو بھوپال سے کلکتہ لے آئیں۔ ان افراد کے ذریعے بھوپال والوں کو کم از کم یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کلکتہ میں ہے۔

حمید اللہ خاں بیٹی کی طرف سے پریشان تو تھے ہی اور اب یہ اشارے مل رہے تھے کہ وہ کلکتہ میں ہے۔ یہ افواہیں کانوں میں بڑ چکی تھیں کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ یقین تو نہیں تھا لیکن تحقیق بھی ضروری تھی۔ انہوں نے اپنے ایک قابل اعتماد وزیر صاحبزادہ سعید الظفر کو کلکتہ بھیجا کہ وہ وہاں جا کر معاملے کی تحقیق کریں۔

اس دن وہ فلائنگ کلب سے اپنے ہوٹل واپس آئی تو ہوٹل کے عملے نے اطلاع دی۔

”ایک بوڑھا آدمی آیا تھا جو بھکاری معلوم ہوتا تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ ہم نے اسے بھگا تو دیا ہے مگر وہ کہہ گیا ہے کہ پھر آئے گا۔“

عابدہ نے کوئی پروا نہیں کی کہ ہوگا کوئی فقیر۔ ابھی وہ غسل وغیرہ کر کے فریض ہوئی تھی کہ ہوٹل کے ملازموں نے فقیر کی آمد کی اطلاع دی۔ عابدہ نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اسے بھگا دو۔ وہ بھاگ گیا لیکن دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ پھر آیا تھا اور اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سلسلہ دو تین دن چلتا رہا۔

اس فقیر کو اتنے دن کی یا تر کے بعد کم از کم یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ صبح کس وقت ہوٹل سے نکلتی ہے۔ ایک صبح جب وہ ہوٹل سے نکلی تو اس نے دیکھا ایک بوڑھا آدمی کھڑا ہے۔ اس نے عابدہ کو جھک کر طویل سلام کیا۔ عابدہ نے اپنے پرس سے کچھ پیسے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔ بوڑھے آدمی نے اپنے چہرے سے مصنوعی داڑھی ہٹائی اور سر پر بندھا ہوا کپڑا اٹھایا۔ اس کے سامنے صاحبزادہ سعید الظفر خاں کھڑے تھے۔

”صاحبزادہ صاحب، یہ کیا بہروپ ہے؟“
”حضور، میں نے جو کچھ کیا ہزہائی نس کے حکم سے کیا۔ وہاں بھوپال میں آپ کے بارے میں بڑی غلط افواہیں اڑ رہی تھیں۔ ہزہائی نس نے مجھے بھیجا کہ میں آپ کو ڈھونڈ نکالوں اور حقیقت کا کھوج لگاؤں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں جب سے کلکتہ آیا ہوں دن رات آپ کا تعاقب کر رہا ہوں۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کی کلکتہ خفیہ آمد کا مقصد ہوا بازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں پہلے ہی ہزہائی نس کو رپورٹ بھیج چکا ہوں کہ آپ کی بیٹی نے کوئی قابل مذمت کام نہیں کیا۔ آپ ان کی جانب سے تسلی رکھیں۔“

”صاحبزادہ صاحب، آپ کی کوششیں بجا ہیں لیکن آپ مجھے بھوپال لے جانے میں کامیاب نہیں ہوں گے جب تک کہ میں اپنی تربیت مکمل نہ کر لوں۔“
”میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا بلکہ چاہوں گا کہ آپ کی اضافی توانائیوں اور صلاحیتوں پر بند نہیں باندھا جائے۔“ صاحبزادہ سعید الظفر نے ہزہائی نس حمید اللہ خاں کو بھی سمجھایا۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا اور عابدہ سلطان تربیت حاصل کرتی رہی۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ بھوپال کی ریاست اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ نواب حمید اللہ خاں نے ریاست کے تمام وسائل اور اپنی ذاتی خدمات برطانویوں کے سپرد کر دیں۔ فضائیہ کے ایک دستے کی تربیت اور ساز و سامان کے مکمل اخراجات ریاست بھوپال کی جانب سے فراہم کیے گئے۔ ریاست کی افواج کو مختلف محاذوں پر برطانوی کمانڈ کے ماتحت لڑانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ ریاست کے دیہی علاقوں کا بہت بڑا حصہ خالی کروا کے برطانیہ کی بری اور فضائی فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا تا کہ فوجی مشقیں اور بمباری کی آزمائش کی جائے۔
عابدہ سلطان ہندوستان کی دوسری پائلٹ بن کر

بھوپال واپس آچکی تھی۔ جنگ کے زمانے میں پیٹروں کی قلت تھی۔ عابدہ اپنے حصے کے پیٹروں کو شکار پر جانے کے لیے بھا کر رکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے موٹر سائیکل خرید لی اور پھر اسے شہر میں دوڑانی پھرتی، دفتر جانے یا پھر رشتے داروں کے ہاں جانے کے لیے استعمال کرنے لگی۔ اس وقت یہ مقامی روایت سے اتنی بڑی بغاوت تھی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

وہ روایات کے معاملے میں جتنی بے پروا تھی اپنے بیٹے کے معاملے میں اتنی ہی ذمے دار تھی چنانچہ جب شہر یار کو اسکول بھیجنے کا مسئلہ درپیش آیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے کسی اقامتی اسکول میں داخل کروائے گی تاکہ وہ ریاست کے زوال پذیر ماحول اور درباری خوشامدیوں سے دور رہے۔ ہندوستان میں اس وقت شہزادوں کے لیے اسکولوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ یہ اسکول اندور، اجیر، لاہور، دہلی اور بنگلور وغیرہ میں تھے۔ اس نے ان سب اسکولوں کے دورے کیے اور بالآخر رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون کو منتخب کیا۔

شہر یار اس وقت گیارہ سال کا تھا۔ اسے گھر سے دور ڈیرہ دون کے اقامتی اسکول میں چھوڑنا عابدہ کے لیے مشکل مرحلہ تھا۔ وہ کتنی بھی بہادر سہی بیٹے کو اتنی دور اکیلا چھوڑنا اس کے لیے سوہان روح تھا لیکن سوال بیٹے کے مستقبل کا تھا۔

مئی 1945ء میں دوسری جنگ عظیم اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ یہ خوشی کی بات تھی۔ ریاستی فوجیں واپس آ رہی تھیں۔ جشن منائے جا رہے تھے لیکن دیسی ریاستوں کو ایک خطرے کا احساس بھی تھا۔ آزادی کی پکار اب پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر دوبارہ ابھری تھی۔ اس نئی صورت حال میں شاہی ریاستوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ 1946ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے آئے۔ اس وقت تک یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت کا آخری دور آچکا ہے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

جیسے جیسے آزادی کا دن قریب آیا فسادات کے شعلوں نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عابدہ کو اپنے بیٹے کی فکر تھی۔ اس نے شہر یار کو ڈیرہ دون سے بلالیا اور قریب ہی واقع ڈیلی کالج اندور میں داخل کروادیا۔

اس کی زندگی میں دوسرا وحشت ناک لمحہ وہ تھا جب ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان کے اعلان کے بعد 1948ء میں ایک انتہا پسند ہندو متورام گڈ سے نے گاندھی جی کو قتل کیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس لیے نہیں کہ گاندھی جی اسے بہت عزیز تھے بلکہ اس لیے کہ دوسرے سب لوگوں کی طرح اسے بھی اندازہ تھا کہ اب پورے ملک میں فسادات پھوٹ پڑیں گے اور اگر قاتل مسلمان نکلا تو.....

اس کا بیٹا اندور میں تھا۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ اپنی اسٹیشن ویگن میں بیٹھی اور یہ جانے بغیر کہ گاندھی جی کو قتل کرنے والا ہندو ہے یا مسلمان فوری طور پر اندور روانہ ہو گئی۔ یہ چار گھنٹے کی مسافت اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان تھا۔

اس کی اسٹیشن ویگن پر پیل پی جی ملر کے گھر پر جا کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی اندر گئی۔ پر پیل گھر پر ہی تھے۔

”میں اپنے بیٹے اور دوسرے مسلم لڑکوں کو جو جتنے بھی میری کار میں بیٹھ سکتے ہیں، بھوپال لے جانے کے لیے آئی ہوں۔“

”مجھے آپ کے لڑکے پر تو اعتراض نہیں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دوسروں کے لڑکوں کو بھی لے جائیں۔“

”اس لیے کہ ان کی جانوں کو خطرہ ہے۔ اگر گاندھی جی کا قاتل مسلمان نکلا تو مسلمان لڑکوں کی خیر نہیں۔“

”آپ یہ بھی تو سوچیں کہ دوسرے لڑکوں کے والدین کی اجازت کے بغیر میں کیسے انہیں آپ کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔“

”اس کی ضمانت میں لیتی ہوں۔ ان لڑکوں کے والدین اپنے بچوں کو بھوپال کے وارث تخت کی تحویل میں نسبتاً زیادہ محفوظ پا کر خوش ہوں گے۔ میں کوئی عام عورت نہیں ہوں، راجکمار ہوں بھوپال کی۔ یہ میری تحویل میں آکر غائب نہیں ہو جائیں گے۔ اپنے والدین تک یہ حفاظت پہنچیں گے۔“

پر پیل اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن جب عابدہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر ان بچوں کو یہاں کچھ ہوا تو تمام تر ذمے داری ان پر عائد ہوگی تو وہ نرم پڑ گئے۔

عابدہ کی اسٹیشن ویگن میں دس چھوٹے چھوٹے بچے ٹھس ٹھسا کر بیٹھ گئے۔

عابدہ کی کار پر بھوپال کی نمبر پلیٹ تھی۔ اسے اندور میں تو کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ اندور سے تعلقات اچھے تھے لیکن جب گاڑی گوالیار سے گزرنے لگی تو خطرہ بڑھ گیا کیونکہ گوالیار کے ساتھ بھوپال کے تعلقات کشیدہ تھے۔ گوالیار انتہا پسند ہندوؤں کا گڑھ تھا اور ابھی تک قاتل کی شناخت کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ عام تاثر یہی تھا کہ یہ حرکت کسی مسلمان کی ہو سکتی ہے۔

بھوپال پہنچنے تک اعلان ہو چکا تھا کہ قاتل ہندو تھا۔ اس اعلان سے مسلمانوں میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ خطرات ٹل گئے وہ تو اس لیے بھی مطمئن تھی کہ بھوپال پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

عابدہ سلطان دوسری بہنوں کے نسبت اپنے والد سے بہت زیادہ قریب تھی۔ وہ نہ صرف وارث تخت تھی بلکہ لڑکوں کی کمی دور کر رہی تھی۔ شکار میں، پولو گراؤنڈ میں، گھر سواری میں، ہر جگہ وہ والد کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ان کی پرستش کرتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت سے تو وہ ان کی احسان مند ہو گئی تھی جب سے انہوں نے اسے نواب سلطان کے تخت پر دے کے چنگل سے بچایا تھا لیکن پھر انہوں نے ایک ایسا قدم اٹھایا کہ عابدہ سلطان کے ہاتھ سے اس کا وہ بت گر کر ٹوٹ گیا جس کی وہ پوجا کرتی تھی۔ انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ حکمران وقت ایک کیا کئی شادیاں کر لیتے تھے لیکن ان حکمرانوں کی کوئی بیٹی عابدہ سلطان نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی طرح بھی سوتیلی ماں کے ساتھ مودبانہ رشتہ قائم کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کے نزدیک اس کے باپ نے اس کے اعتماد کو دھچکا پہنچایا تھا۔

خجل کے سازشیوں نے اس کی باغیانہ فطرت کا فائدہ اٹھا کر بہت جلد یہ مشہور کر دیا کہ وہ ہڑہائی نس کی سخت ترین مخالف ہو گئی ہے اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ اس موقع پر وہ سب کچھ ہوا جو ان مواقع پر ہوتا ہے۔ وہی لوگ جو ان کی پہلی بیوی سے اظہار ہمدردی کرتے تھے ہڑہائی نس کے پاس جا کر پہلی بیوی کی شکایتیں کرتے تھے۔

ان سب باتوں کی تصور وار عابدہ سلطان کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہڑہائی نس نے نہ صرف پہلی بیوی کی طرف سے منہ پھیر لیا بلکہ عابدہ سے بھی ان کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو گئے۔ یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ اس میں کچھ قصور عابدہ کی سرکش طبیعت کا بھی تھا۔ اس نے باپ کے قریب جانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ مکمل طور پر ان کی

دوسری بیوی کے خلاف محاذ آرا ہو گئی اور اپنی ماں کا دفاع کرنے لگی۔ اس نے میاں بیوی کے جھگڑے کو باپ بیٹی کا جھگڑا بنالیا۔

ایک واقعے نے ان تعلقات کو مزید خطرناک بنا دیا۔ ہڑہائی نس بچے کی تکلیف میں مبتلا ہو کر شدید بیمار ہو گئے تھے۔ ان کا آپریشن ہونا ناگزیر لگتا تھا۔ عابدہ کی والدہ نے اس پر دباؤ ڈالا کہ اگر چہ والد نے خیر خبر رکھنا بند کر دیا ہے مگر اسے ان کی عیادت کو جانا چاہیے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی والدہ کا کہا مانا۔ وہ ان کی عیادت کے لیے ان کے نیم تاریک کمرے میں گئی جہاں خواتین ان کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ ہڑہائی نس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔

اس کے مودبانہ سلام کا بے توجہی سے جواب دیا اور دوسری خواتین کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی رہی۔ اس سے زیادہ بے عزتی کیا ہو سکتی تھی کہ کوئی اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے اسے روکنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ واپس آئی تو ماں پر برس پڑی۔ وفادار بیوی اپنے شوہر کے خلاف ایک بات سننے کی روادار نہیں تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اب ہڑہائی نس سے کبھی نہیں ملے گی۔

آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور اب ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ تھا۔ نواب حمید اللہ خاں بہت دن تک ہاتھ پاؤں مارتے رہے تھے کہ الحاق سے بچ جائیں لیکن الحاق ناگزیر تھا۔ اس مشکل سے نکلنے اور اپنی آبرو بچانے کے لیے انہوں نے ایک شاطرانہ چال چلی۔ ایک منصوبہ تشکیل دیا جس کے مطابق وہ اپنا اقتدار اپنی وارث تخت یعنی عابدہ سلطان کے حوالے کر کے پاکستان چلے جائیں جہاں قائد اعظم نے انہیں گورنر مشرقی پاکستان بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں اگر الحاق ہوتا تو عوام اس کا ذمے دار عابدہ سلطان کو قرار دیتے کہ وہ مزاحمت نہ کر سکی اور الحاق کر لیا۔

عابدہ سلطان کو اس منصوبے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اس تذلیل کے لیے تیار نہیں تھی کہ بھوپال کی دوسو پچاس سالہ آزادی اس کے دستخط سے ختم ہو۔ خاندانی جھگڑوں نے اس مشکل مسئلے کو سلجھانے کی راہ میں مزید دشواریاں کھڑی کر دیں۔

ایک روز اس کے والد نے اسے اپنے اس گھر میں بلایا جہاں وہ ورزش کرتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے اپنا ریواور نکال کر اس پر تان لیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ بیٹھ گئی تو انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”میں بہت جلد پاکستان جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ریاست کے تمام معاملات تم سنبھالو۔ جناح نے مجھے بلایا ہے۔ شاید مجھے گورنر جنرل بنایا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس بات کو یقینی بناؤ کہ مجھے ریاست سے سالانہ پانچ لاکھ روپے ملتے رہیں۔“

”آپ کوئی کیوں نہیں چلاتے۔“ عابدہ نے کہا۔ ”میں ریاست کے متحدہ ہندوستان کے ساتھ انضمام میں کوئی کردار ادا کر کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی کہ ایک عورت ہونے کی وجہ سے میں اپنی ریاست کو نہیں بچا سکی۔“

اس کے یہ تیور دیکھ کر وہ نرم پڑ گئے۔ انہوں نے ریوالور نیچے رکھ دیا۔ ”ارے تم تو مجھ سے ناراض ہونے لگیں۔ آؤ میرے پاس آؤ۔“

انہوں نے اسے گلے لگانے کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ سمجھ رہی تھی کہ یہ بھی ان کی محض چال ہے۔ سختی سے کام نہیں چلا تو نرمی پر اثر آئے۔

”آپ جو چاہیں کریں مگر میں ریاست کے انضمام میں کسی بھی قسم کا کردار ادا کرنے سے انکار کرتی ہوں۔“ اس ملاقات کے بعد جو آخری ملاقات کہی جاسکتی تھی وہ تیزی سے یہ محسوس کرنے لگی کہ اب اس کے اور اس کے بیٹے کے لیے بھوپال میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ یہاں رہ کر عیش و آرام تو ملتا رہے گا لیکن عزت نصیب نہیں ہوگی۔

اس کے بعد جو حالات سامنے آئے انہوں نے اس کے احساسات کو یقین میں بدل دیا۔ اس کے والد نے اس کی طرف سے بالکل ہی منہ پھیر لیا بلکہ انتقام پر اثر آئے۔ سازشی عناصر نے ان کشیدہ تعلقات کو مزید کشیدہ کرنے کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔ یہ الزام تک لگایا گیا کہ اس کی والدہ نے اس کے والد کو زہر دینے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ عابدہ کے کہنے سے ہوا۔

والد کی طرف سے مسلسل تذلیل آمیز احکام صادر ہو رہے تھے۔ اس ماحول میں بار بار وہ اپنے بیٹے کے متعلق سوچتی تھی۔ کیا میں ریاست ختم ہو جانے کے بعد عام شہری کی طرح بھوپال میں رہ سکوں گی؟ اس کی نگاہ پاکستان کی طرف اٹھنے لگی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ پاکستان میں ایک نئی زندگی کی ابتدا کی جائے۔ وہاں کچھ نہیں ہوگا تو یہ تو ہوگا کہ ہم

وہاں اقلیتی فرشتے سے تعلق رکھنے والے نہیں کہلائیں گے۔ اس کا ذہن تیزی سے پاکستان کی طرف مبذول ہو رہا تھا۔ وہ میرا وطن ہے۔ مسلمانوں کا وطن ہے۔ وہاں سب مسلمان آزاد اور یکساں ہوں گے۔ مسلم تہذیب کا گہوارہ ہوگا۔

پاکستان جانے کے ارادے کے ساتھ ہی وہ اپنی معاشی حالت پر بھی غور کرنے لگی جس پر اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اب تک اپنے محل نور الصباح میں رہتی چلی آئی تھی جہاں باون ملازمین، سرکاری سپاہی، کاریں، رافٹیں، گھوڑے غرض ہر وہ چیز بھی جس کی خواہش کی جاسکتی تھی اس کے باوجود صرف وہ تنخواہ اس کی تھی جو اسے کاہنہ کے صدر کی حیثیت سے ملتی تھی۔ جاگیروں کا وجود صرف کاغذوں پر تھا۔ کچھ سرمایہ کاری البتہ کی تھی یا اس کے زیورات تھے جو اس کے اپنے تھے۔

اس حساب کتاب کے بعد اسے جذباتی رشتوں کا خیال آیا۔ پاکستان جانے کا مطلب اپنی ماں اور بہنوں سے علیحدگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ہندوستان میں رہنا پسند کریں گی۔ بھوپالی خاندانوں سے بھی دور ہونا مقدر ہو جائے گا۔ سوچوں کا یہ مرحلہ نہایت اذیت ناک تھا لیکن وہ جس بات کی ٹھان لیتی تھی اسے کر کے چھوڑتی تھی۔

اسے ان رشتوں کے مقابلے میں اپنے بیٹے کے مستقبل کا خیال آتا تھا۔ وہ پاکستان چلا گیا تو ریاستوں کی اخلاقی پستی سے نکل جائے گا۔ خوشامدیوں اور چالپوسوں سے دور ہو جائے گا۔ دل پھینک لڑکیوں میں گھر کر اپنا وقت برباد نہیں کرے گا۔ اس کا مستقبل بن جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہو گئی۔

اسے جو کچھ بھی کرنا تھا نہایت رازداری سے کرنا تھا۔ اپنے والد اور بھارتی حکومت سے چھپانے کی ضرورت تھی ورنہ وہ اس کے عزائم کی راہ میں ضرور رکاوٹیں کھڑی کرتے۔

اس نے سب کی نظروں سے چھپ کر بمبئی اور احمد آباد میں اپنے زیورات بیچنا شروع کر دیے۔ کراچی میں اکاؤنٹ کھول لیا اور زیورات سے حاصل ہونے والی رقم کراچی منتقل کرنے لگی۔

جب رقم منتقل ہو گئی تو اس نے اپنی ماں کو بھی بتایا کہ کہیں ان کے آنسو اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائے اور لندن جانے کے راستے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔

نے ہڑپائی نس کو تحریری طور پر مطلع کر دیا کہ میں اپنے بیٹے کو ایک برطانوی پبلک اسکول اوٹڈل میں داخل کروانے انگلینڈ جا رہی ہوں۔ ان دنوں لندن میں اولمپک گیمز بھی ہو رہے تھے۔ پروگرام یہی بنا تھا کہ پہلے اولمپک گیمز دیکھنے جائیں گے اور پھر شہر یار کو اوٹڈل کے اسکول میں اقامتی طالب علم کے طور پر داخل کروایا جائے گا۔

لندن پہنچتے ہی وہ ایک حادثے سے دوچار ہو گئی۔ اس کا وہ پرس جس میں اولمپک کے تمام ٹکٹ بھرے ہوئے تھے، وہ پرس بے دھیانی میں ٹکٹوں سمیت ریل ہی میں رہ گیا۔ شہر یار کا منہ لٹک گیا۔ یہ ٹکٹ اس نے ہندوستان میں خریدے تھے لندن میں یہ بہت مہنگے داموں فروخت ہو رہے تھے بلکہ مل ہی نہیں رہے تھے۔ ان ٹکٹوں کا دوبارہ خریدنا بہت مشکل تھا۔

اگلی صبح ایک آدمی اس سے ملنے آیا۔ چلیے سے نہایت غریب اور بے روزگار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جسے وہ دیکھتے ہی پہچان گئی۔ یہ اسی کا گم شدہ بیگ تھا۔

”مجھے یہ بیگ ٹرین سے ملا تھا۔ میں نے بیگ پولیس کے حوالے کرنے سے بہتر سمجھا کہ آپ تک پہنچا دوں۔ میں نے آپ کے بیگ سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال لیا ہے۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“ عابدہ خاتون نے اس شخص کی ایمان داری کو دیکھتے ہوئے انعام دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور صرف اتنے پیسے لینے پر تیار ہوا جتنے اس کے ہوٹل تک پہنچنے میں خرچ ہوئے تھے۔

وہ ابھی پاکستان جانے کا ارادہ کر رہی تھی اور قائد اعظم سے رابطہ کر کے انہیں اپنے ارادے سے آگاہ بھی کر دیا تھا کہ ایک دن اچانک یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ اس کا فیصلہ درہم برہم ہو گیا۔

اس نے پاکستان روانگی کو چند دن کے لیے ملتوی کر دیا اور پاکستان پر چھائے غم کے سیاہ بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ پاکستان کے بارے میں اس کے ذہن میں سوالیہ نشان ابھرنے لگے۔ اب اسے کچھ دن انتظار کرنا تھا۔

اس نے اپنے بیٹے کو اوٹڈل میں چھوڑا اور خود واپس بھوپال چلی گئی۔

وہ بھوپال پہنچی تو ریاست سخت افراتفری کا شکار تھی۔

بھارتی حکومت سخت دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ انضمام کے معاہدے پر دستخط کر دیں۔ ایک کے بعد ایک ریاست انضمام کے معاہدے پر دستخط کر رہی تھی۔ تقدیر اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔

وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ خاندانی اختلافات پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر گئے ہیں۔ ہڑپائی نس اپنے خاندان کو اپنا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں۔ معززین شہر پاکستان جا رہے ہیں یا جا چکے ہیں۔ خود ہڑپائی نس کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ انہیں جناح صاحب کی جگہ گورنر جنرل بنایا جا رہا تھا۔

عابدہ کو یہ پیغام پہنچائے جا رہے تھے کہ اسے ہڑپائی نس کی جگہ لینی ہے اور اس بات کی ضمانت دینی ہے کہ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان کا وظیفہ ان تک پہنچا دیا جائے گا۔ عابدہ ایسی کسی ذمے داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سوتیلی ماں کی طرف سے۔۔۔ تذلیل کا سامنا الگ تھا۔

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ پاکستان چلی جائے گی۔

1949ء میں ہڑپائی نس کے بٹے کی تکلیف شدت اختیار کر گئی۔ انہیں آپریشن کے لیے فوراً بمبئی لے جانا پڑا۔ ان کی ہنگامی پرواز کے بارے میں خاندان والوں کو مطلع نہیں کیا۔ اس لیے کوئی اثر پورٹ بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کی ماں بمبئی جانے پر اصرار کر رہی تھیں تاکہ آپریشن کے وقت وہ وہاں موجود ہوں۔

کاہنہ کے دو وزیر ہڑپائی نس کا خط بمبئی سے لے کر آئے اور ہڑپائی نس کے حکم سے سب کے سامنے یہ خط پڑھ کر سنایا۔

”ہڑپائی نس دوبارہ کبھی ہماری صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہیں کیونکہ ہم لوگ مردار خور گدھ کی طرح ان کی موت کے منتظر ہیں۔“ جب یہ خط، یہ عجیب و غریب خط پڑھا جا چکا تو عابدہ نے بھی زبانی پیغام پہنچا دیا۔

”ہڑپائی نس کو مطلع کر دینا کہ اب وہ کبھی میرا چہرہ نہیں دیکھیں گے۔“

اس کے تعلقات اپنے باپ سے کشیدہ ہو گئے تھے لیکن اس خط نے تو آخری لکیر کھینچ دی۔ اسے دکھ تھا تو یہ کہ خاندانی معاملات میں انہوں نے کاہنہ کے دڑا کو بھی شریک کر لیا تھا۔

اس کے بعد آنے والے چند مہینے تباہ کن تھے۔

ہزہائی نس کے اقدامات جارحانہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے عابدہ کا تمام جہیز قبضے میں لے لیا۔ اس کی کوٹھی نورالصبح جو اس کی دادی نے تعمیر کروا کے دی تھی اور اس پر ریاست کا کوئی پیسا صرف نہیں ہوا تھا دوسرے کاغذات تیار کروا کے اسے ریاستی املاک میں شامل کر لیا۔ اس کا ایک کھوڑا تھا جس کا نام اس نے بنگ سو لجر رکھا تھا۔ وہ اس کی وفاداری کی وجہ سے اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ ایک صبح جب اس نے بنگ سو لجر کو بلوایا تو سائیکس نے شرمندگی سے کہا۔ ”بنگ سو لجر کو غلطی سے بیچ دیا گیا ہے۔“ یہ غلطی نہیں تھی بلکہ اس کے والد اسے جذباتی صدمہ پہنچانا چاہتے تھے لیکن ہوا یہ کہ ان واقعات نے بھوپال سے اس کی علیحدگی کو آسان بنا دیا۔ اگر ذرا سی بھی وابستگی تھی تو وہ ختم ہو گئی۔

اس کی قسمت نے پھر یوری کی۔ ہزہائی نس کو علاج کے لیے بیرون ملک جانا پڑا اور وہ بھوپال چھوڑنے کی آخری تیاریوں میں غرق ہو گئی۔

بھوپال ہندوستان میں ضم ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ہزہائی نس کے عملے نے اسے مطلع کیا کہ اب ریاست شہریار کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ جب اسے یہ اخراجات بھی خود ہی برداشت کرنے ہیں تو وہ بھوپال میں کیوں رہے۔ اس نے پاکستان منتقل ہونے کی تیاری شروع کر دی۔

وہ اپنے گھر میں بھی دوسرے درجے کی شہری بن گئی تھی اور ہندوستان میں بھی۔

وہ بمبئی گئی اور پاکستان جانے کے لیے سیٹ کنفرم کروائی۔ یہ جہاز سائیکس جنوری 1950ء کو روانہ ہونے والا تھا۔ وہ نہایت غلٹ میں بھوپال واپس آئی تاکہ سامان وغیرہ باندھ لے۔ اس نے اپنا ذاتی سامان فرنیچر، بندوقیں وغیرہ اپنی والدہ کے محل میں رکھوا دیا۔

وہ جب اپنے خاندان والوں سے رخصت ہونے لگی تو سب کا یہی خیال تھا کہ وہ انگلینڈ جا رہی ہے۔ اس نے خاندان والوں کو کچھ نہیں بتایا اور خاموشی سے بمبئی آ کر بحری جہاز میں سوار ہو گئی۔ بگل بجا جہاز نے ساحل چھوڑا اور وہ جذبات کے سمندر میں ڈوب گئی۔ وہ باپ دادا کی نشانیوں کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اسے شکار گاہیں، پولو کے مقابلے، موسیقی کی محفلیں سب ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ پاکستان کا انتخاب کر کے وہ کوئی غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟

اب ارادہ بدلنے کی گھڑی گزر چکی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے پاکستان کے لیے بھوپال کو چھوڑ رہی تھی۔ اس کی ایک بچہ باپ سے کشیدگی بھی تھی لیکن بڑا احساس یہ تھا کہ یہاں وہ آخری میں شمار ہوگی جبکہ پاکستان مسلمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ وہاں وہ اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق زندگی گزار سکے گی۔ وہ کتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہے اسے معلوم تھا لیکن اس کی باہلی فطرت اس سے پہلے بھی کئی قدم اٹھا چکی تھی۔ اس کی دلیرانہ اسے اس وقت بھی سہارا دے رہی تھی۔ اسے جو کچھ بھوپال میں میسر تھا پاکستان میں نہیں مل سکے گا لیکن وہاں سب مسلمان ہوں گے، یہ خیال اسے تقویت دے رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں غوطے کھاتی ہوئی انگلینڈ پہنچ گئی۔

انگلینڈ پہنچتے ہی اس نے ویزا کے لیے کوششیں شروع کر دیں لیکن اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اسے پاکستان جانے کا اجازت نامہ دینے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔ کوئی عام خاتون نہیں تھی بھوپال کی وارث تخت تھی۔ اس سے پہلے نواب جو ناگڑھ کے پاکستان منتقل ہونے سے بھارت پاکستان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اس لیے اس کے معاملے میں بھی ضرورت سے زیادہ چھان بین کی جا رہی تھی۔

چھ مہینے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ اسے یہ شک ہونے لگا تھا کہ حکومت ہندوستان اور اس کے والد نے کسی طرح اس کے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت کو روکا ہے۔ یہ خیال اس وقت مزید تقویت اختیار کر رہا تھا جب ہندوستانی ہائی کمشنر کرشنا مینن نے اس سے ملاقات کی اور اسے پاکستان جانے سے روکنے کی کوشش کی۔

”تم ایک بہادر اور بے ارادے کی لڑکی ہو۔ تمہارے لیے پاکستان میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ مت جاؤ، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بھارتی حکومت تمہارا ہر طرح خیال رکھے گی اور تم اپنے والد کی محتاج نہیں رہو گی۔“

عابدہ سلطان نے انہیں یہ کہہ کر لا جواب کر دیا۔ ”جناب مینن! والد سے اختلاف میرا ذاتی و خاندانی مسئلہ ہے اور میں کبھی جذباتی بنیاد پر پاکستان جانے کا فیصلہ نہیں کرتی۔ میں نے یہ فیصلہ بہت غور و فکر کے بعد کیا ہے۔ اس فیصلے کا تعلق میرے بیٹے کے آئندہ باعزت شہری ہونے سے ہے اور یہ میرے جیسے مسلمانوں کی منزل ہے۔“

”جناب مرچلے ہیں، اب ان جیسا وہاں کوئی نہیں ہے۔“

”جناب مرچلے ہوں لیکن پاکستان زندہ ہے۔“ عابدہ

نے جواب دیا۔

یہ جواب بہت دو ٹوک تھا لیکن کرشنا مینن نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے بعد بھی وہ اسے برابر ترغیب دیتے رہے کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ سرکاری دعوئوں پر بلاتے رہے اور سرکاری آداب سے نوازتے رہے۔

عابدہ سلطان تو ارادوں کا پہاڑ تھی۔ اسے کون ہلا سکتا تھا۔

ایک دن وہ ایک دکان سے نکل رہی تھی کہ اس کی ملاقات لیاقت علی خاں سے ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئے اور اس سے لندن کے قیام کے بارے میں بھی پوچھا۔ جب اس نے بتایا تو انہوں نے اس کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ ہائی کمشنر ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اسی وقت حکم دیا کہ انہیں فوری ویزا جاری کیا جائے۔

پاکستان جانے کے لیے رکاوٹیں دور ہو گئی تھیں۔ اس نے یورپ کا کچھ سفر بذریعہ کار کیا پھر بحری جہاز سے مختلف جگہوں کی سیر کرتے ہوئے بی، اے، او، سی کے طیارے کا سہارا لیا۔

وہ کراچی کے چھوٹے سے ایئر پورٹ پر اتری تو اپنے سامان کے ساتھ اکیلی تھی۔ بھوپالی خاندانوں میں سے کوئی تھا نہ کوئی قریبی رشتے دار۔ رات کا وقت تھا۔ پہلے اس نے سوچا کسی ہوٹل چلی جائے پھر اسے نواب جو ناگڑھ کا خیال آیا جن کی بیگم منور جہاں عرف ماں صاحب اس کی گہری سہیلی تھیں۔ اس نے ایک ٹیکسی کورکنے کا اشارہ کیا۔

”تمہیں جو ناگڑھ ہاؤس کا کچھ علم ہے جہاں نواب جو ناگڑھ رہتے ہیں۔“

”میڈم، معلوم تو نہیں ہے لیکن وہ تو بہت مشہور آدمی ہیں۔ کسی سے پوچھ کر میں آپ کو پہنچا دوں گا۔“

”ایسا نہ ہو کہ ہم جھگڑتے رہیں اور صبح ہو جائے۔“

”نہیں مجھے کچھ اندازہ ہے، پہنچا دوں گا۔“

شہر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کی ٹیکسی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ سڑکوں پر چوکیداروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ٹیکسی والا تھوڑی تھوڑی دیر رک کر چوکیدار سے پوچھ لیتا تھا کہ نواب جو ناگڑھ کہاں رہتے ہیں۔ آخر کئی گھنٹوں کی تنگ و دو کے بعد دلاور منزل مل ہی گئی۔ جہاں ماں صاحب، ان کے بھائی بہن اور درجنوں ملازمین رہائش پزیر تھے۔

چوکیدار نے ذرا سا دروازہ کھولا تھا کہ وہ اسے دھکا دے کر اندر گھس گئی اور زور سے چلائی۔

”ماں صاحب۔“ پھر کسی نے اوپر ہی منزل سے جھانکا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھی کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

”ماں صاحب، جلدی اٹھو۔ یہاں حضور آئی ہیں۔“ کسی کی آواز آئی۔

ماں صاحب اسے دیکھ کر باہر آئیں پھر جیسے ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پورا خاندان اور ملازمین اس کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ ناشتے کے وقت سے پہلے ہی ناشتے کا حکم دے دیا گیا۔

ناشتے کی میز پر ہی ماں صاحب نے وہی تقریر شروع کر دی جو وہ لندن میں کرشنا مینن کی زبانی سن چکی تھی۔

”عابدہ، تم اس تباہ شدہ ملک میں کیوں آ گئیں؟ میں تو کہتی ہوں کچھ دن میرے ساتھ رہ کر واپس بھوپال چلی جاؤ۔ یہاں تمہیں تو بہن اور بے عزتی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں ہم جیسے اعلیٰ لوگوں کا کوئی احترام نہیں ہے۔ جناب صاحب کے مرنے کے بعد یہاں بدعنوانیوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ تمہیں اس ملک میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

دراصل ان کا یہ غصہ ان کی ذاتی فرسٹریشن کا نتیجہ تھا۔ نواب جو ناگڑھ نے انہیں اپنی گھریلو زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ وہ ایک قلیل تنخواہ میں گزارہ کر رہی تھیں۔ وہ اس ملک کو اپنی ریاست سمجھتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ہر جگہ ان کا حکم چلے جو کہ غلط تھا۔

عابدہ نے ان کی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور جھٹکن اتارنے کے لیے ان کے بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی۔

سو کر اٹھی تو سب سے پہلے اپنے بیٹے کو تار دیا کہ وہ کراچی پہنچ گئی ہے۔

اس کوٹھی میں دو چار دن رہنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ غل غپاڑے کے اس ماحول میں اس کا یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ماں صاحب تو یہی چاہتی تھیں کہ جب تک اس کا مستقل ٹھکانا نہیں ہو جاتا وہ ان کے ساتھ رہے لیکن اس نے کسی مناسب ہوٹل کی تلاش شروع کر دی۔

ان دنوں بے تحاشا مہاجرین کی آمد کی وجہ سے کسی ہوٹل میں کوئی کمر خالی نہیں تھا۔ بڑی تنگ و دو کے بعد کلفٹن ہل کے قریب واقع برٹل ہوٹل میں اسے ایک کمر مل گیا۔ یہ کمر اتیسری منزل پر تھا اور وہاں کوئی لفٹ نہیں تھی لیکن کوئی اور متبادل رہائش بھی نہیں۔ وہ وہاں منتقل ہو گئی۔

اس نے یہاں منتقل ہونے کے بعد جب ذرا آنکھیں

کھول کر دیکھا تو اسے ماں صاحب کی کبھی ہوئی بہت سی باتیں بخیر نظر آنے لگیں۔

مہاجرین بڑی تعداد میں کراچی آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی گنا آبادی بڑھ گئی تھی لیکن اس اچانک بڑھنے والی آبادی کے لیے نہ تو رہائش کا انتظام تھا اور نہ ہی اتنے لوگوں کو خوراک مہیا کرنے کی سہولت تھی۔ گورنر کی ایک شاندار رہائش گاہ کے سوا کام کرنے کی سہولتیں موجود ہی نہیں تھیں۔ سرکاری ملازمین کو بوسیدہ عمارتوں اور عارضی قائم کی گئی جھونپڑیوں میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ کوئی ٹیلی فون نہیں تھا، ٹائپ رائٹر مشینیں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ اکثر تو کھلے میدانوں میں کمزور کرسیوں پر بیٹھے اور گتے کے ڈبوں کو اوندھا کر کے ان سے میز کا کام لیا کرتے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں فطری طور پر یہ ناممکن تھا کہ زمین کی خریداری کے لیے ضروری اجازت نامہ حاصل کیا جاسکے یا گاڑی چلانے کے لیے لائسنس حاصل کیے جاسکیں۔

ان نامساعد حالات میں سب سے پہلے اسے رہنے کے لیے ایک گھر تعمیر کرنا تھا جس کے طے زمین خریدنی تھی۔ وہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں تھی جو وہ وقتاً فوقتاً کراچی منتقل کرتی رہی تھی۔ اس کے علاوہ نہ کوئی ذریعہ تھا نہ مدد کی توقع۔ اس کا معمول ہو گیا تھا کہ برٹل ہوٹل سے ناشتا کرنے کے بعد دلاور منزل سے کسی کو ساتھ لیتی اور زمین دیکھنے نکل جاتی۔

شہزادیوں کا دماغ لے کر آئی تھی اور اب یہ ٹھوکریں کھانے کو مل رہی تھیں۔

کئی مہینوں کی تنگ دود کے بعد اسے ملیر میں چار ایکڑ کا ایک قطعہ اراضی مل گیا۔ یہ کراچی سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا لیکن پرسکون اور دیہی آب و ہوا کی وجہ سے اسے یہ علاقہ بہت پسند آیا۔ اس نے یہ زمین خرید لی۔ ملکیت کا احساس ہوتے ہی اسے کراچی اچھا لگنے لگا۔

اس نے اس زمین پر مکان کی تعمیر کے لیے نقشہ خود بنایا۔ ماہر تعمیرات اور ٹھیکے داروں سے بات چیت کی۔ تعمیر کا کام ٹھیکے پر دے دیا لیکن نگرانی خود کرنی رہی۔ جھلمتی دھوپ میں ملیر جاتی۔ دور دور تک کہیں سایہ نہیں تھا۔ ایک نیم کا درخت اس کا دم ساز بن گیا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ مزدوروں کو کام کرتے دیکھتی رہتی۔

اس مملکت خداداد میں وہی ہوا جو ایک اکیلی عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ٹھیکے داروں نے جب دیکھا کہ اس

عورت کے آگے پیچھے کوئی نہیں تو انہوں نے اسے نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ اس پر جوان کی بے ایمانی کھلی تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ پاک لوگوں کے وطن میں دیانت داری نام کو نہیں۔

یہ وقت اس تنہا عورت کے لیے بڑی مشکل کا تھا۔ کئی بھوپالی اہم عہدوں پر تعینات تھے لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کے باب سے ڈرتے تھے۔ یہ خبر ابھی تک گرم تھی کہ نواب بھوپال کو گورنر جنرل بنایا جا رہا ہے۔ بھوپالی ڈرتے تھے کہ اگر وہ پاکستان آگئے تو ناراض بیٹی کی مدد کرنے پر ان سے باز پرس نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خبر صحیح تھی لیکن خفیہ سازش کے تحت نواب حمید اللہ خاں کو پاکستان کی سیاست سے باہر رکھا گیا۔

عابدہ نے ایک ٹھیکے دار سے نقصان اٹھانے کے بعد تعمیر کا کام دوسرے ٹھیکے دار کے سپرد کیا۔ وہ بھی اپنے پیش رو کی طرح بے ایمان نکلا۔

ایسے میں خدا نے ان کی مدد کی اور ایک خدا ترس ٹھیکے دار مل گیا جس نے دیانت داری سے کام کر کے اس کے مکان کو مکان کی شکل دے دی اور وہ 1951ء میں مکمل گھر میں منتقل ہو گئی۔ ابھی وہاں نہ بجلی تھی نہ پانی۔ کھڑکیاں نہیں تھیں اور اکیلی عورت بچے کے نیچے پستول رکھ کر سوتی تھی۔

شام کو لائین کی روشنی میں کھانا کھاتی۔ ستار بجاتی اور برآمدے میں چھروانی لگا کر سو جاتی۔ رہائش نہایت تکلیف دہ تھی لیکن یہ گھر برٹل ہوٹل کے چھوٹے ڈبے نما کمرے سے بہتر تھا۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے خوشامدیوں اور طفیلیوں سے بھی نجات مل جاتی تھی۔ یہاں اس سے ملنے صرف وہی دوست آتے تھے جو اس کے حقیقی دوست تھے۔

اس کے کھیلوں کے شوق پر یہاں بہت برا اثر پڑا۔ پولو اور گھڑ سواری کے لیے اس کے پاس گھوڑے نہیں رہے تھے لہذا وہ اسکو اش کی طرف متوجہ ہوئی۔ پیچھے بیرکس میں مردوں کے ساتھ باقاعدگی سے کھیلا کرتی تھی۔ دن بھر شہر میں گزرنے کے بعد رات گئے ملیر لوٹ آتی۔

وہ کراچی میں پولو پیچ تو نہیں کھیل سکتی تھی البتہ کئی دفعہ اس سے پولو پیچوں کی ایما پڑنگ کروائی گئی۔ گھڑ سواری کے سلسلے میں منعقد کی ہوئی ان تقاریب سے وہ لطف اندوز ہوتی۔ ہاکی یا کرکٹ کھیلنے کا اسے موقع نہ مل سکا کیونکہ پاکستانی ماحول میں عورت کا مردوں کے ساتھ کھیلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اسے یہ بھی مشورے دیے جارہے تھے کہ وہ یہاں کلیم داخل کر کے جائداد حاصل کرے لیکن حکومت کی مشکل اس کے سامنے تھی۔ دعوے دستیاب جائداد سے بہت زیادہ تھے۔ جو زمین دستیاب بھی تھی اس پر طاقت ور لوگوں کے قبضے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس کے لیے کلیم داخل کروانا مشکل تھا۔ اس کی جینی ذاتی جائداد بھوپال میں تھی اس کے کاغذات وہ اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ سارے کاغذات اس کے والد کی تحویل میں تھے۔ اس نے کوشش بھی کی کہ بھوپال سے وہ کاغذات آجائیں لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی۔

جعلی کاغذات کی بھرمار تھی۔ کبھی قطاریں تھیں، رشوت کا بازار گرم تھا۔ پانچ سال کی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے جدوجہد ترک کر دی۔

ایک دن وہ ملیر میں اپنے گھر میں بیٹھی تھی کہ علامہ خلیل عرب اس سے ملاقات کے لیے آئے۔ یہ وہی بے بدل عالم تھے جن سے اس نے بھوپال میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی وہاں کیا شان و شوکت تھی اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حلیہ ایسا تھا کہ دیکھنے سے خوف آئے۔ ان کا پا جامہ میلا اور پھٹا ہوا تھا۔ پرانی شیر وانی میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ آتے ہی ایک گلاس پانی مانگا اور پانی پی کر بے ہوش ہو گئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کا بیٹا شہزاد ان دونوں پاکستان آیا ہوا تھا اور اس وقت گھر پر ہی تھا۔ دونوں کی کوششوں سے مولوی صاحب کو ہوش آیا۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے بڑی روح فرسا داستان سنائی۔

”ہر ہائی نس کی مصر اور سعودیہ کے دورے کی ناکامی کا الزام مجھ پر لگا یا گیا۔ اس کی پاداش میں میری جاگیر ضبط کر لی گئی اور اسی مفلسی کی حالت میں مجھے بھوپال سے کراچی آنے پر مجبور کر دیا گیا۔ میری یہ حالت ہے کہ میرے پاس ملیر آنے کے لیے بس کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ میں پیدل چل کر یہاں تک آیا ہوں۔ گوہر تاج! میں نے زندگی میں کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا لیکن اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے پاس اپنے گھر والوں کو کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ ہم فاتے مرنے پر مجبور ہیں اور ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رہ رہے ہیں۔ آپ ہی ہیں جو میری مدد کر سکتی ہیں۔“

”مولوی صاحب، آپ برے حال میں آئے ہیں لیکن اچھے وقت آئے ہیں۔ میرا بیٹا کیمبرج میں داخلے کا خواہش مند ہے۔ اس کا انتخاب اس شرط پر ہوا ہے کہ اسے

عربی، فارسی سنسکرت میں ایک امتحان پاس کرنا ہوگا۔ اس نے اپنے لیے عربی کا انتخاب کیا ہے۔ آپ اسے عربی پڑھانے کی زحمت قبول فرمائیے۔ ابھی اس کے پاس ایک سال ہے۔“ اس نے علامہ خلیل عرب کو دوسروں پرے مایوار تنخواہ پر شہر یار کو عربی پڑھانے پر رکھ لیا۔ کچھ رقم انہیں اور دی کہ وہ گھر کے لیے راشن وغیرہ لے جائیں جو انہوں نے بطور قرض قبول کی۔ وہ باقاعدگی سے پڑھانے کے لیے آنے لگے۔

شہزاد نے بہت سخت محنت کی اور عربی کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شہزاد نے کیمبرج سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔

1956ء میں جب شہزاد کی تعلیم کا آخری سال تھا اس نے ماں کو خط لکھا کہ اس کی ملاقات ایک پاکستانی لڑکی سے ہوئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ آئی سی ایس افسر اختر حسین کی بیٹی نجمہ حسین تھی جو اس وقت پاکستان دفتر خارجہ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔

اس عرصے میں عابدہ کئی سرکاری خدمات انجام دے چکی تھی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کے ساتھ اسے نیویارک بھیجا گیا۔ یہاں کے ذرائع ابلاغ نے اسے ایک ایسی شہزادی کے طور پر پیش کیا جو 73 شیر مار چکی تھی اور جو پاکستان کی خاطر بھارت میں اپنے محل چھوڑ آئی تھی۔

اقوام متحدہ میں اپنی کامیابی کے بعد پاکستان واپس آئی جہاں اسے معلوم ہوا کہ اسے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے تقریری دورے پر جانا ہے۔ وہ دوبارہ امریکا گئی جہاں اس نے ایک نامعلوم ملک پاکستان کی طرف سے تقریریں کیں اور اس ملک کو متعارف کروایا۔

پاکستان میں بوگرہ قیادت پر عدم اعتماد کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اسے اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آنا پڑا۔

محمد علی بوگرہ مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ سکندر مرزا نے لی تو بہت جلد عابدہ سلطان کے ان سے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔

1956ء میں وہ چین گئی۔ چین سے واپسی پر اس پر یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ اسے کوئی سفارتی ذمے داری تفویض کرنے کے لیے غور کیا جا رہا ہے۔

شہزاد کیمبرج سے وکالت میں آنرز کی ڈگری لے کر تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب وہ نوکری ڈھونڈنے کراچی آ گیا

تھا۔ اسے برما شیل میں نوکری مل گئی پھر اس نے سی ایس ایس کا امتحان بھی پاس کر لیا۔
عابدہ سلطان کو برازیل کی سفارت کی پیش کش ہوئی تو اس نے اسے قبول کر لیا۔ 1957ء میں وہ برازیل چلی گئی۔

برازیل روانگی سے پہلے ملیر کے گھر میں اس نے شہر یار کی منتقلی کر دی جس میں سکندر مرزا نے بھی شرکت کی۔ وہ برازیل میں بھی کہ شہر یار نے دفتر خارجہ میں ملازمت لے لی۔ برازیل میں ایک سال گزارنے کے بعد وہ اکتانگنی اور اس نے اسٹیفنی دے دیا۔ وہ ملیر اپنے گھر لوٹ کر آئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ شہر یار نے بجلی کا انتظام کر دیا تھا۔ آٹھ سال بعد وہ اس قابل ہوئی کہ لائین کی مدھم روشنی کے بغیر کھانا کھا سکے اور بچے میں بیٹھ سکے۔

اسی گھر میں شہر یار نے اپنی منگیت سے شادی کی اور تربیت کے لیے پیرس چلا گیا۔ بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ برف اب کچھ پگھلنے لگی تھی۔ اس کی ماں اس سے ملنے ہر سال پاکستان آنے لگی تھیں جو ظاہر ہے ہڑبائی نس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

جنوری 1960ء میں وہ اپنی بہن ماجدہ سے ملنے دہلی چلی گئی۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی کہ اس کی ماں کا فون آیا۔ ہڑبائی نس کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ مصر تھیں کہ وہ فوراً بھوپال پہنچے۔

1949ء میں والد کی طرف سے توہین آمیز خط ملنے کے بعد سے وہ اپنے والد سے نہیں ملی تھی لیکن والد کی نازک حالت کا سن کر وہ دکھ سے بھر اٹھی۔ کشیدہ تعلقات کے باوجود آخر وہ اس کے باپ تھے۔ خون نے جوش مارا۔ تمام ناراضگیوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ بھوپال پہنچ گئی۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی۔ وہ بارہ سال میں پہلی دفعہ ان سے مل رہی تھی۔ ہڑبائی نس کیوں کا سہارا لیے لیٹے تھے۔

”کون ہے؟“ انہوں نے نحیف آواز میں پوچھا۔
”بیا حضور آئی ہیں۔“ ایک مددگار نے انہیں بتایا۔
ان کا چہرہ خوشی سے تھما اٹھا۔

”بڑکل آئی ہے۔“ انہوں نے قدرے بلند آواز میں کہا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ ان بانہوں میں سما گئی۔
”تم ٹھیک تو ہو، کچھ کمزور لگ رہی ہو۔ اپنا خیال رکھا کرو اور ہاں میں ذرا ٹھیک ہو جاؤں پھر تم سے پاکستان کے

بارے میں بہت سی باتیں کروں گا اور کان بھی کھینچوں گا۔ تو مجھے چھوڑ کر جو چلی گئی ہے۔“ وہ اس سے زیادہ بات نہ کر سکے اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

اس پر یہ خوف ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ ان کی بیٹائی ختم ہو چکی ہے۔ وہ سن تو سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اسے یقین ہو گیا کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

چار فروری کو صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ ٹیلی فون یونہی نہیں بجا ہے۔ ایک عہد کے خاتمے کا اعلان ہے۔ ٹیلی فون بتا رہا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔

عجیب قدرت کے کھیل ہیں۔ وہ بارہ سال تک اپنے والد سے نہیں ملی تھی اور اب ان کی موت کے وقت وہ وہاں موجود تھی۔ ان کی موت اور شایان شان طریقے سے تدفین کے بعد ایک مرتبہ پھر اس پر زور دیا جانے لگا کہ وہ واپس نہ جائے اور اپنے والد کی جانشینی کے فرائض انجام دے۔

”واپس مت جاؤ۔ ہمارے پاس رہو۔ ہم تمہیں نواب کی جانشینی سمجھتے ہیں۔“

”میں ایک پاکستانی ہوں۔ میرا مقدر پاکستان سے وابستہ ہے۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں واپس بھارت اور بھوپال لوٹ جاؤں۔“ اس نے سب کی خواہشات ٹھکرا دیں۔ بھوپالی عوام کے جذباتی مطالبے کو رد کیا اور کراچی لوٹ آئی۔ وہ واپس کراچی آئی تو ایک دن صدر ایوب خاں نے اس کے والد کی تعزیت کے لیے اسے بلایا۔ اس ملاقات میں انہوں نے بھی اس سے وہی کہا جو دوسرے کہتے رہے تھے۔

”تمہیں اپنی جانشینی کے حق کے لیے دعویٰ کرنے بھوپال ہی میں ٹھہر جانا چاہیے تھا۔“

”میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ میں پاکستانی ہوں اور میرا بیٹا آپ کی حکومت میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ محض محلوں اور خطابات کی خاطر میں اپنی وفاداری تبدیل نہیں کر سکتی۔“

”تمہاری وفاداری پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان کی خاطر تمہاری قربانی سے ہم آگاہ ہیں۔ تمہارے والد نواب بھوپال ہونے کے باوجود پاکستان کے مخلص دوست تھے۔ ہم تمہیں بھارت میں ان کی جگہ پاکستان کا... مخلص دوست دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پاکستان کے مفاد میں ہے۔ اگر تم واپس بھارت جانے کا

واجد علی شاہ

1867-1887ء، آخری تاجدار اودھ،

والی اودھ امجد علی شاہ کے بیٹے۔ فن تعمیر میں عمیق دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی باغات، عمارات کی تعمیر شروع کی۔ ساتھ اس کے فن موسیقی، رقص اور شعر و سخن میں بھی اکثر کھوئے رہتے۔ بیٹس بہا ٹھمریاں اور دادرے تخلیق کیے۔ جاتوروں کے شوقین و دلدادہ اور انیس زیور گل پارسا، مثبت صورت، درد جگر، صدائے ملک، فلک آشیاں جیسے خطابات سے نوازتے تھے۔ 1847ء میں بعد از وفات والد، نو عمری میں تخت نشین ہوئے، فوج اور انتظامیہ کو منظم کیا مگر 31 جنوری 1856ء کو انگریزوں نے بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کو اپنی غاصبانہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ معزولی کے بعد دو سال تک فورٹ ولیم کالج میں نظر بند رہے پھر کلکتہ کے نزدیک قلعہ ”میا برج“ منتقل کر دیے گئے۔ وہیں ایام اسیری میں وفات پائی۔ نامی گرامی مصنف تھے۔ بہت سی کتب تصنیف کی ہیں۔ جن میں چند اک بیان کی جاتی ہیں۔ دستور واجدی، ہیبت حیدری صورت المبارک، صحیفہ سلطانی جوہر، عروض وغیرہ۔ اکثر کتب نایاب ہیں۔

لیے کہ یہاں اس سے محبت کرنے والے موجود تھے۔

اس کے اکیلے پن کا فائدہ اٹھا کر ایک چور اس کے گھر میں کود گیا۔ وہ اس وقت پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پینے کے لیے پانی مانگا۔ عابدہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی چور ہے۔ پانی دینے کے بہانے وہ آگے بڑھی اور اسے آرم لاک لگا دیا۔ چور نے بہت زور لگایا لیکن وہ خود کو چھڑا نہ سکا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی عورت اسے اتنی مضبوطی سے پکڑ سکتی ہے۔ وہ گرل گانڈرہ چکی تھی۔ آرم لاک لگانا اس نے وہیں سے سیکھا تھا۔

اس نے ملازمین کو آواز دی جنہوں نے آکر اسے رسیوں سے باندھ دیا۔ پولیس کو خبر کی گئی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ جس آدمی کو اس نے پکڑا تھا وہ ایک چور تھا اور پولیس کی حراست سے بھاگ نکلا تھا۔

☆☆☆

وہ ایوب خاں کے مارشل لا حکومت کی مخالف رہی تھی لیکن ابھی اس نے سیاست میں قدم نہیں رکھا تھا۔ عوامی

فیصلہ کرو تو بھی تمہاری پاکستانی قومیت برقرار رہے گی۔“
”آپ کا شکریہ لیکن میں کسی بھی قیمت پر اپنی قومیت تبدیل نہیں کروں گی۔ اگر پاکستان میرے والد کی جانشینی کے قانونی حق پر میرا ساتھ دینا چاہتا ہے تو اپنے طور پر کرے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کروں گی۔“

ایوب خاں اس پر متفق ہو گئے اور حکم جاری کیا کہ میرا دعویٰ پاکستان دفتر خارجہ کے ذریعے ہندوستان حکومت کو پہنچا دیا جائے۔

ہندوستان کیوں ایسی پاکستانی عورت کا دعویٰ قبول کرتا جو اقوام متحدہ میں ملک کی بطور سفیر نمائندگی کر چکی ہو اور جس کا بیٹا دفتر خارجہ میں خدمات انجام دے رہا ہو۔ اس کی سرکشی اور بے باکی بھی ہندوستانی حکومت پر پوری طرح واضح تھی۔ ہندوستانی حکومت نے واضح انکار نہیں کیا، یہ ظاہر کیا کہ قانون اگر اجازت دے گا تو اس کے دعوے کو ضرور قبول کیا جائے گا جبکہ ہر قانون اسے بڑی بیٹی اور ولی عہد ہونے کے ناتے اسے اپنے باپ کا جانشین قرار دے رہا تھا۔ قومیت کی تبدیلی سے حق وراثت ختم نہیں ہو جاتا۔

انہی دنوں اسے پنڈت نہرو کا خط ملا۔ انہوں نے اشارہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان آکر ان سے ملے۔ اس نے دہلی پہنچ کر اشوکا ہوٹل میں قیام کیا اور ٹیکسی پکڑ کر پنڈت نہرو سے ملے پہنچ گئی۔

”آپ کا معاملہ آئینی ماہرین کے زیر غور ہے۔“
”ماہرین کچھ بھی فیصلہ کریں لیکن میں کسی قیمت پر پاکستانی قومیت تبدیل نہیں کروں گی۔“ پنڈت نہرو بھی تقریباً مایوس ہو گئے تھے۔

وہ کراچی واپس چلی آئی۔ اس کے آنے کے بعد ہندوستانی آئین میں ترامیم کے بعد اس کی بہن ماجدہ کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ کوئی نیا فیصلہ نہیں تھا۔ اس کی اسے شروع ہی سے توقع تھی۔ اس شعلہ خو کو ہندوستان اپنی ایک ریاست کا جانشین کیوں بناتا۔

اس کا بیٹا بہ حیثیت تھروڈ سیکریٹری لندن میں تعینات تھا۔ اسلام آباد دنیا دار حکومت بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایوب خان کے دور میں اسے کوئی سرکاری ذمے داری نہیں سونپی جائے گی۔

اس کا بیٹا ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا اور وہ ملیر میں اکیلی تھی۔ دوستوں کے ہاں چلی جاتی تھی یا تمام تر بے ہنگم زندگی کے باوجود دلاور منزل میں اسے سکون ملتا تھا۔ شاید اس

جمہوریت کی بحالی کے لیے تحریک چلی تو اس نے بھی سوچا کہ وہ اس تحریک میں اپنا کردار ادا کرے۔ وہ کونسل مسلم لیگ کی ممبر بن گئی۔

اس کے اندر کے باغی نے سراٹھایا اور وہ سیاست میں سرگرم ہو گئی۔ اس کو ایک مصروفیت مل گئی۔ عوامی اجتماعات سے خطابات کر کے اس کا وقت گزرنے لگا۔ صدارتی انتخابات کی لہر اٹھی تو کونسل مسلم لیگ کے رہنماؤں کو فکر لاحق ہوئی کہ ایسی کون سی شخصیت ہے جسے ایوب خاں کے مقابلے پر لایا جائے۔ سب کی نظر مختار مہ فاطمہ جناح پر پڑی۔

مصیبت یہ تھی کہ خود فاطمہ جناح اس جھنجٹ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ عابدہ کے تعلقات ان سے اس وقت کے تھے جب وہ قائد اعظم کے ساتھ بھوپال کے دورے پر آیا کرتی تھیں۔ اس نے ان یادوں کے سہارے یہ طے کیا کہ وہ فاطمہ جناح کو لکیشن لڑنے پر آمادہ کرے گی۔

”میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ آپ کونسل مسلم لیگ کی قیادت قبول فرمائیں۔“

”میں انکار کر چکی ہوں۔“

”اب میں آپ سے درخواست کر رہی ہوں۔“

”میں بھٹکے ہوؤں کی قیادت نہیں کر سکتی۔“

عابدہ سلطان اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مس جناح، ہم نے آپ کے بھائی کی قیادت میں پاکستان کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اب آپ ہی ان کا خواب جمہوریت حاصل کرنے میں مدد کر سکتی ہیں جو مارشل لا کے بوجھ تلے دبا پڑا ہے۔ میں کسی بھی صورت میں آپ کا انکار قبول نہیں کروں گی۔ میں کل پھر آؤں گی اور اس وقت تک آتی رہوں گی جب تک آپ ہماری دعوت قبول نہیں کر لیتیں۔“

وہ دوسرے دن پھر فلیگ ہاؤس پہنچ گئی۔ اس ملاقات میں اس پر عجب انکشاف ہوا۔

”عابدہ! کونسل مسلم لیگ (سی او پی) کے کسی رہنما نے مجھ سے قیادت کے لیے نہیں کہا۔“

”لیکن.....“ عابدہ بوکھلا کر رہ گئی۔ ”میں تو فلیگ اسٹاف ہاؤس کے باہران کی کاریں دیکھ چکی ہوں۔ انہیں اس مشن پر بھیجا گیا تھا کہ وہ آپ کو یہ پیشکش قبول کرنے پر راضی کریں۔ انہوں نے واپس جا کر بتایا بھی کہ آپ نے یہ پیشکش ٹھکرادی ہے۔“

”نہیں کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو میرے

پاس مالی امداد مانگتے آئے تھے۔“ وہ سمجھ گئی کہ سازشیں یہاں بھی کام کر رہی ہیں۔

”مس جناح، آپ صرف ایک دن انتظار کریں۔ سی او پی کی پوری قیادت آپ کے پاس آئے گی۔“

”دیکھیں گے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عابدہ کی کوششوں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا اور مس جناح نے رضامندی ظاہر کر دی۔

ایوب خاں کے مقابلے میں فاطمہ جناح کو شکست ہو گئی مگر انہوں نے فوجی حکومت کی جڑیں ہلا دی تھیں۔

صدارتی انتخاب کے کچھ ہی عرصے بعد 1965ء میں پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ گئی۔ عابدہ سلطان نے بطور پائلٹ اور نشانہ باز کے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس پیشکش کے جواب میں اسے خواتین رضا کاروں کو شہری دفاع کی تربیت دینے کے لیے کہا گیا۔ وہ باقاعدگی سے ایک یونیورسٹی کے کپتان بن جانے لگی جہاں وہ نوجوان لڑکیوں کو انٹل چلانے اور نشانہ بازی کی تربیت دیتی۔

تین ہفتوں بعد جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ جنگ ایوب خاں کا خاتمہ ثابت ہوئی۔ سیاسی زوال شروع ہوا۔ جنرل یحییٰ خان نے ایوب خاں سے حکومت لے کر دوسری بار مارشل لا لگا دیا۔

عابدہ سلطان کی سیاسی گہما گہمی بھی دم توڑ گئی۔ وہ سیاست کے میدان سے دوستوں کے حلقے میں لوٹ آئی۔

اب وہ بھوپال میں اپنی جائیداد کے حصول کے لیے مقدمہ بازی میں مصروف تھی۔ اس لا حاصل کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگلہ دیش بننے سے قائد اعظم کا مشرقی اور مغربی بازو کے متحدہ پاکستان کے تصور کا خاتمہ ہو گیا۔ پاکستان نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ اپنا زیادہ آبادی والا حصہ گنوا دیا۔

اس جذباتی صدمے نے اسے بیمار کر دیا۔ اس جیسی حوصلہ مند عورت اپنے گھر میں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے بیٹے اور اس کے بچوں میں گم ہو گئی۔ یہ مایوسی کے اندھیروں کی انتہا تھی جن میں وہ گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا بیٹا دفتر خارجہ کی ملازمت کی وجہ سے کبھی اسلام آباد میں ہوتا تھا کبھی اس کی تعیناتی بیرون ملک ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ ملاقات کے لیے آ جاتا تھا کبھی وہ اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اب وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گئی تھی لیکن کھیلوں کی خواہش کم نہیں ہوئی تھی۔ پیرانہ سالی اور ہلکی

پھلکی بیماریوں نے اسے اسکو اش کھیلنے کے قابل نہیں رکھا تھا لہذا اس نے نیبل ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ اپنے باغیچے میں نیبل نصب کروائی جہاں بہت جلد ملیر کے مقامی لوگ باقاعدگی سے ہر سہ پہر آنے لگے۔ یہ سندھی، بلوچ اور مہاجر لڑکے نیبل ٹینس سے لطف اندوز ہوتے اور پھر کھیل کے بعد اس کے ساتھ دنیا کے ہر موضوع پر بات چیت کرتے۔ کبھی کبھی شطرنج کی بازی بھی جیتی۔

یہ لڑکے اسے سیاسی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بھی تھے اور عوامی رد عمل اس تک پہنچتا رہتا تھا۔ جب المیہ مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا دور عروج آیا تو اسے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی گئی لیکن اس نے اب عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ کسی پارٹی سے اس کی مخالفت اس کے بیٹے کی فارن سروس کی ملازمت پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

عمر کے ساتھ ساتھ پرانی چوٹیں بھی اپنا رنگ دکھانے لگی تھیں۔ اپنی جوانی میں کھیلوں کے دوران وہ کئی بار زخمی ہوئی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی زخمی ہوئی تھی۔ گھٹنے کی ہڈی اپنی جگہ سے ہل گئی تھی۔ گھوڑوں سے گرنے کے دوران اس کے جسم پر بے شمار چوٹیں آئی تھیں۔ اب یہ چوٹیں تکلیف دے رہی تھیں۔ بعض اوقات سر چکرانے لگتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر ڈاکٹروں کو دکھانے پر تیار ہو جاتی۔ ورنہ وہ اپنی قوت مدافعت کو کام میں لا کر اپنا علاج خود کرنے کی عادی تھی۔

وہ سیاسی نشیب و فراز کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا عروج بھی اس نے دیکھا اور زوال بھی دیکھ رہی تھی پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ جنرل ضیا الحق کے ہاتھوں ملک میں تیسرا مارشل لا لگ گیا۔

ضیا الحق جب میدان میں آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت بنے گا۔ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ منظر نامہ بدلنے لگا۔

اس کے بیٹے کو ضیا الحق نے سفیر بنا کر اردن بھیجا۔ یہ خبر اس کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ اس کا بیٹا صرف 43 سال کی عمر میں سفیر کے عہدے تک پہنچ گیا۔ اردن میں شہر یار کے چار سالہ قیام کے دوران وہ اس کے پاس تین دفعہ گئی۔

1981ء میں وہ اپنی ماں سے ملنے بھوپال گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ نہایت افسردہ حالات میں جی رہی ہیں۔ محل

ویران کسمپرسی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ٹینس کورٹ میں گھاس اگ آئی تھی۔ صرف پرانے وفادار ملازم خدمت کے لیے رہ گئے تھے۔

وہ ماں سے مل کر واپس پاکستان آ گئی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ اس کی ماں سے آخری ملاقات ہے۔ 1982ء میں اسے ماں کی بیماری کی خبر پہنچی۔ اس نے پھر بھوپال جانے کا فیصلہ کیا۔ ویزا بھی لے لیا لکٹ کا بندوبست بھی کر لیا کہ فون پر ماں کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اب وہ بھوپال کس کے لیے جاتی۔ اب تو ملیر ہی اس کا بھوپال تھا۔

اس کے پرانے دوست منظر نامے سے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ لیڈی ہارون انتقال کر گئی تھیں، ماں صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ جونا گڑھی بیگمات بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ کچھ نئے دوست تھے جو ملیر اس سے ملنے آ جاتے تھے۔ ادھر بھوپال سے بھی متواتر موت کی خبریں آرہی تھیں۔

اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بہنوئی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ اکیلی ان صدموں کو جھیل رہی تھی۔

اس کا بیٹا اب برطانیہ میں سفیر نامزد ہوا تھا۔ وہ کچھ دن کے لیے لندن چلی گئی۔ یہاں سے وہ ویزا گئی یہیں اس نے یہ روح فرسا خبر سنی کہ جنرل ضیا الحق کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے۔

وہ پاکستان واپس آئی تو اسے اپنے بیٹے کی فکر تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد شہر یار کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ پی پی پی ضیا کے نامزد لوگوں کے خلاف تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ شہر یار اپنی کارکردگی کی وجہ سے اپنے عہدے پر قائم رہا۔

وہ سیاسی اکھاڑ پھچاؤ کو دیکھتی رہی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی اور چلی گئی۔ نواز شریف برسر اقتدار آئے اور چلے گئے، بے نظیر پھر آ گئیں۔

اس کی امیدیں مزید دم توڑ گئیں۔ اس وقت اسے کوئی نجات دہندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ملیر کے گھر میں قرآن کا مطالعہ کرنے، ذرائع ابلاغ کو مراسلات لکھنے اور لندن میں اپنے بیٹے کی ترقی اور فلاح کے لیے دعائیں کرنے میں وقت گزار رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ تجزیہ کرنے بیٹھ جاتی کہ اس کا پاکستان آنے کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط؟ وہ یہاں کی سیاست سے مطمئن نہیں تھی لیکن یہ سوچ کر اسے اپنا فیصلہ درست نظر آتا تھا کہ اس کا بیٹا ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اس کا مستقبل ایسا تابناک نہیں ہوتا۔

1992ء میں اس نے اپنے دو پوتوں کی شادیاں بھی دیکھ لیں۔

1994ء کو اس کا بیٹا اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ملازمت سے علیحدہ ہو گیا۔ ملازمت سے علیحدگی کے بعد اسے روانڈا میں اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کا خصوصی نمائندہ تعینات کیا گیا۔

1996ء میں اس کا بیٹا ملازمت سے فراغت کی زندگی گزارنے لگا مگر پھر اسے دفتر خارجہ اصلاحاتی کمیٹی کا سربراہ تعینات کر دیا گیا اور پھر پاکستان کرکٹ ٹیم کے بھارتی دورے کے لیے منتظم بنا کر بھارت بھیجا گیا۔

بھارت سے واپسی پر اسے دو سالہ معاہدے پر پیرس میں پاکستانی سفیر کا عہدہ دیا گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ پیرس گئی لیکن وہاں کی سردی نے اس کے جوڑوں میں درد شروع کر دیا لہذا وہ لوٹ آئی۔

اس جیسی متحرک عورت، بڑھتی ہوئی عمر کے ہاتھوں بے بسی کی تصویر بنی جا رہی تھی۔ ہر وقت دوستوں میں گھری رہنے والی اب کہیں آنے جانے سے گریز کر رہی تھی۔ جانی بھی کہاں اب وہاں کون تھا۔

فروری 2001ء میں وہ پیرس سے ملیر لوٹ کر آئی تو خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی۔ عمر بھی تو ستاسی سال ہو گئی تھی۔ کچھ دن سے وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اس نے گلشن اقبال میں آنکھوں کے ایک کلینک کوفون کیا۔ اپنی چھوٹی سوزوکی خود چلاتی ہوئی وہاں چلی گئی۔ کلینک کے ڈاکٹر نے اس کی آنکھ کے عدسے کی لیزر سے صفائی کی اور آدھے گھنٹے تک کلینک ہی میں روکے رکھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ دوبارہ اپنی کار میں سوار ہوئی اور بہ آسانی ملیر تک پہنچ گئی۔ اس نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ بعض کام وہ ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے کر گزرتی تھی۔

یہ اس کی فطری ہمت کا آخری باب تھا جو اس نے پڑھا۔ اس وقت وہ تقریباً صاحب فراش تھی۔ اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے سے معذور۔ گھٹنوں میں سوجن کی وجہ سے درد تھا۔ مٹانے کی تکلیف نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ نیند مفقود ہو گئی تھی۔ شہر یار آیا ہوا تھا۔ اس نے اس مشکل وقت میں فیصلہ کیا کہ وہ ماں کے پاس ٹھہرے گا۔ انہیں ملازموں پر چھوڑنے کے بجائے خود ان کی خدمت کرے گا۔

اس وقت عابدہ سلطان کے پاس اس کے سوا کوئی کام نہیں تھا کہ وہ اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالتی رہے۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ شہر یار کو اپنی یادداشتوں میں شریک کر لیتی۔ اپنی دادی کی سخت گیری کے قصے سنائی، اپنی باغی طبیعت کا جائزہ لیتی، اپنے والد کے احسانات کا تذکرہ کرتی پھر بڑے دکھ سے ان واقعات کا اعادہ کرتی جو ان کی دوسری شادی کے بعد پیش آئے۔

وہ اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب مرتب کر چکی تھی۔ اس کا بیٹا 68 سال کا ہو چکا تھا۔ جسے وہ زہریلی ہواؤں سے بچا کر بھوپال سے پاکستان لائی تھی، ایک کامیاب زندگی گزار چکا تھا۔ اس نے جو بھرپور زندگی گزاری تھی اس کے بعد اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے پاکستان کا انتخاب کیا تھا اور اب وہ اس سرزمین پر مرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بھوپال کی آخری نشانی اب ظاہری آنکھوں سے گم ہونے والی ہے۔

وہ 27 اپریل 2002ء کو اٹھاسی سال کی عمر میں شوکت میموریل اسپتال میں داخل کی گئی۔ آخری ہفتوں میں یہ واضح ہو گیا تھا کہ مٹانے میں کینسر ہے جو پھیپڑوں اور معدے تک پھیل چکا ہے۔

11 مئی 2002ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اسے اسی روز ملیر میں اس کے پسندیدہ باغ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی اس کی موت کے بعد بھی اس کے ساتھ رہی۔ اس کے جنازے میں لوگ جوق در جوق آئے۔ ان میں نہ صرف بھوپالی اور اس کے خاندان کے لوگ شامل تھے بلکہ ملیر کے نواحی گاؤں، دیہات سے عام پاکستانی جن میں سندھی، بلوچی، کسان، گوالے، معمر خواتین اور وہ لڑکے بھی شامل تھے جن کے ساتھ وہ ٹیبل ٹینس اور شطرنج کھیلتی رہی تھی۔

سرحد کے اس پار بھی سوگ کی فضا طاری تھی۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ نے فون کر کے تعزیت کی اور بتایا کہ بھوپال کی ہر مسجد اور ہر مندر شہزادی عابدہ سلطان کی وفات پر سوگوار ہے۔

ماخوذ

عابدہ سلطان ایک انقلابی شہزادی کی خود نوشت 'مصنفہ عابدہ سلطان'

اوائل میں یہ ستارہ برطانوی فلکیات دان ایڈموئنڈ ہیلی کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ اسی شخص نے ہیلی کی سفری تفصیلات اور مدار کا ابتدائی تجزیہ کیا اور اپنے عزیز دوست اور ممتاز سائنس دان سر آئزک نیوٹن کو اپنے مفروضے سے آگاہ کیا۔ اس کا تجزیہ مین وین درست تھا۔ 1758 میں یہ ستارہ دوبارہ ظاہر ہوا۔ بد قسمتی سے اس واقعے سے قبل ایڈموئنڈ ہیلی جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

وہ ایک دم دار ستارے کے ساتھ پیدا ہوا اور سات عشروں بعد اس ستارے کی دم تھامے نئے جہانوں کی سمت کوچ کر گیا۔ مگر جاتے جاتے وہ اپنی روشنی چھوڑ گیا جو آج بھی باقی ہے۔ ہیلی نامی دم دار ستارہ ہر 75 برس بعد زمین کے نزدیک سے گزرتا ہے۔ یوں تو اس کی خلا نوردی کا تذکرہ قبل مسیح کی دستاویزات میں بھی ملتا ہے مگر اٹھارویں صدی کے

مستلشیان علم و ادب کے لیے اس ماہ کا تحفہ خاص

اس نے امریکی ادب کو معراج بخشی۔ اس کے ایک ایک لفظ انمول کہلائے۔ اس نے ادب کی اس قدر خدمت کی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی جبکہ اس نے ایک ایسے گہرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں علم و ادب کا چرچا نہ تھا مگر اس کے شوق نے اسے علم جاویداں عطا کیا اور آج وہ موت کے بعد بھی اپنی تحریروں میں زندہ ہے۔

ہیلے اب
ابن کبیر



1835 میں یہ پھر چکا... اور تب فلوریڈا کے ایک غریب گھرانے میں اس بچے کی پیدائش ہوئی جس کی قسمت اس خلاگرد سے جڑی تھی۔

جس دن وہ ستارہ ظاہر ہوا، امریکی ریاست میسوری کے چھوٹے سے گاؤں فلوریڈا کے ایک مختل شخص کے ہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نام تھا اس کا جان مارشل ہیمز۔ آبائی وطن امریکی ریاست ورجینیا تھا۔ وہ ایک زمین دار گھرانے کا سپوت تھا۔ اس کے اجداد نے کئی عشروں قبل برطانیہ سے ہجرت کی تھی اور امریکا میں پیر جمائے بیٹھا تھا مگر باپ کی موت کے بعد اس کا گھرانہ بکھر گیا۔ اس کا خاندان کینٹکی اٹھ آیا۔ فقط گیارہ برس کی عمر میں اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا پڑا۔ چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ ساتھ ہی تعلیم بھی جاری رکھی۔ 21 برس کی عمر میں وکیل کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

کینٹکی میں اس کی ملاقات خوبو جین سے ہوئی۔ 1823 میں ان کی شادی ہو گئی۔ وہ مختلف سرکاری عہدوں پر رہا مگر اپنا نام پیدا نہیں کر سکا۔ پوسٹ ماسٹر کا عہدہ بھی کچھ کام نہیں آیا۔ آگے پیچھے بچے ہو گئے۔ مالی مسائل نے گھیر لیا۔ ملازمت ترک کر کے اپنی جمع پونجی سے دکان کر لی مگر کاروبار کا تجربہ بھی بری طرح ناکام رہا۔

1835 میں ہیمز خاندان اپنے پانچ بچوں کے ساتھ میسوری اٹھ آیا۔ برسات کے جن دنوں یہ کنبہ ایک بکھی میں سوار جس میں دو گھوڑے تھے اور جس کے پیروں کی چراچرہٹ لامتناہی معلوم ہوتی تھی کینٹکی سے میسوری آ رہا تھا۔ جین حمل سے تھی۔

ایک روایت کے مطابق اسی سفر کے دوران جنگل سے گزرتے ہوئے ایک رات بلی ستارہ آسمان پہ ظاہر ہوا تھا جسے دیکھ کر کوچوان نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور شیطان پر لعنت ملامت کی تھی۔

دو کمروں کے بوسیدہ مکان میں اس گھرانے نے رہائش اختیار کی اور وہیں وہ بچہ پیدا ہوا جو ناکامیوں کے بھنور میں گھرے کلیمنٹر گھرانے کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کرنے والا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک سرد اور دور افتادہ دنیا تھی۔ غروب آفتاب کے بعد ہواؤں کے جھکڑ چلتے جو چپکے سے چراغ بجھا دیتے۔ رات کے وقت جنگل سے گیندروں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ فلوریڈا میں جان مارشل نے قانون کی پریکٹس شروع

کر دی تھی۔ گزربسر کا کوئی واضح امکان پیدا نہیں ہوا تو شام میں ایک جنرل اسٹور میں کھڑا ہونے لگا۔

بارشوں کے موسم میں اس کی بیوی جین نے چھپنے بچنے کو جتا جس کا نام سیمول لینک ہو رہا تھا۔ چند روایات کے مطابق وہ دم دار ستارے کے آسمان پہ ظاہر ہونے کے بعد ایک ہفتے بعد پیدا ہوا تھا۔

تومولو کی قلعاریاں اس بوسیدہ مکان میں نیا پن پیدا نہیں کر سکیں۔ ہاں اس کی تنگی مزید بڑھا دی۔ ہیمز گھرانہ پہلے ہی سات افراد پر مشتمل تھا۔ پھر وہیں ایک غلام لڑکی بھی رہتی تھی جو گھر کے کام کاج میں مالکن کا ہاتھ بٹاتی۔

اس وقت امریکا کی چند ریاستوں میں غلامی کا تصور باقی تھا۔ میسوری بھی ان ریاستوں میں شامل تھی۔

سیمول ایک نحیف و نزار بچہ تھا۔ اکثر بیمار رہا کرتا۔ رات بھر کمزور آواز میں روتا رہتا۔ ماں باپ کو اندیشہ تھا کہ شاید وہ پہلا موسم سرما بھی نہ نکال پائے۔

تو ہم پرستی اس زمانے میں عروج پر تھی۔ جین نے گاؤں کے ایک ستارہ شناس سے رجوع کیا۔ اس شخص نے بچے کی بیماری کو دم دار ستارے کی بدختری قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ وہ فقط چند ماہ کا مہمان ہے۔

”منجوس ستارے کی مکروہ شعاعیں اس میں سرایت کر گئی ہیں، اس کی موت یقینی ہے۔“ بوڑھے مستقبل بین نے اپنے پانسوں سے کھیلے ہوئے کہا۔

گو جان ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ ایسی باتوں پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا مگر اس دعوے نے اسے دہلا ڈالا۔ دراصل 28:1 کے موسم خزاں میں اسے اپنے ایک بیٹے سے جدائی کا کرب سہنا پڑا تھا۔ لڑکا فقط چھ برس کی عمر میں دوسرے جہان سدھار گیا تھا۔

اس پورے واقعے کا پریشان کن امر یہ تھا کہ کینٹکی کی ایک بوڑھی عورت نے اس بچے کی پیدائش کے وقت ہی اس کی موت کی پیش گوئی کر دی تھی جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے فلوریڈا کے ستارے شناس کی پیش گوئی غلط نکلی۔ سیمول ادبی شاہکار تخلیق کرنے کے لیے زندہ رہا۔

وقت گزرتا تھا۔ اس کی صحت تو نہیں سنبھلی مگر وہ بیمار یوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ اب سیمول چار برس کا ہو گیا تھا۔

1839 میں کلیمنٹر خاندان کو ایک بھاری صدمہ سہنا پڑا۔ سیمول سے دو برس بڑی لڑکی مارگریٹ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ فلوریڈا کے قبرستان میں اسے دفنایا گیا۔

سیمول اس وقت تین برس کا تھا۔ ابھی وہ غم سے نا آشنا تھا۔ چند روز تک ماں باپ سے مارگریٹ کی بابت پوچھتا رہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

اسی برس اس کا خاندان ساحلی شہر بینی بیل اٹھ آیا۔ یہ مرسکون شہر دنیا کے تیسرے بڑے دریا مسیسیپی کے کنارے واقع تھا۔ یہیں صحیح معنوں میں سیمول نے شعور کی آنکھ کھولی۔ اور آنکھ کھولتے ہی دریا کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی دوپہر بس دریا کے کنارے گزرنے لگیں، جس کی روانی میں کہانیاں چھپی تھیں۔ ایسی کہانیاں جنہیں وہ مستقبل میں ساری دنیا کے سامنے بیان کرنے والا تھا۔

ریاست میسوری میں غلامی کا تصور عام تھا۔ اسے غلامی کے نظام کا بے حد قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اور پھر اپنی ہی زندگی میں اس نے اسے شکست و ریخت کا شکار ہوتے دیکھا۔ اس تجربے نے اس کے قلم کو کئی یادگار کہانیاں عطا کیں۔ مگر یہ سب تو بہت بعد میں رونما ہوا، اس وقت تو وہ ایک شریر اور ضدی بچہ تھا جو پڑھائی سے بھاگتا۔ گلی محلوں میں ادھم مچاتا اور ماں باپ کی ناک میں دم کیے رکھتا۔

اسکول جانے سے اسے نفرت تھی۔ اس کا دل تو ساحل پرانکا رہتا۔ گھومنے پھرنے میں، پاس پڑوس کے بچوں کو تنگ کرنے میں اسے مزہ آتا۔ ان حرکتوں کا نتیجہ سزا کی صورت سامنے آتا۔ خوب درگت بنتی مگر وہ باز آنے والوں میں کہاں تھا۔ کچھ روز دیکا بیٹھا رہتا اور پھر اپنی پرانی جون میں لوٹ آتا۔ اپنی اچھل کود اور غل غپاڑے سے گھر کا نقشہ بگاڑ دیتا۔ اس اکیلے نے ماں باپ کو اتنا دق کیا کہ باقی بچے مل کر بھی نہیں کر سکے۔ وہ طوفان کھڑا کر دیتا۔ گھر کا سامان الٹ پلٹ دیتا۔ تھوڑا بڑا ہوا تو اور سرکش ہو گیا۔ پہلے فقط اسکول سے بھاگ کر رہتا تھا، اب وہ گھر سے بھی غائب رہنے لگا۔ شام تک نہیں لوٹتا تو بڑا بھائی اس کی تلاش میں نکلتا۔ وہ دریا کنارے کی پیڑ کے نیچے جو استراحت ہوتا، مزے مزے کے خواب دیکھ رہا ہوتا کہ بڑا بھائی سر پر پہنچ جاتا اور کان مڑورتے ہوئے اسے گھر لے جاتا۔

اس کا باپ ایک سخت گیر آدمی تھا۔ سنجیدگی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مسکراتا اس کے نزدیک ایک غیر ضروری فعل تھا۔ سیمول اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا، وہ لحاف میں دیک جاتا۔ البتہ ماں سے وہ بہت لاڈ کرتا تھا۔

جین کی حس مزاح کمال کی تھی۔ گو اس نے زندگی میں

بہت سے مسائل کا سامنا کیا، معاشی مشکلات سے نبرد آزما ہوئی، بیٹے کی موت کا صدمہ سہا، صحت کے مسائل بھی اسے پریشان رکھتے، مگر اس کی بذلہ نچی قائم تھی۔ کبھی موڈ میں ہوتی تو بچوں کو بتاتی۔ ”تمہارے ابا نے ہنس کھہ ہونے ہی کی وجہ سے تو مجھ سے شادی کی۔ میری بذلہ نچی نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔“ سیمول نے اپنی ماں سے مسکراتے، قہقہے لگانے کا ہنر سیکھا، جو زندگی میں اس کے بہت کام آیا۔ یہ بذلہ نچی اس کے قلم کی روشنائی بنی۔

☆☆☆

صبح کو دھند رہنے لگی تھی۔ جب بچی سڑکوں پر گھوڑے کے ٹاپلوں کی آواز گونجتی، تب بھی منظر پر دھندلاہٹ قابض رہتی۔

سیمول کا باپ علی الصباح جب لڑکے لحاف کے نیچے ہوتے، منظر لپیٹے گھر سے نکل جاتا۔ وہ خاصا مصروف رہنے لگا تھا۔ کاندھوں پر بھاری ذمے داریاں تھیں۔ یہاں آنے کے بعد اس کے مالی حالات میں خاصا سدھار آ گیا تھا۔ قانون کی تعلیم کام آئی اور جارج مارشل اٹارنی اور جج کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگا۔ اسی کی زیر نگرانی بینی بیل سینٹ جوزف ریلوے ٹریک تعمیر ہوا۔ اس ٹریک نے میسوری کے دو بڑے شہروں کو باہم جوڑ دیا۔ ڈاک فوری پہنچنے لگی۔ لوگ اپنی لڑکیوں کو پڑوسی شہر میں بیابنے لگے۔

سیمول کی یہ طور لکھاری عالمی شہرت کے علاوہ یہ ٹریک وہ دوسرا امر ہے جس کی وجہ سے تاریخ میں جارج مارشل کلیمنٹر کو یاد کیا جاتا ہے۔

نٹ کھٹ سیمول ہنستا کھیلتا، گیت گاتا، گنگناٹا پروان چڑھتا تھا۔ اب وہ گیارہ برس کا ہو گیا تھا اور ایک حادثے کے بہرہ مست نزدیک پہنچ گیا تھا۔

جارج کی موت نمونہ کے سبب ہوئی۔ اور یہ سب بہت اچانک رونما ہوا۔ گھرانے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ سب درہم برہم ہو گیا۔ پورا ایک ماہ سوگ میں گزرا، مگر مرنے والے کے ساتھ انسان مرنے نہیں جاتا۔ زندہ رہتا تھا اور زندگی جدوجہد کی متقاضی تھی۔ ذمے داریاں اس کی ماں پر آن پڑیں۔

غم زدہ عورت گھر کی کفالت کی جانب متوجہ ہوئی تو سیمول کی چاندی ہوئی۔ وہ اسکول سے ویسے ہی متفرق رہا کرتا تھا۔ نصابی کتب جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتیں۔ اس کا من تو بس شراؤں اور گھومنے پھرنے میں لگتا۔

باپ کی موت کے بعد اس کی بے چاری ماں گردن تک ذتے داریوں میں پھنس گئی۔ معاشی مسائل نے اسے ہلکان کر دیا۔ وہ اپنے لڑکے پر توجہ نہیں دے سکی، جو سارا سارا دن دریا کنارے لیٹا رہتا یا اس ٹریک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دور تک چلا جاتا جو اس کے باپ نے تعمیر کرایا تھا۔

ایسے ہی ایک دن وہ اتنا دور چلا گیا کہ مڑ کر دیکھنے پر اسے قصبے کے مکانات کتھی دھبوں کے مانند نظر آنے لگے۔ تھک کر وہ ایک درخت تلے پڑ گیا۔ نیند نے آن لیا اور تب اس نے خواب دیکھا۔

وہ دیکھتا ہے کہ چاندنی رات ہے اور وہ ہاتھ میں کاغذ قلم لیے حیران و پریشان بیٹھا ہے۔ اچانک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ سر اٹھایا تو اپنے مرحوم باپ کو سامنے کھڑا پایا۔ اس حالت میں کہ چہرے پر شفیق مسکراہٹ ہے۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے باپ کو مسکراتا دیکھا۔ اس نے اپنا شفیق ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

سیمول کو خود میں کچھ ٹوٹا محسوس ہوا۔ وہ احساسِ ندامت سے بھر گیا۔ اس کے سامنے کھڑے شخص نے اپنے کنبے کی کفالت کے لیے، اپنے بیوی بچوں کے لیے دن رات محنت کی۔ وہ تین تین ملازمتیں کیا کرتا اور اس کے عوض وہ کیا چاہتا تھا... فقط یہ کہ اس کی اولاد اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ بیٹے اس کا ساتھ دیں۔

اور بدلے میں سیمول کیا کر رہا تھا۔ بچپن میں صاحبِ فراش رہا۔ ماں باپ نے اس کی صحت یابی کے لیے لاکھ طرح کے جتن کیے۔ جب کچھ صحت سنبھلی تو بجائے فرماں بردار بچہ بننے کے اپنی شرارتوں سے انہیں دق کرنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سر اٹھایا کر دیکھا۔ سامنے ایک دھندلی سی شیبہ تھی اور پیچھے روشن افق۔ اچانک آسمان پر ایک ستارہ ظاہر ہوا اور یوں میں فنا ہو گیا۔ لڑکے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ریلوے ٹریک کے نزدیک ایک پیڑ تلے مٹی پر لیٹا تھا۔

اس خواب کے بعد وہ اداس رہنے لگا۔ ہر لمحے یہ غم ستاتا کہ اس نے اپنی ذتے داریوں سے پہلو تہی کی۔ ماں باپ کو پریشان کیا۔ ان کی امیدوں پر پورا اتر کے بجائے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔

یہ سوچ ہر وقت اس پر سوار رہتی۔ خیالات کی اس تکرار نے جلد ہی ایک صدمے کی شکار اختیار کر لی۔ نٹ کھٹ سیمول اب خاموش اور معطل رہنے لگا۔ گھنٹوں دریا کنارے بیٹھ کر

چپکے چپکے روتا رہتا۔

ایک شام وہ دریا کنارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ غم کی شدت سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ توازن بگڑا اور وہ سیدھا پانی میں جا گرا۔

اچانک اسے ہوش آیا اور اگلے ہی لمحے خوف نے اسے گھیر لیا۔ وہ تیرتا نہیں جانتا تھا اور دریا کی رفتار تیز تھی۔

وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ شور مچانے لگا۔ لیکن وہاں کوئی ہوتا تو مدد کو آتا۔ اس کی ناک اور منہ میں پانی چلا گیا۔ دم گھٹنے لگا۔ موت قریب آتی معلوم ہوئی۔ حواس معطل ہو گئے۔

اچانک اسے جھٹکا لگا۔ کوئی اسے تھکیٹ رہا تھا۔ پھر مزید جھٹکے لگا۔ اب وہ خشکی پر تھا۔ پیٹ پر دباؤ بڑھنے لگا۔ اس نے منہ سے پانی باہر اگلا۔ دھیرے دھیرے ہوش آ گیا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ ایک مانوس آواز کانوں سے ٹکرائی۔ یہ اس کا ایک محلے دار تھا جسے بد نصیب جین نے اپنے بیٹے کی تلاش میں بھیجا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ سیمول نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا گیا۔

پڑوسی نے لوٹنے کے بعد اس کی ماں کو تمام واقعے سے آگاہ کیا۔

رات وہ اپنے بیٹے کے بستر کے پاس اسٹول رکھ کر بیٹھ گئی۔ ”کیا بات ہے میرے لال؟“ ماں نے سوال کیا۔

سیمول پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”میں... میں بہت گستاخ ہوں... میں نے آپ لوگوں کا کہا نہیں مانا... اب... اب...“

عورت نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”میرے بیٹے اب رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ آنسو اب تمہارے باپ کے لیے بے معنی ہیں۔ تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔“

”آپ... مجھے معاف کر دیں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”میں تمہیں معاف کر دوں گی مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”میں آپ کا ہر حکم بجا لاؤں گا۔“ اس نے آنسو پونچھے۔ ”بس مجھے اسکول جانے کا مت کہیے گا۔ وہاں... میرا دم گھٹتا ہے۔“

عورت نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ ”نہیں، میں تمہیں اسکول جانے کا نہیں کہوں گی۔ لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اب

تم میرا کہا مانو گے اور مگر کی کفالت کی ذتے داری اٹھاؤ گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

اور یوں اس بچے کی زندگی میں جو جلد امریکی ادب میں نئی روح پھونکنے والا تھا، ایک موڑ آیا۔ اس کی ماں نے اسے ایک چھاپے خانے میں بھرنی کروا دیا۔

وہاں کی زندگی سیدھی سادی اور بوریت سے مڑتی تھی۔ کچھ انوکھا نہیں تھا۔ مشینوں کی کھٹ پٹ۔ کیمیکل کی بو۔ رنگ۔ کاغذ سب ایک سا تھا۔ اور وہاں وہ دو برس رہا۔

اور پھر اس چھاپے خانے میں ایک واقعہ رونما ہوا۔ ☆☆☆

یہ پندرہویں صدی ہے۔ فرانس پر شکست کی اور پس مردگی چھائی ہے۔ انگریز فوجیں اہم قلعوں پر قابض ہیں، شاہی خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ اور ایسے میں... ایک کسان کی بیٹی منظر میں ظاہر ہوئی۔

ایک کنواری دو شیزہ جو یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اسے غیب سے آوازیں آتی ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کراؤ۔ جب وہ ولی عہد سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی تو قرب و جوار میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ لارنس کی دو شیزہ فرانس کی مدد کو آن پہنچی ہے۔ ایک جگہ ہوئے چرچ سے اسے وہ تکرار ملی جس کی بابت روایت تھی کہ سورما ہی اسے اٹھا سکتے ہیں۔

اس زمانے میں مرلن کے علاقے سے ایک بزرگ کے ظہور کا بھی عقیدہ تھا۔ یہ عقیدہ جب کسان کی لڑکی کے غیبی آواز سننے کے دعوے سے ملا تو اساطیری شکل اختیار کر گیا۔ ولی عہد دونوں چارلس اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے دس ہزار سپاہی اس کے ساتھ کیے لڑکی نے ایک ہاتھ میں تلوار تھامی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ اس نے اور لیز کی سمت رخ کیا اور زور دار جملہ کر کے اسے انگریزوں سے خالی کروالیا۔ وہ یقین کی قوت کے ساتھ آگے بڑھی اور مسلسل فتوحات کے نتیجے میں جلد وہ لمحہ آن پہنچا، جب ولی عہد کے سر پہ تاج رکھا گیا۔ فرانس کو ان کا بادشاہ مل گیا۔

اور پھر کیا ہوا... کسان کی بیٹی، فرانس کی محسن انگریزوں کی قید میں چلی گئی جنہوں نے اس پاکیزہ روح کو جادو کر کے کہہ کر آگ میں جھونک دیا۔

یہ جون آف آرک کا تذکرہ ہے جس کی کہانی اتنی

حیران کن ہے کہ حقیقی ہونے کے باوجود افسانہ لگتی ہے۔ ایک لڑکی، ایک عام سی لڑکی، جس نے فرانس کو غلامی سے نجات دلائی اور پھر شعلوں کو سوئپ دی گئی۔

سیمول کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ آنکھوں میں نمی۔ دل میں احترام۔ وہ فرانس کی کنواری کی بابت پڑھ رہا تھا اور ہر سطر کے ساتھ حیرت کے سمندر میں اترتا جا رہا تھا۔

سیمول فیمین کی زندگی پر کام کرنے والے محققین متفق ہیں کہ کاغذ کا وہ عام سا ٹکڑا جو شاید ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا اس روز لڑکے تک پہنچا تھا، اسی ٹکڑے نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔ اسے جذبات و احساسات کی بلند ترین چوٹی تک رسائی عطا کی۔ اسے قلم تھامنے کا حوصلہ دیا اور تخیل کے گھوڑے پر سوار کر دیا۔

عشروں بعد... جب اس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی اور پوری دنیا میں اس کے نام کا ڈنکان بجا رہا تھا، سیمول نے جون آف آرک سے متعلق، اپنی پہلی محبوبہ سے متعلق ایک کتاب لکھی۔

گو ناقدین نے اس کتاب کو سیمول کی صفحہ اول کی تصانیف میں شمار کرنا گوارا نہیں کیا مگر وہ ہمیشہ اسے اپنی بہترین کاوش گردانتا رہا۔

☆☆☆

1851 کا سال تبدیلیاں لایا۔

اس نے چھاپے خانے سے راہِ قرار اختیار کی اور اپنی بل جرنل نامی ایک چھوٹے سے اخبار سے وابستہ ہو گیا۔ اس اخبار کا مالک کوئی اور نہیں، اس کا بڑا بھائی اریون تھا جو کبھی اس کے کان مڑورتا ہوا اسے گھرایا کرتا تھا۔

جون آف آرک کی کہانی نے اس میں لکھنے کی جوت جگا دی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں خیال قلم بند کیا کرتا۔ دن بھر کے واقعات کو تحریری شکل دے ڈالتا۔ نٹ کھٹ اور چلبلا تو وہ بچپن سے تھا۔ ماں سے بذلہ نجی وراثت میں ملی تھی جسے یار دوستوں کے حلقے نے مہمیز کیا تو روزناموں میں وہ مزاحیہ انداز ہی برتا۔

اس کی ڈائری دیکھ کر ہی بڑے بھائی کو احساس ہوا کہ اس میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اسے اخبار میں ملازمت کی پیش کش کی، جسے سیمول نے بہ خوشی قبول کیا۔ وہ اخبار کے لیے مزاحیہ خاکے لکھا کرتا۔ جب قارئین کی جانب سے مثبت رد عمل آیا، تو اسے بڑا حوصلہ ملا۔ وہ مزید کھل کر لکھنے لگا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں اس نے میسوری چھوڑنے کا

فیصلہ کر لیا۔ وہ نیویارک شہر چلا گیا جہاں اس نے خود کو پرنٹنگ انڈسٹری کو سونپ دیا۔

فلاڈیلفیا اور سینٹ لوئس کے علاقوں میں بھی پرنٹنگ اینجٹ کی حیثیت میں کچھ وقت گزارا۔ اس دوران اپنی ڈائری ہی میں لکھی، مگر وہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ ناشر کا دھندا اسے اتنا راس آیا کہ وہ تنظیم سازی، تنظیم بازی میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ ناشروں کی تازہ تازہ قائم ہونے والی تنظیم International Typographical Union کا وہ رکن بن گیا۔ اس پلیٹ فارم سے خاصا فعال رہا۔ سرکوں پر اس نے ”ہماری ماتیں پوری کرو“ کے نعرے بھی لگائے۔ ایک بار تو حکومت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر لالچی چارج بھی ہوا۔

نعرے لگانے کے لیے اس نے ایک کام اور کیا۔ اس نے کتابوں سے پکی دوستی کر لی۔ فارغ وقت کتب خانوں میں گزارنے لگا جہاں وہ دنیا جہاں کا ادب پڑھتا۔ پہلے تو فقط چھٹی کے روز لائبریری آیا کرتا تھا، مگر پھر چمکا پڑ گیا۔ کام دھندے چھوڑ کر یہاں بیٹھا رہتا۔ دنیا بھر کے ادیبوں کو پڑھتا۔ کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

1853 میں اس کا بڑا بھائی ریاست آیووا کے شہر موسکین اٹھ آیا اور ”موسکین جرنل“ کے نام سے اخبار شروع کیا۔ چھوٹا بھائی رہا تو مصروف شہروں میں جہاں نعرے بازی اور مطالعہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر بڑے بھائی کی ہدایت پر اخبار کے لیے لکھنے لگا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اسی شہر چلا آتا اور یہاں کی آب و ہوا میں گرمیاں گزرتا۔

”موسکین جرنل“ میں سیموئل کے آٹھ افسانے شائع ہوئے۔ یہ تخلیقات قابل ذکر تو نہیں تھیں مگر ان ہی کے طفیل اس سفر کا آغاز کیا جس نے سیموئل کو مارک ٹوئن کے قالب میں ڈھالا اور امریکا کا ہر دل عزیز مصنف بنا دیا۔

☆☆☆

تاجد نظر پانی ہی پانی تھا۔ زمین دکھائی نہیں دیتی۔ یوں لگتا جیسے خشکی کبھی نظر نہیں آئے گی مگر پھر اچانک ہی بندرگاہ کے آثار دکھائی دینے لگتے۔

بحری سفر جیش اور اسرار بھرا ہوتا ہے۔ انسان کو ان جانی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔

سیموئل کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک دخانی کشی پر سوار ہوا، جہاں اس کی ملاقات کپتان ہورس ہنسی سے ہوئی۔ اس شخص نے نو جوان کو اتنا متاثر کیا کہ سیموئل نے دخانی کا

کپتان بننے کی ٹھان لی۔ معاوضہ بھی اس کام کا اچھا ملا کر دیا تھا۔ مگر اس عہدے کا حصول سہل نہیں تھا۔ معلومات شرط تھی۔ نہ صرف دریا کا مزاج سمجھنا پڑتا بلکہ بندرگاہوں کا علم بھی ضروری تھا۔

لگ بھگ دو برس سیموئل نے اس مضمون کے مطالعے میں کھپائے، تب کہیں جا کر 1859 میں لائسنس ملا۔

اس تجربے نے سیموئل کو ”مارک ٹوئن“ کا قلمی نام عطا کیا۔ امریکا کے ان ساحلوں پر کشتیوں میں نصب پانی کی گہرائی ناپنے والے آلے کو مارک ٹوئن ہی کہا جاتا تھا۔

آخر گس باعث اس نے ایک آلے کے نام کو اپنی ادبی شناخت کے طور چنا، اس بابت محقق خاموش ہیں۔

جس زمانے میں وہ ٹریننگ کر رہا تھا، اس نے اپنے چھوٹے بھائی ہنری کو قائل کرنا شروع کر دیا کہ اُسے بھی اس پیشے میں آ جانا چاہیے۔ اچھی آمدنی ہوگی۔ مفت میں سمندروں کی سیر بھی ہو جائے گی۔

ہنری نے بات مان لی۔ بوڑھی ماں سے اجازت لی اور اپنے بھائی کے پاس چلا آیا۔

جس لمحے دونوں بھائی بغل گیر ہوئے، ٹھیک تب... موت کا غفریت مسکرایا۔ ایک سانچہ رونما ہونے کو تھا۔

21 جون 1858 کو ایک کشتی میں ہونے والے دھماکے میں جواں سال ہنری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس واقعے نے سیموئل کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ خود کو اس کا ذمے دار گردانے لگا۔ اور تاسف کا یہ احساس ساری زندگی اس کے ساتھ رہا۔ یہ ایک بھاری بوجھ تھا جو وہ قبر میں ساتھ لے گیا۔

مگر اس واقعے کا ایک عجیب پہلو بھی تھا۔

ہنری کی موت کے بعد سیموئل دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ وہ کمرے کے کونے میں پڑا گرہ کرنا پڑتا۔ پھر ایک دن ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ہنری کی موت سے ٹھیک ایک ماہ قبل اس نے ایک بے رنگ خواب دیکھا تھا جس میں وہ اور ہنری ایک بحری سفر پر نکلتے ہیں اور انہیں طوفان آگھیرتا ہے۔

وہ کئی کئی فٹ بلند لہروں میں گھر جاتے ہیں۔ خواب میں وہ بہ مشکل کشتی کو طوفان سے نکال کر ساحل پر لاتے ہیں اور تب اس پر یہ پریشان کن انکشاف ہوتا ہے کہ ہنری کشتی میں نہیں۔ کسی لہر نے اُسے نگل لیا۔

جب اُسے یہ خواب یاد آیا تو اس پر عجیب کیفیت طاری

ہوئی۔

”قدرت ہمیں پیغامات دیتی ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”بس ہمیں انہیں سمجھنا ہوتا ہے۔“

اسی واقعے نے مابعد الطبیعیات کے موضوع میں اس کی دلچسپی پیدا کی۔ کئی برس بعد، 1882 میں جب Society for Psychical Research کا قیام عمل میں آیا، تو سیموئل اس کے ابتدائی ارکان میں سے تھا۔

مابعد الطبیعیات میں بڑھتی دلچسپی کے طفیل بھائی کی جدائی کا غم کچھ کم ہوا۔ اس نے بہ طور جہاز راں کام جاری رکھا۔ یہاں تک کہ 1861 کا ہیبت ناک سال ظاہر ہوا، امریکا میں خانہ جنگی چھڑ گئی اور دریائے مسیسیپی میں جہازوں کی آمدورفت روک لی پڑی۔

خانہ جنگی کے دوران جب قانون نافذ کرنے والے اداروں میں بھرتیوں کا اعلان ہوا تو سیموئل اور اس کے دوستوں نے بھی درخواست جمع کروائی۔

اس کا انتخاب ہو گیا۔ اب اسے بہادر سپاہی کی طرح محاذ پر لڑنا تھا اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں اسے بڑے بھائی کا تار موصول ہوا، جو ان دنوں ریاست نیوڈا میں وفاقی اہل کار ہو گیا تھا۔

”فورا چلے آؤ۔ تمہارے لیے ایک اچھا موقع ہے۔“ آخر میں لکھا تھا۔ ”میرے تار کو حکم جانو!“

چاروٹا چاروہ وہاں سے چل تو دیا مگر جاتے جاتے اس ڈائری کو ساتھ لے جانا نہیں بھولا جس میں اس نے سمندر گردی کے دنوں کی یادیں قلم بند کی تھیں۔

بعد میں یہ یادیں کتابوں کا حصہ بننے والی تھیں۔

☆☆☆

وہ سیماب صفت آدمی تھا۔ کہیں تک کر بیٹھنا اس کے لیے دشوار تھا اور نیوڈا میں سفر کے خاصے مواقع تھے۔

اس کا بھائی ریاست نیوڈا کے گورنر کا سیکریٹری تھا۔ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے لیے اسے خاصا سفر کرنا پڑتا۔ گورنر دوروں پر نکلتا تو وہ ساتھ ہولیتا۔ کبھی کبھی ریاستی پیغام دور افتادہ علاقوں میں پہنچنے کی ذمے داری اس پر آن پڑتی۔

ایسے ہی ایک سفر کے لیے دونوں بھائی کچھ میسور ہوئے، 3200 کلومیٹر طویل ”گرینٹ پلیئر“ کہلانے والے وسیع و عریض میدان کو عبور کیا۔ براعظم شمالی امریکا کے سب سے بڑے پہاڑی سلسلے کوہ راکی کو پار کرتے ہوئے سالٹ

مارک ٹوئن کے اقوال

ناقدین مارک کا شمار مختلف مزاج تخلیق کاروں میں کرتے ہیں۔ طبیعت کی شوخی اس کی تحریروں میں بھی عیاں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے کئی اقوال بے حد مشہور ہوئے تاہم ان اقوال میں... فقط مزاح نہیں۔ ان میں دانش بھی ہے۔ اور اسی دانش کے سہارے یہ ایک طویل عرصے سے زندہ ہیں۔ یہاں مارک ٹوئن کے چند قول درج کیے جا رہے ہیں۔

☆ جتنا وقت بچ کو تھے باندھنے میں لگتا ہے، اتنی دیر میں جھوٹ آدمی دنیا میں پھیل چکا ہوتا ہے۔

☆ منہ بسورتے ہوئے یہ کہتے پھرنا کہ دنیا آپ کی مقروض ہے، نری حماقت ہے۔ دنیا آپ کی مقروض نہیں ہو سکتی۔ وہ آپ کی آمد سے صدیوں پہلے بھی موجود تھی اور آپ کے جانے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

☆ بہ ظاہر ایسا کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں، جو آج رونما نہیں ہو سکتا۔ آج کا دن انوکھے واقعات کے لیے سازگار ہے۔

☆ لوگ آپ کو بیوقوف اور کند ذہن خیال کرتے ہوں، ایسے میں بجائے اس کے کہ آپ اپنی زبان کھول کر ان کی تصدیق کر دیں، چپ رہنا ہی بھلا۔

☆ اگر آپ سچ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں، تو پھر آپ کو ہر بات یاد رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اذیت تو آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے اٹھانی پڑتی ہے۔

☆ زندگی میں کامیابی کے لیے آپ کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک جہالت، دوسری اس جہالت کو عقل مندی سمجھنے کا اعتماد۔

لیک سٹی پہنچے، جہاں انہوں نے مسیحیوں کے مورمن فرقہ سے ملاقات کی، جو ان دنوں اپنے پڑوسیوں کی شرارتوں سے سخت نالاں تھا۔

سیمونل کے لیے یہ سفر حیرت بھرا رہا اور اس کا اختتام نیوڈاکے شہر ورجینا کی چاندی کی کانوں پر ہوا۔ اب وہ کان کن بننا چاہتا تھا۔

بھائی کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ ایک مقامی کمپنی میں بھرتی ہو گیا اور توجہ کے عین مطابق اس کام میں بری طرح ناکام رہا۔

چاندی کی کانوں میں اس کی ملاقات ایک شخص ڈین ڈی کیولی سے ہوئی، جو ریاست کا جانا مانا لکھاری تھا۔ سیمونل اور اس کے رجحانات یکساں تھے۔ جلد ہی دونوں میں دوستی ہو گئی۔ کان کنی کی نوکری چھوڑنے کے بعد اس نے ڈی کیولی کی ملازمت اختیار کر لی۔

ملازمت کیا تھی، وقت گزاری کا بہانہ تھا۔ صبح وہ جلدی اٹھ کر ڈی کیولی کا دفتر کھولتا۔ کچھ دیر بعد اس کا دوست ہاتھ میں چھڑی لیے وہاں پہنچ جاتا۔ ساتھ ناشتا کرتے۔ پھر الگ الگ میزوں پر بیٹھ کر لکھنے لگتے۔ وہ اخباروں کے لیے مضامین، پرچوں کے لیے کہانیاں اور خاکے وغیرہ لکھتے۔ جب وقت میسر ہوتا تو کتابوں کا مطالعہ ہوتا۔ ان پر اخبار خیال کیا جاتا۔

ڈی کیولی کا دفتر وہ مقام تھا، جہاں سیمونل کلیمین نے جو ماضی میں کئی کہانیاں لکھ چکا تھا، پہلی بار مارک ٹوئن کا قلمی نام اختیار کیا۔

اس نام کے تحت اس نے "Letter From Carson" کے زیر عنوان ایک تحریر لکھی تھی، جس کا پڑھنے والوں نے تو کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر ڈی کیولی نے اسے بہت سراہا اور سفری تجربات قلم بند کرنے کی راہ سمجھائی۔ "تم نے امریکا کی مختلف ریاستوں میں خاصا وقت گزارا ہے، اس تجربے کو لکھ کیوں نہیں ڈالتے؟"

خیال اُسے بھایا۔ اس نے قلم تھام لیا اور اپنی یادداشتوں کو نیم افسانوی اور مزاحیہ پیرائے میں صفحات پر بکھیرنے لگا۔ صحافتی سرگرمیاں بھی ساتھ جاری رہیں۔ کچھ یافتہ ہونے لگی۔

قسمت کی انگلی تھامے 1864 میں وہ کیولی فورنیا چلا گیا۔ وہاں کی ادبی فضا اسے خوب راس آئی۔ بریٹ ہارٹ اور آرٹھوس وارڈ جیسے معروف ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔

وہاں ایک دو شیزہ ایسا کلوہر تھا بھی تھی۔ بڑی ہی شوخ چنچل عورت تھی۔ لکھتی بھی کاٹ دار تھی۔ ماضی کے سیمونل اور حال کے مارک ٹوئن نے اس کے ساتھ عشق لڑایا۔ ایک بار وہ دونوں بنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچنے لگے تھے مگر یہ نیل منڈھے نہیں چڑھی۔

بعد کے برسوں میں جب کبھی وہ ملتے تو اس فیصلے کو یاد کر کے خوب ہنستے۔

☆☆☆

اُس نے چھاپا خانے میں کام کیا، کوئلے کی تاریک کان میں وقت گزارا، سمندری طوفانوں کا مقابلہ کیا، صحافت کی مگر اب سب بدلنے والا تھا۔ سیمونل کلیمین کی ماہیت قلب کا وقت آن پہنچا۔ وہ پرانی کیمپلی اتارنے کو تھا۔

ایسا سے عشق لڑانے کے علاوہ ان دنوں وہ ایک طویل کہانی پر بھی کام کر رہا تھا۔ یہ جم اسمبلی نامی شخص کا قصہ تھا جیسے کارادی ایک موٹا، گنجا اور بوڑھا شخص سیمونل وکیل ہے، جو ایک کان کن ہے۔ یہ کہانی اُس نے آرٹھوس وارڈ کے کہنے پر لکھنا شروع کی جسے شہر کے ایک بڑے پبلشر کی جانب سے نئے لکھاریوں کی کہانیوں کا ایک انتخاب تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

کوشش کے باوجود مارک اسے وقت پر مکمل نہیں کر سکا۔ جب یہ مکمل ہوئی، تو اس کی ندرت اور اسلوب نے آرٹھوس وارڈ کو بہت متاثر کیا۔ اس نے کہانی معروف ہفتہ وار ادبی اخبار The Saturday Press کے ایڈیٹر کو بھیج دی۔ وہ بھی مارک کی تخلیقی اس سے بہت متاثر ہوا۔ 18 نومبر 1865 کو اس کہانی کی اشاعت عمل میں آئی۔

ادبی حلقوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ قارئین نے بھی سراہا۔ مقبولیت کے پیش نظر کئی اخبارات اور رسائل نے اسے دوبارہ شائع کیا۔

بعد میں سیمونل، یعنی مارک ٹوئن نے اس میں مزید تبدیلی کی، جس کے بعد بریٹ ہارٹ نے ماہ دسمبر میں مشہور پرچے The Californian میں اسے شائع کروایا۔ کہانی کا عنوان "The Celebrated Jumping Frog of Calaveras County" رکھا گیا۔

چند ہی روز میں اس کی شہرت پوری ریاست میں پھیل گئی۔ امریکا کے دیگر حصوں میں بھی اس کہانی کی بازگشت

1867 میں اس کی 21 کہانیوں پر مشتمل پہلی کتاب شائع ہوئی۔ یہ کہانی اس مجموعے کے سرکا تاج تھی۔ نام بھی اسی سے لیا گیا۔

ہمارا پیارا نوجوان ادیب اب امریکیوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

اگلے برس ایک شام کے اخبار کے لیے اس نے بہ طور رپورٹر جزیرے ہوائی کا سفر کیا۔ پرمزاح انداز میں بیان کردہ اس کی سفری یادداشتیں اخبار کی زینت بنیں۔ تو مارک کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔

اس کے طرز تحریر کی بڑھتی مقبولیت دیکھتے ہوئے ایک مقامی اخبار کو خیال سوچا کہ کیوں ناں مسٹر مارک ٹوئن کو یورپ اور مشرق وسطیٰ کے دورے پر بھیجا جائے۔ اس سفر نامے کی قسط وار اشاعت سے اخبار کی سرکولیشن میں قوی اضافہ متوقع تھا۔

اخبار کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ اس کے مراسلوں نے عام امریکیوں کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں ان خطوں سے روشناس کروایا، جن کی بابت ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ خود مارک بھی اس تجربے سے بہت لطف اندوز ہوا۔

ان مضامین کو 1869 میں کتابی شکل دی گئی، جو The Innocents Abroad کے نام سے شائع ہوئی۔ کتاب بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ مارک کو ٹھیک ٹھاک ریائی ملی۔

یورپ کے سفر سے جڑا ایک اور قصہ بھی ہے جو اس زمانے میں تو کسی تحریر کا حصہ نہیں بنا مگر آج اس کے بغیر مارک ٹوئن کی کہانی یکسر ادھوری ہے۔

☆☆☆

بھلا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص بحری سفر پر نکلے اور دوران سفر اس کی ملاقات اپنے برادر بستی سے ہو جائے، جب کہ اپنی شریک حیات کو اس نے بھی دیکھا نہ ہو۔ مارک کے ساتھ یہ ہی ہوا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب وہ اسرائیل روانگی کے لیے ریاست اوہائیو کی بندرگاہ پر پہنچا، اس کی ملاقات چارلس لیگلڈون نامی ایک تاجر سے ہوئی۔ وہ ایک ہنس کھ اور زندہ دل آدمی تھا۔ سفر کے دوران ان کی خوب نہی۔ جہاں ایک دوسرے کو لطفے سنائے، وہیں ایک دوسرے کے ماضی اور خاندان کے بارے میں بھی گفتگو رہی۔

اور ایسی ہی ایک نشست میں چارلس نے مارک کو اپنا

خاندانی البم دکھایا، جس میں اس لڑکی کی تصویر بھی تھی جس سے مارک مستقبل میں شادی کرنے والا تھا۔

چارلس کی بہن اولیویا میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ پہلی ہی نظر میں وہ اسے دل دے بیٹھا۔ اسے روز دیکھنے کی آرزو دل میں چمکنے لگی۔ چارلس سے اصرار کرنے لگا کہ وہ اپنے اہل خانہ کی تصاویر البم سے نکال کر دیوار پر چسپاں کر دے۔

"میں نے خود بھی ایسا ہی کیا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا اور کسی منجھے ہوئے اداکار کی طرح نظر آتا تھا۔ "اس طرح وقت اچھا گزرتا ہے۔"

پہلے ان دونوں کی ملاقات عشرے پر یا بیس بار میں ہوا کرتی تھی۔ ظہرانے اور عشاء پر وہ اکٹھے ہوتے مگر اب مارک یوں کرنے لگا کہ ناشتے کے فوراً بعد اس کے کیمین میں چلا جاتا۔

یہ ظاہر وہ چارلس سے باتیں کر رہا ہوتا مگر درحقیقت دیوار پر لگی اولیویا کی تصویر کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہوتا۔

جب اس کا دوست گفتگو کی طویل نشستوں سے اکتانے لگتا تو وہ بلا سبب اس کی تعریف کرنا شروع کر دیتا۔ کبھی بکھار وہ اس سے غیر اہم امور پر مشورے کرنے چلا آتا۔

چارلس سوچتا، اس کے اچھے خاصے دوست کو ہو کیا گیا ہے۔ کیوں بیک بیک باتیں کر رہا ہے۔ اگر کبھی وہ اس بابت سوال کرتا تو مارک ہنس کر ٹال جاتا۔

اس کی بہن سے شادی رچانے کے بعد مارک نے یہ راز کھولا اور تب وہ دونوں جی بھر کے ہنسے۔ مگر اس وقت تو حالات مختلف تھے۔

ایک سہ پہر تو مارک نے یہ کہہ کر چارلس کو گھٹنے میں ڈال دیا کہ "دوست، میں تم سے ملنے کیمین آتا ہوں، لیکن تم ہوا خوری کے لیے نکل جاتے ہو۔ کیوں تم مجھے ایک چابی بناؤ، تاکہ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا سکون سے انتظار کر سکوں۔"

بے چارے تاجر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ امریکا لوٹنے کے بعد بھی مارک کا دل اولیویا میں اٹکا رہا۔ صحافت کا پیشہ اسے چارلس کے شہر نیویارک لے آیا تھا۔ تو جب کبھی موقع ملتا، وہ چارلس کے دفتر کا چکر ضرور لگاتا جہاں ایک دیوار پر اس کے گھر والوں کی تصاویر آویزاں تھیں اور ان ہی میں ایک تصویر اس کی بہن کی تھی۔

دفتر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے دوست سے کہتا، تم سے ملنے کو جی کر رہا تھا، سو چلا آیا، امید ہے مصروف نہیں ہو گے۔ کبھی بہانہ بناتا، یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا ملتا

ایک خاص سبب تھا جس کی وجہ سے چارلس کو اس کی محبت اچھی لگتی۔ مارک کے مانند وہ بھی محیر العقول باتوں اور مافوق الفطرت قوتوں پر تھوڑا بہت یقین رکھتا تھا، اسی وجہ سے دونوں کی گاڑی چھٹی۔

ایک دن باتوں باتوں میں چارلس نے بتایا کہ اس کی بہن ادب کی دلدادہ ہے۔ ڈکنز کی تو دیوانی سمجھیں۔ نیویارک میں اگلے دنوں ڈکنز کے اعزاز میں ایک تقریب ہے، وہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

توقع کے عین مطابق اس دن مارک چارلس سے ملنے نہیں آیا، وہ تو اس تقریب میں تھا۔

ڈکنز کا وہ بھی مداح تھا۔ اسے قریب سے دیکھنا عام دنوں میں ایک بیش قیمت تجربہ ہوتا، مگر اس روز تو اس کی نظریں اگلی صف میں بیٹھی اس خوب روڑی سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں جو بڑے انہماک سے عظیم ڈکنز کے الفاظ سن رہی تھی۔

تقریب کے اختتام پر اس نے اپنی محبوبہ کے قریب آکر ہلو کہا۔

اولیویا نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور ڈکنز کا آٹوگراف لینے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ رش کی وجہ سے کوشش کامیاب نہیں گئی۔ وہ کھڑی منہ بسور رہی تھی کہ عاشق پھر پہنچ گیا۔

”میں سیکول کلیمز ہوں۔ آپ کے بھائی کا دوست۔“

”اوہ مل کر خوشی ہوئی مسٹر کلیمز۔ کیسے مزاج ہیں؟“

لوکی تیز سی اطوار کے مطابق مسکرائی۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ حسین تھی۔

اتفاق سے تقریب کے منتظمین میں ایک افسر مارک کو پہچانتا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈکنز کے پاس لے گیا۔

عاشق کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو متاثر کرنے کا سنہری موقع آ گیا۔ اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔

کچھ دیر بعد آدمی اولیویا کے سامنے کھڑا تھا۔ ”محترمہ، معروف ادیب مارک ٹوئن آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔“

”مارک ٹوئن؟“ لوکی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”کیا وہ بھی یہاں آئے ہوئے ہیں؟“

”جی ہاں، وہ رہے۔“ افسر نے اشارہ کیا۔

دراصل اولیویا نے مارک کا نام سنا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا، اب جو نظر اٹھائی تو یہ وہی صاحب تھے جو کچھ دیر پہلے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”مسٹر مارک اس وقت چارلس ڈکنز کے ساتھ جانے نوش فرما رہے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں جوائن کر سکتی ہیں۔“

”اوہ کیوں نہیں۔“ وہ چکی۔ ”یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔“

تو یوں ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اور اولیویا سمجھ گئی کہ یہ صاحب جو حالیہ دنوں میں The Innocents Abroad نامی ایک مقبول عام کتاب لکھ چکے ہیں، اُن سے محبت کرنے لگے ہیں۔

☆☆☆

وہ ادب سے بگنہ ہو گیا، مطالعے کا شوق جاتا رہا اور صحافت میں دلچسپی ماند پڑ گئی۔

اب مارک کی کلی توجہ کا مرکز اولیویا کے نام لکھے وہ طویل خطوط تھے، جنہیں پوسٹ کرنے سے قبل وہ کئی گھنٹے انہیں تراشنے خراشنے میں صرف کرتا۔ اور پھر جواب کا انتظار کرتا۔ جوابی خطوط کو بار بار پڑھتا۔ انہیں نیچے کے نیچے رکھ کر سوتا۔

اس نئی سرگرمی کے باعث چارلس سے اس کی ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں۔

اس زمانے میں اس نے اپنے ایک محبت نامے میں اولیویا کے حسن کی جی بھر کر تعریف کی، اس کی آنکھوں کو جھیل کی گہرائی سے، ہونٹوں کی لالی کو رس بھرے پھلوں سے اور رنگت کو اچلے دن سے تشبیہ دی۔ آخر میں اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی پیشکش کر دی۔

اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد انتظار کے آسیب نے اسے گھیر لیا۔ وہ ہر وقت بے چین رہتا۔ مضطرب گھر کے صحن میں ٹھلٹھا رہتا۔ نظریں دروازے پر رہتیں، کب ڈاکیا آئے اور اسے اس اذیت سے نجات دلانے۔

اور پھر ڈاکیا آیا۔ مگر اذیت کم کرنے کے بجائے وہ اذیت بڑھا گیا۔

اولیویا نے جواب میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کے طرز تحریر کی تعریف کی۔ اس کے جذبے کو سراہا، مگر شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

تھا تو وہ ایک خط، ایک کاغذ کا ٹکڑا، مگر اس نے مارک پر خنجر سا اثر کیا۔ اسے زخمی کر دیا۔ صدمے سے وہ زمین پر گر پڑا۔ دل ڈوبنے لگا۔ سانس رک سا گیا۔

صدمے کی حالت نے اس پر غنودگی طاری کر دی۔ وہ نیند میں اتر گیا اور نیند کی تاریکی میں امید کا چراغ روشن ہوا۔

خواب کی کی کیفیت میں اس نے دیکھا۔

اولیویا سامنے کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں مارک کا لکھا محبت نامہ ہے اور وہ ایک گیت گنگنا رہی ہے۔ ایسے میں وہ منظر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے سفید رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا ہے اولیویا فوراً خط چھپا لیتی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے قریب آتا ہے۔ لڑکی اٹھلا کر دوڑ پڑتی ہے۔ اب وہ اس کا تعاقب شروع کرتا ہے۔ کمر اٹھتوں سے بھر جاتا ہے۔ بالآخر کھڑکی کے پاس پہنچ کر وہ اسے بانہوں میں بھر لیتا ہے۔

اب اولیویا اس کی بانہوں میں ہے۔ اور ٹھیک تب...

گر بے کاٹھنا بچتا ہے۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ جسم پسینے سے شرابور تھا۔ باہر رات کا آخری پہر تھا۔ صبح ہونے لگی۔

”قدرت کا اشارہ مل چکا ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔

خدا واقعی اس کے ساتھ تھا۔ اگلی صبح چارلس کا ملازم اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔

”آپ کے دوست مسٹر چارلس لینڈون کے والد سیٹھ جاردس لینڈون آپ کو سلام کہتے ہیں۔ شرفائے شہر کے لیے کل شام ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر آپ شرکت کریں گے تو وہ اسے اپنی خوشی نصیبی جانیں گے۔“

وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ”کیسے گا، ان کا بلاوا ناچنے کے لیے حکم ہے۔ میں ضرور حاضر ہوں گا۔“

اگلی شام اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا، اچھی خوشبو چھڑکی اور کبھی میں سوار چارلس کی حویلی کی سمت چل پڑا۔

جاردس لینڈون ایک امیر کبیر شخص تھا۔ وہ شہر کا بڑا تاجر تھا۔ ادیبوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ مارک سے بہت احترام سے پیش آیا۔ مگر مارک کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اگر سیٹھ اسے پوری طرح نظر انداز کر دیتا، تب بھی وہ غم نہیں کرتا۔ وہ تو اپنی محبوبہ کو دیکھنے آیا تھا۔

لڑکی سرخ لباس میں تھی جس پر ہاتھ کا کام تھا۔ اس نے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

وہ ایک کونے میں کھڑا اولیویا کو تنک رہا تھا۔ لڑکی بھی جانتی تھی کہ اس کا محبوب یہاں آیا ہوا ہے۔

مارک جام کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا کہ چارلس اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ”چلو میں تمہیں اپنے اہل خانہ سے ملانا ہوں۔“

اس نے باری باری سب سے مارک کا تعارف کروایا۔ اس کی کہانیوں اور کتابوں کا تو چرچا تھا ہی، پھر اس شام وہ تیار بھی خوب ہو کر آیا تھا، جس کی وجہ سے ہر ملنے والا اس سے متاثر نظر آ رہا تھا، ماسوائے میزبان کی بیٹی یعنی اولیویا لینڈون کے۔

وہ ظالم دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

تقریب کے اختتام کا وقت آن پہنچا۔ اب مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ ڈھیٹ بنا آخر تک ٹھہرا رہا، مگر کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ بادل ناخواستہ اسے اپنے دوست کے اہل خانہ کو الوداع کہنا پڑا۔ چارلس اسے چھوڑنے باہر تنک آیا۔ اس کا باپ بھی دروازے میں کھڑا مارک کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

مارک کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ لوگوں کو حیران کن کہانیاں سنانے والا شخص ایک کہانی بن رہا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ چارلس ساتھ تھا۔ میزبان کی نظریں اس پر لگی تھیں۔ محبوبہ کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور کبھی سامنے تھی۔

جوں ہی اس نے بھی کے پائیدان پر پیر رکھا، اس کا توازن بری طرح بگڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ گھٹنا تھا سے زمین پر آ رہا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ چارلس دوڑا دوڑا آیا۔ فوراً دو ملازموں کو بلوایا گیا۔ وہ اسے گھر کے اندر لے گئے۔ ایک صوفے پر مارک کو لٹا دیا گیا۔ سب اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر نفیشت تھی۔

کبھی بھیج کر لینڈون صاحب نے ڈاکٹر بلوایا۔ ڈاکٹر کو زخم یا سوجن کا نشان تو نظر نہیں آیا، مگر مارک اس بری طرح کراہ رہا تھا کہ اسے یہ کہتے بنی کہ جناب مارک ٹوئن کو سخت آرام کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے آج رات وہ یہیں ٹھہر جائیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ چارلس نے فوراً کہا۔ ”یہ ان کا اپنا گھر ہے۔“

مارک یہی تو چاہتا تھا۔ وہ اس گھر کو اپنا گھر اپنی سرسراں بنانا چاہتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے یہ سارا ڈھونگ رچایا۔ اس ڈرامے کے سہارے وہ ایک دو تھیں، پورے گیارہ دن سینٹ لینڈون کے اس عالی شان مکان میں رہا۔

ڈاکٹر باقاعدگی سے علاج کے لیے آتا رہا۔ چارلس اور اس کے والد ہر شام اس کی خیریت پوچھتے۔ اس کے ساتھ چائے پیتے۔ باقی وقت وہ ہوتا اور اس کی محبوبہ اولیویا ہوتی، جس پر مارک کی بذلہ سخی کا جادو چل گیا تھا۔

وہ ایک دوسرے کو اصلی کے بجائے پیار کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ وہ اسے پیاری لیوی کہہ کر مخاطب کرتا اور جواب میں وہ اسے پیارے پوتھ کہتی۔

اس نے مارک کو یہ بتا کر بھی حیران کر دیا کہ اس نے اپنے عاشق کا ار سال کردہ ایک بھی خط تلف نہیں کیا، بلکہ قریبی پینک کے لا کر میں انہیں رکھوا دیا ہے اور جب بھی دل کہے، انہیں نکال کر پڑھتی ہے۔

ایک بار وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں مارک کو پیارے
یوتھ کہہ گئی تو چارلس چونکا۔ اولیویا نے بھائی کو یہ کہہ کر مطمئن کر
دیا کہ بچپن میں مارک کے والدین اسے اسی نام سے پکارتے
تھے۔ وہ فقط مریض کا دل بہلانے کے لیے ایسا کرتی ہے،
تاکہ وہ مثبت سوچ کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کر سکے۔

دراصل لینکڈون خاندان کی جانب سے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اویویا ہی کو سونپی گئی تھی۔ ون کے اوقات میں وہی گھر میں ہوتی۔ مارک کے لیے بارہ دن بہت تھے۔ اُن کے درمیان وہ محبت پروان چڑھی، جس کے لیے دو پیار کرنے والے انسان سارے جہان سے ٹکڑے کر لے سکتے ہیں۔

جس دن وہ بھلا چنگا ہو کر حویلی سے رخصت ہوا، اولیویا بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔

جب مارک نے اپنے بڑے بھائی کے توسط سے رشتہ بھیجا تو لینکڈن صاحب بڑے شپٹائے۔ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ابھی اولیویا کی عمر ہی کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی یہ رشتہ قبول نہیں کرے گی مگر جب پتا چلا کہ بیٹی تو ہائی بھر چکی ہے، تو وہ الجھن کا شکار ہو گئے۔

بلا شبہ وہ ادیبوں کا احترام کرتے تھے۔ مارک انہیں پسند تھا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ معاشی اور سماجی رتبے میں ان سے کئی گنا کم تھا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا جب کہ وہ خاندانی نواب تھے۔

اس ضمن میں انہوں نے اپنے بیٹے سے مشورہ کیا۔
چارلس سیدھا سادہ آدمی تھا۔ باپ سے اس موضوع پر
بات کرنے سے قبل وہ مارک سے مل چکا تھا۔

مارک نے اسے اپنے پراسرار خواب سنا کر اور چند دیگر علامات کی کہانی گھڑ کر شیشے میں اتار لیا تھا۔ وہ راضی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی منالیا۔ یوں فروری 1870 میں وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ مارک نے نیویارک کے علاقے ہینلیو میں ایک اچھا سا ابارٹمنٹ خرید لیا۔ اگلے تین برس یہ

جوزا وہیں مقیم رہا۔
وہ نیپیلو ایکسپریس نامی اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ اس
اخبار کے کچھ شیئر بھی اس کے پاس تھے۔

زندگی حسین اور پرسکون تھی۔ اب مارک ایک نئے طریقے پر عمل پیرا تھا۔ وہ جو کچھ لکھتا، چاہے کہانی ہو، ناول یا خاکہ... وہ اشاعت سے پہلے اویویا کو ضرور دکھاتا۔

اولیویا ادب کی سنجہ رھتی تھی، مطالعہ اس کا وسیع تھا، اس کے مشورے مارک کے خاصے کام آتے۔

شادی کے ٹھیک ایک برس بعد خدا نے انہیں ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام لینڈون رکھا گیا۔ بڑا ہی خوبصورت بچہ تھا۔ آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا کہ قدرت کے ایک اشارے نے مارک کو چھینوڑ ڈالا۔

یہ ایک خواب تھا جو اس نے موسم گرما کی ایک انتہائی طویل اور گرم رات میں دیکھا۔

خواب کچھ یوں تھا کہ مارک دفتر میں بیٹھا ہے۔ ایسے میں ریڈیو سے ایک خبر نشر ہوئی کہ ایک پراسرار مرض نے شہر پر حملہ کر دیا ہے۔ بیماری کے جراثیموں نے فضا سے آکسیجن کھینچ

لی ہے۔ خبر نشر کرنے والا بتاتا ہے کہ اس بیماری سے بچنے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ خبر سنتے ہی مارک کے ذہن میں اپنے بچے کا خیال آیا۔ وہ گھر کی جانب دوڑ پڑا جوں ہی وہ گھر کے قریب پہنچا، اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے تاریکی میں اترنے لگا۔

جب وہ خواب سے جاگا، جسم پسینے میں تر تھا اور رات کا آخری پہر تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ خواب سچ ہوگا مگر وہ اس بات پر یقین کرنے سے کتر اترتا تھا مگر قدرت اشارہ کر چکی تھی۔

اگلے ہی ہفتے گھر میں کوئی قلعاریاں دو نہیں تبدیل ہوئیں۔ بچے کو کسی بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ شخص سے پتا چلا کہ وہ خناق کے مرض میں مبتلا ہے۔

بچہ بیماری کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ انیس ماہ کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹے بھائی ہنری کی موت کے بعد یہ وہ صدمہ تھا، جس نے بذلہ سچ مارک ٹوئن کو اداسی کی کھائی میں دھکیل دیا، جہاں شاید وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتا، مگر باہمت اولیو یا اس کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کی سمت کھینچ لائی۔

یہ اولیویا ہی تھی جو اسے دوبارہ لکھنے کی میز تک لے گئی اور اسے تخیل کی دنیا سے جوڑ کر غم کم کرنے کا موقع فراہم کیا۔

تصانیف پر ایک نظر

مارک ٹوئن نے اپنی زندگی میں جم کر لکھا۔ اسی کام سے اس نے پیسے کمائے۔ مارک کی کتب پر تفصیلی بات کرنے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ یہاں فقط تذکرے تک محدود رہتے ہیں۔

یوں تو اس نے جو کچھ لکھا کمال کا لکھا مگر ناول
اس کے زیادہ مقبول ہوئے۔ اس نے اپنی زندگی
میں کل تیرہ ناول لکھے۔ آخری ناول اس کی موت
کے چھ برس بعد لکھا گیا۔ ناولوں
Arthur's Court by Mark میں
The Prince And اور Twain
The Pauper بہت مقبول ہوئے۔

کہانیوں کے مجموعے کی تعداد دس ہے، جو یادگار کہانیوں سے پُر ہیں۔ ان کہانیوں کو متعدد بار اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ چند قصوں کو ٹی وی اور سینما کے لیے بھی برتا گیا۔ مضامین اس نے کئی لکھے، جنہیں چھ کتابوں میں سمویا گیا۔ اس کے سفر نامے بھی بہت مقبول ہوئے، جن میں اس کا کاٹ دار قلم اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تقاریر اور خطوط کو بھی کتابی شکل دی گئی۔

معروف ناقد جیمز وکلف کے مطابق مارک ٹوئن کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جن کی بے پناہ شہرت نے ان کے لکھے ہر لفظ کو بیش قیمت بنا دیا۔ ان کی موت کے بعد ناشرین نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ تحریر شائع کیں، جنہیں مصنف نے خود کبھی درخوبر اعتنائیں جانا تھا۔

اپنے عہد کے معروف مصنف ولیم فاکنر
نے اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بابائے
امریکی ادب قرار دیا اور کہا کہ موجودہ امریکی
ادب کی عمارت اس کی فراہم کردہ بنیادوں پر
کھڑی ہے۔

اس سانچے کے بعد اس نے بیفیلو کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر ریاست کنیکٹیکٹ کے شہر ہارٹ فورڈ میں رہائش اختیار کر لی۔ ایک نیا مکان تعمیر کیا۔ خدا نے اُسے تین بیٹیوں سے نوازا اور بیٹیوں کی پرورش اسی مکان میں ہوئی۔

گرمیوں کی چھٹیاں یہ خاندان اولیویا کی بہن سوزین کے فادرم ہاؤس پر گزارتا جو نیو یارک کے مضافات میں واقع تھا۔ سوزین نے اپنے بہنوئی کے لیے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی لائبریری تعمیر کروادی تھی تاکہ وہ گھر کی کھٹ پٹ اور بچوں کے شور و غل سے دور آرام سے بیٹھ کر پڑھنے لکھنے کا کام کر سکے۔

ویسے اس لائبریری کی تعمیر کا ایک سبب اور بھی تھا۔
 ارک پائپ پینے کا عادی تھا اور سوزین نہیں چاہتی تھی کہ وہ دین
 امر اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا منہ سے دھواں چھوڑتا
 ہے۔

مارک 1874 سے 1891 تک ہارٹ فورٹ میں
ہا۔ اس دوران اس نے بیس بار سوزین کے فارم ہاؤس کا رخ
یا اور اسی عرصے میں کئی شاہ کار ناول اور یادگار کہانیوں کو جنم
دیا۔

اس فہرست میں اس کا شہرہ آفاق ناول The Adventures of Tom Sawyer بھی شامل ہے، جس کی اشاعت 1876 میں عمل میں آئی۔

یہ کہانی ایک نوجوان لڑکے کے گرد گھومتی ہے جو
یائے مسیحی کے قریب سینٹ پیٹر برگ نامی شہر میں رہتا
ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ شہر ریاست میسوری کے علاقے

میل سے انتہائی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ ناقدین متفق
 کہ اس ناول میں مارک نے اپنی کہانی بیان کی ہے۔ ان
 کی یاد تازہ کی ہے، جب وہ اسکول سے بھاگ جاتا اور

آج اس ناول کا شمار مارک ٹوئن کی اہم ترین تصانیف ہوتا ہے۔

اس کی مقبولیت کے پیش نظر مارک نے اس کا سیکوئل لکھا۔

1881 میں اس کے ایک اور شاہکار The Prince and the Pauper کی اشاعت عمل آئی جس کا ترجمہ آج دنیا کی ہر بڑی زبان میں دستیاب ہے۔ یہ پندرہویں صدی کے دوہم شکل نو جوانوں کا قصہ ہے جس میں ایک شہزادہ ہے اور دوسرا ایک گداگر۔ حالات کچھ

ایسے ہوتے ہیں کہ وہ دونوں اپنے اپنے مقامات بدل لیتے ہیں، جس کے بعد کہانی میں ایک کے بعد ایک دلچسپ موڑ آتے ہیں اور قاری بہت اہل آخری تک چلا جاتا ہے۔

A Connecticut Yankee in King Arthur's Court بھی اس زمانے کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں موجودہ عہد کا ایک انجینئر حادثاتی طور پر چھٹی صدی میں چلا جاتا ہے، جب سلطنت برطانیہ پر شاہ آرٹھر کی حکومت تھی۔ بس جناب، اس کے بعد ایسی پرجسس کہانی شروع ہوتی ہے کہ پڑھنے والا دیوانہ ہو جائے۔

ان کہانیوں کے طفیل اس نے لاکھوں کمائے۔ وہ امریکا میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا مصنف تھا۔ 80 کی دہائی کے آخر میں مارک نے اس مشغلے سے رجوع کیا، جسے وہ ایک طویل عرصے سے ترک کیے ہوئے تھا۔

وہ سفر پر نکل گیا۔ رخ یورپ کی جانب تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے یورپ کے تاریخی گرجا گھروں میں وقت گزارا۔

پہلی بار اسی خطے کی سمت آتے ہوئے اس کی ملاقات چارلس سے ہوئی تھی جس کی بہن سے اب وہ شادی کر چکا تھا۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد اس نے ایک سفر نامہ لکھا جو A Tramp Abroad کے زیر عنوان شائع ہوا۔ اُسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اس کے ستارے اس وقت اپنے عروج پر تھے۔

☆☆☆

وہ ایک جادوگر تھا۔ برقیاتی شرارے اس کی انگلیوں پر ناپتے۔ وہ اس کا حکم پاتے ہی جست لگاتے۔ ایک سے دوسرے مقام پر۔ دوسرے سے تیسرے مقام پر۔ دیکھنے والا ششدر رہ جاتا۔

یہ اپنے عہد کے ممتاز برقیاتی انجینئر نیکولا ٹیکسلا کا ذکر ہے جس کی برقیاتی میدان میں تحقیق نے انیسویں اور بیسویں صدی پر ان مٹ نفوش چھوڑے۔

نیکولا سائنس دان تو تھا، مگر وہ عام سائنس دانوں سے یکسر مختلف تھا۔ مزاج میں خشکی نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور زعدہ دلی تھی۔ وہ ایک سچا فنکار تھا۔ مارک ٹوئن کی اس سے گہری دوستی تھی۔

آپ ادیبوں اور سائنس دانوں کی دوستیوں کے تذکرے کھنگال ڈالیں مگر آپ کو وہ آہنگی، وہ پھنگی کہیں نہیں

ملے گی جو ان دونوں کی دوستی میں نظر آتی ہے اور اس کا واضح سبب تھا۔

نیکولا ایک ایسا سائنس دان تھا جس میں ایک کلاکار کی روح تھی اور مارک ایک ایسا ادیب تھا جو سائنسی طرز فکر پر کامل یقین رکھتا تھا۔

مارک اس کی لیبارٹری میں گھنٹوں گزارتا۔ اس نے چھ ایجادات کا بھی دعویٰ کیا جن میں سے ایک آدھ صداقت پر بھی مبنی تھا۔ دونوں کی دوستی مرتے دم تک رہی۔ مارک نے اپنے دوست کے جھلک اور دقیق خیالات سے کشید کردہ نظریات کو فکشن تخلیق کرنے کے لیے بھی بڑی خوبی سے برتا۔

ناقدین متفق ہیں کہ مارک کے قصے کہانیوں کے پیچھے نیکولا جیسے عظیم سائنس دان کی فکر ہونے کے باعث انہیں بہ آسانی سائنسی ادب کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔

ناولوں میں مارک کے پیش کردہ کئی نظریات اور طریقے بعد میں سائنسی کسوٹی پر پورے اترے۔ سبب یہ ہے کہ اس نے ان کا نہ صرف مطالعہ کیا، بلکہ تجربہ گاہوں میں انہیں برتا بھی۔

نیکولا عظیم سائنس دان تھا۔ اس نے بہت دولت کمائی مگر وہ اسے صحیح ڈھنگ سے سنبھال نہیں سکا۔ عمر کے آخری حصے میں دیوالیا ہو گیا۔ کنگلا ہو گیا، ٹھیک اپنے دوست مارک کی طرح۔

☆☆☆

جی ہاں، یہ سچ ہے۔ مارک پر ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب وہ یکسر دیوالیا ہو گیا تھا۔

یہ قصہ دلچسپ ہے۔ مارک اپنے عہد کا کامیاب ترین لکھاری تھا۔ وہ دوسرے مصنفین سے زیادہ معاوضہ وصول کرتا۔ انیسویں صدی میں جتنے پیسے اس نے اپنی تحریروں سے بنائے کوئی اور ادیب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور وہ اس کا حق دار تھا۔ بلاشبہ وہ باکمال ادیب تھا مگر جتنا اچھا وہ ادیب تھا، اتنا اچھا تا جرنیل تھا۔

اس نے کئی طرح کے کاروبار میں پیسا لگایا اور ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ عام طور سے جدید ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کرتا۔ کوئی نئی مشین آتی تو فوراً اس کے شیر خریدا لیتا۔

اب نئی ٹیکنالوجی کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مارکیٹ میں آنے سے پہلے چھوٹے پیمانے پر برقی جاتی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کا اصل فیصلہ تو بعد میں صارفین کرتے ہیں۔

جن منصوبوں میں وہ خوشی خوشی سرمایہ کاری کرتا بعد میں عوام انہیں رو کر دیتے۔

یوں تو ہر کاروبار میں گھانا ہوا، مگر جیمز میکنی کی ڈیزائن کردہ مشین نے تو اس کا بھٹائی بٹھادیا۔

واقعہ یوں ہے کہ اس زمانے میں طباعت کے میدان میں طبع ساز ہاتھ سے کام کیا کرتے تھے۔ لکڑی کے خانوں پر حروف کندہ ہوتے جنہیں سیاہی میں ڈوبا کر کاغذ پر منتقل کیا جاتا۔

جیمز میکنی کا اپنی مشین سے متعلق دعویٰ تھا کہ اب طباعت کرنے والوں کو لکڑی کے خانے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں، بس مشین کے سامنے بیٹھ جائیں اور ذہن میں آنے والے حروف کی ”کی“ دہاتے جائیں، مشین از خود انہیں کاغذ پر منتقل کر دے گی۔

مشین نے آنے کے ساتھ ہی امریکا میں تہلکا مچا دیا۔ جس نے اسے دیکھا، دیکھا رہ گیا۔ یہ بہت ہی جاذب نظر تھی۔ پھر اس کی نمائش بھی بڑے اچھے ڈھب پر کی گئی۔ مارک اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مشین کے دھندے میں سرمایہ کاری کا فیصلہ کر لیا اور تین لاکھ ڈالر اس میں لگا دیے۔ یہ رقم آج کے آٹھ کروڑ ڈالر کے برابر ہے۔

اس نے نہ صرف اپنی تمام جمع پونجی لگا دی بلکہ اپنی بیوی کی ترکے میں ملنے والی زمین بھی بیچ ڈالی۔ اسے یقین تھا کہ اس ٹائپ رائٹنگ مشین کو ہاتھ لیا جائے گا مگر جوں ہی وہ مارکیٹ میں پہنچی، شکایات کے انبار لگ گئے۔ ایک کے بعد ایک مسئلہ پیدا ہونے لگا۔ کمپنی کے انجینئروں کو قسم دور کرنے میں خاصا وقت لگا اور جتنی دیر میں وہ ایسا کرتے ایک اور کمپنی اس سے بہتر اور نسبتاً سستی مشین مارکیٹ میں لے آئی۔

مارک کی ساری رقم ڈوب گئی۔ اگلے چند روز وہ گھر ہی سے نہیں نکلا۔ شراب سے دل بہلاتا رہا۔ پھر یار دوست ملنے آئے۔ اس کی دل جوئی کی حوصلہ دیا۔ چند جام خود بھی چڑھا گئے۔ تھوڑا بہک گئے۔

اسی بھکی ہوئی شام مارک نے سوچا کہ ناشر اس کی کتابیں فروخت کر کے لاکھوں کماتے ہیں، کیوں نہ وہ بھی ایک پبلشنگ ہاؤس لگائے۔ نئے میں دھت دوستوں نے تائید کی۔ اگلے ہفتے اس کی بنیاد رکھ دی گئی۔

ابتدائی تجربہ شان دار رہا۔ اس ادارے سے شائع ہونے والی پہلی کتاب سابق امریکی صدر اولیسن ایلس گرانٹ کی یادداشتوں پر مشتمل تھی۔ کتاب کا بہت چرچا ہوا۔

ماہنامہ سرگزشت

خوب کی۔ خاصا نفع ہوا۔ اب مارک نے پوپ لیون دہم کی آپ بیتی شائع کی۔ پوپ ان دنوں موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ ہر کافی ہاؤس میں ان کے متعلق گفتگو رہتی۔ مارک کو یقین تھا کہ اس کتاب کو بھی بہت پسند کیا جائے گا، مگر بدبختی کتاب کے نصیب میں تھی۔ اس کی فقط دو سو کاپیاں فروخت ہوئیں اور 1893 کے موسم گرما کی یہ بھیانک ناکامی مارک کے پبلشنگ ہاؤس کو لے ڈوبی۔

حالات بے حد بگڑ گئے۔ مارک کنگلا ہو گیا۔ مکان اور بچے کچھے زیورات گروہی رکھنے پڑے۔ مسئلہ تب بھی حل نہیں ہوا۔ وہ ہنوز کئی اداروں اور افراد کا مقروض تھا جو احتراماً دھمکیاں تو نہیں دیتے، مگر ہر تھوڑے عرصے بعد اپنے ہر کارے سے کھلو ابھیجے کہ حضور ہماری رقم کب لوٹا رہے ہیں؟

ان دنوں وہ خاصا پریشان رہا۔ کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ من و عن و ہی کیفیت تھی، جس میں انسان خود کشی کو اکلوتا انتخاب تصور کرنے لگتا ہے۔ مارک بھی اس بابت سوچنے لگا تھا مگر پھر اس نے ایک خواب دیکھا۔

وہ ایک تاریک اور گرم رات تھی جب بے آرام غنودگی اسے کمرے سے بھری وادی میں لے گئی۔ مارک نے خود کو تاریکی میں پھنسا پایا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی راستہ نہیں تھا، بس ایک آواز تھی۔ ایک مدھر آواز۔ کہیں پاس ہی دریا بہہ رہا تھا اور اس کی روانی امید افزا موسیقیت کو جنم دے رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا۔ پھر اسے ایک سارے نظر آیا، جس کا چہرہ دھند میں گم تھا۔ ”کیا تم دریا کا راستہ تلاش کر رہے ہو؟“ سائے نے سوال کیا۔

مارک کا جواب اثبات میں یا کر اس نے اشارہ کیا۔ مارک اس کے پیچھے ہولیا۔ کچھ دور جا کر دھند چھٹنے لگی۔ منظر صاف ہو گیا۔ اب وہ دریا کے سامنے کھڑا تھا جس کی روانی میں طلسم تھا۔

”بہت بہت شکر یہ میرے دوست۔“ مارک اپنے محسن کی سمت مڑا مگر... وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور پسینے میں شرابور مارک جا بجا تھا کہ قدرت اشارہ کر چکی ہے۔

اگلے ہی دن ایک تقریب میں اس کی ملاقات ہنری راجرنامی آدمی سے ہوئی جو ایک سرمایہ کار تھا۔

اس سے مل کر مارک کو شدید جھجکا لگا۔ اس کی شکل اس کے مرحوم بھائی ہنری سے بہت ملتی تھی جو کشتی کے حادثے میں

سمو یا جو حسب روایت بیٹ سیر ثابت ہوا۔ جادو تھا اس کے قلم میں...

☆☆☆

معاشی مسائل کے گرداب سے تو وہ نکل آیا تھا مگر مصائب ہنوز تعاقب میں تھے۔

بیٹے اور بھیلی بیٹی کو تو وہ پہلے ہی کھو چکا تھا، 1896 میں اسے اپنی بڑی بیٹی سوسی کی موت کا کرب بھی سہنا پڑا جو چوبیس برس کی عمر میں ایک موذی مرض کا شکار ہو کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اپنے باپ کی کئی یادگار کہانیوں کا موضوع بننے والی اس پیاری لڑکی کے جانے کے بعد گھر میں یکدم سناٹا چھا گیا۔ درود یوار سے وحشت ٹپکنے لگی۔

مارک بیوی اور چھوٹی بیٹی کو لے کر اپنی سالی سوزین کے فارم ہاؤس چلا گیا اور اس بار کافی عرصے وہاں رہا۔ اس کی بگڑی حالت کے پیش نظر سوزین نے اسے گھر میں پائپ پنے کی اجازت دے دی تھی مگر مارک نے پرانے عہد کی پاس داری کی۔ وہ اسٹڈی ہی میں تمباکو نوشی کیا کرتا۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ انسان زندگی میں لوٹ آتا ہے۔ مارک بھی انسان تھا، زندگی سے پیار کرنے والا ایک بذلہ سنج انسان۔ دھیرے دھیرے حالات ڈگر پر آنے لگے۔ شاید وہ سوسی کا غم بھول جاتا ہے مگر 1904 میں جو واقعہ رونما ہوا، اس نے مارک کو دہلا ڈالا۔

اولیویا اس کی پیاری بیوی، اس کی محبوبہ، وہ لڑکی جس کی تصویر دیکھ کر وہ عشق میں مبتلا ہو گیا تھا، اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ کتنا بڑا صدمہ تھا۔ کیسا سانحہ تھا۔ اس نے گریہ کیا۔ سر پر خاک ڈالی اور ماتمی لباس پہن لیا۔

وہ ٹوٹ گیا تھا۔ جھریاں گہری ہو گئیں۔ وہ بہت بوڑھا اور بیمار معلوم ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ یہ کرب سہہ نہیں پائے گا۔ جلد دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

ابتدا میں تو مارک کو بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ زندگی سے جی اچاٹ ہو گیا تھا مگر چھوٹی بیٹی اسے زندگی میں واپس لے آئی۔ ”ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”قدرت آپ کو زندہ رکھتی ہے۔ حریف تمہارے لیے!“

بیوی کی جدائی کے بعد اس میں ایک عجیب تبدیلی آئی۔ سفید رنگ اسے اپنی جانب کھینچنے لگا۔ اتنی شدت سے کہ اس کا طرز زندگی ہی بدل گیا۔

درزی کو نئے آرڈرز دیے گئے۔ درجنوں سفید سوت

اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ شخص مارک ٹوئن کے لکھے ایک ایک لفظ کا عاشق تھا اور مشکل کی اس گھڑی میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تقاضا فقط یہ تھا کہ مارک اسے دوستی کا شرف بخشے۔

اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں۔ مارک بہ خوشی مان گیا اور زندگی کے آخر تک اس سے ایک بھائی کی طرح پیش آتا رہا۔

ہنری ایک ذہین کاروباری آدمی تھا۔ ”سب سے پہلے تو آپ خود کو دیوالیہ قرار دیں ورنہ جنہوں نے قرض دیا ہے وہ ناگ میں دم کیے رکھیں گے۔“ ہنری نے اسے مشورہ دیا۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اس نے یوں کیا کہ مارک کی تحریروں کے جملہ حقوق، جو مصنف کے نام محفوظ ہوتے تھے، وہ اس کی بیوی کے نام منتقل کر والیے۔

”مقرض آپ ہیں۔ قانون آپ کو گرفت میں لے کر رائٹنگ میں ملے والی رقم ضبط کر سکتا ہے۔“ ہنری نے ایک فائل کے ورق پلٹتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ رقم اچھی خاصی ہے۔ حقوق آپ کی بیگم کے نام ہوں گے تو وہ رائٹنگ پر اپنا حق نہیں جما سکیں۔“

اب اس نے مارک کے لیکچرز کا پروگرام ترتیب دیا جس سے اچھی آمدنی کی توقع تھی۔

یہ جولائی 1895 کا ذکر ہے، جب وہ امریکا سے روانہ ہونے والے بحری جہاز میں سوار ہوا۔ اس نے آسٹریلیا، سری لنکا، انڈیا، جنوبی افریقا میں وقت گزارا۔ اس سفر کے دوران ایک موقع پر وہ شدید علیل ہو گیا۔ مہلکین نے مشورہ دیا کہ وہ واپس لوٹ جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔

”یہ آگے کتنا پیچھے کھائی والا معاملہ ہے ڈاکٹر۔“ وہ مسکرایا۔ ”اور کتنا کھائی سے بہتر ہے۔“

ہندوستان میں وہ تین ماہ رہا۔ روحانیت میں تو اسے پہلے سے دلچسپی تھی۔ اس پر اسرار زمین پر پہنچنے ہی اس نے ہندوستانی تصوف کا مطالعہ شروع کیا۔ کئی آشرموں کا دورہ کیا۔ مسلم صوفیوں سے بھی اس کی ملاقات رہی۔

پھر وہ برطانیہ گیا جہاں اس کے مداح بندرگاہ پر امنڈ آئے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

جب وہ امریکا لوٹا، اس کے پاس خاصی رقم تھی۔ وہ تمام قرض اتار سکتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

ایک برس پر محیط اس تجربے کو اس نے Following the Equator نامی سفر نامے میں

سے۔ سفید گاؤں تیار کیے گئے۔ سفید قمیص، سفید پتلون، سفید ٹائی، اب تو اس کی الماری میں یہی رنگ دکھائی دیتا۔ شب خوابی کا لباس تک سفید تھا۔

ایک بار کسی نے اس بابت پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ دوبارہ سوال ہوا، تب بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سفید رنگ کا اس کی مشرقی تصوف میں دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ واضح رہے کہ مشرق میں مردے کو سفید رنگ کا کفن پہنایا جاتا ہے۔

آج بھی مارک کی زندگی پر تحقیق کرنے والے ریسرچر اس بابت غور کر رہے ہیں کہ آخر اس نے اس شدت سے سفید رنگ کیوں برتنا شروع کیا۔

خیر، بیوی کے انتقال کے بعد وہ زندگی میں لوٹ تو آیا مگر اب مارک میں پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے لطیفے، اس کی شوخیاں، اس کی شرارتیں سب دم توڑ گئیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا اس نے کم کر دیا۔ بس ہنری راجر اور نیکولا سے ملاقات ہوتی۔ بیٹھے کی شام وہ تینوں مل بیٹھتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے۔ ہلکی شراب سے بھی دل بہلایا جاتا۔

کچھ برس ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا کہ اچانک ایک روز یہ بھگون ٹوٹ گئی۔ دوستوں میں سب سے کم عمر ہنری راجر 20 مئی 1909 کو اچانک انتقال کر گیا۔

مارک کے لیے یہ واقعہ شدید تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنے سائنس دان دوست کو یہ کہلویا کہ وہ آئندہ اس سے ملنے نہیں آئے۔ اس نے لکھا:

”پیارے دوست، ناراض نہیں ہوتا، نہ ہی مجھے غلط سمجھنا مگر مجھے لگتا ہے کہ اس گھر پر نحوست کا سایہ ہے۔ ایک کے بعد ایک میرے عزیز زندگی سے محروم ہو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس کا شکار بنو۔“

جواب میں نیکولا نے لکھا۔ ”عزیز مارک، تمہیں اسی عمر میں پہنچ کر تو ہم پرست بننا تھا۔“

مارک نے ان الفاظ میں اسے جواب دیا۔ ”یہ تو ہم پرستی نہیں، مابعد الطبیعیات ہے۔ وہ سائنس جس پر تمہاری برادری یقین نہیں رکھتی۔ میں نحوست کو محسوس کر سکتا ہوں اور اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ جلد ایک اور موت واقع ہونے والی ہے۔ اور غالب امکان ہے کہ مرنے والا کوئی اور نہیں، تمہارا بوڑھا دوست ہی ہو۔ تو بیٹھی الوداع!“

مارک کا اندازہ غلط نکلا۔ موت اس کے نہیں، کسی اور کی تلاش میں تھی۔

☆☆☆

وہ دسمبر کی خاموش رات تھی۔ برف گر رہی تھی۔ کل کرسمس تھی۔ پورا شہر برقی قہقہوں سے سجا تھا مگر گھر خوشیوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ تنہا کف کا بتادلہ ہو رہا تھا۔ چہرے مسرت سے دکھ رہے تھے۔

مارک اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا۔ نیکولا کی جانب سے مبارک باد کا پیغام پہنچ چکا تھا۔ ساتھ میں ایک ایک بھی تھا۔ مرحوم ہنری کی بیوہ نے بھی مٹھائی بھجوائی تھی۔ وہ خود کو ہشاش بشاش اور تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک کھٹکا ہوا۔ اس نے سر اٹھایا۔ دروازے میں اس کی بیٹی جین کھڑی تھی۔ مارک کے خاندان کی آخری نشانی۔ اس کی نسل کی بقا کی امید۔

بوڑھے نے جین کی سمت دیکھا۔ وہ بالکل اپنی ماں جیسی تھی اور اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے محبت تھی۔

”میری کرسمس پاپا۔“ لڑکی نے بازو باپ کی گردن کے گرد حائل کر دیے۔

”کرسمس مبارک بیٹا۔“ اس نے جین کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”آج کی رات جادو بھری ہے۔“ جین کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ماما اور ہمیں ہمارے ساتھ ہیں۔“

بوڑھا چونکا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی۔ سانس لے رہی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے پرعزم تھی۔

”میں ذرا شاور لے لوں۔“ لڑکی نے کہا۔ اس نے بوڑھے کے گال پر بوسہ دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ چلی گئی۔ بوڑھا لائبریری میں رہ گیا مگر وہ تنہا نہیں تھا، ایک انجمن اس کی ساتھی تھی جو اسے ستارہ ہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ زینہ عبور کیا۔ لڑکی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ کھل گیا۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ ”جین۔“ اس نے اپنی بیٹی کو پکارا۔ جواب نہ دار۔

”جین!“ وہ دروازہ پینے لگا۔ اندر پانی گر رہا تھا۔ خاموشی تھی۔ اور بوڑھے کا خوف بڑھ رہا تھا۔

گو وہ تا تو اس تھا، کمزور تھا مگر خوف نے قوت عطا کی۔ اس نے دروازے کو کھڑکی ماری۔ وہ کھل گیا۔ اندر شب لبالب بھرا ہوا تھا اور اس میں جین کی لاش تیر رہی تھی۔

☆☆☆

ترکی نمی دہم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشوق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں وہی کچھ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔



ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی گیارہویں کڑی

از میر پہلے اس کا نام سمونا تھا جس پر یونان نے قبضہ کر لیا تھا ایک صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے لیکن ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سنگ مرمر کے تباہ شدہ شہر اپنے سس اور یہاں کی ایک ایسی یادگار ہے جسے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ چھ ہزار قبل مسیح میں یہ شہر بہت خوشحال اور بارون تھا۔ پرانی یادگاروں کی کھوج لگانے والوں نے کھدائی اور تحقیق کے بعد بتا لگایا کہ اس جگہ دیگر معدنیات بھی زمین میں دفن ہیں جنہیں برآمد کرنے کے لیے باقاعدہ

وہ چونکا۔ اس نے اپنے بائیں جانب دیکھا اور تب ایک دھماکا ہوا۔ پورا آسمان روشن ہو گیا اور اس روشنی میں اس نے اپنے مرحوم ماں باپ کا چہرہ دیکھا۔ بہن بھائی اور دوست وہاں تھے۔ اس کا بیٹا اور تینوں مرحوم بیٹیاں تھیں۔ جین تو ابھی تک بھگی ہوئی تھی جیسے ابھی تب سے نکلی ہو۔ اور پھر... اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ چہرے پر اس کے مسکراہٹ تھی۔ روشن مسکراہٹ۔

اچانک ہر چہرہ، ہر منظر غائب ہو گیا۔ ایک جلتا ہوا ستارہ آسمان میں داخل ہوا اور مارک کی سمت بڑھنے لگا۔ مارک اپنے سے قاصر تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ آگ کا گولا اس کی سمت بڑھ رہا تھا اور پھر... ایک سرگوشی ہوئی۔ ”میں آ گیا۔“

بوڑھا اپنے بستر میں تھا۔ جسم پسینے سے تر ہوا۔ رات کا آخری پہر۔ یہ خواب نہیں تھا۔ مستقبل کی جھلک تھی۔ اب کوئی الجھن نہیں رہی تھی۔ وہ سب جان گیا۔ اگلی صبح کے اخبارات نے تصدیق کر دی۔ ہیلی ٹائی ستارہ اگلے برس زمین کے پاس سے گزرنے والا تھا۔

”وہی ستارہ جو میری پیدائش کے وقت ظاہر ہوا تھا۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”اب وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔“ اسی شام اس نے میڈیا کو ایک بیان دیا۔

”میں ہیلی ستارہ کے ساتھ 1835 میں پیدا ہوا۔ وہ پھر ظاہر ہونے والا ہے اور اس بار میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو مجھے واقعی حیرت ہوگی۔“

مارک کو حیرت کا تجربہ نہیں کرنا پڑا، البتہ پوری دنیا اس وقت حیران رہ گئی جب اس کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ 21 اپریل 1910 کو جب ہیلی زمین کے مدار کے قریب پہنچا مارک نوٹن جہانی فانی سے کوچ کر گیا۔

جب اس کی موت کی اطلاع صدر امریکا ولیم ہارورڈ تک پہنچی اس نے کہا۔ ”اس نے ہمیں خوشی فراہم کی۔ کروڑوں انسان اس کے ممنون ہیں۔ وہ امریکی ادب کا سب سے بڑا محسن ہے اور ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔“

نیویارک کے پریسیڈین چرچ میں اس کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ مارک کو اس کی بیوی کے آبائی قبرستان میں اولیویا کے پہلو میں دفنایا گیا۔

جس ستارے کے ساتھ وہ اس دنیا میں آیا تھا، اسی کی دم تھامے لوٹ گیا۔ مگر پیچھے اپنی روشنی چھوڑ گیا۔

مارک نوٹن کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ اس نے چار بچوں کی موت کا کرب برداشت کیا۔ بیوی سے جدائی کا صدمہ سہا۔ اب کچھ نہیں بچا تھا مگر وہ ہنوز زندہ تھا۔ اور اب اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

مارک کو اطلاع ملی کہ اس کی دوست اینا کلو برتھ سان فرانسسکو کے زلزلے میں اپنا سب کچھ کھو چکی ہے، تو اس نے اپنی چند یادگار تصاویر پر دستخط کر کے انہیں نیلامی کے پیش کر دیا اور رقم این کے حوالے کر دی۔ شدید بیماری کے باوجود ایک خصوصی فوٹو شوٹ کروایا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی زلزلہ زدگان کے لیے وقف کر دی۔

اس نے ”آئینل فٹش اینڈ ایکوریم“ کے نام سے غریب لڑکیوں کے لیے ایک کلب قائم کیا اور اپنی کل توانائیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔ وہ ان بچیوں کو اپنی پوتیاں کہا کرتا۔ ان کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس نے دیگر سماجی تنظیموں کی بھی معاونت کی۔ اس ضمن میں لیکچر بھی دیے۔

اسی زمانے میں اسے آکسفورڈ یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ ڈگری وصول کرتے ہوئے اس نے کہا، ”چلو اچھا ہوا۔ یہ واقعہ میری زندگی میں رونما ہو گیا۔ اگر آکسفورڈ والے سستی کا مظاہرہ کرتے تو شاید میرے بغیر ہی اس تقریب کا انعقاد کیا جاتا۔“

تقریب میں موجود بیش تر افراد نے اس جملے کو مارک کی بذلہ سنجی پر محمول کیا۔ کئی نے قہقہے لگائے مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ مارک سنجیدہ ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے اس کے کانوں میں پراسرار سرگوشیاں ہورہی تھیں۔ مگر میں سائے حرکت کر رہے تھے۔ کوئی اپنی آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔ اسے اپنی جانب متوجہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ موت ہے۔ ماضی میں وہ بھی تو خودی اور کبھی خواب کی میں اس کی علامات دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے بہ خوبی پہچانتا تھا، مگر مسئلہ کچھ اور تھا۔ یہ موت کا کوئی عام تجربہ نہیں تھا۔ پیغام میں کچھ خاص تھا۔ کچھ انوکھا جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔

اور پھر ایک خواب نے یہ سچی سلجھادی۔ رات کی تاریکی میں وہ گھاس کے میدان میں کھڑا تھا۔ اوپر ستاروں سے بھرا آسمان۔ اچانک مارک ہوا میں اڑنے لگا۔ وہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ آسمان میں داخل ہو گیا اور تب اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

مہم چلائی ضروری ہے۔ حضرت مریم نے جہاں (بقول مقامی لوگوں کے) اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے وہ بوسیدہ گھر بھی ہم نے دیکھ لیا۔ ترک حکومت نے اس کی دیکھ بھال کا بطور خاص خیال رکھا ہے کیونکہ دنیا کے ہر کونے سے کرجن سیاح ترکی آکر اس گھر کی زیارت ضرور کرتے ہیں۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر پرانے محلات کے کھنڈر بھی دیکھے۔ ترکی میں ہم نے یہ دیکھا کہ انہوں نے قدیم یادگاروں کو ہر ممکن طریقے سے سنبھال کر رکھا ہے۔ استنبول میں پرانے قلعے کی دیواروں اور پرانے دروازوں کو گرانے کے بجائے انہیں گزرگاہیں بنالیا ہے۔ پرانی دیواروں کو گرانے کے بجائے جہاں تک ممکن ہے انہیں محفوظ رکھا گیا ہے۔ شہر کے بہترین ساحلی علاقے کی کشادہ سڑک پر جب سیاح ان پرانے دروازوں سے گزرتا ہے اور اس کی دور تک پھیلی ہوئی پرانی دیواروں کو دیکھتا ہے تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ ترکوں کو اپنی قدیم ترین عمارتوں سے بھی بہت محبت ہے۔ مرزا مشرف نے ایک نقشہ دیکھ کر ہمیں بتایا کہ اپنے سس شہر کا نام سکندر اعظم کے ایک جنرل کے نام پر رکھا گیا۔ اس کی بنیاد تین سو سال قبل مسیح میں رکھی گئی تھی۔

بٹ صاحب جو نہ میوزیم دیکھنے کے شوقین اور نہ ہی انہیں آثار قدیمہ سے کوئی دلچسپی ہے، ہم لوگوں کی باتیں سن کر تنگ آگئے تھے۔

”بھائی، آپ لوگ کس جگہ آگئے ہیں جہاں ہر چیز قبل مسیح کی یا کئی سو سال پرانی ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”اپنی تاریخ اور روایات کے بارے میں ہر قوم کے لیے جاننا ضروری ہے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”ہم تو لاہور کی تاریخ اور پرانی عمارتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لاہور کے قلعے کی تفصیل کا پتا نہیں ہے۔ شاہی قلعہ البتہ موجود ہے لیکن وہاں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر مغل بادشاہ کسی وقت دوبارہ لاہور آجائیں (روحانی طور پر) تو اول تو وہ اپنی تعمیر کردہ عایشان اور خوبصورت عمارتوں کو پہچانیں گے نہیں۔ پھر ان کی خستہ حالی دیکھ کر وہ حیران رہ جائیں گے۔ شاہی قلعے کی بیرونی دیواریں کھنڈر بن چکی ہیں۔ دیوان خاص اور شیش محل کا حصہ محفوظ ہے لیکن وہ بھی اچھی حالت میں نہیں ہے۔ وہ ڈھلوان راستہ جہاں سے کسی زمانے میں ہاتھی گزر کر دیوان خاص کو جایا کرتے تھے اب وہ کسی پہاڑی علاقے کی سڑک کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ مرمت کا کام

اول تو ہے نہیں اور اگر ہے تو برائے نام۔ ذرا سوچئے کہ اتنے بڑے شاہی قلعہ کی مرمت کے لیے چار چھ کارنگر مصروف نظر آتے ہیں۔ ان عمارتوں کو تعمیر کرنے میں ہزاروں مزدوروں اور کارنگروں نے حصہ لیا تھا اور شب و روز کام کیا تھا۔ اس قلعے کی مرمت کے لیے چار پانچ مزدور کیا کام آئیں گے۔ شالیمار باغ کو دیکھ کر رونا آ جاتا ہے۔“

”کیا آپ شالیمار کو دیکھ کر روئے تھے؟“ خان صاحب نے پوچھا۔

”آئسو تو نہیں لکے لیکن دل بہت بھاری ہو گیا تھا۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ لاہور شہر کے قلعے کے کتنے دروازے تھے؟“

خان صاحب نے انگلیوں پر حساب لگانا شروع کر دیا۔ ”ایک بھائی دروازہ، دوسرا شاہ عالمی دروازہ (اب یہ دروازہ نظر نہیں آتا) اکبری دروازہ۔“ اس کے بعد خان صاحب کی لگتی ختم ہو گئی۔

ہم نے کہا۔ ”لاہور کے بارہ دروازے تھے۔ اب چند دروازوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ دس دروازوں کی جگہ دکانیں بن چکی ہیں۔ دیواریں کھنڈر بن چکی ہیں جن پر دکاندار اپنا سامان نمائش کے لیے لٹکاتے ہیں۔“

”دیکھو، دوسرے ملک میں آکر اپنے ملک کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔“

”بھئی ہم تو آپس میں باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں۔“

ترکی کے بارے میں تو آپ جان گئے ہیں کہ یہ ملک جس کا دارالحکومت ہزاروں سال پہلے اناطولیہ تھا کئی اقوام کی گزرگاہ اور محکوم رہا ہے۔

سب سے پہلے ایران کے بادشاہ کبخر و نے قہر ماپولی کو فتح کیا۔ اس کے بعد سکندر اعظم کے دل میں دنیا کو فتح کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ بائیس سال کی عمر میں ساری دنیا کو فتح کرنے لگا تھا اور 32 سال کی عمر تک اس نے تقریباً آدھی دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ اس کی منزل ہندوستان بھی لیکن ترک علاقے میں بھی سکندر اپنی فوجوں کے ساتھ مختلف حکومتوں کو فتح کرتا رہا۔ 32 سال کی عمر میں وہ اچانک بیمار ہوا اور وفات پا گیا۔ اس وقت وہ واپس مقدونیہ جا رہا تھا مگر فاتح عالم بن کر اسے مقدونیہ پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر یونانی نشانیاں آج بھی ترکی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس شاداب اور سرسبز سرزمین پر رومیوں کی نظر پڑی تو ان کی نیت بھی

خراب ہو گئی۔ قیصر روم نے اپنی فوجیں ترکی کو فتح کرنے کے لیے بھیج دیں۔

بازنطینی شہنشاہ نے اناطولیہ پر قبضہ کر لیا اور لگ بھگ ایک ہزار برس تک بازنطینی حکمرانوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ ایک ہزار سال تک قسطنطنیہ ملک کا دارالحکومت رہا۔ بازنطینیوں کے عہد میں ہی اس ملک میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جب عیسائی حکومت نے مذہب کے نام پر دوسرے شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک اختیار کیا تو مسلمانوں کو یہ برداشت نہ ہو سکا۔ ساتویں صدی ہجری میں عربوں نے اس ملک کا رخ کیا اور مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ اس کے بعد سلجوقیوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ سلجوقیوں کے بعد ترکوں کا دور حکومت شروع ہوا اور عثمانیہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ عثمانی سلطنت نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ترک فوجیں فتوحات پر فتوحات کرتی ہوئی یورپ میں ویانا تک پہنچ گئیں۔ سلطنت عثمانیہ کو دنیا کی سب سے بااثر اور طاقتور سلطنت کہا جاتا تھا۔ عثمانی فوج کی آمد کی خبر سن کر ہی مخالف طاقتیں ہتھیار ڈال دیتی تھیں۔

عثمانیہ سلطنت کی یادگار کی دیکھ بھال جس طرح کی جاتی ہے امید ہے کہ عنقریب یہ بھی آثار قدیمہ بن جائیں گے۔ اتنے پرانے شہروں کے کھنڈروں کو دیکھ کر کیا مزہ آئے گا؟“

”بٹ صاحب یہ تو اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے۔ آپ تو کسی ٹائٹ کلپ جا کر ہی خوش ہوں گے۔“

”بھئی کبھی زندہ اور جیتے جاگتے انسانوں میں بھی جانا چاہیے۔“

پاموکلے کے معدنیاتی چشموں کو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ سب نے بٹ صاحب سے کہا کہ بٹ صاحب آپ بھی اس چشمے کے پانی میں غسل کر لیں۔

”کیوں بھئی مجھے تو کوئی جلدی بیماری نہیں ہے۔“

”بیماری کا اور موت کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ بھی بھی سکتی ہے۔ آپ اس چشمے کے پانی میں ایڈوائس غسل کر لیجئے بلکہ ایک بڑی بوتل پانی کی بھر کر بھی لے جائیے۔“

ازمیر کو ہم کم سے کم وقت میں دیکھ چکے تھے۔ اس کی وجہ شہرت دراصل بودرم کا علاقہ ہے جہاں شاندار مہنگے ہوٹل اور بہترین ساحل ہیں۔ کوئی عام آدمی ان ہوٹلوں میں رہنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

بٹ صاحب کی سوچی سمجھی رائے تھی کہ جو اپنی ذاتی

بحری کشتی میں آکر ان ساحلوں سے لطف اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا اس کو تو اس طرف کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے ورنہ خواخواہ احساس کسری میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ دراصل دولت مندوں کی تفریح گاہ ہے۔ اس سے ترکی کروڑوں اربوں ڈالر کماتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی سیاح کے لیے اس ملک میں ہر وہ چیز موجود ہے جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ یہ قدیم و جدید تہذیب اور تعمیراتی فن کا شاہکار ہے۔ یہاں آکر سیاح نہ صرف کشش بلکہ روحانی خوشی بھی محسوس کرتا ہے۔ استنبول شہر میں پانچ سو مساجد ہیں جن میں زیادہ تر انتہائی قدیم ہیں مگر ان کی دیکھ بھال ایسے کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کوئی اس کو تعمیر کر کے گیا ہے۔ مسجدوں کا ذکر سننے ہی مرزا مشرف بے چین ہو گئے۔ بولے ”بھائیو آپ نے نیلی مسجد دیکھی تو ہے مگر بہت سرسری انداز میں۔ اس مسجد کو سرسری انداز میں دیکھنا کافی نہیں ہے۔“

بٹ صاحب جل کر بولے۔ ”کیوں نہ ہم یہاں حجرے کرائے پر لے کر دو چار دن نیلی مسجد کو دیکھیں۔“

”بٹ صاحب، یہ حقیقت ہے کہ یہ اپنی طرز کی انوکھی مسجد ہے۔ ہم واپس استنبول تو جانی رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ ایک مرتبہ میرے ساتھ نیلی مسجد دیکھیں۔“

مرزا مشرف نے اس قدر گڑگڑا کر یہ درخواست کی کہ ہم سب کے دل موم ہو گئے۔ ذرا سوچئے کہ اس شخص نے ہماری رہنمائی کے لیے اپنے سارے کام چھوڑ کر شب و روز ہمارے ساتھ گزارے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر دینا بہت مناسب ہوگا۔“

”بلکہ ثواب ہوگا۔“ بٹ صاحب بول پڑے۔ ”ایک تو ہم ایک تاریخی مسجد دیکھ لیں گے دوسرے مرزا صاحب کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔“

ازمیر کے مختصر لیکن خوبصورت انٹرپورٹ پر پہنچے تو وہاں مغربی سیاحوں کا ایک ہجوم تھا جو کہ ہماری طرح استنبول واپس جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں خواتین بھی کافی تعداد میں تھیں۔ کچھ انتہائی بوڑھی اور کبڑی لیکن اسی طرح میک اپ سے سجی ہوئی اور جدید ترین خوبصورت لباس میں ملبوس۔ لیکن نصف درجن کے نزدیک جوان خواتین بھی تھیں جو اس ننھے سے خوبصورت انٹرپورٹ کی ہر زاویے سے تصاویر بنا رہی تھیں۔ بٹ صاحب نے بھی فوراً بیگ میں سے اپنا قیمتی کیمرہ نکال لیا۔

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب آپ پہلے بھی انٹرپورٹ

سمجھوتا نہیں کرتے اور اپنے وقار اور آزادی کی خاطر دنیا کی بڑی بڑی طاقت سے ٹکر جاتے ہیں۔

قبرص کا جزیرہ ہمیشہ سے ترکی اور یونان کے مابین کشیدگی کا سبب بنا ہوا ہے۔ قبرص بھی ترکی سلطنت کا ایک حصہ تھا لیکن جب سلطنت عثمانیہ کا زوال ہوا تو یونان کے حکمرانوں نے سوچا کہ یہ قبرص یہ قبضہ جمانے کا بہترین موقع ہے۔ قبرص میں آبادی کے اعتبار سے عیسائیوں کی اکثریت ہے۔

انہوں نے یہ تنازع اقوام متحدہ تک پہنچا دیا۔ اقوام متحدہ میں ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہی تھا کہ یونان نے قبرص پر قبضہ جمانے کے لیے اپنی فوجیں اتار دیں اور پورے جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ ترکی نے قبرص سے یونانی فوجیں واپس بلانے کا مطالبہ کیا لیکن یونان کو چونکہ دوسری مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی اس لیے اس نے ترکی کے مطالبے پر کان نہ دھرا۔ ترکی نے ٹنگ آمد چنگ آمد کے تحت اپنے بحری جہاز قبرص روانہ کر دیئے۔ کسی بڑے خطرے کو روکنے کے لیے یورپ اور امریکا نے ترکی کو جنگی جہاز قبرص بھیجنے سے روکا لیکن ترک بحری جنگی جہازوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ امریکا کو علم تھا کہ یہ معاملہ کسی بڑے جنگی تصادم کا سبب بن سکتا ہے جس سے نیٹو کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اس نے اور اقوام متحدہ نے یونان پر زور دیا کہ اپنی فوجیں قبرص سے واپس بلا لے اور اقوام متحدہ کے فیصلے کا انتظار کرے۔ یونان کی حکومت کو علم تھا کہ ترکی سے تصادم تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس نے اپنی فوج کا بڑا حصہ واپس بلا لیا لیکن ترکی جہاز قبرص پہنچ چکے تھے۔ ترکی فوجیں بھی قبرص میں اتر گئیں اور انہوں نے قبرص کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ترکی کا کہنا ہے کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت قائم کر دی جائے۔ ترک حکومت نے ایسا ہی کیا اور قبرص کے ایک تہائی حصے پر ترکوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس حکومت کو یونان کے حملے سے بچانے کے لیے ترک فوج وہاں متعین کر دی گئی۔ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا ہے لیکن ایک تہائی جزیرے پر ترکوں کی حکومت قائم ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ترک کسی صورت بھی ترکوں کی حق تلفی برداشت نہیں کرتے خواہ تمام مغربی دنیا راہ میں رکاوٹ کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ بعض تحقیقی نگاروں کا خیال ہے ترک پہلے منگولوں کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ منگول کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ حضرت نوح کی

کشتی کوہ اراروت میں آکر ٹھہری تھی۔ ان کے دو بیٹے اس کشتی میں تھے۔ ان کے ایک بیٹے یافت کی نسل ایشیائے کوچک کے شمال مشرقی علاقوں میں پھیل گئی اور دوسرے بیٹے سام۔۔۔۔۔ نے مشرق وسطیٰ اور افریقا کا رخ کیا۔ بہر حال یہ شخص اندازے ہی کہے جاسکتے ہیں۔ یافت کی نسل دوسرے قبیلوں کے ساتھ گھل مل گئی جن میں نور و قبائل بھی شامل ہیں۔ ان سب قبیلوں نے ترکی زبان کو اپنا لیا اور ترک کہلانے لگے۔ جن علاقوں میں ترکی بولی جاتی تھی وہ ترکستان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں رومی شہنشاہ ان علاقوں پر حکمرانی کرتا تھا اور یہ سرزمین تورکیہ کہلاتی تھی۔ بازنطین کے بادشاہوں نے بھی اس علاقے پر حکومت کی۔ یہ سب علاقے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ترک کہلانے لگے۔

یہ واقعات مرزا مشرف نے ہم لوگوں کو سنائے۔ مرزا کو واقعات بیان کرنے اور ان میں دلچسپی اور چاشنی پیدا کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ ہم ان کی زبانی یہ واقعات اس طرح سنتے رہے جیسے کوئی قصہ گو قصہ بیان کر رہا ہو۔

مرزا مشرف نے ترکوں کی اصلیت کے بارے میں بتایا کہ اس بارے میں کئی قصے مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مادہ بھیڑیے نے ایک انسان کو جھم دیا تھا اور وہی شخص ترکوں کا جد امجد تھا۔ مختصر یہ کہ ترکی اور ترکوں کے بارے میں بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ مرزا مشرف نے اس بارے میں کافی مختلف داستانیں پڑھ رکھی تھیں جو انہوں نے ہمیں بھی سنائیں۔

انہوں نے کہا کہ جب چنگیز خان کی فوجیں راستے میں آنے والی ہر چیز کو تھس تھس کر رہی تھیں، ان میں ایک قبیلہ ارطغرل کا بھی تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے قبیلے چنگیز خان سے محفوظ رہنے کی خاطر جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ارطغرل کا قبیلہ محض چار سو بیس گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ان کی تعداد چند سو کے قریب تھی۔ یہ قبیلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی مناسب پناہ گاہ کی تلاش میں سفر کرتا رہتا تھا۔

ارطغرل نے کس طرح عروج حاصل کیا، یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ انگور کے قریب ارطغرل کو دو فوجیں مصروف جنگ نظر آئیں ارطغرل کو کچھ علم نہ تھا کہ یہ کون نبرد آ رہے۔ اس نے کچھ دیر ٹھہر کر جائزہ لیا اور جو فوج کمزور پڑی

نظر آئی اس کی حمایت کے لیے جنگ میں شامل ہو گیا جس کے نتیجے میں طاقتور فوج کو بھگنا پڑا۔ فتح حاصل ہو جانے کے بعد ارطغرل کی دوسرے قبیلے سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ سلجوقی سلطان علاؤ الدین کی فوج تھی جسے تاتاریوں نے کمزور پا کر گھیر لیا تھا۔ سلطان علاؤ الدین ارطغرل کے اس کارنامے سے بہت خوش ہوا اور اس کو اپنا نائب بنالیا۔

سن 1300 میں تاتاریوں نے ان علاقوں پر پھر حملہ کیا۔ اس جنگ میں سلطان علاؤ الدین سلجوقی ہلاک ہو گیا۔ سلطان علاؤ الدین کے علم پر ہلال کا نشان بنا ہوا تھا جسے ارطغرل نے اپنا لیا۔ اس کا بیٹا غیاث الدین اس کا جانشین بنا لیکن وہ بھی تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

ارطغرل کا ایک بیٹا عثمان بھی تھا۔ اس دوران میں ارطغرل مسلمان ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔

تاتاری تو لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے رخصت ہو گئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے جنہیں سب اوہ پاس کہا کرتے تھے۔ عثمان خان ان خدا رسیدہ بزرگ کی بیٹی پر عاشق ہو گیا اور ان کے پاس آمد و رفت ہو گئی۔ ان کی تلقین سے عثمان خان بھی مسلمان ہو گیا۔ بزرگ نے اپنی بیٹی کی شادی عثمان خان سے کر دی۔ عثمان خان نے ایک نئی حکومت قائم کی جو بعد میں عثمانیہ سلطنت کہلائی۔ عثمان خان ایک بہادر، انصاف پسند اور رحمدل حکمران تھا۔ قدرت نے اس کو قیادت کی صلاحیت بھی عطا کی تھی جو دانش مندی اور عدل و انصاف کی وجہ سے رعایا میں بہت مقبول تھا۔ وہ انصاف کے معاملے میں کسی مسلمان کی جانبداری نہیں کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس کے دربار سے انصاف حاصل کرتے تھے۔ عثمان خان بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ فتوحات میں غریبوں اور یتیموں کا حصہ مال غنیمت میں سے نکالنے کے بعد سب کچھ سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ وہ ایک معمولی سے سادہ مکان میں رہتا تھا۔ ایک مصنف کے مطابق وفات کے بعد اس کے گھر سے دولت اور ہیرے جواہرات نہیں ملے۔ صرف ایک سوئی عمامہ، لکڑی کا ایک چیمو، نمکدان اور چند گھوڑے اور مویشی ملے کیونکہ وہ زراعت کے ذریعے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ عثمانیہ سلطنت کی پہلی مسجد بنانے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہوا۔ دس سال تک بروسر کا محاصرہ کرنے کے بعد جب یہ قلعہ فتح ہوا تو سلطان عثمان بستر مرگ پر تھا۔ اس

کی وصیت کے مطابق بروسر کو دار السلطنت بنایا گیا اور اس کو وہیں دفن کیا گیا۔ بعد میں اس کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ عثمان خان کی سلطنت مختصر تھی۔ اس کی رعایا میں عیسائی، یونانی بھی شامل تھے جو عثمان خان کی خوبیاں دیکھ کر اسلام لے آئے تھے۔ اس طرح جو نئی نسل تیار ہوئی وہ عثمانی کہلائی۔ عثمانی سلطنت نے بعد میں اتنی ترقی کی کہ اس وقت کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت بن گئی۔ ترکوں نے مشرق و مغرب کے بے شمار ملکوں کو فتح کر لیا۔ ترکی فوج ہنگری تک پہنچ چکی تھی۔ ہنگری اور ویانا سلطنت عثمانیہ کے حصے بن چکے تھے۔ بہر حال عروج و زوال تو اللہ کا نظام ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب سلطنت عثمانیہ سکڑ کر محض ترکی تک محدود رہ گئی ہے لیکن ترکوں کی شجاعت، خودداری میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ترکی غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس کا بچہ بچہ پاکستان سے محبت کرتا ہے۔ ترکی ہمارا بہترین دوست ہے۔

نبلی مسجد یا سلطان احمد مسجد اگرچہ ہم دیکھ چکے تھے لیکن مرزا مشرف کا کہنا تھا کہ اس وقت ہم نے سرسری طور پر مسجد کو دیکھا تھا۔ اس مسجد کو تفصیل سے دیکھنا بہت ضروری ہے ورنہ آپ پاکستان واپس جا کر یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ آپ نے استنبول کی نبلی مسجد دیکھی ہے۔

بٹ صاحب ہمیں ایک طرف لے گئے اور بولے ”یہ شخص ہمیں تفصیل سے نبلی مسجد دکھائے بغیر نہیں رہے گا۔ اس کی روح ہمیشہ بے چین رہے گی۔“

”تو مطلب کیا ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ ہے کہ اس کا دل رکھنے کے لیے ہی سہی ہمیں اس کی خواہش پوری کر دینی چاہیے۔ دیکھیے تا بے چارہ سارے کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ پھر رہا ہے۔ اسے ہم سے کوئی مطلب بھی نہیں ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”مطلب یہی ہے کہ وہ ہمیں نبلی مسجد دکھائے۔“

اس طرح فیصلہ ہو گیا کہ ہم لوگ نبلی مسجد دیکھیں گے اور بہت غور سے دیکھیں گے۔

استنبول شہر تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے اور نبلی مسجد 450 سال پرانی ہے۔ ولی کی طرح یہ شہر بھی کئی بار اجڑا اور پھر آباد ہوا لیکن شکر ہے کہ یہ چنگیز خان ورنجیت سنگھ جیسے حملہ آوروں سے محفوظ رہا جس کی وجہ سے اس کی قدیم اور نادر عمارتیں سلامت رہیں۔ بعد میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا

تو خاص طور پر یہ خیال رکھا کہ ان پرانی عمارتوں کی مرمت اور تزئین کی جائے تاکہ ماضی کی یہ یادگاریں آنے والی نسلوں کے لیے یادگار رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استنبول کی قدیم ترین تاریخی عمارت بھی اتنی زیادہ قدیم نہیں لگتی بلکہ یوں لگتا ہے جیسے حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ استنبول صبح معنوں میں ایک تاریخی شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ آٹھ سو سال قبل مسیح بھی یہ شہر آباد تھا بازنطینی حکمرانوں نے اس کا نام بازنطین رکھا تھا۔ جب رومن یہاں کے حکمران بنے تو انہوں نے اس کا نام بدل کر اپنے بادشاہ کے نام پر کاہنٹیلی نوئل رکھ دیا۔ جب ترکوں نے اس کو فتح کیا تو اس کا نام قسطنطین سے بدل کر استنبول رکھ دیا۔ اب یہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ عثمانی سلطنت کے زیرِ قیام آنے کے بعد یہاں جو عمارتیں ترکوں نے بنوائیں ان میں بازنطینی طرز تعمیر نمایاں ہے یہاں تک کہ مسجدیں بھی اسی طرز پر تعمیر کی گئی ہیں۔ استنبول کی نیلی مسجد سلطان سید سلیمان کی مسجد اور مسجد سلطان احمد بازنطینی طرز تعمیر ہی کا نمونہ ہیں۔ بٹ صاحب نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اگر یہ مساجد ہندوستان میں ہوتیں تو مسلمان بادشاہ ان کے نام ضرور بدل دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ سلیمانی مسجد کا نام بدل کر جہانگیری مسجد یا بابر مسجد رکھ دیا جاتا۔

نیلی مسجد کے نام سے یہ مسجد استنبول کی شان ہے۔ لیکن دوسرے شہروں میں بھی نیلی مسجد کے نام سے مساجد موجود ہیں۔ ملائیشیا کے علاوہ افغانستان کے شہر مزار شریف میں بھی ایک مسجد نیلی مسجد کہلاتی ہے۔ استنبول کی نیلی مسجد کے چھ مینارے ہیں۔ ترکی میں چھ میناروں والی یہ واحد مسجد ہے۔ معمار محمد آغا نے اس مسجد کا نقشہ بنایا تھا۔

کہتے ہیں کہ پہلے اس کے سات مینارے تھے۔ مکہ مکرمہ کی مسجد کے سات مینارے ہیں اس لیے نیلی مسجد کے مینارے چھ کر دیئے گئے۔

مسجد کے پاس پہنچ کر اندر داخل ہونے سے پہلے مسجد بنوانے والے سلطان احمد اول کے لیے ہم سب نے فاتحہ پڑھی۔ مسجد کا مرکزی کمرہ بہت وسیع ہے اور اس کی اونچائی بھی کافی ہے۔ مسجد کے اندرونی حصوں کی دیواروں پر بیس ہزار نیلے چینی ٹائلز لگائے گئے ہیں۔ مسجد میں ہر دیوار پر نیلا رنگ ہے۔ مسجد میں دو سو کے قریب کھڑکیاں ہیں جن میں شیشہ لگا ہوا ہے۔ شیشے کی کھڑکیوں کی وجہ سے مسجد کا

اندرونی حصہ روشن رہتا ہے اور ہوا بھی آتی رہتی ہے۔ مسجد کے اندر دیواروں پر اس زمانے کے عظیم ترین خطاط سید قاسم بخاری نے قرآن شریف کی آیات کی خطاطی کی ہے۔ مرزا مشرف بڑے فخر یہ انداز میں مسجد کی ہر چیز دکھا رہے تھے اور اس کی تعریف کر رہے تھے۔

خان صاحب نے کہا۔ ”مرزا صاحب تو اتنے فخر سے سب چیزیں دکھا رہے ہیں جیسے یہ مسجد خود ان ہی نے تعمیر کی ہے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”ہو سکتا ہے یہ بھی اس خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔“

مرزا مشرف ہماری باتوں سے بے خبر مسجد کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے میں مصروف تھے۔

”آپ یہ مزید دیکھ رہے ہیں؟“ مرزا صاحب نے پوچھا۔

”کیوں نہیں سامنے تو ہے۔“

”اس منبر کی خاص بات یہ ہے کہ مسجد کے ہر کونے سے نمازی امام کو دیکھ سکتے ہیں۔“

ہم نے پہلے بھی غور نہیں کیا تھا کہ یہ بھی خاص بات ہے۔ سوچا کہ جب اپنے ملک کی کسی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھیں گے تو اندازہ لگائیں کہ کیا وہاں بھی منبر کی یہی خوبی ہے۔ مسجد کے ہر مینار پر تین منبر تھے۔ کسی زمانے میں مؤذن ان ہی میناروں پر کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے تاکہ دور تک اذان کی آواز جائے۔ آج کل یہ کام لاؤڈ اسپیکر سے لیا جاتا ہے اس لیے مؤذن تو نظر نہیں آتے مگر آواز دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ اس اذان کی آواز تمام شہر میں سنی جاتی ہے کیونکہ صوتی نظام کے ذریعے اس کو بازاروں، گلی کوچوں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ استنبول میں آپ مختلف اوقات میں مختلف اذانیں نہیں سنیں گے جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہر مسجد کا ناظم یا مہتمم مختلف فرقوں کے اعتبار سے اذان دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر عصر کی نماز کا وقت ہے تو آپ کے کانوں میں ایک اذان کی آواز آئے گی پھر تھوڑے تھوڑے وقت کے بعد اذانوں کی آواز بلند ہوتی ہے جو لگ بھگ نصف گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔ دراصل یہ مختلف فرقوں کی اذانیں ہوتی ہیں۔

ترکی میں جہاں تک ہمیں بتایا گیا ہے مختلف اوقات میں اذانوں اور نمازوں کا رواج نہیں ہے۔ اذان کی بیک وقت ہر مسجد سے صدا بلند ہوتی ہے اور اسی وقت تمام شہر میں نماز ادا کی جاتی ہے۔

ترکی میں بھی فرقہ پرستی اور اس سلسلے میں باہمی جھگڑوں کا رواج تھا لیکن خلافت ختم کرنے کے بعد جب مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت قائم ہوئی تو مصطفیٰ کمال پاشا نے دینی اختلافات دور کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات اٹھائے۔

- 1۔ تمام مساجد حکومت کے زیر انتظام کر دی گئیں۔
- 2۔ ہر مسجد کا امام حکومت کا ملازم تھا اس لیے وہ فرقہ وارانہ تفریق نہیں پھیلا سکتا تھا۔

- 3۔ مساجد کے دروازے صرف نماز کے وقت کھولے جاتے تھے اور نماز ادا کرنے کے بعد بند کر دیے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مساجد کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے تو لوگ یہاں بیٹھ کر ہر قسم کی گفتگو کرتے تھے جس کی وجہ سے مذہبی منافرت پھیلتی تھی۔

- 4۔ امام مسجد کو نماز جمعہ کے وقت صرف خطبہ دینے کی اجازت تھی۔ خطبے کے علاوہ امام کو اپنی طرف سے کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

- 5۔ نکاح پڑھانے کے لیے نکاح خواں (اکثر امام) کو مطلع کر دیا جاتا تھا۔ ترکی میں شادی کے موقع پر آج بھی دھوم دھام اور نمائشیں رسمیں نظر نہیں آتیں۔ ہم لوگوں کو ایک نکاح کی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یہ ایک بالکل سادہ تقریب تھی جو دلہن کے گھر پر منعقد ہوئی تھی۔ دلہن اور دولہا کے قریب ترین عزیز اور رشتے دار گھر کے ڈرائنگ روم میں اکٹھے تھے۔ دولہا کوٹ پتلون میں ملبوس تھا۔ دلہن نے مغربی دلہن کے انداز کا یون پہن رکھا تھا بلکہ میک اپ کے علاوہ کوئی اور زیبائش نہ تھی۔ شرکاء کی تعداد 35 کے لگ بھگ ہوئی۔ قاضی صاحب کا انتظار تھا۔

وقت مقررہ پر کال بیل بجی۔ دولہا کے والد نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک میسجینٹس سالہ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے شیو کر رکھا تھا اور سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر کوئی ٹوپی یا عمامہ وغیرہ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نکاح خواں ہیں۔ انہوں نے ہر ایک سے علیک سلیک کی اور اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر دولہا اور دلہن بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ نکاح خواں نے نکاح کے سلسلے میں قرآن کی چند آیات پڑھیں۔ سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس شادی کی کامیابی کے لیے دعا کی۔

سینئر ٹیبل پر کیک اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ نکاح کے بعد دولہا اور دلہن نے ایک دوسرے کو

میراث

قانون وراثت علم المیراث کہلاتا ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیات جن پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی ہے آیات الوارث کہلاتی ہیں۔ وراثت کے لیے کسی قانونی اور محضوی رشتے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غلام میراث کا وارث قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلامی فقہ کی رو سے مسلمان کسی منکر کو بھی وارث مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میراث میں سے پہلے جنازے کے اخراجات، پھر قرضے منہا کر لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچے، اس کے ایک تہائی میراث برطابق وصیت تقسیم کر دی جائے۔ کوئی وصیت نہ ہونے کی صورت میں اصحاب الفرائض کو مال کی تقسیم میں فوقیت دی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہوں تو عصبیات میں تقسیم ہوگی۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوں تو ذی الورحام میں تقسیم ہوگی۔

مرسلہ: نعمان بشیر لاہور

کیک کھلایا۔ نکاح خواں کو بھی کیک کھلایا گیا مگر انہوں نے کافی پینے کے لیے رکنا ضروری نہیں سمجھا، معذرت کر کے رخصت ہو گئے۔

شادی کی اس تقریب میں سب لوگ روزمرہ کے لباس میں تھے۔ خواتین نے نہ زرق برق لباس پہنا تھا اور نہ ہی زیورات۔ کچھ دیر میں کافی پی کر مہمان رخصت ہو گئے اور صرف گھر والے اور انتہائی قریبی عزیز باقی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد میز پر کھانا چن دیا گیا۔ کھانے میں بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ لذیذ ترکی کھانے اور کباب، سادہ چاول، روٹی کے ساتھ میز پر رکھے گئے تھے۔ ایک خاص چیز یہ تھی کہ بیٹنگن کوکٹ کراس کے اندر۔۔۔ مختلف سبزیاں اور مرچیں بھر کر بیٹنگن کو بھونچل میں بھونچتے ہیں۔ (جس طرح گرم ریت میں بھنے بھونے جاتے ہیں) بیٹنگن کو دھاگے سے لپیٹ کر بھونا جاتا ہے۔ اس کے پکنے کے بعد دھاگا نکال دیا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ ترکی کی ایک خاص ڈش ہے۔ چکھ کر دیکھا تو واقعی بہت لذیذ یا تھا۔ اس کا مزہ بھی اٹھکا تھا۔ اس طرح یہ شادی کی سادہ سی تقریب ختم ہو گئی۔ ہم لوگ تو چلے آئے اور دولہا دلہن ہی مون منانے کے لیے بحری سفر پر

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی کمزوری کا شکار تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عنبر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کہیں، فاتح مسجد اور رستم پاشا مسجد استنبول کی سیکڑوں مساجد کی امر تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت پڑے گی۔

مرزا مشرف کی تو خواہش تھی کہ ہم استنبول کی تمام قدیم مساجد دیکھیں لیکن اس کے لیے استنبول میں کم سے کم چھ مہینے رہنا ضروری ہے۔

قابل تعریف بات یہ ہے کہ صدیوں پرانی یہ مساجد نگہداشت کے باعث آج بھی یوں لگتی ہیں جیسے ابھی تعمیر ہوئی ہیں۔ یہ بھی ترک قوم کی ایک خوبی ہے۔

اگلے دن کے لیے مرزا مشرف کا اصرار تھا کہ ہم پرنس آئی لینڈز دیکھنے جائیں۔

”کیا یہ جزیرہ کسی شہزادی نے بنوایا تھا؟“ بٹ صاحب نے معصومیت سے سوال کیا۔

”خان صاحب نے فوراً صحیح کی۔“ بٹ صاحب، ”جزیرہ کوئی بلند ٹک نہیں ہے جسے بنوایا جائے۔ یہ تو اللہ میاں بناتا ہے۔“

”جیسے استنبول ایک بڑا جزیرہ ہے۔“

”جی نہیں، استنبول جزیرہ نہیں ہے۔“

”اچھا اچھا، یہ تو جزیرہ نما ہے۔“

”اچھا بٹ صاحب۔ آپ جغرافیہ کی کتاب کھول کر مت بیٹھ جائیے۔ مرزا صاحب کو آئی لینڈ کے بارے میں بتانے دیجیے۔“

”یہ ایک جزیرہ نہیں ہے، پانچ جزیرے ہیں۔“

”اومانی گاڈا ایک جزیرے میں پانچ جزیرے؟ یہ تو دیکھنے کی چیز ہوگی۔“

مرزا مشرف نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”یہ پانچ بہت خوبصورت جزیرے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر لیکن ان کی خصوصیات مختلف ہیں۔“

”وہاں جانے کا طریقہ کیا ہے؟“ بٹ صاحب نے پوچھا۔

”تیر کر جانا پڑتا ہے۔“ مرزا مشرف نے بہت سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔

”مرگئے۔ پھر میں تو وہاں جا ہی نہیں سکتا۔ میں تو بڑے نالے میں نہیں تیر سکتا۔ سمندر میں کیسے تیروں گا؟“

اب خان صاحب کی باری تھی۔ بولے ”بٹ صاحب، یہ لوگ ریز کے کپڑے بھی دیتے ہیں۔ یہ کار کے نیوب کی طرح ہوتے ہیں جن میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ یہ پکن کر اگر تیر تو ڈوبنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔“

”اور اگر اس کی ہوا نکل جائے جیسے کہ نیوب میں

جاتی ہے اور صرف نماز پڑھنے والوں کو مسجد کے اندر آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ مسجد سلطان احمد نے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد سے ملحق مدرسہ، پرائمری اسکول، ایک مقبرہ اور مارکیٹ بھی ہے۔ اس کے علاوہ دکانیں، حمام، شفاخانہ اور پانی کی سبیلیں بھی ہیں۔ ان کی آمدنی مسجد کی دیکھ بھال پر خرچ کی جاتی ہے۔

نئی مسجد کو دیکھنے کے لیے ہر وقت غیر ملکی سیاحوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ لیکن تمام مسجد میں انہیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مسجد کا صرف مغربی حصہ سیاحوں کے لیے کھولا جاتا ہے تاکہ غیر ملکی مسجد کی تمام خوبیوں کو بخوبی دیکھ سکیں اور چاہیں تو تصاویر بنا سکیں۔ سیاحوں کے لیے یہ بندوبست ہے کہ مسجد کے بیرونی دروازے پر پلاسٹک کے ایسے بیگ مفت میں دیے جاتے ہیں جو وہ اپنے جوتوں پر چڑھا سکیں۔ اس طرح انہیں اپنے جوتے اتارنے نہیں پڑتے اور مسجد کا اندرونی حصہ بھی صاف رہتا ہے۔

غیر مسلم سیاح خواتین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ سر پر اسکارف پہنیں۔ یہ اسکارف مسجد کے باہر ہی دستیاب ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔ مسجد کے اندر داخل ہونے کے بعد مسجد کے احترام میں شور نہ کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے اور یہ بھی کہ مسجد کے اندر تصاویر بنانے کے لیے فلیش استعمال نہ کریں۔

استنبول کے علاوہ دنیا بھر میں مساجد بہت بڑی تعداد میں ہیں اور ہر مسجد کا اپنا حسن ہے۔ ان تاریخی مساجد میں سنہری مسجد، (مسجد الذهب) فیلا میں ہے اور تاریخی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس مسجد کا گنبد سنہری رنگ کا ہے۔ فلپائن کی یہ مسجد لیپیا کے معرقدانی نے تعمیر کرائی تھی۔

استنبول میں باسفورس کے کنارے ایک عظیم الشان مسجد ہے۔ یہ مسجد سلطان عبدالحمید نے 18 ویں صدی میں تعمیر کرائی تھی۔ ایک والدہ مسجد بھی ہے جو سلطان عبدالعزیز کی والدہ نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد بھی اٹھارویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی۔

فاتح مسجد، سلطان محمد فاتح نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر کرائی گئی تھی۔ 1766ء میں زلزلے کی وجہ سے مسجد کے ایک حصے کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ سلطان مصطفیٰ سوم نے اس مسجد کی از سر نو مرمت کرائی اور اس کو بالکل پرانی شکل دے دی گئی اور شبہ تک نہیں ہو سکتا کہ زلزلے میں اس کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ استنبول میں ہر قدیم مسجد کو ایک نام دیا گیا ہے مثلاً شیخ لطف اللہ مسجد، قل شریف مسجد، بی بی خانم مسجد، مسجد

روانہ ہو گئے۔ دیکھیے نئی مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آئیے نئی مسجد کی دوسری خصوصیت دیکھتے ہیں جن کے بارے میں مرزا مشرف ہماری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔

ہم نے پوچھا ”مرزا صاحب آپ تو اس تفصیل سے ہر چیز کے بارے میں بتا رہے ہیں جیسے کہ گائیڈ ہوں۔“ وہ مسکرائے اور بولے۔ ”آپ نے ٹھیک کہا۔ پہلی بار میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ آیا تھا تو ایک گائیڈ ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے بعد پاکستان اور ہندوستان سے جو دوست استنبول آتے تھے انہیں میں ہی استنبول کی سیر کراتا اور معلومات فراہم کرتا تھا اسی لیے یہ سب باتیں مجھے زبانی یاد ہو گئی ہیں۔“

”پھر تو آپ میرا مشورہ مانیں اور پارٹ ٹائم کے طور پر گائیڈ کے فرائض ادا کریں۔ سیر کی سیر اور نقد معاوضہ الگ۔“ بٹ صاحب نے انہیں مشورہ پیش کیا۔

خان صاحب نے فوراً کہا ”مرزا صاحب میری ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ اگر بٹ صاحب آپ کو مفت مشورے کے ساتھ کچھ نقد رقم بھی پیش کریں تو ہرگز قبول نہ کیجیے گا۔ ان کے مشورے ماننے کا نتیجہ بہت سے دوست بھگت چکے ہیں۔“

نئی مسجد کی عمارت تو اپنی جگہ حسین اور انوکھی ہے ہی لیکن اس کے محن میں خوبصورت درختوں کی قطاریں اور سبزہ زار اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ رات کے وقت مسجد میں بجلی کے فیکوں سے اتنی روشنی کی جاتی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے دن نکل آیا ہو۔ مرزا مشرف کے اصرار پر اگلے دن رات کے وقت ہم ایک بار پھر خاص طور پر نئی مسجد دیکھنے گئے اور اس حسین منظر کو دیکھ کر مسحور ہو گئے۔ مسجد کے محن میں پھلوں کے بھی بے شمار درخت لگے ہوئے ہیں جو قطاروں کی صورت میں لگائے گئے ہیں۔ گلاب کے پھولوں کو اس خوبصورتی سے لگایا گیا ہے کہ نہ صرف فضا گلاب کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے بلکہ اس کو لگانے کا انداز بھی بہت دلکش ہے۔ گلاب کے علاوہ بھی قسم قسم کے پھول بڑی خوبصورتی سے لگائے گئے ہیں۔ خصوصاً رات کے وقت منظر نا قابل فراموش ہوتا ہے۔ اس مسجد میں سیاحوں کا جھوم رہتا ہے جو مسجد کے مختلف مناظر کی تصویریں اتارتے رہتے ہیں لیکن جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو سیاحوں سے مسجد خالی کرائی

سے نکل جاتی ہے تو پھر؟

”تو پھر تیرے والا آرام سے ڈوب سکتا ہے۔“
”لا حول ولا قوۃ“ بٹ صاحب بخجیدہ ہو گئے۔ ”بھائی میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ مجھے نہ تیرے کا شوق ہے نہ ڈوبنے کا۔“

ہم نے سوچا کہ بٹ صاحب کو صحیح صورت حال بتادی جائے۔ ”بٹ صاحب یہ لوگ آپ سے مذاق کر رہے ہیں اور آپ سیریس ہو گئے۔ خود ہی سوچیں کہ کیا دنیا میں جزیروں پر تیر کر جاتے ہیں۔“

بٹ صاحب فوراً شیر ہو گئے۔ ”میں بھی ان سے مذاق ہی کر رہا تھا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس طرح دھوکا کھا جاؤں۔“

”تو پھر آپ کتنے بیوقوف ہیں؟“ ہم نے پوچھا۔
”بس، نارمل بیوقوف ہوں۔ ہر شخص نارمل بیوقوف ہوتا ہے۔“

پرنس آئی لینڈ کی مرزا صاحب نے اتنی تعریف کی کہ اگلے روز وہاں جانے کا پروگرام بن گیا۔ مرزا مشرف نے بتایا کہ ایک ٹکٹ خرید کر آپ چاہیں تو پانچوں آئی لینڈ میں تھوڑی تھوڑی دیر تک رک سکتے ہیں۔ اگر چاہیں تو ایک دو روز بھی قیام کر سکتے ہیں اور اسی ٹکٹ پر واپس آ سکتے ہیں۔“
بٹ صاحب نے کہا۔ ”مگر ہم وہاں جنگل میں ٹھہر کر کیا کریں گے۔ کیا رات کی درخت کے نیچے گزاریں گے اور جنگلی پھل کھا کر پیٹ بھریں گے۔“

”بٹ صاحب۔“ مرزا مشرف نے کہا۔ ”یہ ایسے آئی لینڈ نہیں ہیں جو آپ کارٹون فلموں میں دیکھتے ہیں کہ سمندر کے بیچ میں ایک بڑا سا درخت جس کے پیچھے دو آدمی کھڑے ہیلپ ہیلپ پکار رہے ہیں۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ یہ اچھے خاصے بڑے جزیرے ہیں جہاں بہت سے لوگ گھر بنا کر رہتے ہیں۔ خوبصورت بازار، ہوٹل اور ریسٹوران بھی ہیں۔ بڑی رونق ہوتی ہے وہاں، یوں کچھ لیجے کے چھوٹے چھوٹے شہر ہیں۔“

”تو کیا ہمیں وہاں بھی لالچ پر بیٹھ کر جانا پڑے گا؟“
”بھائی یہ منوڑا اور کیا مڑی کا سفر نہیں ہے۔ باقاعدہ چھوٹے بحری جہاز ہوتے ہیں جنہیں فیری کہا جاتا ہے۔“
”فیری میری چھوٹی بچی کا نام ہے۔ بٹ صاحب نے کہا۔ ”نام تو اس کا فیروزہ ہے مگر سب اس کو بیار میں فیری کہتے ہیں۔“

اگلے دن نو بجے ہم بوٹ اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہ ایک

خوبصورت اور بہت صاف ستھری عمارت تھی۔ ایک بڑے سے ہال میں ٹکٹ خریدنے کے لیے کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ لوگ آکر ٹکٹ لے کر ایک دروازے کے اندر چلے جاتے تھے۔ اس کو آپ پنجابی میں تین کہہ سکتے ہیں مگر اس قدر صاف ستھری اور خوبصورت۔ یہ عمارت سمندر سے ملی ہوئی تھی۔ جب فیری آتی تو فیری اور بوٹ سیکشن کے درمیان میں ایک لکڑی کا پل ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ فیری میں جانے کا راستہ تھا۔ اسی راستے سے مسافر فیری سے اتر کر بوٹ اسٹیشن جاتے تھے۔ لیکن اس کے آگے عمارت تک جانے کے لیے درمیان میں ایک لوہے کا پائپ لگا ہوا تھا جو اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بے ترتیبی اور جھوم نہ ہو۔ آنے اور جانے والے مسافر اطمینان سے اپنے اپنے راستے پر چلیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے سلیقہ اور نظم پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی گھنٹے بعد فیری آتی اور جاتی ہے اس لیے اگر ایک فیری نکل جائے تو نصف گھنٹے بعد دوسری آ جائے گی۔ بوٹ اسٹیشن پر بہت رونق اور گہما گہمی تھی۔ مقامی ترکوں کے علاوہ سیاحوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی نظر آرہی تھی بلکہ اکثریت سیاحوں کی ہی تھی۔

کچھ دیر بعد دوسری فیری آگئی۔ ایک محافظ نے دروازہ کھول دیا جس سے گزر کر ہمیں فیری تک جانا تھا۔ اسی راستے سے آنے والے بھی گزر کر اندر آ جاتے تھے۔ فیری تک ایک کھلا ہوا راستہ تھا۔ وہاں تک جانے کا راستہ پچاس گز کے قریب ہو گا۔

ہم لوگ دوسرے مسافروں کے ساتھ فیری کی طرف روانہ ہوئے۔ لکڑی کا تختہ ڈال دیا گیا تھا۔ یہ پانچ گز چوڑا تھا۔ اس پر سے گزرتے ہوئے فیری اور بوٹ اسٹیشن کے درمیان میں سمندر کا نیلا پانی نظر آ رہا تھا۔

بٹ صاحب کچھ خوفزدہ تھے لیکن ہمت کر کے تختے پر سے گزر کر فیری میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور بولے ”شکر ہے کہ پہلا پل صراطِ توٹے کر لیا۔“

فیری دو منزلہ تھی، ایک چوڑے سے راستے سے گزر کر لکڑی کی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ یہ راستہ دراصل عرشے پر جانے کا تھا جہاں کچھ خالی جگہ تھی اور سو کے قریب لکڑی کی بنچیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چونکہ یہ چاروں طرف سے کھلی ہوئی جگہ تھی اس لیے یہاں بیٹھ کر دیکھتے تو چاروں طرف حدنگاہ تک نظر آتے ہوئے سمندر کو دیکھ سکتے

تھے۔ اس کے علاوہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ سمندر میں بیٹھے سمندر کی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ پڑھیاں اتر کر نیچے کے حصے میں جاؤ تو ایک کھلی راہ داری تھی جس میں ایک طرف اسٹینک بار تھا۔ یہاں سے آپ جائے کافی اور کھانے پینے کی دوسری ہلکی پھلکی چیزیں مثلاً چائیں، چاکلیٹ، بسکٹ، کیک وغیرہ خرید سکتے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں بھی سب چیزوں کے نرخ وہی تھے جو استنبول میں تھے۔ ہمارے ملک میں دکاندار جو لوٹ مار اور من مانی کرتے ہیں اس کی ترکی میں اجازت نہیں ہے۔ مثلاً منزل وائر کی جو چھوٹی بوتل بازار سے بیس روپے میں ملتی ہے سینما گھر میں یا ریسٹورنٹ میں وہ چالیس پینتالیس روپے میں ملے گی۔ ہر چیز کا یہی حال ہے لیکن استنبول میں ہم نے دیکھا کہ مغربی ملکوں کی طرح جو قیمتیں مقرر کی گئی ہیں ہر جگہ وہی قیمت وصول کی جائے گی چاہے آپ لندن میں ہوں یا کسی چھوٹے شہر میں۔

فیری میں بیٹھ کر بٹ صاحب کا خوف سمندر ختم ہو گیا تھا، وہ سمندر کے نیلے پانی اور صاف شفاف ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سمندری پرندے اور بگے.... سمندر کی سطح پر پانی پر بیٹھ کر سمندر کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک دلچسپ

اور حسین منظر پیش کر رہے تھے۔ سمندر کے پرندے سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں انگلیاں کرتے، سمندر کے پانی میں غوطے لگاتے اور فیری کے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے بحری جہاز کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایک عجیب ہی منظر نظر آتا ہے۔

ہم نے یورپ میں کئی بار بحری سفر کیے ہیں مگر وہ جہاز فیری سے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کا عرشہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس میں کمرے بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ کمرے میں رہنا یا آرام کرنا چاہیں تو اس کے لیے کرایہ کچھ زیادہ ہوتا ہے اگر انگلستان سے فرانس جاؤ یا فرانس سے بذریعہ جہاز انگلستان جاؤ تو انگلش چینل کے راستے یہ چند گھنٹے کا سفر بے حد پر لطف ہوتا ہے۔

میری رائے یہ تھی کہ فیری کے نچلے حصے کا جائزہ بھی لے لیں مگر سب کی رائے تھی کہ عرشے پر بیٹھنے میں جو لطف ہے وہ نیچے کے حصے میں بیٹھنے میں نہیں ہے۔

عرشے پر جاتے ہی تازہ دم ہو گئے۔ کچھ دیر سمندر کا تماشا دیکھتے رہے پھر اچانک بٹ صاحب کو خیال آیا کہ سب کو کافی پتہ چاہیے۔ وہ اٹھ کر گئے تو خان صاحب نے کہا۔ ”کافی کا تو بہانہ ہے۔ یہ دراصل سیاح خوانین کو

مارچ 2014ء کے شمارے کی عنایتاً

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیریس ڈائجسٹ
ماہنامہ



مزیں
خلوٹ کی محفل
مغلی شہر چٹان اور
مرزا محمد بیگ کے
دھواں دھار دلائل

ببول

محبت کی بھینٹ چڑھ جانے والی ایک کم سن بونیشہ کی سادگی اور زمانے کے انتقام کی روداد..... اسما قادری کے قلم سے آخری صفحات کا تحفہ

آخری بادشاہ

گم شدہ لمحات کا اعادہ کرنا کس قدر دشوار گزار ہے جب..... تاریخ اپنے پنکھ پھیلاتی ہے تو قاری بھی امن لمحات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کے قلم کا لازوال کمال

پس زنداں

آنسوؤں میں بھیکے ایک گلاب چہرے کا ملال..... جس کے دامن میں خار کے سوا کچھ نہ تھا۔ طاہر جاوید مغل کا دلگداز انداز

ماروی

دل کے بند دروازوں پر دستک دینے والی ایک موم کی صورت کا دلربا انداز..... محی الدین نواب کے قلم کی روانی

کاشف ذہین سلیم انور، تنویر ریاض، عبدالقیوم شاد، مریم کے خان، منظر امام کی دلکش تحاریر

اس کے علاوہ

شاہانہ عشق

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اس کے خوف سے دنیا لرزتی تھی۔ وہ جدھر نکل جاتا گشتوں کے پُشتے لگا دیتا کیونکہ وہ فاتح دنیا کہلاتا تھا مگر اس کے دل پر فتح حاصل کر چکی تھی اس کے ایک ادنیٰ افسر کی بیوی۔ وہ اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا۔

جہاں محبت ہوگی وہاں جنگ بھی ہوگی، اور جہاں جنگ کے سیاہ بادل ہوں گے وہیں اس ظلمت تلے محبت کی شمعیں فروزاں ہوں گی۔ جنگ اور محبت میں شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ”سب جائز ہے“..... شاید اس کی یہ قدر مشترک وجہ ٹھہرتی ہے کہ دونوں میں شدت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فاتح جو تیر و تفنگ سے زیر نہ ہو سکے انہیں محبت نے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ بڑے بڑے سورا جو میدان جنگ کے ناقابلِ تسخیر شہسوار تھے محض کسی عام سی حسینہ کی امداد

نیپولین کے ایک خفیہ عشق کی روداد



دیکھتے گئے ہیں۔“

”بھئی دیکھ کر تو آئے ہیں۔“

”ارے بھئی غور سے نہیں دیکھ سکے۔ اب دوبارہ دیکھیں گے اور کسی بہانے تصویریں بھی اتاریں گے۔“

بٹ صاحب پندرہ منٹ بعد واپس آئے۔ ہاتھ میں کافی کے گلاس تھے۔ ایک گلاس خالی تھا جو انہوں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔

”یہ خالی گلاس میرے لیے ہے۔ آپ سب کو تھوڑی تھوڑی کافی مجھے بھی دینی ہوگی۔“

”مگر بٹ صاحب، آپ نے کافی لانے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟“

”بھئی وہاں رش بہت تھا۔ کوئی کافی مانگ رہا تھا۔ کوئی چہس اور چاکلیٹ خرید رہا تھا۔ کوئی کیک پیس خرید رہا تھا۔“

ہم نے کہا۔ ”زیادہ تر تو خواتین ہی ہوں گی؟“

بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا۔ ”ارے یار سب کی سب خواتین ہی تھیں۔ لاجول ولاقوہ میں تو ان کی بے حیائی دیکھ کر حیران رہ گیا۔“

”پھر پندرہ منٹ تک حیران ہوتے رہے۔“

”ارے حیران تو میں اس وقت بھی ہوں۔ غالب نے صحیح کہا ہے کہ میں تو حیران ہوں کہ دنیا اتنی بدل جائے گی۔“

”بٹ صاحب، غالب پر تو رحم کیجیے۔ غلط شعر پڑھنے سے نہ پڑھنا بہتر ہے۔“

اچانک ایک ترک صاحب نمودار ہوئے اور عرصے پر خالی جگہ میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ سمندر کا نظارہ اتنا خوبصورت تھا کہ کسی اور طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

انہوں نے بلند آواز میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ ”لیڈیز اینڈ جنتلمین، میں آپ کی کچھ اینٹیشن چاہتا ہوں۔“

سب کی نظریں ان کی طرف مڑ گئیں۔ وہ درمیانہ قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ سوٹ میں لمبوس تھے۔ بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی مگر مونچھیں بالکل سفید تھیں۔ چہرہ سرخ و سفید تھا۔ آواز بھی بھاری اور اثر کرنے والی تھی۔

انہوں نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد کہا۔ ”آپ میرے ہاتھ میں یہ چھڑی دیکھ رہے ہیں، یہ کوئی معمولی چھڑی نہیں ہے۔ عام طور پر آپ اسے چھڑی کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ بہت فائدہ مند چیز ہے۔ ایک لمحہ توجہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ چھڑی کتنے کام

کے لیے ہے۔ اب دیکھیے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے چھڑی کا ایک حصہ کھینچ کر علیحدہ کیا، اندر سے ایک نوکدار چیز برآمد ہوئی۔ ”اگر آپ کی زندگی کو خطرہ ہے تو یہ چھڑی آپ کی جان بچانے والی تلوار بن سکتی ہے۔“

یہ نوکدار تلوار چھڑی میں لگانے کے بعد انہوں نے چھڑی کے چھ سات فائدے بیان کیے۔ یہ چھڑی دراصل کئی حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ آپ اس سے جو کام لینا چاہیں وہ حصہ کھینچ کر الگ کر دیجیے۔ آخر میں انہوں نے چھڑی کے اوپر کے حصے کو کھول کر پھیلایا اور بولے۔ ”اگر آپ تھک گئے ہیں اور بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے تو اسے کھول کر ایک سیٹ بنا سکتے ہیں۔ چھڑی کا نچلا نوکدار حصہ فرش میں فکس ہو جائے گا اور آپ بڑے آرام سے یوں بیٹھ جائیں گے۔“ انہوں نے اس چھوٹی سی سیٹ پر بیٹھ کر دکھایا۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بڑے اطمینان سے چاروں طرف کا نظارہ کرنے لگے۔

پھر اٹھ کر کھڑے ہوئے اس کو سمیٹ کر چھڑی بنالیا اور بولے۔ ”اس کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے۔“

ایک آواز آئی۔ ”کیا فری ہے؟“

”فری ہی نیچے۔ یہ چھڑی سیون ان دن ہے۔ اس کی قیمت صرف تین ہزار لیرا ہے۔ (اس زمانے میں ایک ڈالر میں 750 لیرا ہوتے تھے) جو صاحب چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔“

”مگر آپ کے پاس تو صرف ایک چھڑی ہے۔“

”اس کی فکر نہ کیجیے۔“ انہوں نے دو قدم پیچھے جا کر چھڑیوں کا ایک ڈھیر اٹھالیا۔ ”یہ دیکھیے، آپ چاہیں گے تو اور بھی آجائیں گی۔ وہ نیچے رکھی ہوئی ہیں۔“

ہمارے ساتھیوں کو یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا لیکن ہم نے ایک چھڑی خرید لی۔ بٹ صاحب کیسے پیچھے رہ جاتے۔ انہوں نے بھی ایک چھڑی خریدی اور اس کو بیٹھنے والی سیٹ بنا کر جیسے ہی اس پر بیٹھے دھڑام سے زمین پر گر گئے۔

چھڑی فروش نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں اٹھایا اور کہا۔ ”آپ نے اس کو صحیح طور پر نہیں کھولا۔ دیکھیے اس کو اس طرح کھولتے ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے چھڑی کو سمیٹ کر کبجا کیا اور پھر سیٹ کو کھول کر بولے۔ ”یہ طریقہ ہے اس پر بیٹھنے کا۔“

انہوں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

(جاری ہے)

جنش سے خاک چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔

نیپولین ملک کے ملک فتح کرتا اور فتح کے پھریرے لہراتا ہوا جب مصر پہنچا تو ایک ایک برطانوی جنگی بیڑوں نے اس کے فرانسیسی بحری بیڑوں کا نہ صرف محاصرہ کر لیا بلکہ ان کی پیش قدمی کو بھی بالکل جامد کر دیا۔ اور یورپ کا یہ فاتح اعظم عارضی طور پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ جانے پر مجبور ہو گیا۔ مگر نیپولین کے مزاج میں ٹھہراؤ کب تھا۔ وہ ملکوں اور متوج مزاج کا آدمی تھا۔ اس کی بے قرار طبیعت اسے چین سے کب بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ تو شاید پیدا ہی متحرک رہنے کے لیے ہوا تھا۔ اب خواہ یہ تحریک جنگ و جدل کی ہوتی یا ملک کے ملک فتح کرنے کا جنون یا پھر نسوانی دلوں کو زیر کرنے پر مہمیز ہوتی، جنگ کے ساتھ رومانس بھی اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ اور یہی..... شاید یہی سبب تھا کہ مصر کے ایک عرب سردار نے شہنشاہ نیپولین کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر چند حسین کنیزوں کا انتخاب تحفہ کے طور پر اس کی خدمت میں بھیجا گیا مگر وائے افسوس کہ اس میں سے کوئی بھی حسینہ نیپولین کو پسند نہ آئی اور ان سب حسین اور اپسرا مثل باندیوں کو واپس کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ سب بے پناہ حسن کی مالک تھیں۔ مگر ان کی کمر اور جسمانی خد و خال کی دلکشی مغربی تئلیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی.... اور یہی وجہ نیپولین کو انہیں ناپسند کرنے کی تھی۔ نفاست پسندی کے حامل نیپولین کی نظر میں یہ ایک بہت بڑا عیب تھا۔ گویا انتخاب حسن کے معاملے میں بھی یہ بادشاہ، معیار حسن رکھتا تھا۔

بالآخر قدرت نے نیپولین کے دل کی تسکین کا سامان پیدا کر ہی دیا۔ ایک دن قاہرہ کے بازار میں اس کی نظر شاطر ایک نوجوان فرانسیسی حسینہ پر پڑ گئی۔ جسے دیکھتے ہی شہنشاہ کا صبر و قناعت گرا گیا مگر وہ غارت گر حسینہ بڑی بے نیازی سے ایک گھوڑی پر سوار اس بات سے یکسر بے خبر چلی جا رہی تھی کہ ایک فاتح شہنشاہ اس کی زلف گرہ گیر... کا اسیر بن چکا تھا۔ نیپولین تب تک اس حسینہ عالم کو محویت میں تکتا رہا جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے ایک جرنیل سے پوچھا۔

”یہ عورت قاہرہ کیسے آئی؟“

جرنیل سمجھ گیا۔ فوراً عرض کی۔ ”یہ ایک لیفٹیننٹ کی بیوی ہے۔“

اگرچہ شہنشاہ کی طرف سے یہ حکم پہلے ہی صادر ہو چکا تھا کہ کوئی بھی سپاہی اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے گا۔ اس کے

باوجود یہ عورت مردانہ لباس میں قاہرہ لائی گئی اسی لیے اس کی خفیہ آمد کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔

”ہائے! کس قدر حسین اور صورت و مجسم حسینہ ہے یہ.....“ نیپولین کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

دوسرے دن..... میڈم فوری! حیرت ناک نگاہوں سے آنکھیں پھاڑے ایک دعوت نامہ پڑھ رہی تھی، جو جرنیل کی طرف سے اسے موصول ہوا تھا۔ اس نے شام میں اپنے شوہر سے اس دعوت نامے کا ذکر کیا تو وہ یکدم آپے سے باہر ہو گیا۔

”ہرگز نہیں، تم اس دعوت میں شرکت نہیں کر سکتیں۔“

وہ اپنی حسین و جمیل بیوی پر برہم ہوتے ہوئے بولا۔

”اگر دعوت میں بلانا اتنا ہی مقصود تھا تو ہم دونوں کو بلایا جاتا۔ صرف تم کیوں؟ مجھے اس طرح نظر انداز کر کے میری کھلی توہین کی گئی ہے۔“

میڈم فوری کو اپنے شوہر کی بات سے اختلاف تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہ ان کی غیر معمولی عزت افزائی تھی۔ وہ اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ یہی بات جب اس نے اپنے شوہر کو سمجھانا چاہی تو وہ فوراً ہتھے سے اکھڑ گیا اور..... طعن و تشنیع کرنے لگا۔

”تم احساس کمتری کا شکار ہو فوری! اس لیے تم عزت اور عزت کے بھاؤ کو نہیں سمجھ سکتیں.....“

میڈم فوری کو شوہر کی بات کا مطلب سمجھ کر دکھ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوری ایک کنواری ماں کی بیٹی تھی، یعنی ناجائز اولاد تھی۔ ناجائز اولاد عموماً خوبصورت، چنچل اور ضدی ہوتی ہے۔ یہی کچھ فوری کے مزاج کا حصہ تھا۔ اسے اپنے شوہر کا یہ رویہ سخت ناگوار گزرا تھا اور وہ اس کے منہ کرنے کے باوجود دعوت میں چلی گئی۔

جب میڈم فوری اپنی شوخ نگاہوں سے دیکھنے والوں کے دل میں پھل چائی جرنیل کے گھر پہنچی تو وہاں جرنیل اس کی بیوی اور چند دیگر مہمانوں کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میڈم فوری پردیس میں عیش و عشرت کا یہ ماحول دیکھ کر بہت محظوظ اور خوش ہوئی۔

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور سب کے سب یکدم تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میڈم فوری نے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو فرانس کا بادشاہ او یورپ کا سب سے بڑا فاتح سبز رنگ کا کوٹ پہنے سامنے کھڑا تھا۔ جب نیپولین ایک کرسی پر

حملات سے بیٹھ گیا تو جرنیل نے بہترین اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے بھری پلیٹیں اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

ان کھانوں کو دیکھ کر نیپولین نے اک شاہان بے نیازانہ انداز میں کہا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے..... پر میں تمہاری خاطر تھوڑا قہوہ پی لیتا ہوں۔

سارے مہمان کھانا تناول کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مگر نیپولین کی نظریں میڈم فوری کے رخ ماہ روشن پر جیسے ٹھہری گئی تھیں۔ قہوے کی پیالی ادھ بھری تھی مگر وہ خود نظریں بھر بھر میڈم فوری کو تنگے جا رہا تھا۔

میڈم فوری کو بھی جلد ہی احساس ہو چلا تھا کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کی نگاہ شوق کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ لیکن پھر اچانک ایک عجیب بات ہوئی..... نیپولین تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ بظاہر سب مہمانوں کو نیپولین کے اس طرح اٹھ کر چلے جانے پر حیرت ہوئی تھی، لیکن سب سے زیادہ حیرت اور خامے دکھ اور صدمے کا باعث میڈم فوری کو بننا پڑا۔ کیونکہ وہ جس انتہاک اور پوری توجہ کے ساتھ نیپولین جیسے بادشاہ کو اپنی طرف گھورتا پارہی تھی، جس سے اس نے بہت سی اچھی اور ”شاہانہ“ امیدیں باندھ لی تھیں۔

تاہم جرنیل کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ آمیز خوف کا شکار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں قہوے کی پیالی تھی جو چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ کچھ قطرے میڈم فوری پر بھی پڑے جس کے باعث اس کی دیدہ زیب و خوشنما فراک خراب ہو گئی۔ جرنیل نے فوراً میڈم فوری سے معذرت کی اور اس کی بیوی نے فوری سے کہا کہ وہ اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کر لے۔ وہاں میرے کئی فراک موجود ہیں۔ وہ پہن کر گھر چلی جانا۔

پالین یعنی میڈم فوری اٹھ کر اندر کمرے میں آ گئی اور ابھی وہ اپنے پہننے کے لیے کسی مناسب لباس کا انتخاب سوچ ہی رہی تھی کہ معاہدہ کین اندر داخل ہوا۔ میڈم فوری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ نیپولین آگے بڑھا اور اپنا ایک طاقتور بازو اس کی سبک کمر کے گرد حائل کر کے ایک طویل بوسہ ثبت کر دیا۔

اس رات وہ بہت دیر تک نیپولین کی خواب گاہ کو اپنے جادو خیز حسن کے گلاب سے مہکائی رہی اور پھر وہاں سے

مہمان

مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ جو کوئی کسی کے گھر آئے تو میزبان اس کو خوش رکھے، تواضع کرے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ بیزار مہمان سے بھی مہمان نوازی کرو۔ اسلام میں مہمان نوازی کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں نظر انداز کرنا کسی کے بس میں نہیں جب میزبان نے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مہمان نوازی کی۔ ایک حدیث میں ہے، جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہو وہ ایک دن اور ایک رات مہمان کی تواضع کرے۔ مہمانی تین دن کی ہوتی ہے اس کے بعد جو بھی تواضع ہوگی وہ صدقہ ہوگی۔ جہاں اسلام میں مہمان کو برا بھلا کہنا منع ہے وہاں مہمان پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ زائد عرصہ کسی کے گھر نہ رہے۔

مرسلہ: نایاب حیدر، لاہور

جاتے وقت اس کے لبوں پہ خوشی کا گیت گنگناہٹ کی صورت میں تھا۔ کہ اس کے دل میں ایک نہایت اہم اور تاریخ کا بڑا راز چھپا ہوا تھا۔

کچھ ایام بیتے۔ پالین کے شوہر لیفٹیننٹ فوری کو ایک بڑی خدمت سپرد کی گئی، اس کے پاس نیپولین کے خفیہ کاغذات تھے۔ وہ ایک شاہی جہاز میں سوار تھا اور فرانس جا رہا تھا۔ مگر وہ اپنی بیوی پالین کو فرانس لے جانے کے بجائے مصر میں ہی رہنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ اس سے اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہونے لگا تھا۔

بہر طور..... لیفٹیننٹ فوری اپنی اس عزت افزائی پر بہت خوش تھا۔ خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا..... مگر اس وقت اس کی یہ ساری خوشی خاک میں مل گئی جب بحر روم میں ایک برطانوی جہاز نے اس کے جہاز پر حملہ کر دیا اور توپوں کے زور پر فرانس کے اس شاہی جہاز پر قبضہ کر لیا۔

تھوڑی دیر گزری، ایک انگریز آفیسر اس کے جہاز پر آیا، اس کے ہمراہ برطانیہ کا مشہور جاسوس باریٹ بھی تھا۔ وہ لیفٹیننٹ فوری کو کمرے میں لے گیا۔ وہاں لے جا کر اس نے لیفٹیننٹ فوری سے کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ یکدم جوش سے سرخ ہو گیا اور بولا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو، مجھے نیپولین اور اپنی بیوی پر



یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف
صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی
نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملتے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید
اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل
رشتہ ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درداستان سرگزشت

قسط: 225

قدر ہستیاں موجود تھیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان کی
فلمی صنعت کے ناقابل فراموش اور انتہائی اعلیٰ کارکردگی
دکھانے والے لوگ ایسے تھے جنہوں نے کبھی کسی انٹرنیٹ یا
فلم کی تعلیم دینے والے ادارے کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ انہوں

قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ ہمیں فلمی صنعت
کے لیے ایک سنہری دور تھا۔ بڑے بڑے نامور اور کامیاب
ہدایت کار، اداکار، موسیقار اور گلوکار اس دور میں انڈین فلمی
صنعت میں موجود تھے۔ ہر شعبے میں دیوقامت اور انتہائی قابل
ماہنامہ سرگزشت

87

مارچ 2014ء

نشانے پر..... ایک وحشیانہ سی خوفناک مسکراہٹ لیفٹیننٹ
فوری کے چہرے پر قصاں تھی، یہی وہ وقت تھا جب یورپ
کے فاتح اعظم کی زندگی اور یورپی قوم کی قسمت..... ایک
معمولی لیفٹیننٹ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے دانت کچکچاتے
ہوئے کہا۔
”یہ کتنا.....! سمجھتا ہے کہ میری بیوی پر ڈاکا ڈال کر
اس کی محبت پر شب خون مارے گا اور میرا آرام و سکون برباد
کر کے خود عیش کرے گا۔ میں ابھی اور اسی وقت اسے موت
کا مزہ چکھائے دیتا ہوں۔“

ساتھ ہی لیفٹیننٹ کے دماغ میں یہ سوچ بھی آئی کہ بیسیوں
جنگوں کا فاتح آج میرے قابو میں اور میرے رحم و کرم پر
ہے۔ اور ابھی یہ میرے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے
میرے قدموں میں گر کر مجھ سے اپنی جان بخشنے کی بھیک
مانگے گا۔ مگر میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا اور اسی
پستول سے اسے گتے کی موت ماروں گا۔“ وہ یہ سوچ ہی رہا
تھا اور ادھر میو لین..... اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالے..... ایک وقار اور شاہانہ استقلال کی تصویر بنا اس کی
طرف دیکھے جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ کی نظریں فاتح اعظم کی
نظروں کی تاب نہ لاسکیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں کی یہ لڑائی
دراصل جبر قوت ارادی اور استقلال کی لڑائی تھی۔ غریب
سپاہی کو ایک شہنشاہ کی خوفناک نگاہوں نے بے دست و پا
کر کے رکھ دیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ شب خوابی کے لباس میں
بھی میو لین اسے اتنا ہی ہولناک اور خوفناک دکھائی دینے لگا
جیسے میدان جنگ میں..... لیفٹیننٹ فوری کے ہاتھ سے بے
اختیار پستول چھوٹ کر گر پڑا۔

”دروازہ کھولو۔“ خواب گاہ کے دم بہ خود ماحول میں
میو لین کی فوجی انداز کی تھمکانے آواز ابھری۔ اور لیفٹیننٹ
فوری نے بے یک جنبش حکم کی تعمیل کی اور خاموشی کے ساتھ
باہر نکل گیا۔

لیفٹیننٹ فوری کو موت کی سزا نہیں دی گئی۔ میو لین
اپنی محبوبہ کے شوہر سے زیادہ انتقام نہیں لے سکا۔ اسے آم
کھانے سے غرض تھی نہ کہ پیڑ گتے سے۔
فاتح اعظم میو لین، اس وقت تک پالین کے حُسن کی
بہاریں لوٹا رہا جب تک اس کی طبیعت دوسری طرف مائل
نہ ہو گئی۔

میو لین کے عشق کا بس یہی انداز تھا۔



مارچ 2014ء

مکمل اعتبار ہے۔ تم دشمن کے جاسوس ہو اور میں ایک دشمن
پر کیسے بھروسہ کروں؟“
بارنیٹ جواباً بولا۔ ”اگر تم چاہو تو سب کچھ اپنی
آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔ میرے ساتھ مصر چلو اور اگر تم نے
ہمت سے کام لیا اور حوصلہ نہیں ہارا تو اپنی بیوی کو اپنے بادشاہ
کی آغوش میں دیکھ لینا۔“
وہ راضی ہو گیا۔

قاہرہ پہنچ کر بارنیٹ..... نے لیفٹیننٹ فوری کو ایک
فحص کے ساتھ کر دیا اور بولا۔ ”جاؤ..... اور جو کچھ میں نے
تم سے کہا ہے اس کا ثبوت اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ
لو..... مگر اس کے لیے تھوڑی ہمت درکار ہوگی۔“
لیفٹیننٹ فوری، میو لین کی خواب گاہ کی طرف گیا اور
نیم خواب پہریداروں سے بچتا بچتا ہوا آگے بڑھا، تھوڑا
آگے جا کر ایک فرانسیسی سپاہی نے اس کی ہوائی آنکھوں سے
اسے دیکھا مگر وردی میں ملفوف دیکھ کر مطمئن ہو کے دوبارہ
اوتھنے لگا۔ فوری سیدھا خواب گاہ کی طرف بڑھا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر اس نے دروازہ ایک ہی
دھکے سے کھول دیا۔ لیفٹیننٹ نے دیکھا اس کی بیوی ایک
سجے سجائے پلنگ پر نیم عریاں حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس
کے سینے میں ٹپش اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ارادہ کیا
کہ اپنے پستول کی ایک ہی گولی سے اس خول صورت و حسین
ناگن کا خاتمہ کر ڈالے۔ مگر پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ
ایسی بے وقامت کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنا چاہیے۔
پستول کی گولی سے اس بے وفا کو مارنا اس پر رحم ہی کرنے
کے مترادف ہوگا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو
ایک ہنر اسے نظر آ گیا۔ اس نے وہ ہنر اٹھایا اور
زپ..... زپ..... بیوی کے عریاں جسم پر برسانا شروع
کر دیا۔

پالین مارے خوف کے خاموش تھی۔ آخر کب تک۔
نازک بدن پر ہنر کی بے رحم ضربات نے بالآخر اس کے منہ
سے چیخ خارج کر دی۔ ایک پہرے دار اس کی چیخ سن کر
دوڑا چلا آیا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے ذرا ہی دیر
بعد ایک اندرونی دروازہ کھلا۔ ایک شخص شب خوابی کے
لباس میں اندر داخل ہوا۔ لیفٹیننٹ فوری نے یکدم عقب
میں پلٹ کر دیکھا۔ وہ میو لین تھا..... اس کی آنکھوں سے
شعلے برسنے لگے اور پاگلوں کی طرح وہ اس کی طرف بڑھا۔
اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور میو لین اس کے

ماہنامہ سرگزشت

86

نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور تجربہ کار لوگوں سے یہ فن سیکھا تھا۔ پونا فلم اسٹی ٹیوٹ کا قیام تو کافی عرصے بعد عمل میں آیا تھا۔ اس سے پہلے پرانے تجربہ کار استاد ہی اپنے شاگردوں کو سکھایا کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی فلمی صنعت نے بہت ہنرمند اور ایسے فن کار اور ہنرمند پیدا کیے جن کی مثال آج بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ ذرا غور کیجئے کہ محبوب خان، شانتا رام، ہمل رائے، گرو دت، کمال امرہوی، راج کپور، اے آر کاردار جیسے ہدایت کار آج کیوں نظر نہیں آتے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی اسکول یا کالج میں فلم کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر لوگ وہ تھے جنہوں نے باقاعدہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم تک حاصل نہیں کی۔ انہیں قدرت نے خود تعلیم دی تھی۔ صلاحیتیں عطا کی تھیں اور انہیں اپنے اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ مثال کے طور پر محبوب خان جیسے ہدایت کار گجراتی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہندوستان کی فلمی صنعت میں جو انوکھے تجربات کیے اور جو بے مثال فلمیں بنائیں انہیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ اردو فلمیں بنانے والا یہ عظیم ہدایت کار اردو زبان نہ پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔

اس زمانے میں جو بھی فلموں میں کام کرنا چاہتا تھا ٹکٹ کٹنا کر سیدھا بمبئی کا راستہ لیتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس نہ پیسا ہوتا تھا نہ سفارش اور نہ ہی تجربہ مگر قسمت آزمائی کا شوق انہیں بمبئی لے جاتا تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ہزاروں نوجوان اداکار بننے کی تمنا لے کر اس شہر پہنچتے تھے۔

ان میں سے اکثر خالی ہاتھ اور خالی جیب ہوتے تھے۔ بمبئی جیسے بڑے اور وسیع شہر میں کسی انجانے کم عمر لڑکے کو رہنے سہنے اور کھانے پینے کے لالے پڑ جاتے تھے۔ عموماً ان کی جیبوں میں ایک روپیہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اللہ پر توکل کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ بمبئی جیسے لاکھوں انسانوں کے سمندر میں یہ کود پڑتے تھے۔

محبوب خان اپنے گاؤں سے چند روپے لے کر بمبئی گئے تھے۔ ان کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے مسجدوں میں بیسرا کیا۔ راتوں کو بمبئی کی کشادہ سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر بستر کے بغیر سوئے۔ درجنوں پھیرے لگانے کے بعد فلم اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہاں مزدوروں، قلیوں اور سامان اٹھانے کا کام

کرنے کو ملا۔ قسمت نے یاوری کی تو ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے لگے۔ پھر قدرت نے مزید مواقع فراہم کیے۔ محبوب خان کی کہانی انوکھی نہیں ہے۔ ہمارے فلم ساز و ہدایت کار لقمان دہلی سے چند روپے لے کر بمبئی پہنچے۔ فلموں کا جنون تھا، اس وقت ان کی عمر پندرہ برس ہوئی۔ انہوں نے بھی بمبئی میں فلموں کے اسٹوڈیو کے اندر قدم رکھنے کے لیے بہت پاؤں پیلے۔ ان کی اور محبوب خان کی کہانی معمولی سے فرق کے ساتھ ایک جیسی ہے۔ فلم اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے کا موقع ملا تو انہوں نے بھی مزدوروں اور قلیوں جیسے کام کیے۔ پھر کس طرح قسمت نے مہربانی کی یہ کہانی آپ پہلے سن چکے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی اردو لکھنے پڑھنے تک محدود تھی۔ 1940ء کے بعد سے لے کر قیام پاکستان تک اور اس کے بعد کا دور انڈین فلم انڈسٹری میں عروج اور کامیابیوں کا دور تھا۔ یہ سب کارنامے ایسے ہی سر پھروں نے سرانجام دیے تھے، آج ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ ان کے بارے میں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ انہیں انڈین فلموں کے عظیم ترین نام کہا جاتا ہے مگر ان میں سے کسی نے کسی فلم اسٹی ٹیوٹ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ جو بھی سیکھا اپنے استادوں سے سیکھا جنہوں نے اپنے استادوں سے سیکھا تھا۔ یہی لوگ آج انڈین فلم انڈسٹری کے چاند سورج کہے جاتے ہیں جنہوں نے بے شمار چمکدار ستاروں کو روشنی دے کر صنعت کے آسمان پر جگمگا دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بھی اکثر بڑے ممتاز، مشہور اور معروف لوگوں کی زندگیاں ایسے ہی واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ آئیے آج آپ کو ایک ایسے ہی معروف اور ممتاز آدمی کی کہانی سناتے ہیں۔ جسے برصغیر کا بچہ بچہ جانتا ہے لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آئے تھے اور کیسے کیسے امتحانوں اور آزمائشوں سے انہیں گزرتا پڑا تھا۔

یہ قصہ سنیل دت کا ہے جس کا بیٹا بچے دت محض اس جرم میں پانچ سال کی سزا کاٹ رہا ہے کہ اس کے گھر سے ایک بغیر لائسنس کی بندوق برآمد ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اٹھارہ ماہ کی سزا کاٹ چکا ہے۔ دراصل اس کا جرم یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان اور ایسے ہندو باپ کا بیٹا ہے جو مذہبی تعصب کے خلاف ہندوستان بھر میں ریلیاں نکالتا رہا ہے۔ بچے دت کی ماں نرگس ایک مسلمان تھی۔ اس کا باپ بھی ایک ہندو تھا جو مسلمان ہو چکا تھا۔ سنیل دت نے بھی ایک باپ



گرو دت

اپنے انڈیو میں کہا تھا کہ اس کا دادا مسلمان ہو گیا تھا۔ سنیل دت ہندوستانی لوگ سبھا کارکن رہا۔ نرگس بھی لوگ سبھا کی رکن رہی تھیں۔ ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی سے ان کی بہت دوستی تھی۔ اب نرگس نہیں رہیں نہ اندرا گاندھی۔ سنیل دت بھی نہیں رہے۔ اب ان کا بیٹا بچے دت رہ گیا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف مظالم کے خلاف آواز اٹھاتا رہتا ہے۔ آج کل وہ ایک جیل خانے میں عام قیدیوں کی طرح قید ہے۔ تین ساڑھے تین سال بعد جب وہ جیل سے رہا ہوگا تو اس کی عمر پچاس سال سے زائد ہوگی۔ پھر شاید وہ ہیرو کا کردار ادا نہ کر سکے گا۔ لیکن ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے جب وہ اٹھارہ ماہ بعد جیل سے باہر آیا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد اس نے جس پہلی فلم میں کام کیا اس کا نام ”کھل ناٹیک“ تھا۔ اس فلم میں اس نے ایک مجرم اور قانون شکن کا کردار ادا کیا تھا۔ یاد دہوری ڈکٹ اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ یہ فلم سپر ہٹ ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ جس فلم میں کام کرے وہ بھی سپر ہٹ ہو جائے۔ دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم تو آپ کو سنیل دت کی داستان سن رہے تھے۔

سنیل دت نے ایک انڈیو میں بتایا کہ جب وہ بمبئی پہنچے تو ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ یہ انڈیو بمبئی کی ایک فلمی صحافی نے چندنی نے لیا تھا اور یہ سنیل دت کا آخری انڈیو تھا۔

سنیل دت جب بمبئی پہنچے تو ان کی جیب میں پندرہ بیس روپے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بمبئی میں در بدر پھرتے رہے۔ سب سے پہلا مسئلہ تو سر چھپانے کا تھا۔ بمبئی میں سردی تو نہیں ہوتی لیکن بارش ہوتی رہتی ہے جو فٹ پاتھوں پر سونے والوں کے لیے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ بارش

ہو جائے تو یا تو وہ سامنے کی عمارتوں کے برآمدے وغیرہ میں پناہ لیتے ہیں یا پھر فٹ پاتھوں پر ہی بیٹھتے رہتے ہیں۔ سوال: تو پھر آپ نے کیا کیا۔ کہاں رہے؟ جواب: رہنا کیا تھا۔ فٹ پاتھوں پر راتیں گزارتا رہا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ دن کے وقت فلم اسٹوڈیو کے چکر لگاتا رہا مگر اندر داخل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ آخر مجھے کالا گھوڑا کے علاقے میں ایک عمارت میں ایک کمرال گیا۔ مگر یہ کمرات میرا نہیں تھا۔ اس ایک کمرے میں آٹھ افراد رہتے تھے جن میں درزی، نائی ہر قسم کے لوگ رات گزارنے کے لیے رہتے تھے۔

میں نے اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے مجھے ہر مہینے کچھ روپیہ بھیجنا شروع کر دیا۔ میں نے بے ہند کالج میں داخلہ لے لیا تاکہ کم از کم بی اے تو کر لوں۔

میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ آپ خواہ ہندو ہوں، مسلمان، سکھ یا عیسائی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں مگر ایک دوسرے سے محبت کریں۔ ہر مذہب محبت اور پیار کرنا سکھاتا ہے۔ لڑائی جھگڑا اور نفرت کرنا نہیں۔ میں کالج میں پڑھنے کے ساتھ ہی بمبئی ٹرانسپورٹ کمپنی میں بھی کام کرتا تھا۔ میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا تھا اور گھر والوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔

ان دنوں بمبئی میں بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اتنی شدید گرمی میں ایک ہی کمرے میں آٹھ آدمی کیسے سو سکتے تھے۔ گرمی کی وجہ سے ہمارا دم گھٹنے لگتا تھا تو ہم رات کو سونے کے لیے فٹ پاتھ پر چلے جاتے تھے۔ یہ فٹ پاتھ ایک ایرانی ہوٹل کے سامنے تھا۔ ایرانی ہوٹل صبح ساڑھے پانچ بجے کھلتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ساڑھے پنج بجے بیدار ہو جانا چاہیے تھا۔ ہوٹل کھلتے ہی ہماری آنکھ بھی کھل جاتی تھی۔ ایرانی ہوٹل کا مالک ہمیں دیکھ کر مسکراتا اور چائے



سنیل دت نکاح کے موقع پر



سینل دت کا آخری دیدار

عورتوں سے بھی ملا جنہیں میں نے دس بارہ سال کی بچیاں دیکھا تھا مگر اب وہ ساٹھ بیسٹھ سال کی بوڑھی عورتیں ہو چکی تھیں۔ اب وہ میرے ساتھ کھینے والی بچیاں نانی دادی بن چکی تھیں۔ انہوں نے بھی بچپن کے بہت سے دلچسپ واقعات اور شرارتوں کی یادیں تازہ کیں۔ اس ماحول میں جا کر میں تازہ دم ہو گیا۔ مجھے بمبئی میں اتنا مزہ نہیں آیا تھا جتنا کہ اس کھلی فضا اور پاس ہی دریا کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر رہا تھا۔

سب میرے بھائی کو پیار سے سو موکہ کر پکارا کرتے تھے۔ گاؤں والوں نے مجھ سے سو مو کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ کیسا ہے کیا کرتا ہے۔ انہوں نے میری بہن رانی اور بیوی کلوتی کے بارے میں بھی پوچھا۔ اگر وہ مجھ سے اداکار کی حیثیت سے مل رہے تھے تو انہیں میرے گھر والوں سے کیا مطلب تھا؟ مطلب نہیں یہ لگاؤ تھا جو سادہ دل گاؤں والوں میں ہوتا ہے۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ میرے والد اور والدہ فوت ہو چکے ہیں تو وہ سب غمگین ہونے لگے اور ان کی باتیں یاد کرنے لگے۔ پنجاب میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو عورتیں سینہ پیٹتی ہیں۔ جب میں نے انہیں پتا جی اور ماتاجی کے مرنے کے بارے میں بتایا تو عورتوں نے سینہ پیٹنا شروع کر دیا جیسے کہ ان کا اپنا کوئی رشتہ دار مر گیا ہے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دنیا میں ایسی بے لوث محبت کہاں نظر آتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ پچاس سال بعد لوگ مجھے اور میرے گھر والوں کو بھول چکے ہوں گے مگر میرا خیال درست نہیں تھا۔ پچاس سال میں تو بہت سے لوگ اپنے حقیقی رشتے داروں کو بھی بھول جاتے ہیں۔

تو ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر ہر ایک اس رروڑ کے واقعات سنا تا۔ کبھی ہم اداس ہو جاتے اور کبھی ہنستے اور خوش ہو جاتے۔ ان دنوں کی یادیں اب کتنی پر لطف اور دلچسپ لگتی ہیں۔

میں پچاس سال کے بعد اپنا آبائی گاؤں دیکھنے گیا جو کہ اب پاکستان میں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وزیراعظم نواز شریف نے مجھے مدعو کیا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ میں اپنا آبائی گاؤں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت مہربان اور شفیق ہیں۔ انہوں نے میرے لیے تمام انتظامات کرادیے۔ میرے گاؤں کا نام خورد ہے۔ یہ جہلم شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا گاؤں دریائے جہلم کے کنارے پر ہے اور یہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ گاؤں سے نکلے ہی جہلم کے پانی کا بہتا ہوا نظارہ قابل دید ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ پاکستان کے لوگ بہت پر خلوص اور محبت کرنے والے ہیں۔ ہمارے عام لوگوں کی طرح۔ میں جب اپنے گاؤں پہنچا تو سارا گاؤں مجھ سے ملنے کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ انہوں نے میری اور خاندان کی خیریت دریافت کی۔ کچھ بوڑھے لوگوں نے مجھے میرے بچپن کے واقعات سنائے اور بتایا کہ ہم سب اس زمانے میں مل کر کتنے خوش رہا کرتے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے اسی لیے اکٹھے ہو گئے ہیں کہ میں ایک اداکار ہوں اور ان میں سے بہت سوں نے میری فلمیں دیکھی ہوں گی اور میرے بارے میں سنا اور پڑھا ہوگا لیکن کچھ دیر بہت میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ اپنے ایک پرانے چمچڑے ہوئے ساٹھی سے ملنے آئے تھے۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے اپنے آبائی گاؤں کو یاد رکھا اور اتنی دور سے صرف گاؤں دیکھنے اور گاؤں والوں سے ملنے آیا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک چمچڑا ہوا رشتے دار آ گیا ہے اور مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسے میں کافی عرصے بعد اپنے رشتے داروں سے ملنے آیا ہوں۔ ہم گاؤں کے لوگ بہت مخلص اور پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔

گاؤں کے نوجوانوں نے ہاتھوں میں کپڑے کا ایک بڑا بنیر اٹھا رکھا تھا جس پر لکھا تھا ”سینل دت! ہمارے گاؤں خور میں خوش آمدید“ بعد میں انہوں نے یہ بنیر لپیٹ کر مجھے دے دیا۔

میرے گاؤں میں بہت جوش و خروش اور محبت ملی۔ وہ سب لڑکے جو میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور ہم نے پرانی یادیں تازہ کیں۔ میں ان



سینل دت، نرگس اور بچے دت

کر کرے بسکٹ ہوتے تھے۔ چائے کے ساتھ یہ کر کرے بسکٹ کھانے میں بہت مزہ آتا تھا۔

اس وقت ہماری چپ صرف ایرانی کیفے میں کھانے پینے کی ہی اجازت دیتی تھی۔ آج کے نوجوان فائبر اشار ہوٹلوں میں جا کر لطف اٹھاتے ہیں مگر ان دنوں ایرانی کیفے ہی ہمارے لیے کھانے پینے اور گپ شپ کرنے کی بہترین جگہ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ویٹر ایک کے اوپر ایک بارہ چائے کی پیالیاں رکھ کر کیسے چائے کی پیالیاں گاہکوں کو تقسیم کرتا تھا۔ ایسا تو کوئی سرکس کا جوکر ہی کر سکتا ہے۔ اس کا یہ تماشا بار بار دیکھنے کے لیے میں بار بار اس سے چائے منگواتا تھا حالانکہ بجٹ اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ بھی خوش مزاج اور ہنس کھ آدی تھا۔ سبھی گاہکوں سے اس کی دوستی تھی۔ وہ فارسی ملا کر اردو بولتا تھا تو بہت مزیدار لہجہ لگتا تھا۔ وہ جب چائے کی بارہ پیالیاں ایک ساتھ اٹھا کر چلے اور ایک ایک پیالی لوگوں کو دیتا جاتا تھا تو کبھی ایسا نہیں کہ کوئی ایک پیالی کری ہو یہاں تک کہ چائے کی ایک بوتل تک طشتری میں نہیں گرتی تھی۔ جب وہ چائے کی بارہ پیالیاں ایک کے اوپر رکھ کر چلتا تو میرے لیے یہ ایک دلچسپ تماشا ہوتا تھا اور جب تک وہ آخری پیالی گاہک کو نہ دے دیتا میں یہ تماشا دیکھتا رہتا تھا۔

ایرانی ہوٹل اس زمانے میں مجھ ایسے جدوجہد کرنے والے خالی جیب لوگوں کے لیے بہت بڑا سہارا ہوتے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر بمبئی میں ایرانی ہوٹل نہ ہوتے تو میرے جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ تو مری جاتے۔ ان کی چائے بہت مزیدار بالائی والی ہوتی تھی۔ ان کے بسکٹ بہت مزیدار ہوتے تھے اور بریڈرول کا تو مزہ ہی الگ ہوتا تھا۔ شام کو جب ہم سب اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے

بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ ہم سب اٹھ کر اس کے چھوٹے سے ریسٹوران میں چلے جاتے اور گرم گرم چائے کی ایک پیالی پیتے۔ اس طرح ہم ایرانی ہوٹل کے مالک کے سب سے پہلے گاہک ہوا کرتے تھے۔ وہ ہم سے بہت محبت سے پیش آتا تھا اور اکثر ہماری حوصلہ افزائی کے لیے کہا کرتا تھا کہ فکر نہ کرو، اللہ نے چاہا تو تم کسی دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ دیکھو جب بڑے آدمی بن جاؤ تو مجھے بھول نہ جانا۔ کبھی کبھی ایرانی چائے پینے اور مجھ سے ملنے کے لیے آ جایا کرتا۔

دوسروں کا تو علم نہیں مگر میں کبھی کبھی جنوبی بمبئی میں اس سے ملنے اور ایک کپ ایرانی چائے پینے کے لیے چلا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوتا تھا۔ میری ترقی پر وہ بہت خوش تھا۔

ایرانی چائے پینے کے بعد میں اپنی صبح کی کلاس کے لیے کالج چلا جاتا تھا۔ وہ بھی خوب دن تھے۔ اب یاد کرتا ہوں تو بہت لطف آتا ہے۔

ان دنوں میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہوتے تھے اس لیے میں کم سے کم خرچ کرتا تھا اور کالج جانے کے لیے بھی سب سے سستا ٹکٹ خریدتا تھا۔ بعض اوقات تو میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اسٹاپ سے پہلے ہی اتر کر پیدل کالج چلا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میں دو اور ریسٹورانوں میں بھی جایا کرتا تھا۔ یہ خدا داد سرکل میں تھے۔ یہ بھی ایرانی ہوٹل تھا۔ ایرانی کیفے کی چائے پینے اور وہاں کے بسکٹ کھانے کا ایک الگ ہی مزہ تھا۔ یہ ایرانی کیفے بہت غریب پرور ہوتے ہیں۔ سستے داموں مزیدار چائے اور ساتھ میں نمکین بسکٹ کھلاتے تھے۔

چرچ گیٹ اسٹیشن کے پاس بھی ایک کیفے تھا۔ ایرانی چائے کے ساتھ یہاں ”کھاری“ بھی ملتے تھے۔ یہ بڑے



سینل دت، نرگس اپنے بچوں کے ہمراہ



دیواند

بمل رائے

وی شاندارام

نرگس اور سنیل دت کی محبت ایک سچی محبت ہے
نوجو بابا کو صحیح راستے پر دیکھنا تمنا ہے
سنیل دت کی مشہور فلمیں۔

مدرانڈیا، میرا سایہ، وقت، سادھنا، سجاتا، بڑوسن، ممتا
بھائی ایم بی بی ایس، مجھے جینے دو، ریشماں اور شیرا۔ سنیل
دت نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی محنت مزدوری اور جدوجہد کے
زمانے میں جاری رکھا تھا جو ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ بی
اے کرنے کے بعد انہوں نے بہت سے چھوٹے موٹے کام
کیے۔ فٹ پاتھوں پر سونے لیکن ہمت نہیں ہاری۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک زمانے میں ”ریڈیو سیلون“
سے فلمی گانوں کا ایک پروگرام ہر روز پیش کیا جاتا تھا جسے
پاکستان اور ہندوستان میں موسیقی کے شوقین باقاعدگی سے
سنا کرتے تھے۔ سیلون کا نام بعد میں سری لنکا ہو گیا۔ یہ
دراصل ایک جزیرہ ہے جنوبی ہندوستان میں تامل ناڈو کے
ساحل سے صرف 25 میل کے فاصلے پر۔ انگریزوں کی
حکومت کے زمانے میں سارا ہندوستان ایک تھا اور سلطنت
برطانیہ کے زمانے میں سیلون کو ہندوستان ہی کا حصہ سمجھا
جاتا تھا۔ اب یہ سری لنکا ہو گیا۔

ریڈیو سیلون کو اپنا پروگرام پیش کرنے کے لیے ایک
موزوں شخص کی ضرورت تھی جو بہترین نعمات پروڈیوسرز
سے حاصل بھی کر سکے۔ سنیل دت نے بھی اس کے لیے
درخواست دے دی۔ صورت شکل اچھی تھی اور پنجابی ہونے
کے باوجود ان کا اردو تلفظ ولولہ بہت اچھا تھا۔

اس طرح انہیں منتخب کر لیا گیا اور کافی عرصہ تک وہ
ریڈیو سیلون سے ”گیتوں کی مالا“ پیش کرتے رہے۔ یہ فلم
سازوں کے لیے سستی پبلیٹی تھی اس لیے بھارتی فلم سازوں
نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا اور کشمیر سے راس کمار کی تک

بیماری نے انہیں موقع نہیں دیا اور وہ پاکستان جانے کی
حسرت ہی لے کر چلی گئیں۔

میں دل سے سمجھتا ہوں کہ ہمارے دونوں ملکوں کے
درمیان بہت اچھے تعلقات ہونے چاہئیں۔ اگر ایسی کوئی
تحریک چلائی جاتی ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ نفرت ختم
ہونی چاہیے۔ ہم دوست بن کر کیوں نہیں رہ سکتے۔ ویسے بھی
میں انہما کا قائل ہوں۔ یعنی امن اور سکون۔ الگ الگ
مذہب ہونے کے باوجود ہم محبت پیار سے رہ سکتے ہیں۔
مذہب جو بھی ہو ہم انسان بھی تو ہیں دوستی ہوگی تو دونوں
ملکوں کو معاشی فائدہ ہوگا۔ میں اس سلسلے میں کچھ کام کر سکوں
اور دوپٹھڑے ہوئے ناراض دوستوں کو ملا سکوں۔

میری خواہش ہے کہ ہم دونوں ملک ترقی کریں
خوشحال ہوں۔ ہماری معیشت پر دوسرے رشک کریں۔
بے روزگاری اور جرائم کا خاتمہ ہو جائے۔ کچھ بھی ہو یہ
نفرت اور بے اعتمادی اب ختم ہونی چاہئے۔ اسلحہ پر خرچ
ہونے والی رقم تعلیم، صحت اور لوگوں کو صاف پانی فراہم
کرنے کے لیے استعمال ہو۔ ہمارا مذہب کوئی بھی ہو۔ ہمارا
میل جول اور محبت قائم رہنی چاہئے۔

اگر ہمسائے کے ساتھ دوستی نہ ہو تو ہم ترقی نہیں
کر سکتے۔ امریکا اور کینیڈا کے تعلقات دیکھ لیجئے۔ دونوں
ملک ایک دوسرے کے کام آئیں۔ اس بارے میں انہوں
نے جو اقوال چھوڑے ہیں وہ پیش ہیں۔

نرگس ہر وقت میرے خیالوں میں رہتی ہیں
کشمیر میں اسلحہ بردار امن کے خواہاں ہیں
تشدد کا ٹکریس کی پالیسی نہیں ہونی چاہئے
نوجوانوں کو عقل سے کام لینا چاہئے
نوجوانوں کو حقائق کا اندازہ کرنا چاہئے



پھر وہ مجھے کھیتوں میں لے گئے
انہوں نے کہا ”بالا“ یہ زمینیں تیری ہیں
بچپن میں یار دوست مجھے بالا کہا کرتے
تھے۔

میں نے کہا۔ ”نہیں، یہ زمینیں تمہاری
ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”نہیں تم یہاں آ جاؤ، ہم
تمہاری زمینیں تمہیں دے دیں گے۔“ میں نے
محسوس کیا کہ یہ محض زبانی باتیں نہیں تھیں۔ وہ
اپنے دل سے یہ کہہ رہے تھے۔ ان کی باتوں میں
پیار اور خلوص کی خوشبو تھی۔ میں ایک ایکٹر اور
ڈائریکٹر ہوں۔ چہرے سے دلوں کا اندازہ لگا سکتا

ہوں۔ یہ جان لیتا ہوں کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔
میں نے پوچھا۔ ”آپ لوگ میرا اتنا احترام کیوں
کر رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے۔ ہمارے
گاؤں کے پاس ایک درگاہ ہے۔ ہم سب ان کی عزت
کرتے ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار بھی جب درگاہ کے پاس
سے گزرتے ہیں تو اپنے گھوڑوں سے اتر جاتے ہیں۔
دراصل درگاہ میں سوئے ہوئے بزرگ کا احترام کرتے
ہیں۔ درگاہ کے بزرگ نے ہمیں اتنی عزت دی ہے کہ ہم
ان کی عزت کیوں نہ کریں۔“

میرے پتا جی مرگئے تھے جس وقت میں پانچ سال کا
تھا۔ اس کے باوجود ہم اطمینان سے گاؤں میں رہا کرتے
تھے۔ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ اس گاؤں میں مسلمان زیادہ
اور ہندو کم تھے۔ قیام پاکستان کے وقت جو فسادات
ہوئے۔ ان دنوں میں مسلمانوں نے ہماری حفاظت کی اور
ہماری جانیں بچائیں۔ میرے والد کے مسلمان دوست کا
نام یعقوب تھا۔ وہ ہمارے گاؤں سے ڈیڑھ میل دور رہتے
تھے۔ انہوں نے ہمیں جہلم شہر تک پہنچانے کے لیے بہت
اچھا بندوبست کیا تھا اور بہت حفاظت سے ہمیں کمپ میں
پہنچایا تھا۔ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد پاکستان سے
آ گیا تھا۔

پاکستان سے جانے کے بعد میں کبھی لاہور نہیں آیا۔
کراچی تو آنا ہوا تھا۔ کراچی میں مجھے بے نظیر بھٹو کی شادی
میں مدعو کیا گیا تھا۔ میری بیوی نرگس میرا گاؤں دیکھنا چاہتی
تھیں۔ میں بھی اپنا گاؤں دیکھنا چاہتا تھا۔ پرانے دوستوں

قلم پاکیزہ کا ایک منظر

سے مل کر پرانی یادیں تازہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا چاہتی تھیں
کہ میں کون سے اسکول میں پڑھتا تھا اور اسکول کس طرح
چلایا کرتا تھا۔ (میری بیوی کا انتقال 1981ء میں ہوا تھا)
دراصل میں نے انہیں اپنے بچپن اور گاؤں کی باتیں اتنی
سنائی تھیں کہ انہیں وہاں جانے کی خواہش ہو گئی تھی مگر ایسا نہ
ہو سکا۔

میں DAV اسکول میں پڑھتا تھا اور چھٹی جماعت
تک گھوڑے پر بیٹھ کر اسکول جاتا تھا، میرا اسکول آٹھ میل
دور تھا۔ اسکول جانے کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔
میرے پتا جی زمیندار تھے۔ ہمارے گھر میں بہت سے
گھوڑے تھے۔ مجھے اسکول لے جانے والا گھوڑا سب سے
الگ رکھا جاتا تھا۔

راولپنڈی کے ڈی اے وی اسکول میں بھی میں نے
ایک سال پڑھا تھا۔

میرا اسکول مری روڈ پر تھا۔ مری کچھ دور نہیں تھا۔
میں اسے کوہ مری کہا کرتا تھا۔ کوہ کا مطلب ہے پہاڑ۔ مری
جانے کے لیے ہم بس کے ذریعے جایا کرتے تھے۔

ہمارے اسکول کے راستے میں مشہور گارڈن کالج بھی
تھا۔ ہم گارڈن کالج سے گزر کر اپنے اسکول جایا کرتے
تھے۔ گارڈن کالج بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔

راولپنڈی میں ہمارے کچھ رشتے دار بھی رہتے تھے۔
یہ علاقہ نیا محلہ کہلاتا تھا۔ میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ
رہتا تھا۔ ہمیں اس زمانے میں فلمیں دیکھنے کی اجازت نہیں
تھی۔ اس لیے ہم پوسٹر دیکھ کر دل خوش کر لیا کرتے تھے۔

میری بیگم یہ سب کچھ دیکھنا چاہتی تھیں مگر بد قسمتی سے

ان کے فلمی نعماں گونجنے لگے۔ جب نخب صاحب پاکستان آئے اور انہوں نے فلم میخانہ بنائی تو اس فلم کے گانے ریڈیو سیلون سے پیش کیے گئے جس کی وجہ سے سننے والے بے چینی سے فلم کی نمائش کا انتظار کرتے رہے لیکن جب فلم ریلیز ہوئی تو بری طرح فلاپ ہو گئی حالانکہ ناشاد صاحب نے اس فلم کے نعموں کی بہت اچھی دھنیں بنائی تھیں۔ یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ ناشاد کو موسیقار بنانے کا سہرا نخب صاحب کے سر تھا۔ ناشاد صاحب سازندوں میں شامل تھے اور بہت اچھا ہارمونیم اور طبلہ بجاتے تھے۔ ان کا نام سید شوکت علی تھا۔

نخب صاحب نے اپنی فلم کے لیے نوشاد صاحب سے رابطہ کیا لیکن وہ مصروفیت کے باعث وقت نہ دے سکے۔ نخب مرحوم بہت بڑے اور سخی خورے تھے۔ انہوں نے نوشاد صاحب سے کہا کہ میں اپنی شاعری کے بل پر آپ جیسے کئی موسیقار بنا سکتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فلم کی موسیقی بنانے کے لیے شوکت علی کا انتخاب کیا اور ان کا فلمی نام ناشاد رکھ دیا جس سے ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ معمولی سی تبدیلی عام لوگ محسوس نہیں کر پائیں گے۔ نخب صاحب کی فلم زندگی یا طوفان، کی موسیقی ناشاد صاحب نے بنائی تھی اور یہ فلم نہ صرف ہٹ ہوئی تھی بلکہ موسیقار کی حیثیت سے ناشاد کا نام بھی مشہور ہوا۔ انہوں نے بعد میں اور بھی کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ ممتاز موسیقاروں میں شامل تھے۔ ان کی دھنیں سادہ اور راگ راگینوں پر مشتمل ہوتی تھیں اس لیے بہت مقبول ہوئی تھیں۔ ناشاد کی موسیقی ناقابل فراموش ہے۔ وہ سیدھے سادے محسوس آدئی تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک فلم بھی بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انہوں نے فلم سازی کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔ سنیل دت کے تذکرے سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

لاہور قیام پاکستان سے پہلے بھی ملک کا فلمی مرکز تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے اہل علم و دانش اور فن کار لاہور کو اپنا بسیرا بناتے تھے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بمبئی کو اعلیٰ دماغوں اور فن کاروں سے سجانے کا سہرا بھی لاہور ہی کے سر ہے۔ لاہور سارے پنجاب کا اعصابی مرکز تھا۔ یہاں تک کہ پشاور سے فن کار بننے کی خواہش لیے ہوئے بھی اہل فن لاہور ہی کا رخ کرتے تھے۔ یہاں تعلیم

حاصل کرتے تھے۔ علم و ادب میں نام پیدا کرتے تھے۔ مختلف فنون کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ سنیل دت کی لاہور سے محبت اور اپنے پرانے آقاں گاؤں سے عقیدت کے واقعات آپ سن چکے ہیں۔ آپ اب ایسے فنکار کے بارے میں مختصر آیتا جا رہا ہے جو لاہور میں پلا بڑھا۔ لاہور کے مشہور اور معروف گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور پھر روشن مستقبل کی تلاش میں بمبئی کا رخ کیا۔ اس فنکار کا نام دیو آنند تھا۔ دیو آنند کے خاندان کوفن سے محبت درے میں ملی تھی۔ دیو آنند کے اور بھائی چیتن آنند اور کیتن آنند نے بھی لاہور ہی میں اپنے فن کو چلا دی تھی۔ یہ لوگ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے برصغیر کی فلمی صنعت کو وقار اور نام دینے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ چیتن آنند کی فلم ”نچاگر“ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے بین الاقوامی فلمی میلوں میں دکھایا گیا اور ہندوستان کی فلمی صنعت کا باقی دنیا سے تعارف کرایا گیا۔

دیو آنند نے 83 سال کی عمر میں اپنی خود نوشت لکھی تھی۔ اس کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اپنی سوانح عمری میں انہوں نے اپنی زندگی، فلمی سفر اور اپنے ہم عصر اداکاروں اور ہنرمندوں کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا۔ دیو آنند ایک کشادہ دل اور غیر متعصب انسان تھے اور اپنی رائے کا بہت دیانت اور خلوص کے ساتھ اظہار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے واضح الفاظ میں اپنی سوانح میں لکھا کہ دلپ کمار انڈیا کے سب سے عظیم اداکار ہیں۔ یہ خیال رہے کہ سن 50 اور 60 کی دہائی میں دلپ کمار، دیو آنند اور راج کپور تین بڑے اور نامور اداکار کہلاتے تھے۔ دیو آنند نے خود بھی فلم سازی کی اور بہت خوبصورت اور یادگار فلمیں بنائیں۔ راج کپور کو ہندوستان کا سب سے بڑا ”شو ماسٹر“ کہا جاتا تھا۔ فلمی اخباروں میں ان تینوں کے اختلافات اور رومانی معرکوں کے واقعات بھی بیان کیے جاتے تھے لیکن درحقیقت ان کے آپس میں بہت اچھے اور دوستانہ تعلقات تھے۔

دیو آنند اس لحاظ سے دوسرے اداکاروں اور فلم سازوں سے مختلف تھے کہ وہ فلمی تقاریب اور دوسری محفلوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان کے ملاقاتیوں اور دوستوں کی تعداد بہت محدود تھی جس سے وہ باہر نہیں جاتے تھے۔ وہ اداکاری، فلم سازی اور پھر ہدایت کاری میں مصروف رہتے



شیام کمار

تھے۔ فلم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ آخر دم تک وہ کام میں مصروف رہے۔

دیو آنند کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ظاہر یہ کرنا ہے کہ دیو آنند دوسرے بہت سے پنجابی فن کاروں کی طرح لاہور میں رہے تھے اور لاہور سے جانے کے بعد بھی لاہور کی یادیں ان کے دل سے نہ نکل سکیں۔ لاہور والے بھی انہیں بہت پسند کرتے تھے۔

دیو آنند 26 ستمبر 1923ء کو لاہور سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں گھروڈہ میں پیدا ہوئے تھے۔ گھروڈہ ضلع پٹھان کوٹ میں ہے۔ اس وقت پٹھان کوٹ ضلع نہیں تھا تحصیل تھی۔ جو ضلع گرداسپور میں واقع تھا۔ ان کا بچپن اور لڑکپن گرداسپور میں گزرا جہاں ان کے والد وکالت کرتے تھے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اس لیے میٹرک پاس کرنے کے بعد دیو آنند کو گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا۔ لاہور میں رہ کر ان کی صلاحیتیں اور زیادہ نکھر گئیں اور ان کی شخصیت کی تعمیر گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہوئی۔

2007ء میں ان کی خود نوشت سوانح عمری دہلی سے شائع کی گئی۔ اس کا نام Roman cing with life ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں

لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے معلوم ہوا کہ دیو آنند کی پہلی محبت ان کی ایک کلاس فیلو ایشا چوہڑہ تھی لیکن یہ سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ دیو آنند نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بمبئی کا رخ کیا۔ لاہور سے دیو آنند 1943ء میں بمبئی گیا تھا۔ اس کے بعد دیو آنند پہلی بار 1999ء میں سمجھوتا بس کے ذریعے بھارتی وزیراعظم واجپائی کے ساتھ لاہور آیا۔ جب اس نے لاہور کی سڑک پر قدم رکھا تو جذبات کی شدت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف نے اس کا خصوصی طور پر استقبال کیا۔

بمبئی میں دیو آنند نے بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ دراصل دیو آنند نے اپنے آغاز کی فلموں میں انگریز بینک مین کا کردار ادا کیا جو کہ بعد میں ایسا بھ بچن نے اپنا کر بہت مقبولیت حاصل کی۔ دیو آنند نے بہت جلد اپنی کارکردگی کی وجہ سے ہندوستان کے تین بڑے اداکاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کر لیا۔ دیو آنند کی فلمیں پاکستان آیا کرتی تھیں اور بہت مقبول تھیں۔ ضدی، بازی، جال، آرام، سزا، ٹیکسی ڈرائیور، ہاؤس نمبر 44 اور دوسری فلموں کی وجہ سے وہ سارے برصغیر میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی۔ کچھ عرصے بعد ویڈیو اور سی ڈیز کی وجہ سے پاکستان میں بھارتی فلمیں دیکھی جانے لگیں۔ اس طرح پاکستانیوں کو سی ڈی، کالا پانی، ہم دونوں، گائیڈ اور کئی دوسری مشہور فلمیں دیکھنے کا موقع ملا۔

دیو آنند نے لاہور سے بمبئی جا کر اداکاری شروع کی تو اداکارہ اور گلوکارہ ثریا کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں ڈوب گئے۔ ثریا اپنے دور کی مقبول اداکارہ اور گلوکارہ تھیں۔ اس وقت بمبئی کی فلمی صنعت میں دفن کارائیں ایسی تھیں جو کہ ہیروئن بھی تھیں اور اپنی آواز کا جادو ایسے جگاتی تھیں کہ ایک دنیا ان کی دیوانی تھی۔ ان میں ایک تو نور جہاں تھیں اور دوسری ثریا۔ ثریا نے بہت سی یادگار فلموں میں کام کیا۔ ان کی آواز نور جہاں اور دوسری گلوکاراؤں سے مختلف تھی۔ ثریا کی آواز میں ایک ایسی لگاؤ اور کشش تھی جو دوسری گلوکاراؤں میں نہ تھی۔

بہر حال، جب دیو آنند نے ثریا کے ساتھ کام کیا تو

ان کی باتوں اور دلکش شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ ثریا کی شخصیت میں جو حسن اور کشش تھی اس نے سارے ہندوستان کو پاگل بنا رکھا تھا۔ ثریا اور نور جہاں اس زمانے میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والی فن کارائیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ نور جہاں کے پاکستان چلے آنے کے بعد ثریا کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ لیکن بعد میں نئی گلوکارائیں فلمی صنعت میں شامل ہوئیں۔ خاص طور پر رتنا سنگھ اور آشا بھونسلے نے شہساز بیگم جیسی گلوکارہ کو بھی گھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

ادھر ثریا کی نجی زندگی میں ایک انقلاب اور انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ دیو آنند اور ثریا کی محبت کی خبریں سارے ہندوستان میں عام ہو گئیں۔ ثریا کی ڈکٹیٹر قسم کی نانی اور خود غرض ماں کی ہرگز یہ رضا مندی نہیں تھی کہ ثریا دیو آنند سے شادی کرے۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ مذہب کی وجہ سے ان دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ سنا ہے کہ دیو آنند نے یہ شرط بھی منظور کر لی کہ وہ مسلمان ہو جائے گا لیکن نانی اور ماں دیو اربن کر دونوں کے راستے میں کھڑی ہو گئیں اور شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ثریا ایک سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ ان کے لیے ایک خزانہ تھی۔ وہ اس کو کسی اور کے سپرد کیسے کر سکتی تھیں۔ بہر حال ثریا مجبور ہو کر رہ گئی اور یہ شادی نہ ہو سکی۔ دیو آنند کچھ عرصے غلط کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اس نے فلم ٹیکسی ڈرائیور کی ہیروئن کلپنا کارنیک سے شادی کر لی، کلپنا کارنیک ایک کرچن لڑکی تھی کلپنا کارنیک کے والدین امرتسر میں رہتے تھے اور اس کا اصل نام مونا سنگھ تھا۔ یہ شادی تو ہو گئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ شاید دیو آنند ثریا کو نہ بھول سکا تھا یا پھر ان دونوں میں وہی ہم آہنگی نہ تھی۔ دیو آنند دن رات اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے پاس گھر اور کلپنا (مونا سنگھ) کے لیے وقت نہ تھا۔

فلمی صنعت کو یہ علم تھا کہ ان دونوں کی ازدواجی زندگی بھس رہی ہے۔

دونوں ایک لڑکے کے ماں باپ بھی بنے جو اب فلمی کاروبار سے غفلت ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اپنی سوانح عمری میں دیو آنند نے اپنی بیوی اور گھریلو زندگی کے بارے میں ایک سطر بھی نہیں لکھی جو کہ بہت عجیب بات ہے۔

دیو آنند نے تو حالات سے سمجھوتا کر کے جیسے تیسے

اپنے آپ کو کام میں گم کر دیا مگر ثریا کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ ثریا کی نانی کا انتقال ہو گیا جس کی تمام دولت اور فیصلوں پر اختیار تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد ثریا نے آزادی کا سانس لیا۔ وہ انڈین فلمی دنیا کی سب سے دولت مند فن کارہ تھی۔ اس کی جائداد اور دولت بے حساب تھی۔ اب وہ اپنی سب چیزوں اور اپنی زندگی کی مالک بن چکی تھی۔

اس نے 1962ء میں عین عروج کے زمانے میں فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ فلموں میں اداکاری اور گلوکاری ترک کر دی اس کے بعد نہ تو کسی نے ثریا کو گاتے ہوئے سنا نہ اس کی اداکاری کی ایک جھلک دیکھی۔ ثریا نے ایک تہا زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ کسی فلمی تقریب یا کسی محفل میں نہیں جاتی تھی۔ کسی سے ملتی نہیں تھی۔ نہ کسی نے اس کی آواز سنی نہ صورت دیکھی۔ ثریا لاہور میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماموں اور دوسرے رشتے دار لاہور ہی میں رہتے تھے لیکن ثریا کا کسی سے واسطہ نہ تھا۔ اپنی ماں کو اس نے اپنے گھر سے رخصت کر دیا اور پھر اس کی صورت تک نہیں دیکھی۔ جب ماں بیمار ہوئی تو ثریا نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ کروڑ پتی بیٹی نے ماں کو علاج کے لیے کسی اچھے اسپتال میں بھی داخل نہیں کیا۔ اس نے ایک بے سہارا اور مفلس عورت کی طرح ایک امدادی اسپتال میں زندگی کی آخری سانس لی۔

یہ ثریا کا انتقام تھا۔ خود سے بھی اور اپنے رشتے داروں سے جنہوں نے بھی اس کے احساسات کو نہیں سمجھا۔ اس کے جذبات کو نظر انداز کر دیا۔ اسے ایک ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جو موت سے بدتر تھی۔ جس طرح فرعون مرنے کے بعد اہرام میں اپنی لاش کو دفن کر لیتے تھے اسی طرح ثریا نے جیتے جی خود کو میرین ڈرائیو کے خوبصورت اور قیمتی ”اہرام“ میں زندہ درگور کر لیا تھا۔ وہ اس دور کی انارکلی تھی جسے جیتے جی دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ مگر یہ دیوار ثریا نے بذات خود بنوائی تھی۔

دیو آنند ایک روشن خیال اور ترقی پسند شخص تھا۔ اسی لیے اس کی اکثر فلموں کے نقمات ساحر لدھیانوی لکھتے تھے۔ دیو آنند کی بیوی کلپنا کارنیک کا خاندان لاہور میں کرشن نگر میں رہتا تھا۔ یہ لوگ پاکستان ہی میں رہے۔ انہوں نے ہندوستان جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دیو آنند لاہور کی یاد کی آگ میں سلگتا رہا لیکن کبھی اپنی جنت میں نہیں آیا۔



دیو آنند

1999ء میں پاک و ہند دوستی کا چرچا ہوا تو ایک خاص سمجھوتا بس میں بیٹھ کر بھارتی وزیراعظم واجپائی اور کچھ اہم منتخب لوگ پاکستان آئے تو اس بس کا اہم ترین رکن دیو آنند ہی تھا۔ وزیراعظم سے لے کر دوسرے تمام بس کے مسافر اس سے مرعوب تھے۔ دیو آنند نے اپنی سوانح عمری میں لاہور کے اس دورے کے واقعات لکھے ہیں۔

گورنمنٹ کالج کے دورے کے بارے میں دیو آنند کی زبانی سنیں۔ ”جب میں نے گورنمنٹ کالج کی عمارت دیکھی تو طالب علمی کے زمانے کی تمام خوبصورت یادیں تازہ ہو گئیں۔“ یہاں دیو آنند نے اپنے پرانے استادوں اور ساتھی طلباء سے باتیں کیں۔ ”میں نے حمید اللہ خان برکی سے ملاقات کی جو ہمارے کالج کے بہترین پاکی پلیئر تھے۔ پرانی یادیں میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ میں نے کالج کی پہلی منزل کی گیلری میں سب سے پہلے اوشا کرن کو اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ہاتھ میں کتابیں اٹھائی ہوئی تھیں اور ایک شرمیلی خاموش نظر ڈال کر میرے پاس سے گزر گئی۔ وہ ایک ساڑی میں ملبوس تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر وہ خاموشی سے گزر کر چلی گئی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مصویمت تھی۔ میں نے جھپکتے اور شرماتے ہوئے اسے ہیلو کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کالج کے برآمدے میں اس کی جوتی کی اونچی اڑی کی آواز میں دیر تک سنتا رہا۔ پھر وہ آواز بھی معدوم ہو گئی۔“

کالج کے پرانے طلباء کو میرے کالج میں آنے کی خبر ملی تو وہ سب کے سب دوڑے آئے۔ مجھ سے گلے ملے۔ مجھے پرانے نام سے پکارتے رہے۔ کئی لڑکوں نے فلم ٹیکسی ڈرائیور، کا نغمہ بنری پر بجانا شروع کر دیا۔ وہ سب اس طرح خوش ہو رہے تھے جیسے کوئی گمشدہ قیمتی چیز انہیں مل گئی ہو۔ میری خوشی بھی بے انتہا تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پالیا ہے۔ ان سب نے مجھے بتایا کہ گورنمنٹ کالج جتنا کہ ان کا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔“

دیو آنند نے پاکستانی وزیراعظم سے ملاقات کا بھی تذکرہ کیا۔ اس نے لکھا کہ وزیراعظم اس سے بہت محبت اور خلوص سے پیش آئے۔ ہم دونوں بہت جلد ایسے محل مل گئے جیسے کہ عرصہ دراز سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں انہوں نے ایک خالص پنجابی کی طرح لاہوری انداز میں خاطر مدارات کی۔ وہ خود بھی گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں کالج کیلور ہے ہیں۔“

جب کچھ عرصے بعد دیو آنند کی وفات کی خبر ملی تو نواز شریف بہت دیر تک خاموش اور غمگین بیٹھے رہے۔ وزیراعظم دیو آنند کو اپنا ذاتی دوست کہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کو قریب لانا ان کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ عمران خان نے دیو آنند کی وفات پر اظہار افسوس تک نہیں کیا حالانکہ بالی وڈ کے فن کاروں نے ان کے اسپتال کے لیے فنڈ جمع کرنے میں بہت مدد کی تھی۔ دیو آنند بالی وڈ کے لہجہ تھے۔ اشتیاق صاحب کو کسی نے بتایا کہ دیو آنند کسی زمانے میں عمران خان کو اپنی فلم میں ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔

دیو آنند کی خود نوشت سوانح عمری پڑھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو دیو آنند کے پرستار تھے۔ دیو آنند نے بہت لمبی عمر پائی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ آخری دم تک کام کرتے رہے اور صرف شدید بیماری کے دنوں میں ہی انہوں نے کام چھوڑا تھا۔ وہ ہمیشہ نئے موضوعات کے بارے میں فلمیں بناتے رہتے تھے اور دنیا کے ہر ملک میں انہوں نے فلم بندی کی۔ ان کی خواہش تھی کہ ایک فلم پاکستان میں بھی بنائیں مگر یہ خواہش حسرت ہی رہی۔ انہیں اپنے کام سے عشق تھا اور یہ عشق مرتے دم تک قائم رہا۔ دوسرے بڑے فن کاروں کی طرح دیو آنند جیسا فن کار اور شخصیت بھی دوبارہ بالی وڈ کو نصیب نہ ہوگا۔

یہ بتانا ہم بھول گئے کہ ثریا کا 2012ء میں انتقال

ہو گیا۔ خدا جانے ان کی دولت انہوں نے کس کے حوالے کی یا کسی فلاحی ادارے کو دے دی۔ یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ 1962ء کے بعد کسی نے ثریا کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ کیسے کیسے وضع دار لوگوں سے یہ دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے۔

بڑے بڑے فن کار دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جب ان کی مقبولیت اور عروج کا زمانہ ہوتا ہے تو وہ آسمانوں پر رہتے ہیں۔ ایک دنیا ان کے پیچھے دیوانی ہوتی ہے۔ دنیا کا کون سا عیش و آرام ہے جو انہیں حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو وہ عروج کے بعد زوال کا شکار بھی ہوتا ہے۔ جوانی کے بعد بوڑھا بھی ہوتا ہے اور پھر پت جھڑ کے پتوں کی طرح درخت سے گر کر خاک میں مل جاتا ہے۔

فلمی اداکار بھی انسان ہوتے ہیں۔ خواہ کتنا ہی بڑا اداکار کیوں نہ ہو ایک دن اس پر بھی زوال اور بوڑھاپا آتا ہے یہاں تک کہ وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بس اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ بھی دھندلا جاتی ہیں اور پھر حافظے سے بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ مگر کبھی بھی پرانے دن یاد دلانے کے لیے آ جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے کہ آپ نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

ایسا ہی خواب پچھلے دنوں ہم نے بھی دیکھا۔ کسی نے یاد دلایا تو یاد آیا۔ اداکار شyam کو آج کوئی نہیں جانتا۔ آج کی نسل سے پہلی والی نسل بھی اداکار شyam سے شاید واقف نہ ہو۔ شyam ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ فلمی پرچوں میں شyam کے اس حادثے کی تاریخ 26 اپریل 1951ء ہے۔

آئیے پہلے آپ کا شyam سے تعارف تو کرائیں۔ دراصل اشتیاق احمد صاحب جو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور دنیا میں ملکوں ملکوں گھومے ہیں۔ انہوں نے اشاک ہوم یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور لاہور میں LUMS جیسی درس گاہ میں لیکچر بھی دیتے ہیں۔ اشتیاق صاحب کے بارے میں یہ تفصیل بتانا اس لیے ضروری ہے کہ انہیں فلموں کا بہت شوق ہے۔ انڈین فلموں کے بارے میں وہ اتنا کچھ جانتے ہیں کہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ پاکستانی فلموں، فلم سازوں اور اداکاروں سے بھی انہیں بہت دلچسپی ہے۔ وہ ہر وقت انڈین اور پاکستانی فلموں کے فنکاروں کی کھوج میں رہتے

ہیں۔ پچھلے دنوں وہ لاہور میں تھے تو ایک نہایت عزیز دوست کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستانی اداکار ایم اسماعیل کے بیٹے کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس بارے میں ہر ایک سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اور پرانے پاکستانی فن کاروں کے بارے میں بھی وہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ان کا شوق بھی ہے اور ہابی بھی۔

انہوں نے باتوں باتوں میں شyam کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ہم نے شyam کی ایک دو فلمیں ہی دیکھی ہیں۔ دراصل اس زمانے میں ہماری عمر کے لڑکوں کو فلمیں دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے کسی عزیز کے ساتھ کبھی کبھار کوئی فلم دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ شyam کا ان دنوں فلمی پرچوں میں بہت چرچا تھا۔ وہ اپنے رومانہ اور اسکیٹلز کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔ دراز قد، کھلتا ہوا رنگ، متناسب جسم، شوخ آنکھیں اور بات بات پر مسکراتا اور قہقہہ لگانا ان کی عادت تھی۔ مختلف فلمی ہیروئنوں کے ساتھ ان کی دوستیوں کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔ ان کی کئی فلمیں بہت کامیاب ہوئی تھیں اپنی دلکش شخصیت اور خوش مزاجی کی وجہ سے وہ فلمی دنیا میں بہت مقبول تھے۔ اس زمانے میں اخبارات میں فلمی دنیا کی خبریں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے بہت اچھے اور خوبصورت فلمی میگزین نکلا کرتے تھے جن سے فلمی دنیا اور فلمی لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن معلوم ہوا کہ شyam گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کیونکہ شyam بہت اچھے گھڑ سوار تھے۔ بعد میں تفصیل معلوم ہوئی کہ شyam ایک فلم شبنم کی شوٹنگ کے لیے گھڑ سواری کر رہے تھے۔ اچانک گھوڑا بدک گیا اور شyam گھوڑے سے نیچے گر گئے۔ گرنے سے زیادہ چوٹ نہیں آئی لیکن المیہ یہ ہوا کہ ان کا پیر رکاب میں پھنس گیا تھا گھوڑا مسلسل بھاگتا رہا یہاں تک کہ لوگوں نے اس کو پکڑ کر شyam کا پیر رکاب میں سے نکالا۔ مگر کافی دور تک زمین پر گھٹنے اور سر کے زمین سے ٹکرانے کی وجہ سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ انہیں فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جاں بردہ ہو سکے۔ اس طرح ایک ہنسا کھیلنا خوش باش اداکار چند لمحے میں زندگی سے رشتہ توڑ گیا۔

شyam جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت وہ شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے۔ شyam رنگین مزاج اور

دل پھینک تو تھے ہی۔ اس زمانے میں ان کی ایک سوشل گرل ممتاز قریشی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات پسندیدگی اور پھر پیار میں تبدیل ہو گئی۔ قیام پاکستان کے بعد جب شyam نے بمبئی میں رہائش اختیار کی تو ان کی شادی شدہ زندگی بہت خوشگوار تھی۔ شyam دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن دو بچے اور ایک بیوی چھوڑ گئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شyam کی ہلاکت کے بعد تاجی اپنے بچوں کو لے کر بمبئی سے لاہور آ گئے۔ ان کا ایک بیٹا شاکر اور ایک بیٹی ساحرہ ساتھ تھی، ممتاز بیگم عرف تاجی نے راولپنڈی کے ایک بڑے عہدے دار سے شادی کر لی جس نے تاجی اور شyam کے بچوں کو اپنے حقیقی بچوں کی طرح پالا پوسا، اعلیٰ تعلیم دلانی اور انہیں ہر وہ سہولت فراہم کی جو ایک باپ اپنے بچوں کو دے سکتا ہے۔ ساحرہ نے ٹی وی میں اداکارہ اور بعد میں ہدایت کاری کی حیثیت سے قابل تعریف کام کیا اور ان کا شمار ٹی وی کی بہترین فن کاروں میں ہونے لگا۔ اسی دوران ان کی ملاقات راحت کاظمی سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اور چند ٹی وی ڈراموں میں ایک ساتھ کام کیا۔ اس رومانی جوڑی کو بہت پسند کیا گیا۔ ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان دونوں میں باہمی ہم آہنگی پیدا ہو گئی بالآخر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور دونوں بے بسی خوش رہتے ہیں۔ ساحرہ نے بعد میں ٹی وی پروڈیوسر کی حیثیت سے بہت اچھے موسیقی کے پروگرام پیش کیے۔ ساحرہ کا بھی بھائی شاکر امریکا میں رہتے ہیں۔ وہ ذہنی امراض کے ڈاکٹر ہیں لیکن جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ بھی پاکستان نہیں آئے۔ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ بھی ان کا زیادہ میل ملاپ نہیں۔

اشتیاق احمد صاحب نے پاکستان میں ساحرہ کاظمی اور راحت کاظمی سے ملاقات کی۔ وہ شyam کے خاندان اور پس منظر جاننا چاہتے تھے مگر ساحرہ کاظمی اس بارے میں بالکل لاعلم ہیں کیونکہ بچپن میں پاکستان آنے کے بعد ان کا شyam کے رشتے داروں سے کوئی تعلق یا رابطہ نہیں ہے۔

انٹرنیٹ کی بدولت اشتیاق صاحب کا رابطہ شyam کے رشتے داروں سے ہو گیا۔ ان کے رشتے دار ہندوستان میں پونا، (مہاراشٹر) اور دہلی میں رہتے ہیں۔ شyam کے بچے بھل چڈھا سے ای میل کے ذریعے ان کی دوستی ہو گئی۔ بھل چڈھا صحافی ہیں اور بمبئی میں رہتے ہیں۔ جب ای میل کے ذریعے تعلقات گہرے ہو گئے تو طے پایا کہ چڈھا اشتیاق

صاحب کو بلو کہے گا اور وہ اسے چٹنوں کے نام سے مخاطب کریں گے۔ بھل شyam کو شyam چاچا کہتا ہے۔ بھل چڈھا نے بتایا کہ اس نے کئی بار پاکستان آنے کی کوشش کی مگر یہ پروگرام پورا نہ ہو سکا۔ اشتیاق صاحب نے اسے بتایا کہ وہ اکثر انڈیا جاتے رہتے ہیں اس بار گئے تو بھل چڈھا سے ضرور ملیں گے۔ بھل چڈھا شyam کے چھوٹے بھائی ہرنس چڈھا کا چھوٹا بیٹا ہے۔

شyam کے بارے میں جو معلومات حاصل ہو سکیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ شyam کا اصل نام شyam سندھ چڈھا تھا۔ اس کے گھرانے کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ چڈھا پنجابی ہندو کٹھری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ شyam کی پرورش راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ اس نے پنڈی کے مشہور گورڈن کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد شyam نے فلمی صنعت میں کام کرنے کا ارادہ کیا۔ شyam نے اداکاری کا آغاز ایک پنجابی فلم ”گوانڈی“ سے کیا۔ یہ فلم 1942ء میں بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ بمبئی چلا گیا جہاں اداکار کی حیثیت سے اس کو بہت کامیابیاں حاصل ہوئیں اور وہ ایک مقبول ہیرو بن گیا۔

اشتیاق صاحب جب انڈیا گئے تو انہوں نے شyam کے چڈھا خاندان سے نئی دہلی میں ملاقات کی۔ بھل نے سب سے پہلے ان کی ملاقات ہرنس سے کرائی جو شyam کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کی عمر اس وقت 90 سال تھی۔ وہ تندرست اور چلتے پھرتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ طویل عمر کی مجبور یوں نے انہیں بھی جکڑ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہرنس چڈھا کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ ان کا تمام وقت اپنے گھر ہی میں گزرتا تھا۔ جو رشتے دار ان سے ملنا چاہتا تھا وہ ان ہی کے گھر آ کر ملاقات کر لیتا تھا۔ اشتیاق صاحب کے ساتھ ہرنس چڈھا بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور دونوں باہمی طویل گفتگو کے باعث ایک دوسرے کو اچھی طرح جان گئے اور مکمل مل گئے جیسے طویل عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اور شyam ایک دوسرے سے بہت قریب تھے اور دونوں میں بہت پیار تھا۔ ان کی والدہ دونوں کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ والد نے دوسری شادی کر لی تھی مگر ان کی سوتیلی ماں بہت اچھی تھی اور ان دونوں سے گئے بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ سوتیلی ماں سے یہ دونوں بھی بہت

بیار کرتے تھے کیونکہ اس نے انہیں بھی احساس تک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کے گئے بیٹے نہیں۔

اشتیاق صاحب کا کہنا ہے کہ شکل و صورت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے شام اور ان کے بھائی ہرنس چڈھا میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ شام کا قد ہرنس چڈھا سے لمبا تھا۔

ہرنس چڈھا نے پرانے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ شام کی تاریخ وفات دراصل 25 اپریل 1952 تھی۔ یہی تاریخ اتفاق سے ہرنس چڈھا کی سالگرہ کی بھی تھی۔ اشتیاق صاحب نے امریکا میں رہنے والے شام کے بیٹے شاکر سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر یوں لگا جیسے وہ جان بوجھ کر ان سے ملنا نہیں چاہتا۔

ساحرہ اور شاکر کی بہن اور پوتا میں بہت بڑی جانداد ہے جو کہ درحقیقت شام کی جانداد تھی۔ انڈیا میں ان دونوں کے رشتے داروں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہندوستان جا کر اپنی جانداد حاصل کریں لیکن دونوں بہن بھائی میں سے کسی نے بھی اس جانداد کو حاصل کرنے کی خواہش اور کوشش نہیں کی۔ اس کا سبب کوئی نہیں جانتا کہ وہ وارث کی حیثیت سے اپنے باپ کی اتنی بڑی جانداد کیوں نہیں حاصل کرنا چاہتے۔ یہ شام کی مختصر کہانی ہے۔ اس سے زیادہ شام کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

شام کی موت کے فوراً بعد جب اشتیاق صاحب پاکستان آئے اور لاہور کے پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں جانا ہوا تو ان کی ملاقات ایسے کئی لوگوں سے ہوئی جو شام کو جانتے تھے اور اس کے ساتھ پڑھتے رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خوش مزاج اور ہر وقت ہنستے رہنے والا طالب علم تھا۔ لڑکیوں میں وہ بہت مقبول تھا اور بیک وقت کئی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ طلباء کی سیاست اور آپس کے جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ اس طرح شام سندر چڈھا عرف شام جولاہور میں پلا بڑھا تھا بہن میں زندگی کی بازی ہار گیا۔

☆☆☆

جب ہم چھوٹے تھے تو ابن بطوطہ اصراراً دوپہا کو کامیڈی کریکٹر سمجھتے۔ چند سال بعد معلوم ہوا کہ ابن بطوطہ ایک سفر نامہ نویس تھا۔ ہماری نصاب کی کتابوں میں بھی ابن بطوطہ کے بارے میں معلومات دی گئی تھیں۔

معلوم ہوا کہ ابن بطوطہ ایسا سیاح اور مورخ تھا جس نے زندگی دنیا بھر کے ملکوں کی سیر و تفریح میں گزار دی۔ مگر وہ صرف سیاح ہی نہیں تھا۔ وہ ایک تاریخ نگار بھی تھا جس نے اپنے زمانے کے ملکوں کے رسم و رواج اور وہاں رہنے والوں کے بارے میں بہت کارآمد معلومات فراہم کیں۔ ہمارے ملک میں ایک سیاح ابن انشاء نے تو اپنی ایک کتاب کا نام ہی ابن بطوطہ رکھ لیا۔ وہ بھی ملکوں ملکوں گھوم کرتے تھے اور وہاں کے عجیب عجیب قصے سنایا کرتے تھے۔ ابن بطوطہ نے تو اپنی دلچسپی اور دنیا کو دیکھنے کے شوق میں سفر اختیار کیے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا کہ وہ محض داستان گو نہیں ہیں۔ وہ اپنے عہد کی تاریخ لکھ رہے ہیں جو کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ ابن بطوطہ کے دلچسپ اور معلوماتی سفر نامے بھی شائع ہوئے جنہیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ دنیا کی غالباً ہر زبان میں ان کے دلچسپ اور معلوماتی سفر نامے ترجمہ کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ اردو میں پہلے یہ سفر نامے ”عجائب الاشر“ کے نام سے شائع ہوئے لیکن بعد میں سفر نامہ ابن بطوطہ کے نام سے شائع ہوئے اور بے حد مقبول ہوئے۔ یہ سفر نامے ایک طرح کی داستانیں ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ جغرافیہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یہ ایک انتہائی معلوماتی اور مفید ہیں۔ طلباء کو یہ سفر نامے ضرور پڑھنے چاہئیں تاکہ وہ پرانی تاریخ سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

آئیے پہلے تو آپ کا تعارف ابن بطوطہ سے کراتے ہیں۔ یہ کوئی فرضی یا قلمی نام ہے۔ ان کا پورا نام محمد بن عبد اللہ ابن بطوطہ بربر تھا۔

وہ سن 1304ء میں کنجھر میں پیدا ہوئے تھے جو کہ مراکش میں واقع ایک شہر ہے اور آج بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ ان کے خاندان کو قاضیوں کا خاندان بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کے خاندان کے کئی افراد قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ خود ابن بطوطہ نے بھی قانون کی تعلیم حاصل کی ہوگی اور اگر وہ دنیا کے سفر پر نکل پڑتے تو ممکن ہے اپنے ملک میں وہ بھی کسی شہر کے قاضی ہوتے۔ وہ اسلامی مسائل اور فقہ وغیرہ پر دسترس رکھتے تھے۔

وہ ایک شاعر بھی تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ادب سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔ شعر گوئی تو وہ کرتے ہی تھے لیکن ان

کے سفر نامے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ادیب اور اہل قلم بھی تھے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد اور وہاں کے واقعات سے دنیا بھر کو باخبر کرنے کے بعد ابن بطوطہ 65 سال کی عمر میں (سن 1369) میں وفات پا گئے۔

ابن بطوطہ نے اکیس سال عمر میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت ان کا ارادہ دنیا کی سیاحت کا نہ تھا۔ وہ حج کرنے کے ارادے سے اپنے گھر سے نکلے تھے۔ جب انہوں نے دنیا کو دیکھا تو پھر حج کرنے کے بعد واپس گھر جانے کے بجائے انہوں نے دنیا کا سفر کرنے کا ارادہ کر لیا اور پھر ساری زندگی سیر و سیاحت ہی میں گزار دی۔ انہوں نے جن ملکوں کا سفر کیا ان میں (آج کے ناموں کے اعتبار سے) مصر، شام، اردن، لبنان، اسرائیل، فلسطین، عراق، یمن، امارات کے ملک، سعودی عرب، ایران، ترکی، آذربائیجان، جارجیا، روس، تاجکستان، ترکمانستان، آرمینیا، کرغزستان، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، مالدیپ، سری لنکا، تھائی لینڈ، برما، کمبوڈیا، ملائیشیا، انڈونیشیا، چین، شمالی افریقہ کے ممالک، سوڈان، لیبیا، تیونس، مراکش، (جو کہ ان کا وطن تھا) تانزانیہ، مالی، اچین، اور دوسرے ممالک شامل ہیں۔ یہ اندازہ لگانا آسان نہیں ہے کہ چودھویں صدی کے قدیم زمانے میں جب ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں حاصل نہیں تھیں۔ نہ ہوائی جہاز، نہ بس۔ ریل گاڑی تو کیا تیل گاڑیاں بھی اتنی عام نہیں تھیں۔ لوگ پیدل یا پھر اونٹوں، گھوڑوں اور گدھوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود دنیا کے اتنے بہت سے ملکوں کا سفر کرنا، وہاں قیام کرنا اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر معلوماتی سفر نامے لکھنا آسان نہیں، ایک ناممکن کام تھا۔ آج جبکہ سفر کی جدید اور تیز رفتار سہولتیں حاصل ہیں کیا کوئی شخص اتنے ملکوں کا سفر کر کے اتنے معلوماتی اور مفصل سفر نامے لکھ سکتا ہے؟

ابن بطوطہ جب ہندوستان پہنچا تو یہاں سلطان محمد تغلق کی حکومت تھی۔ سلطان تغلق سن 1325ء میں اپنے والد سلطان غیاث الدین تغلق کو قتل کرا کے تخت نشین ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کی سلطان تغلق سے ملاقات ہوئی تو سلطان بہت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اس کو لاکھوں تنگہ (اس زمانے کا سکہ) عطا کرنے کے علاوہ اس کو دہلی کا قاضی بھی مقرر کر دیا۔

ابن بطوطہ نے سلطان تغلق کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ابن بطوطہ جب دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو اس نے لکھا کہ اس دریا کو بیج آب کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پانچ دریاؤں کے ملاپ سے بنا ہے۔

اس زمانے میں سندھ ایک علیحدہ ملک تھا جس کا پایہ تخت ملتان تھا۔ موجودہ جنوبی پنجاب کا بہت بڑا حصہ بھی اس سلطنت کا حصہ تھا لیکن سندھ کا والی بھی سلطان تغلق کو خراج ادا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سندھ میں دریائی گھوڑے RHINO بہت کثرت سے تھے۔ وہ جنگلوں میں آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ ابن بطوطہ نے ہندوؤں کی رسم ”ستی“ کا تذکرہ کیا ہے جس میں شوہر کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو بھی شوہر کی لاش کے ساتھ ہی زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ جب لوگوں سے یہ سنا تو ابن بطوطہ نے

سینس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای

WELCOME
BOOK SHOP

ویکم بک شاپ

پی او بکس: 27869 کمرہ، دہلی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز

WELCOME
BOOK PORT

ویکم بک پورٹ

ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر

میں اردو بازار کراچی

فون: 32633151، 32639581، 32638086 (92-21) فیکس:

ای میل: welbooks@hotmail.com

ویب سائٹ: www.welbooks.com

بذات خودستی کی ایک رسم دیکھی اور تفصیل سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ ایک روح فرسا منظر تھا جسے دیکھ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے لکھا کہ کس طرح بیوہ کو سنگھار کر کے شمشان گھاٹ لایا جاتا ہے۔ اس کو ایک جلوس کی شکل میں لے جاتے ہیں۔ جلوس کے آگے آگے ڈھول بجانے والے ہوتے ہیں۔ ڈھولوں کی آواز اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی۔ بیوہ شوہر کی لاش کے پاس پہنچائی جاتی ہے اس کے بعد لکڑیوں میں آگ لگائی جاتی ہے۔ بیوہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ لیٹ جاتی ہے۔

ہندو پنڈت اس موقع پر اشلوک پڑھتے ہیں۔ بیوہ کے لیٹنے کے بعد مزید لکڑیاں اس کے اوپر رکھ دی جاتی ہیں اور ان میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ پنڈت اشلوک پڑھتے ہوئے ان لکڑیوں پر بھی چھڑکتے رہتے ہیں تاکہ آگ اور تیز ہو جائے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ جب زندہ بیوہ کے جسم کو آگ لگتی ہے تو وہ بہت دلدوز انداز میں چیختی چلاتی ہے مگر ڈھول کے شور اور آس پاس جمع ہونے والے لوگوں کے نعروں کی وجہ سے اس کی آواز اس شور میں دب جاتی ہے اور ایک زندہ عورت جلادی جاتی ہے۔ یہ منظر رونگٹے کھڑے کرنے والا تھا جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ میرا ایک ساتھی یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے اوپر ٹھنڈا پانی ڈالا تاکہ وہ ہوش میں آ سکے۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آیا اور پھر چیخ کر بے ہوش ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجبوراً اسے وہاں سے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

ابن بطوطہ کو تصوف سے بھی دلچسپی تھی اور ہندوستان میں اس کی کئی صوفیوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صوفی سے اس کی ملاقات ہوئی جو طویل العمر تھا۔ 120 سال کی عمر میں بھی اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ ابن بطوطہ کی ایک اور بہت مشہور صوفی سے ملاقات ہوئی وہ افغانستان میں تیج شیر کے علاقے میں رہتے تھے۔ لوگ انہیں عطا اولیاء کے نام سے یاد کرتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ عطا اولیاء کا مطلب ہے اولیاءوں کا عطا کردہ۔ ابن بطوطہ نے ان کی کشتیاں میں جا کر ان سے ملاقات کی جو کہ ایک پہاڑی پر واقع تھیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی عمر 350 سال ہے۔ ابن بطوطہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اب ان کے سیاہ بال نکلتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سو سال کے

بعد ان کے بال سیاہ اور دانت مٹے ہو جاتے تھے۔ دیکھنے میں وہ پچاس سال کے نظر آتے تھے۔ خدا جانے اس بیان میں کتنی صداقت ہے کہ ان کی عمر 350 تھی۔ آج کے مقام پر ابن بطوطہ کی ملاقات اس زمانے کے معروف بزرگ ولی سید جلال الدین بخاری سے ہوئی۔ ابن بطوطہ ان کی نیکی اور علم سے بہت متاثر ہوا (سید جلال الدین کو جہانیاں جہاں گشت بھی کہا جاتا تھا) ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں آج ایک بڑا شہر تھا جہاں بڑی خوبصورت عمارتیں تھیں۔ شہر کے بازار بھی بہت پُر رونق اور خوبصورت تھے۔

سندھ کے دارالحکومت ملتان میں ابن بطوطہ کو وہاں کے گورنر نے اپنا مہمان رکھا۔ گورنر کا تعلق قریشی خاندان سے تھا جو بہاؤ الدین ذکر یا ملتان کے خاندان سے تھے۔ ابن بطوطہ کے بقول قریشی بھی کسی کو اپنا مہمان نہیں رکھتے تھے جب تک کہ گورنر اجازت نہ دے۔

ابن بطوطہ نے ملتان میں بغاوت کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بغاوت کو دبانے کے لیے سلطان محمد تغلق بذات خود آیا تھا۔ ایک رات وہ خاموشی سے اپنے خیمے سے نکلا۔ اس وقت باغی شاہی قلعے تک پہنچ گئے تھے۔ عماد الدین قریشی کو سلطان نے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا کیونکہ عماد الدین کی صورت شاہ سلطان تغلق سے تھی۔

سفر نامہ ابن بطوطہ میں اس نے لکھا ہے کہ ملتان کے صوفی رکن عالم قریشی نے تصدیق کی کہ اپنے والد غیاث الدین تغلق کو قتل کرانے میں اس کے بیٹے سلطان محمد تغلق کا ہاتھ تھا۔ رکن الدین عالم نے بتایا کہ سلطان غیاث الدین کا قتل ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان تغلق نے بہت سے عالم و فاضل لوگوں کو قتل کرایا تھا۔ ان میں بہت سے نیک اور پارسا لوگ بھی شامل تھے۔ سلطان جس کو قتل کرتا تھا اس کے لیے اپنے قاضی سے فتویٰ ضرور لیتا تھا۔ سلطان تغلق نے بہت سے نیک اور خدا ترس علماء کو قتل کرایا کیونکہ انہوں نے اس کی مرضی کے مطابق فتوے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

رکن عالم قریشی کے بعد سلطان نے حد قریشی کو ان کا جانشین بنوایا۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ اور ملتان میں پیری فقیری کا رواج تھا اور گدی نشینی کے لیے بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ملتان کے گورنر نے سلطان کو اطلاع

دی شیخ حد قریشی اور ان کے اہل خاندان درگاہ سے ہونے والی آمدنی کو لنگر اور خاناہ کے بجائے اپنے عیش و عشرت پر خرچ کر رہے ہیں اور ان لوگوں نے بہت بڑی رقم اپنے پاس بھی جمع کر رکھی ہے۔

بخارا کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ وہاں اکثر مساجد، مدرسے اور بازار بہت خستہ حالت میں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب چنگیز خان اور ہلاکو نے حملہ کیا تو ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ شہر میں بڑھا لکھا عالم نظر نہیں آتا۔ کسی نے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ جگہ امام محمد اسماعیل بخاری کا مقام پیدائش ہے۔ ابن بطوطہ کو حیرت اس لیے ہوئی کہ کسی زمانے میں یہ شہر علم و فن اور تہذیب کا مرکز تھا۔ صدیوں تک دور دور سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے آتے تھے۔ لیکن افسوس کہ تاتاریوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

دمشق و شام میں امام ابن تیمیہ کو دیکھا جہاں وہ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ان کے خطبہ کے دوران میں امام تیمیہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ہم سب سے اعلیٰ اور اونچا ہے جیسے کہ میں اس منبر کی اونچی میزبانی پر کھڑا ہو کر بلند ہو گیا ہوں مگر اللہ کی عظمت اور بڑائی کا کوئی انسان مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

مسجد میں ایک الملکی عالم بھی موجود تھا۔ اس نے اپنے سینے پر اتنی زور زور سے ماتم کے انداز میں ہاتھ مارا کہ اس کی پگڑی سر سے گر گئی۔ قاضی غنبل نے اس شخص سے کہا کہ تم مسجد میں ٹوپی پہن کر کیوں نہیں آئے اور خطبہ کے دوران میں اس طرح ماتم کر کے نمازیوں کو پریشان کیوں کیا؟

بعد میں اس شخص کو مار پیٹ کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ ایک اور عالم نے اس طریقے پر اعتراض کیا کہ اس کے خلاف امیر اور سلطان کو شکایتی درخواست بھیجی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے امام تیمیہ کے خلاف قانونی کارروائی بھی شروع کر دی۔ درخواست میں لکھا تھا کہ ابن تیمیہ نے اپنے خطاب میں نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے۔ سلطان نے یہ شکایت پڑھنے کے بعد حکم دیا کہ امام تیمیہ کو مسجد میں بند کر دیا جائے اور زندگی بھر یہ وہیں رہیں۔ یعنی انہیں سزائے عمر قید دے دی گئی۔

سلطان کے اس حکم کی وجہ سے سارے عالم اسلام میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس قسم کی تفریق کی وجہ اسلام کو بہت نقصان پہنچا۔ یہ فرقہ بندی آج تک

سر دیاں

وہی بھی سر دیاں

وہی گھٹائیں

وہی سرد ہوا میں

شاہراہ زیست پر ادھ بکھلے گلابوں کے موسم میں

آج بھی رقص کرتی ہیں

تیری میری صدا میں

بھر کے جھولی میں تیری یادوں کے کنول

آنکھ میں درد کے جگنو جھلملاتے ہیں

سرمائی کھر میں ڈوبی شام میں

اپنی سرد تھیلی کو دیکھ کر تنہا

سوچتی ہوں

تو کہاں ہوگا..... تو کہاں ہوگا

شاعرہ: نصیحہ آصف خان، ملتان

موجود ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات نے عالم اسلام کے لیے منگولوں کے حملوں سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

جب وہ غرہ گیا تو وہاں ہیزے کے بیماری پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً ایک ہزار افراد اس کی وجہ سے روزانہ ہلاک ہو رہے تھے، دمشق میں روز 2400 افراد اس بیماری کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ دبا یرو ظلم تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے شہر الیگزینڈریا میں روزانہ 1800 اور قاہرہ میں ہر روز 2100 افراد ہلاک ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اللہ کا قہر نازل ہو گیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اس زمانے کی اشیاء کی قیمتیں بھی لکھی ہیں۔ بنگال میں چاول دس سے پندرہ روپے من تھے جو بے حد منگے تھے۔ مزدور کو کام کاج کا معاوضہ بہت کم ملتا تھا۔ لوگ مشکل سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بھینس کا دودھ تین روپے سیر تھا۔ ایک تندرست مرغی ڈیڑھ پیسے میں مل جاتی تھی۔ ایک صحت مند بکری یا بھیڑ ڈیڑھ پیسے میں مل جاتی تھی۔ دیسی گھی سو روپے کا ایک کھول جاتا تھا۔ چینی دو پیسہ کی ایک سیر مل جاتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ایک صحت

مند اور خوبصورت لڑکی ایک دینار میں نیلام میں خریدی تھی۔ دینار کو آپ آج کے آٹھ روپے کہہ سکتے ہیں۔

ابن بطوطہ نے سفر نامے میں ہندوستان کے بارے میں لکھا ہے کہ ساری دنیا ہندوستان کا رخ کرتی تھی اور یہاں سے دولت سمیٹ کر لے جاتی تھی۔ مسلمان ملکوں سے بہت سے مسلمان بھکاری بن کر یہاں آتے تھے اور بھیک مانگ کر اچھی آمدنی کمالتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ سے بھکاریوں کی جنت رہا ہے اور یہاں کے لوگ بہت مخیر اور فیاض تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بھیک مانگنے کو آج بھی بہت اچھا بڑس سمجھا جاتا ہے۔ ابن بطوطہ کے سفر نامے کے دوسرے واقعات پھر بھی۔

پشاور سے شوکت رحمن خٹک اداکار راجکار کے بارے میں معلومات دے رہے ہیں راجکار بھی بلوچستان کے شہر لورالائی میں پیدا ہوئے تھے۔۔۔۔۔ بالی وڈ کے ایک سپر اسٹار اداکار کے بارے میں معلومات حاضر خدمت ہیں۔ اس کا تعلق پٹھانوں کے خٹلے بلوچستان سے تھا۔ اس کا اصل نام ٹھکوشن بھارت تھا۔ اس کی والدہ نے یہ نام انتخاب کیا تھا۔ اس کا فلمی نام مشہور کہانی نویس ہدایت کار کمال امرہوی نے راجکار رکھا اور اسی نام سے اس نے شہرت حاصل کی۔ راجکار نے اس نام کی لاج رکھی۔ چار دہائیوں تک فلم انڈسٹریوں پر راج کیا۔ راجکار کی پیدائش 18 اکتوبر 1924 کو بلوچستان کے مشہور شہر لورالائی میں ہوئی۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ اپنی فیملی کے ہمراہ بمبئی منتقل ہوا۔

راجکار نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور پولیس سب انسپکٹر 1944ء میں کیا تھا۔ 1952ء میں جب وہ ایک سڑک پر ڈیوٹی دے رہے تھے کہ ان کی ملاقات کمال امرہوی سے ہوئی۔ وہ اس کی آواز سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ راجکار کا انداز گفتگو بہت متاثر کن تھا۔ سہراب مودی کے لیے کمال امرہوی نے جیلر فلم کی کہانی لکھی تھی اور اس فلم کو سہراب مودی بڑی ہنرمندی سے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ مرکزی کردار سہراب مودی خود ادا کر رہے تھے۔ کمال امرہوی نے ٹھکوشن پنڈت کو فلموں میں کام کرنے کی آفر دی۔ جسے اس نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ دوسرے دن کمال امرہوی اسے سہراب مودی کے پاس لے گئے اور کہا کہ مستقبل کے ایک عظیم اداکار سے آپ کو ملارہا ہوں۔ سہراب مودی بھی

اس کے انداز گفتگو سے متاثر ہوئے اور اس کو راجکار کے نام سے فلم جیلر میں کردار مل گیا۔

کمال امرہوی کے ایک رشتہ دار مشہور ڈائریکٹر جم نقوی جنہوں نے بعد میں پاکستان میں بہت معیاری فلمیں بنائیں ان دنوں رگیلی کے نام سے فلم بنارہے تھے، کمال امرہوی کے کہنے پر انہوں نے راجکار سے کنٹریکٹ سائن کیا اور ریحانہ کو بطور ہیروئن کا سٹ کیا۔ ریحانہ نے ہندوستان میں سرگم، سگائی اور دیگر فلموں میں بطور ہیروئن کام کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان آکر رات کے راہی، میں درپن کے برعکس ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ بعد میں انہوں نے رات کے راہی کے فلم ساز اور مشہور ساؤنڈ ریکارڈر اقبال شہزاد سے شادی کر لی۔ اقبال شہزاد نے بیٹی، بدنام جیسی فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ ریحانہ سے ان کی شادی کا میاب نہ ہو سکی اور طلاق پر اختتام ہوا۔

راجکار کی پہلی فلم رگیلی 1952ء کے آخر میں ریلیز ہوئی اگرچہ فلم اوسط درجے کی ثابت ہوئی مگر راجکار کے بولنے کے منفرد انداز کو فلم بینوں نے پسند کیا۔ راجکار کی خوبصورت اداکاری، پُرکشش آواز خصوصاً لہجے، مکالموں کی ادائیگی اور کمال فن کے باعث اس کے ہم عصر اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے مرعوب ہو جاتے تھے۔ راجکار نے رگیلی کے بعد جیلر، آبشار، گھمنڈ، لاکھوں میں ایک جیسی فلموں میں اداکاری کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہت پسند کیا گیا۔ سہراب مودی نے راجکار کو فلم ”نوشیر واں عادل“ میں شہزادہ نوشیر واں کالافانی کردار دیا۔ اس فلم نے راجکار کو بے مثال شہرت دی اور فلم سازوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ شہرت یافتہ ڈائریکٹر محبوب خان نے راجکار کو ”مدراندیا“ میں نرگس کے شوہر کا کردار دیا۔ ڈائریکٹر اعظم محبوب خان نے عورت، روٹی، الہلال، اشمول گھڑی، آن انداز جیسی شہرت یافتہ فلمیں بنائی تھیں۔ انہوں نے اپنی فلم عورت کو ”مدراندیا“ کے نام سے فلمایا۔ اس فلم کی کاسٹ میں نرگس، سنیل دت، راجندر کمار جیسے بڑے اداکار شامل تھے۔ محبوب خان نے دلپ کمار کو نرگس کے بیٹے کے کردار کی آفر کی تھی مگر دلپ کمار نے اس فلم میں اس وجہ سے انکار کر دیا کہ نرگس اس کے ساتھ کئی فلموں میں ہیروئن آچکی تھیں۔ دلپ کمار اور نرگس کی فلموں میں بالچل، میلہ، باہل وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں یہ کردار سنیل دت نے ادا کیا۔ فلم کے ایک سین میں نرگس آگ میں بری طرح پھنسی ہوئی

تھی۔ سنیل دت نے جان کی پروا نہیں کی اور جلتی آگ میں کود کر نرگس کو بچالیا۔ نرگس سنیل دت کے اس جذبے سے اتنی متاثر ہوئی کہ فلم کی کامیاب ریلیز کے بعد اس سے شادی کر لی۔ اداکار بننے دت نرگس اور سنیل دت کی نشانی ہے۔ راجکار نے اپنے مختصر سے کردار میں اپنی لافانی اداکاری سے اپنے فن کو منوایا۔ مدراندیا آسکر ایوارڈ کے لیے بھی منتخب ہوئی تھی۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد راجکار نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انہوں نے مختلف کرداروں کو نبھایا، تقریباً 70 سے زائد فلموں میں کام کیا۔ 1960-1970-1980 میں راجکار کی فلمیں کامیابیوں کا خزانہ ثابت ہوئیں۔ لیش چوپڑہ کی فلم ”وقت“ جس میں سنیل دت، ششی کپور، سادھنا، شرمیلا ٹیگور، بلراج سہنی جیسے بڑے آرٹسٹوں نے کام کیا تھا۔ راجکار نے سب ساتھی اداکاروں پر اپنی برتری ثابت کی۔ راجکار کا ایک مکالمہ فلم ”وقت“ میں اس نے ادا کیا جو آج بھی یاد ہے۔ ”یہ بچوں کے کھیلنے کی چیز نہیں، ہاتھ کٹ جائے تو خون نکل آتا ہے۔“

ششی کپور کی فلم اجالا میں راجکار ولن بنے تھے۔ پیغام میں دلپ کمار کے بھائی مل ورکر کے کردار میں آئے۔ دلپ کمار کی لافانی اداکاری کے ساتھ راجکار کی اداکاری کو فلم بین نہیں بھولے۔ دلپ کمار، راجکار کو بہت چاہتے تھے۔ ان کی فرمائش پر سہاش کھٹی نے 32 سال بعد دلپ کمار کے ہمراہ راجکار کو لے کر فلم ”سوداگر“ بنائی۔ سوداگر اپنے وقت کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ راجکار نے مینا کمار کی ساتھ دل اپنا اور پریت پرائی، دل ایک مندر، کاجل، پاکیزہ میں کام کیا۔ ان فلموں میں راجکار المیہ کردار میں نظر آئے اور اپنی عمدہ کردار نگاری سے لوگوں کے دل موہ لیے۔ فلم پاکیزہ کے ایک سین میں راجکار مینا کمار سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ ”آپ کے پاؤں دیکھنے میں بہت حسین ہیں انہیں زمین پر مت رکھیے گا۔ میلے ہو جائیں گے۔“

فلم پاکیزہ 1972ء میں بنی تھی۔ اپنے وقت کی بہترین فلم تھی۔ چچن آنند کی فلم ہیرا پنجا میں راجکار کی اداکاری بلند یوں پر تھی۔ 1972ء میں راجکار کی ایک اور لازوال فلم ”لال پتھر“ تھی۔ جس میں راجکار نے ایک ایسے زمیندار کا کردار ادا کیا جس کی بیوی سے وہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی اور یہ کردار راجکار کی زندگی کے قریب کردار تھا۔ راجکار نے 1960ء میں گائری نامی لڑکی سے

شادی کی تھی۔ ان کے دو بیٹے پودراج، پینی راج اور بیٹی واستو یکتا تھی۔ راجکار کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی بیوی کو تقریبات میں ہمراہ نہیں لے جاتے تھے جس سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ راجکار کی اپنی بیوی کے ساتھ واقعی رفاقت نہیں ہے۔ وہ اکثر تقریبات میں رنگین، بھڑکیلے لباس، لمبے بالوں کی وگ استعمال کرتے تھے۔ وہ خوبصورتی پر جان دیتے تھے۔ کامیاب فلم زنجیر میں مرکزی کردار ادا نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ فلم کا ڈائریکٹر خوبصورت نہ تھا۔ ان تمام خامیوں کے باوجود فلم بینوں نے راجکار کو بڑے اداکار کے طور پر تسلیم کیا۔ ”دل ایک مندر“ میں راجکار نے کینسر کے مریض کا کردار اتنی عمدگی سے ادا کیا کہ ان کو اس فلم پر فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ فلم وقت میں معاون اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ فلم وقت میں راجکار کا یہ مکالمہ بہت مشہور ہوا۔ ”سیٹھ صاحب! جن لوگوں کے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔“

1967ء میں راجکار کی فلم ہماز نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ راجکار کی ہر فلم نے کامیابی حاصل کی۔ ان کی چند کامیاب فلمیں یہ ہیں۔ قدرت، جنگ باز، ایک نئی پہیلی، مرتے دم تک، مقدر کا فیصلہ، تیل مکمل، پھول بنے انگارے، پیار کا بندھن، چنیل کی قسم، سازش، ترنگہ، پولیس اور مجرم، الفت کی نئی منزلیں، میرے حضور محبت کے دشمن وغیرہ، شامل ہیں۔ ایک نئی محفل میں زینت امان سے ان کی ملاقات ہوئی تو راجکار نے اسے فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی جسے زینت امان نے قبول کر لیا اور مشہور ہیروئن بنیں۔

1990ء میں راجکار کی آواز گلے کے کینسر کی وجہ سے ماند پڑنے لگی۔ انہوں نے بڑی حوصلہ مندی اور جرأت سے بیماری کا مقابلہ کیا۔ مالی حالات بھی خراب ہونے لگے۔ بالآخر 3 جولائی 1996ء کو اس نامراد بیماری سے انتقال کر گئے۔ مرتے وقت راجکار کی عمر 69 سال تھی۔ راجکار کی موت پر دلپ کمار نے اپنے تاثر بتائے کہ راجکار تو مر گیا مگر اس کا فن امر ہے۔ اس کا فن اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ بعد از موت راجکار کے بڑے بیٹے نے فلم ”بال برہمچاری“ بنا کر اعزازی طور پر اپنے والد کے نام سے منسوب کر کے ریلیز کر دی۔ راجکار کی آخری فلم ”مجاڑ اینڈ گن“ 1995ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ فلمی تاریخ میں راجکار کا نام سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔

گڑھی کا شیطان

خالد قریشی

اس سیاہ عفریت نے پورے علاقے میں خوف و ہراس پیدا کر رکھا تھا۔ اس کے خوف سے لوگ خود کو گھروں میں بھی غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو پکڑتا اور پٹک پٹک کر مار دیتا۔ اس کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ ایسے درندے سے نمٹنا آسان نہ تھا پھر بھی وہ بندوق لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑا۔



شکاریات کے شوقینوں کی مدارات

اچنی سے پناگرام جاتے ہوئے دس پندرہ جھوپڑوں پر مشتمل مختصر سا گاؤں گڑھی نام کا آتا ہے۔ اس علاقے میں بہنے والی ٹوڈی ندی کے دونوں کناروں پر تین تین میل دور تک بانسوں کے گھنے جنگل ہیں۔ جس جگہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہاں سے پندرہ میل جنوب مغرب کی طرف یہ ندی دریائے کاویری سے جا ملتی ہے۔ بانسوں کے اس جنگل میں عموماً ہاتھیوں کے غول دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہاتھی زمین پر رہنے والا سب سے بڑا اور سب سے وزنی

ممالیہ جانور ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر یہ پاگل ہو جائے تب کیا نہیں کر سکتا۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑنا اس غیر معمولی قد و قامت کے جانور کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہاتھی پاگل کیوں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ دو تین وجوہات جو میرے محدود مشاہدے کے ذریعے منظر عام پر آئیں ان میں پہلی وجہ ہاتھی کے مستی کے ایام ہیں۔ یہ ایام تین ماہ کے عرصے پر مشتمل ہو سکتے ہیں اور ان ایام کے دوران ہاتھی نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ ہاتھی کے زخمی ہونے پر منحصر ہے۔ کسی غیر لائسنس یافتہ شکاری کی خود ساختہ رائلٹی بدولت اگر وہ زخمی ہونے کے بعد مشتعل ہو جائے تو خطرے کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے دوران ہار جانے کی صورت میں دگر فتنے ہونے کے بعد بھی یہ دیوزاد جانور آبادی کا رخ کرنے کے بعد تباہی و بربادی کا ایسا باب رقم کرتا ہے جس کی مثال آپ کو تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ان تین وجوہات کے علاوہ ہاتھی جیسا شریف النفس اور پیار کرنے والا جانور آپ کو تمام کرۂ ارض پر دوسرا میسر نہیں آ سکتا۔ گڑھی گاؤں کا وہ دیوقامت ہاتھی بھی پاگل ہوا تھا۔ تب مدراس کی حکومت نے سالم کے کلکٹر اور ڈسٹرکٹ آفیسر کے ذریعے اس کا حلیہ اخباروں میں شائع کر کے اسے شیطان قرار دے دیا۔ گڑھی گاؤں میں میرا ایک دیرینہ ساتھی رائگا موجود تھا۔ اس کا خط موصول ہونے کے بعد میں نے چار دن کی چھٹی لی اور اپنی کار میں پناگرام پہنچ گیا۔ پناگرام سے میں نے رائگا کو ساتھ لیا اور ہم گڑھی کے فارسٹ ہنگل کی طرف چل دیے جو وہاں سے اٹھارہ میل دور تھا۔ راستے میں ہم اینٹائے ہما دو نامی جگہ کے پاس سے گزرے۔ اس نام کے لفظی معنی ہیں وہ جو ہڑ جس میں ہاتھی گر گیا ہو۔ یہ ایک قدرتی جو ہڑ نما تالاب ہے جو اینٹائے ہما دو کے کنارے بلند چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ اینٹائے ہما دو دریائے چنار کی ایک شاخ ہے اور دریائے چنار بذات خود کاویری کا ایک حصہ ہے۔ جنوبی ہندوستان کے دریاؤں میں کاویری سب سے بڑا دریا ہے۔ اینٹائے ہما دو جو ہڑ بہت گہرا دکھائی دیتا تھا اور قریبی آبادی والوں کے کہنے کے مطابق کبھی خشک نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ بہت عرصہ ہوا۔ ایک ہاتھی جب پانی پینے کی غرض سے اس جو ہڑ پر آیا تو وہ پھسل کر اس کے اندر گر گیا اور پھر چکنی چٹانوں کے سبب اس میں سے باہر نہ نکل پایا۔ ہاتھی بہت

اچھے تیراک ہوتے ہیں اور ان میں ہر کوئیس جیسی قوت برداشت بھی ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ان کی جسامت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے زیادہ عرصہ تیرتے رہنا ان کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ وہ غریب ہاتھی تین روز مسلسل اس کنواں نما تالاب میں تیرتے رہنے کے بعد ڈوب گیا۔ اس دوران بہت سے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے پناگرام سے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ہاتھی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ لیکن اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے۔

بہر حال ہم شام کو پانچ بجے کے قریب گڑھی پہنچے۔ گڑھی میں مقیم جنگل کے محافظ نے مجھے بتایا کہ شیطان گرد و نواح میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً دس مزید ہاتھی بھی وہاں تھے۔ یہ تمام ہاتھی ڈاک ہنگلے کے قریب ایک چشمے پر پانی پینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ہاتھی شیطان کی جسامت کے برابر تھے۔ اس لیے ان میں شیطان کو پہچاننا مشکل تھا۔ لیکن میرے مشاہدے کے مطابق شیطان بننے کے بعد ہاتھی اپنے گروہ کو خیر باد کہنے کے بعد جنگل میں اکیلا گھومنا پھرنا شروع کر دیتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ اس کے سامنے جو بھی جاندار نظر آتا ہے وہ اسے ہنس نہیں کر کے رکھ دیتا ہے۔ دس پندرہ ہاتھیوں کے غول میں شیطان ہاتھی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ حلیے کے لحاظ سے ان تمام میں کوئی بات منفرد نہیں ہوتی۔ چار ٹانگیں دوکان، ایک دم اور دو دانت..... لیکن سرکاری اعلان میں اس ہاتھی کا حلیہ مبہم طور پر بیان کیا تھا۔ اس میں نقطہ یہ درج تھا کہ ہاتھی کے اگلے پاؤں کا محیط 10،4 انچ تھا اور وہ تقریباً نو فٹ آٹھ انچ اونچا تھا۔ اس کا رنگ کالا بتایا گیا۔ مگر نہانے کے بعد تمام ہاتھی کالے نکلتے ہیں۔ قد کے لحاظ سے شیطان ہاتھی نارمل قد کے مطابق تھا۔ دنیا میں ہاتھیوں کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ اول افریقی ہاتھی جسامت کے لحاظ سے ایشیائی ہاتھیوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ براعظم افریقا کے متعدد ملکوں مثلاً جنوبی افریقا، زمبابوے، زائریمبیا اور بوٹسوانا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ایک بالغ افریقی ہاتھی کا اوسط قد گیارہ فٹ جبکہ وزن سات ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ ایشیائی ہاتھی، بھارت، تھائی لینڈ، نیپال، سری لنکا اور سائرا کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ ایک بالغ ایشیائی ہاتھی کا اوسط قد دس فٹ جبکہ وزن چھ ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ ہاتھی کی اوسط عمر 60 سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ بعض ہاتھی

70 سال سے زائد عمر کے بھی پا جاتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی شیطان ہاتھی کے حلیے کی۔ مبہم حلیے کے مطابق اسے تلاش کرنا نہایت مشکل تھا۔ ہاتھی کے حلیے میں کوئی خاص امتیازی نشان موجود نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کے اگلے دو دانت جو تین فٹ لمبے تھے، اپنی چونٹیوں کے قریب ایک دوسرے کو ملتے ہوئے کراس کرتے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ فقط اس آخری نشان کے ذریعے میں اس ہاتھی کی شناخت کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بات مشکوک تھی کہ وہ مجھے اپنے قریب آکر اپنا قدناپنے کی اجازت دے۔ اب میرا لاکھ ٹھل پوں ہونا چاہیے تھا کہ میں تمام رات فاریسٹ بنگلے کے قریب پہنچنے والے چشمے کے قریب کسی درخت پر بچان باندھ کر گزارتا۔ لیکن یہ بات بھی قابل قبول نہیں تھی۔ ہاتھی شیطان بننے کے بعد اپنے ہم جنسوں سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور اس جگہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے جہاں اس کے ہم جنس موجود ہوں۔ بچان پر رات گزارنا فضول تھا۔ اب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ میں کسی ایسے ہاتھی کے پاؤں کے نشانات پر چل پڑتا جس کے پاؤں کا محیط شیطان کے پاؤں کے محیط کے برابر ہوتا اور اس کا کھوج لگاتے ہوئے اس تک پہنچ جاتا۔ پھر اسے سامنے سے دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کیا اس کے دانت ایک دوسرے کو کراس کرتے ہیں کہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہی شیطان ہاتھی ہوتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے دوبارہ چشمے سے اپنی جدوجہد کا از سر نو آغاز کرنا پڑتا۔ یاد رہے کہ میں چار دن کی چھٹی لے کر آیا تھا اور ان میں سے ایک دن رائگا کو ساتھ لینے اور گڑھنی آنے کے دوران صرف ہو گیا تھا۔

اگلی صبح میں رائگا اور جنگل کے محافظ کو ساتھ لے کر ایک ہاتھی کے پاؤں کے نشانات پر چلنے لگا۔ چشمے کے کنارے پر مختلف ہاتھیوں کے پاؤں کے مختلف سائز کے نشانات موجود تھے۔ گزشتہ شب ان ہاتھیوں نے چشمے پر پانی پیا تھا۔ ان میں سے بعض بے حد چھوٹے ہاتھیوں کے پاؤں کے نشانات تھے۔ یہ ہاتھی اندازاً تین فٹ سے زیادہ اونچے نہ ہوں گے۔ ازراہ معلومات بتاتا چلوں، ہتھنی کے حمل کی مدت بائیس ماہ ہوتی ہے جو تمام زمینی جانوروں میں سب سے زیادہ مدت ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت بچے کا وزن ایک سو پانچ کلو گرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ ہتھنی اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ بہر حال چشمے کے گرد ایک چکر لگانے پر مجھے معلوم ہوا کہ تین ہاتھیوں کے پاؤں کے نشان

شیطان ہاتھی کے پاؤں کے محیط کے برابر تھے۔ ان میں سے دو ہاتھیوں نے تو اس جانب سے پانی پیا تھا جہاں دوسرے ہاتھی کھڑے تھے۔ لیکن تیسرا ہاتھی ایک مختلف سمت سے آیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہی شیطان ہو سکتا تھا۔ لہذا میں نے اس کے پاؤں کے نشانات پر چل کر اس کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔ رائگا سب سے آگے تھا اور ہاتھی کے پاؤں کا کھوج لگا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور اپنی 450/400 جیفری دونالی رائفل سے اس کو کور دے رہا تھا۔ فارسٹ گارڈ میرے عقب میں تھا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ عقبی حملے کا خیال رکھے۔ ہو سکتا ہے کہ ہاتھی نصف دائرے کے چکر میں گھوم کر ہمارے عقب کی جانب سے نمودار ہو۔ چشمے سے چل کر تھوڑے فاصلے پر لمبی گھاس شروع ہو جاتی تھی۔ اس پر ہاتھی کے پاؤں کے نشانات با آسانی مل سکتے تھے۔ ہاتھی کے پاؤں سے گھاس پھلی ہوتی تھی۔ گھاس کے بعد خاردار جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں ہاتھی کے گزرنے کا سراغ لگانا نسبتاً آسان تھا۔ لیکن خاردار جھاڑیوں کے سبب ہمارا راستہ قدرے مشکل ہو گیا کیونکہ وہ کپڑوں سے الجھ جاتی تھیں۔ ہم نے ایک میل کا فاصلہ نہایت دشواری کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد ہم ایک چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے پہنچ گئے۔ اس پہاڑی کی ڈھلوان پر بانس کے گھنے درخت آگے ہوئے تھے اور ہاتھی ان میں سے گزر کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اسے پہاڑی کہنا درست نہیں ہوگا۔ زمین کا یہ خطہ اونچے نیچے نشیب و فراز پر مشتمل تھا۔ پہاڑی ٹیلے پر بھی یکمشت چڑھ جانا ہاتھی جیسے جسم کے مالک جانور کے لیے ممکن نہیں۔ گڑھنی کے رہائشیوں کے کہنے کے مطابق گزشتہ ہفتے شیطان ایک ایسے چرواہے لڑکے پر چڑھ دوڑا جو جانور چرانے کے دوران نیند کی وجہ سے چشمے کے کنارے سرسبز خطے کے پاس لیٹ کر سو گیا۔ شیطان ہاتھی ایک لڑکے کا پیچھا کرتا ہوا چشمے کی جانب چلا آیا۔ جانوروں کے پیچھے چلانے کی بدولت لڑکے کو بروقت خطرے کا احساس ہو گیا۔ وہ اٹھ کر جنگل کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ بے قابو ہاتھی سے جان چھڑانے کا آسان طریقہ جنگلی تدابیر کے مطابق یہ ہے کہ اپنے جسم پر موجود کپڑے کا کوئی بھی حصہ ہاتھی کی جانب اچھال دیجیے۔ وہ اسے چیرنے پھاڑنے میں مشغول ہو جائے گا۔ تب آپ محدود وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریبی درخت یا پہاڑی پر چڑھ کر اس کے عتاب سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ چرواہے

میں بہت نیچے اتر گیا ہے چونکہ موثر الذکر بات کا زیادہ امکان تھا۔ لہذا ہم خاموشی کے ساتھ بچوں کے بل آگے بڑھنے لگے۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ کوئی خشک پتیا خشک ٹہنی ہمارے پاؤں کے نیچے آکر ہماری موجودگی کا راز نہ کھول دے ہم اپنے پاؤں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ مزید نصف میل کا سفر ہمیں کھلی وادی میں لے آیا۔ یہاں جھاڑیوں اور مختلف اقسام کے درختوں کی بہتات اور ہتھنی گھاس کے سبب ہم پندرہ بیس گز سے زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مزید دو سو گز ہمیں دریائے گولاموٹی ندی کی ایک شاخ کے پتھر لے کنارے پر لے آیا۔ ہاتھی یہاں سے پچاس گز ندی کے کنارے کنارے گیا تھا اور ایک ریتیلی جگہ سے اس نے ندی کو عبور کیا تھا۔ ندی کا دوسرا کنارہ سرسبز اور جھاڑیوں سے مزین تھا۔ ہم حتی الامکان خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ ہاتھی چرنا بند کر کے پھر آگے بڑھنے لگا تھا۔ ہم دو فرلانگ آگے گئے ہوں گے کہ ہمیں ہاتھی کے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ جب ہاتھی اپنی غذا ہضم کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے پیٹ سے خراٹوں جیسی آوازیں نکلتی ہیں۔ میں نے رائگا اور جنگل کے نگران کو بڑے کے بلند درخت پر چڑھنے کا حکم دیا اور خود آواز کی سمت چلنے لگا۔ ہاتھی ایک ایسی کھائی میں کھڑا تھا جو بانس کے گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ آرام کر رہا تھا۔ بہت احتیاط کے ساتھ انچ انچ چلتا ہوا میں کھائی میں اتر گیا۔ پھر ایک لمحہ رک کر میں نے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور ہوا کا رخ دیکھنے کے لیے اسے ہوا میں اچھال دیا۔ مٹی سیدھی زمین پر گری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھائی میں ہوا ساکت تھی۔ یہ بات میرے حق میں نہیں جاتی تھی۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ بند ہوا میں ہاتھی میری بو پا جائے۔ لہذا میں مزید احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ بانسوں کے درخت میرے اوپر تھے۔ چند قدم آگے چل کر مجھے ایک ایسی چیز دکھائی دی جو ایک سیلیٹی رنگ کے بڑے پتھر سے مشابہ تھی۔ یہ ہاتھی تھا۔ جو زمین پر کھڑا سو رہا تھا۔ بد قسمتی سے اس کا منہ دوسری جانب تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں چکر کاٹ کر دوسری طرف جاتا اور اس کے دانت دیکھ کر اسے شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر جہاں کھڑا تھا وہیں سے اسے جگا دیتا۔ یہ زیادہ آسان تھا۔

دوسرے طریقے کو آزمانے کا فیصلہ کرنے کے بعد میں بانسوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں ہو گیا اور پھر آہستہ

میں بہت نیچے اتر گیا ہے چونکہ موثر الذکر بات کا زیادہ امکان تھا۔ لہذا ہم خاموشی کے ساتھ بچوں کے بل آگے بڑھنے لگے۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ کوئی خشک پتیا خشک ٹہنی ہمارے پاؤں کے نیچے آکر ہماری موجودگی کا راز نہ کھول دے ہم اپنے پاؤں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ مزید نصف میل کا سفر ہمیں کھلی وادی میں لے آیا۔ یہاں جھاڑیوں اور مختلف اقسام کے درختوں کی بہتات اور ہتھنی گھاس کے سبب ہم پندرہ بیس گز سے زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مزید دو سو گز ہمیں دریائے گولاموٹی ندی کی ایک شاخ کے پتھر لے کنارے پر لے آیا۔ ہاتھی یہاں سے پچاس گز ندی کے کنارے کنارے گیا تھا اور ایک ریتیلی جگہ سے اس نے ندی کو عبور کیا تھا۔ ندی کا دوسرا کنارہ سرسبز اور جھاڑیوں سے مزین تھا۔ ہم حتی الامکان خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ ہاتھی چرنا بند کر کے پھر آگے بڑھنے لگا تھا۔ ہم دو فرلانگ آگے گئے ہوں گے کہ ہمیں ہاتھی کے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ جب ہاتھی اپنی غذا ہضم کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو اس کے پیٹ سے خراٹوں جیسی آوازیں نکلتی ہیں۔ میں نے رائگا اور جنگل کے نگران کو بڑے کے بلند درخت پر چڑھنے کا حکم دیا اور خود آواز کی سمت چلنے لگا۔ ہاتھی ایک ایسی کھائی میں کھڑا تھا جو بانس کے گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ آرام کر رہا تھا۔ بہت احتیاط کے ساتھ انچ انچ چلتا ہوا میں کھائی میں اتر گیا۔ پھر ایک لمحہ رک کر میں نے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور ہوا کا رخ دیکھنے کے لیے اسے ہوا میں اچھال دیا۔ مٹی سیدھی زمین پر گری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھائی میں ہوا ساکت تھی۔ یہ بات میرے حق میں نہیں جاتی تھی۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ بند ہوا میں ہاتھی میری بو پا جائے۔ لہذا میں مزید احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ بانسوں کے درخت میرے اوپر تھے۔ چند قدم آگے چل کر مجھے ایک ایسی چیز دکھائی دی جو ایک سیلیٹی رنگ کے بڑے پتھر سے مشابہ تھی۔ یہ ہاتھی تھا۔ جو زمین پر کھڑا سو رہا تھا۔ بد قسمتی سے اس کا منہ دوسری جانب تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں چکر کاٹ کر دوسری طرف جاتا اور اس کے دانت دیکھ کر اسے شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر جہاں کھڑا تھا وہیں سے اسے جگا دیتا۔ یہ زیادہ آسان تھا۔

دوسرے طریقے کو آزمانے کا فیصلہ کرنے کے بعد میں بانسوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں ہو گیا اور پھر آہستہ

سے سیٹی بجائی۔ ہاتھی نے کوئی پروا نہیں کی۔ شاید وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ یا پھر شاید اس نے اسے کسی پرندے کی آواز جان کر توجہ نہیں دی۔ اب کی دفعہ میں نے منہ سے رنج کی آواز نکالی۔ اس نے میرا مقصد حل کر دیا اور ہاتھی نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ وہ ایک بڑا اور شاندار ہاتھی تھا۔ تقریباً دس فٹ بلند..... اس کے دانت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ لیکن وہ ایک دوسرے کو کراس کرنے کے بجائے دور دور تھے۔ ظاہر ہے میں نے اپنا وقت غلط ہاتھی کے تعاقب میں ضائع کیا تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں نصف منٹ تک میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شدید غصہ اور نفرت دکھائی دیتی تھی۔ اس غصے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اس کے آرام میں خلل ہوا تھا۔ غصے کے بعد اس کا دوسرا عمل حیرت پر مشتمل تھا۔ چند لمحے میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد وہ ایک دو قدم میری طرف بڑھا۔ میں نے پھر ایک تیز سیٹی بجائی۔ اس آواز پر اس کی جراث دب سی گئی۔ وہ مڑا اور تیزی سے جنگل میں بھاگ گیا۔ اس کے بھاگنے کی آواز لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی چلی گئی۔ ہم ناکام و بے مراد پانی کے چشمے کی جانب چلے آئے۔ اب ہمیں یہی عمل دوبارہ دہرانا تھا۔ چشمے پر دو اور ہاتھیوں کے پاؤں کے نشان شیطان کے پاؤں کے نشان کے برابر تھے۔ پاؤں کے وہ دونوں نشان کچھڑ میں تھے اور انہیں ناپ کر کسی مثبت نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ خواہ کوئی بھی جانور ہو، کچھڑ میں اس کے پاؤں کے نشان اصل سائز سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوپہر کے تین بجتے والے تھے۔ نشانات کے تعاقب میں دوبارہ جنگل کا رخ کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے ہم واپس رہائش گاہ کی جانب چلے آئے۔ دوسرے دن صبح میری آنکھ کچھ تاخیر کے ساتھ کھلی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور بندوق کو ہاتھوں میں تھا۔ رانگا اور جنگل کے محافظ کے ہمراہ چشمے کی جانب چل دیا۔ چشمے پر گزشتہ دن والے تمام نشانات کا تفصیلی طور پر جائزہ بھی نہیں لینے پایا تھا کہ گڑھنی گاؤں کا ایک آدمی ہمیں اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے نشانات ثبت تھے اور وہ کافی حد تک بوکھلایا ہوا بھی دکھائی دیتا تھا۔ قریب پہنچنے پر اس نے ہمیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ شیطان نے گڑھنی گاؤں کی نوجوان عورت کو نہایت بے دردی کے ساتھ زمین پر پٹخ پٹخ کر ہلاک کر دیا ہے۔ مزید

کوئی بھی بات حیرت کیے بغیر میں رانگا اور جنگل کے محافظ کے ہمراہ اس آدمی کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا جو اس درونکے واقعے کا چشم دید گواہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم چاروں گاؤں سے کچھ دور درختوں کے ایک ایسے جھنڈ تک جا پہنچے جہاں گڑھنی گاؤں کے تمام افراد جمع تھے۔ ان کے درمیان میں سرخ کپڑوں میں لپیٹا ہوا گوشت پوست کے لوتھڑوں پر مشتمل ایک ایسا وجود زمین پر دھرا پڑا تھا جو شاید کچھ دیر پہلے نوجوان اور کھلتے ہوئے وجود پر مشتمل رہا ہوگا۔ ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ میں تھام کر اس کے نرم و نازک جسم کو متعدد بار زمین پر پٹختے کے بعد پاؤں کے ذریعے بھی پکڑا تھا۔ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد گڑھنی کا شیطان جنگل سے گزر کر اس پہاڑی کی جانب چلا گیا تھا جو ہمارے جنگل کے عقب میں تھی۔ میں نے رانگا اور جنگل کے محافظ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم قدموں کے واضح نشان کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہاتھی نے جنگل کے عقب والی پہاڑی عبور کرنے کے بعد ٹکڑی کا رخ کیا تھا۔ ندی تک پہنچنے کے لیے ہمیں چار میل کا مزید فاصلہ طے کرنا پڑا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہاتھی جنوب مغرب کی طرف مڑ کر ندی کے بہاؤ کی طرف چلے لگا ہے۔ میں جانتا تھا کہ دریائے کاویری وہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر اس نے تیر کر دیا تو عبور کر لیا تو اس صورت میں اس کا تعاقب کرنا بے سود ثابت ہوتا۔ لہذا ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لیکن ہاتھی ہم سے چند گھنٹے قبل یہاں سے گزر چکا تھا۔ اس لیے ہمارا درمیانی فاصلہ خاصا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے جو لمبے قدم اٹھائے تھے۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ سفر کرنے کے دیہے ہے۔ دوپہر کی دھوپ میں دریا کی ریت اب گرم ہونے لگی تھی۔ اس نے میرے چلنے کی رفتار مدھم کر دی اور میرے بوٹوں میں گھس کر مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی ندی کا پاٹ چٹائی ہو جاتا اور پانی سے بگھے ہوئے پتھروں کا سلسلہ چل پڑتا۔ ایسی جگہوں سے ہاتھی پتھروں سے کترا کر ندی کے کنارے براگے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرا تھا۔ ہم بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ متواتر چلنے کی بدولت پسینے سے ہمارے بدن شرابو ہونے لگے۔ پانچ چھ میل پر مشتمل یہ سفر ہمیں کاویری اور ٹکڑی ندی کے سنگم کے قریب لے آیا۔ دریا سے چند سو گز کے فاصلے پر ٹکڑی ندی میں سے وہ راستہ جاتا ہے جو

موضع یوتا ملائی سے ملی گند لو جاتا ہے۔ ہاتھی نے یہاں سے اپنی سمت تبدیل کر لی تھی اور یوتا ملائی جانے والے راستے پر تقریباً دو میل چل کر پھر سے جنوب مغرب کی طرف مڑ کر اس دلدل کی سمت ہو گیا تھا جو دریائے کاویری کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس دلدل کا نام کڑنی پالم تھا اور اسے میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا۔ ایک زمانے میں، میں وہاں شکار کے لیے آیا کرتا تھا۔ لیکن سال کے اس موسم میں دلدل خاصی خشک تھی اور وہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہاں سے آگے ہمیں ایسے آثار دکھائی دینے لگے جن سے پتا چلتا تھا کہ ہاتھی نے چرنا شروع کر دیا تھا۔ جب ہم دلدل کے مرکز کی طرف بڑھ رہے تھے تو تازہ لید کے ڈھیروں سے معلوم ہوا کہ ہاتھی اب زیادہ دور نہیں ہے۔ دلدل ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی۔ ہم گہری دلدل سے بچنے کے لیے پاؤں بہت احتیاط کے ساتھ رکھ رہے تھے۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمیں کمر تک دلدل میں لے جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں بعض اوقات گھٹنوں تک دلدل میں سفر کرنا پڑا۔ آواز سننے کے لیے میں چند لمحے کے لیے رک جاتا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لمبی لمبی گھاس میں سے ہاتھی کی آواز سنائی دی۔ کوئی پچاس گز آگے ہاتھی کچھڑ میں لت پت کھڑا تھا۔ وہ ایک بڑا ہاتھی تھا اور اس کے دانت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ مڑ کر آخری سروں سے ایک دوسرے کو کراس کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے اپنی چھوٹی چھوٹی شریں آنکھوں سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کان کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوا۔ شیطان ہاتھی سیاہ رنگ کا تھا اور اس نے سونڈ کو اوپر اٹھا کر سانپ کی طرح بل دے رکھا تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رانگل کو سیدھا کیا اور نشانہ لینے کے بعد سانس کو روک کر گولی داغ دی۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی۔ گولی کے زور سے وہ رک گیا اور پھر غصے سے دھاڑا۔ ظاہر ہے اس سلوک کی اسے توقع نہیں تھی۔ گولی کی آواز اور درد نے اسے تیور ا دیا۔ کچھ دیر ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے لیکھت اپنا رخ جنگل کی جانب موڑا۔ میں نے دوبارہ نشانہ باندھا اور دوسرا فائر کر دیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلا اور جب میں نے دوبارہ رانگل بھر کر تیسری گولی چلانے کی کوشش کی تو وہ جنگل میں غائب ہو چکا تھا۔ دوسری

گولی اس کے جسم پر کہیں لگی تھی۔ لیکن یہ دونوں گولیاں اسے زمین بوس کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی تھیں۔ میں نے مڑ کر رانگا اور جنگل کے محافظ کی جانب دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں حیرت کے علاوہ خوف کے تاثرات ثبت تھے۔ بہر حال میں نے آدھا گھٹنا انتظار کرنے کے بعد ان دونوں کو وہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود خون کے نشانات پر آگے بڑھنے لگا۔ وہ کئی جگہ پر گر آیا لیٹا تھا اور وہاں کی ساری زمین لہو سے بالکل سرخ ہو گئی تھی۔ اس نے درختوں کے کئی تنوں کا سہارا بھی لیا تھا اور ان پر ابھی تک خون جما ہوا تھا۔ اگرچہ وہ ہاتھی انسانی نسلوں کا دشمن تھا مگر اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ دو میل مزید آگے چلنے پر میں نے اسے تلاش کر لیا۔ وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ خون بہہ جانے سے وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ زیادہ حرکت کرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ جب میں رانگل کو ہاتھوں میں تھامے اس کی سمت بڑھا تو وہ اپنی جگہ بدستور کھڑا رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتی آنکھوں میں ابھی تک زندگی کے آثار باقی تھے۔ اس سے پندرہ گز دور کھڑے ہو کر میں نے رانگل اٹھائی اور تیسری گولی اس کے سر میں پیوست کر دی۔ موت کا استقبال کرنے کے لیے وہ کالا پہاڑ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اس نے اپنی سونڈ اوپر اٹھائی۔ اور بڑے بڑے کانوں کو ہلانے لگا۔ وہ حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا مگر دو قدم چل کر گر پڑا۔ میری تیسری گولی نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ زمین پر بے سدھ گرا ہوا تھا۔ اگرچہ گڑھنی کا یہ شیطان انسانوں کا دشمن تھا مگر میں یہ بات ضرور تسلیم کروں گا کہ وہ نہایت بہادر تھا۔ اصولی طور پر ہاتھی کے شکار میں مجھے کوئی دلی خوشی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ میں اس بھاری بھر کم جانور کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اسے شکار کرنا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ اس پر نشانہ لگانے میں کچھ خاص دقت نہیں ہوتی اور پھر یہ آسانی سے مل بھی جاتا ہے۔ فقط تھوڑے سے تجربے کی ضرورت ہے۔ بہر حال میں نے تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ زمین پر گرے ہوئے پہاڑی وجود کی جانب دیکھا اور رانگا کو بلانے واپس دلدلی حصے کی جانب چل دیا۔



ہماری قومی ہوا باز کمپنی پی آئی اے میں کچھ کرنے کی دھن میں وہ نوکر ہوا تھا، اس نوکری نے اسے کیسے کیسے تجربات سے دوچار کیا یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس نے تجربات کی بھٹی میں خود کو کندن بنانے کے لیے ہر مرحلہ دشوار کو کس طرح آسان بنایا یہ سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو پل بھر میں حوصلہ بار دیتے ہیں۔

آسان پیرائے میں ایک دلچسپ خودنوشت

پی آئی اے کا پروانہ تقرری لے کر میں کراچی ایئر پورٹ پر، اسمپلائمنٹ ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ شعبہ کے اسٹنٹ منیجر نے پروانہ تقرری کے عوض میرے ہاتھ میں فارموں کا ایک پلندہ اٹھا دیا۔ ان فارموں کی اور بڑی اسناد کی جانچ پڑتال کے بعد مجھے پی آئی اے میڈیکل آفیسر کے نام پر چھ دیا اور کہا کہ کل میں میڈیکل سینٹر جا کر اپنا طبی معائنہ کروالوں۔ وہاں پر میرے ایکس رے اور خون وغیرہ کے نمونے طبی جانچ پڑتال کے لیے لیے گئے اور حکم ہوا کہ کل آجائیں۔



کو تا ہی ناقابل معافی ہے، ان لوگوں کی نگاہ میں جو اس کی قدر کرتے ہیں۔
تھوڑی سی تفصیل انٹر لائن کے شعبہ انجینئرنگ کی غرض و غایت کے متعلق بتاتا چلوں۔

انٹر لائن کے شعبہ انجینئرنگ کا کام جہاز ڈیزائن کرنا یا بنانا نہیں ہے۔ یہ کام جہاز ساز کمپنی کا ہے۔ جہاز راں کمپنی کے شعبہ انجینئرنگ کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاز کی بروقت اور صحیح دیکھ بھال اور مرمت کرے۔ اس کی دیکھ بھال اور مرمت کا جو تجربہ اور مہارت انٹر لائنز کے پاس ہے وہ جہاز بنانے والی کمپنیوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی نیا جہاز بنایا جاتا ہے تو اس کی مینینٹنس کے لیے جو کمپنی بنائی جاتی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس میں خریدار انٹر لائنز کی نمائندگی ہوتی ہے بلکہ اکثر اس کمپنی کی سربراہی کسی انتہائی تجربہ کار انٹر لائن کے انجینئر کے ذمہ ہوتی ہے۔ مینینٹنس کی ہر ضرورت پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔

جہاز کی مینینٹنس کی تمام تر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انٹر لائن کے ٹیکنیکل ڈویژن میں دو اقسام کے ذیلی شعبے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ شعبہ جو براہ راست جہاز پر کام کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان بدست خود کام کرنے والوں کو معاونت فراہم کرتے ہیں۔

براہ راست کام کرنے والوں میں عام طور سے دو طرح کے شعبے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو لائن اور فیلڈ میں کام کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو جہاز کا اور ہال کرتے ہیں۔

معاون شعبوں میں پلاننگ، کوالٹی کنٹرول اور انجینئرنگ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ پی آئی اے میں انجینئرنگ کے شعبے کو ٹیکنیکل انجینئرنگ کا نام دیا گیا تھا، جس کے سربراہ تھے سعید صاحب۔ سعید صاحب پی آئی اے میں ہمارے اصل باس تھے۔ سعید صاحب کے دفتر پہنچے تو ان کو میز پر جھکے ہوئے اور کچھ لکھتے ہوئے پایا۔ میں نے اگلے تین چار سال بھی انہیں میز پر جھکے ہوئے اور کچھ لکھتے ہوئے ہی پایا۔ سعید صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ ہمیں ایک دفعہ پھر یہ سننا پڑا کہ ہم پاکستان کے خوش قسمت ترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شخص اس لیے کہ پی آئی اے نے ہمیں ملازمت دینے کا اعزاز بخشا تھا۔ پی آئی اے وہ ادارہ ہے کہ جس میں نوکری کرنے کے لیے ہر باشندہ پاکستانی صبح و شام خواب دیکھتا ہے۔

گو کہ ہمارا خیال ان سے تھوڑا سا مختلف تھا کہ اصل خوش نصیب کون ہے کیونکہ وہ مقولہ یاد آ گیا تھا جس میں اصول نمبر

اگلے دن ڈاکٹر صاحب نے خوب ٹھوک بجا کر دیکھا۔ اس کے بعد میرے دل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کو میرے دل کی دھڑکن شاید زیادہ پسند آگئی تھی وہ اسے دیر تک اور بار بار سننے رہے پھر اٹھ کر باہر چلے گئے۔ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر صاحب بھی تھے جو کہ ان سے بھی زیادہ معتبر دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بھی میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور کافی دیر تک اس سے محفوظ ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہ دونوں باہر نکل گئے۔ کچھ فکر مند سے لگ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب واپس آئے تو کہنے لگے۔ ”آپ کے دل میں مرمر ہے۔ آپ کل آجائیے گا۔“

مجھے یقین نہیں آیا کہ میرا دل سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے تصدیق کرنی چاہی تو وہ ہنس پڑے کہنے لگے۔ ”یہ سنگ مرمر نہیں ہے انگریزی مرمر (Murmur) ہے۔“ پھر اس انگریزی مرمر کی تشریح کی۔ ”یہ دل کی ایک کیفیت ہے جس میں دل کے والو پوری طرح سے بند نہیں ہوتے ان سے خون رستار ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو مرمر (یعنی سرگوشی) کہتے ہیں۔“ کمبخت انگریز برصغیر ہندوپاک سے چلا گیا مگر میرے دل میں اپنی Murmur چھوڑ گیا۔

اس واقعے کو چھالیس سال گزر چکے ہیں ہنوز انگریز کی یہ مرمر میرے ساتھ ہے۔

اگلے دن میں لرزتے قدموں اور دھڑکتی مرمر کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔ ”پی آئی اے میں خوش آمدید۔“ دل کی مرمر کے ساتھ ساتھ جان میں جان اور پیروں میں طاقت بھی آگئی گردن بھی تھوڑی اکڑ گئی کہ اب میں پی آئی اے میں باقاعدہ شامل ہو چکا تھا۔

میڈیکل کے مرحلے کے بعد میں دوبارہ اسمپلائمنٹ ڈپارٹمنٹ کی خدمت میں حاضر ہوا جنہوں نے مجھے ہیڈنگ بھیج دیا۔ انجینئرنگ کے جس ذیلی شعبے میں مجھے کام کرنا تھا اس کا نام کچھ عجیب سا لگا ٹیکنیکل انجینئرنگ۔ انٹر لائن میں انجینئرنگ کے ذیلی شعبوں کی تقسیم کچھ منفرد ہے جو انٹر لائن کی انجینئرنگ کے مقاصد کو زیر نظر رکھ کر کی جاتی ہے اس کے بنیادی مقاصد ہیں سیفٹی اور ایئر وروی ٹیس یعنی طیارہ ہر طرح سے محفوظ ہو اور شہری ہوا بازی یعنی سول ایویشن اتھارٹی کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو جو ایک طیارے کو قابل پرواز، ایئر وروی رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ ان معاملات میں کسی بھی قسم کی کوتاہی کسی گناہ سے کم نہیں۔ انسانی زندگی کی سلامتی کے مد میں کسی قسم کی نااہلی یا

ایک اور اصول نمبر دو کی تشریح کی گئی تھی۔

اصول نمبر ایک یہ ہے کہ آپ کا افسر ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ اصول نمبر دو یہ ہے کہ اگر بفرس محال اگر بھی اتفاق سے آپ کا افسر غلط بھی ہو تو اصول نمبر ایک کو یاد کر لیں۔

ابتدائی کورٹس بجالانے کے بعد ہم نے سعید صاحب سے پوچھا کہ ”حضور اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“ ارشاد ہوا۔ ”لاہیری ریویج جا کے بچھ جا۔“

ہم نے پی آئی اے جہازوں پر کام کرنے کے لیے جوائن کیا تھا۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ سعید صاحب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم دوبارہ ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھنا شروع کر دیں۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں یہ ناول ہر گلی کے گھر پر واقع لاہیری میں دستیاب ہوتے تھے۔ بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے مگر ابن صفی کو دوبارہ پڑھنا ہماری قسمت میں نہ تھا۔ مذکورہ لاہیری سعید صاحب کے دفتر سے باہر نکلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر بنی ہوئی تھی۔ اس میں ایک کئی گز لمبی میز، درجن سے اوپر کرسیاں اور دیواروں کے ساتھ متعدد الماریاں، ان الماریوں میں خوف ناک قسم کے خیم ٹیکنیکل مینول، درجنوں کی تعداد میں قطار در قطار سجے ہوئے تھے۔ خاصا دہشت ناک منظر تھا۔ میں نے اور اعجاز نے ایک دوسرے کی طرف انتہائی لاچاری سے دیکھا اور کرسیاں کھینچ کر ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے ہوئے ان کرسیوں پر برابر برابر بیٹھ گئے۔

آواز آئی۔ ”السلام علیکم...“ نظر اٹھا کر دیکھا تو ہمارے سامنے والی کرسی پر میز کے اس پار ایک صاحب بیٹھے تھے۔ ”میرا نام جنجوعہ ہے۔“ شاید ہماری اڑی ہوئی رنگت کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا۔ ”آپ لوگ نئے نئے معلوم ہوتے ہیں۔“ ہم دونوں نے لاچاری سے اقرار میں سر ہلادیا۔ موٹے موٹے مینول کی ہیبت ابھی تک ہمارے دلوں پر طاری تھی۔

جنجوعہ صاحب سپر کانسٹیبلین جہاز پر بطور فلائٹ انجینئر کام کر رہے تھے۔ یہ جہاز حال ہی میں پی آئی اے کے بیڑے سے ریٹائر کر دیے گئے۔ جنجوعہ صاحب اس وقت تک فارغ تھے جب تک انہیں کسی دوسرے جہاز پر نہ بھیج دیا جاتا۔

سپر کانسٹیبلین (سپری) اپنی بناوٹ کے لحاظ سے بہت ہی سبک اور خوب صورت جہاز تھا مگر اس کے ڈیزائن میں ایک خرابی تھی۔ یہ خرابی اس کے لینڈنگ گیسٹر میں تھی جو بہت اونچے تھے اور جہاز کی دم سے ہیبت آگے کی طرف لگائے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کا نظام نقل متاثر ہوتا تھا۔ اس خرابی کی وجہ

سے سپری کے چند حادثات بھی ہو چکے تھے خاص طور سے سامان Freight کے حوالے سے۔ ایک دفعہ اس میں کافی بھاری سامان لے جایا جا رہا تھا جو ایک اسلڈ پر سیٹوں سے بندھا ہوا تھا۔ جہاز جب اڑان کے لیے رن وے پر دوڑنے لگا تو اس کی قوت سے اسلڈ کی رسیاں ٹوٹ گئیں اور اسلڈ پچسل کر دم کی جانب چلا گیا نتیجتاً جہاز دم کے بل کھڑا ہو گیا۔

سپری کا ایک واقعہ ہمارے دوران ملازمت بھی پیش آیا۔ بیگر میں کام تین شفتوں میں ہوتا تھا۔ ہر شفت دو دن صبح کے وقت کام کرتی تھی پھر اگلے دو دن سپر میں، اس کے اگلے دو دن رات میں پھر دو دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ چونکہ مسلسل رات کی شفت نہیں ہوتی تھی اس لیے رات کو جاگنے کی عادت بھی مشکل سے پڑتی، اور اگر کام کی مصروفیت نہ ہو تو نیند کے جھونکوں پر قابو پانا بڑے دل گردے کا کام ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اکثر لوگ اپنے ساتھیوں کو اطلاع دیا کرتے تھے کہ اگر میری ڈھنڈیا پڑے تو میں فلاں جہاز کی فلاں نمبر کی سیٹ پر سوتا ہوا پایا جاؤں گا، چپکے سے آکر جگا دیتا۔ ایسے ہی ایک صبر آزمایہ موقع پر ایک ملکینک سپری کی کاپٹ میں جا کر سو گیا۔

سپری کی کاپٹ میں تین بڑی بڑی پھر کیوں پر بنے لپٹے ہوئے ہوتے تھے۔ ہنگامی صورت حال میں ان بیٹوں کو نیچے لٹکا کر ان کی مدد سے نیچے اترا جاسکتا تھا۔

جب ہمارے سپری کی کاپٹ میں سوئے ہوئے ملکینک کی ڈھنڈیا پڑی تو ان کے وفادار ساتھی نے جہاز کے نیچے سے کھڑے ہو کر انہیں آواز دی۔ سوئے ہوئے ملکینک نے نیند کے غماز میں بجائے پنے کو نیچے لٹکانے کے اس کا سرا پکڑا اور کھڑکی سے چھلانگ لگادی اور دم سے نیچے آگرا۔ قسمت اچھی تھی صرف معمولی چوٹیں آئیں۔ ہڈیاں مضبوط تھیں سلامت رہیں۔ قریبی دوستوں نے ہمدردی کی بقیہ شفت کئی دن تک مخلوط ہوئی رہی۔

جنجوعہ صاحب قصہ گو آدمی تھے۔ دلچسپ انداز میں باتیں کرتے تھے۔ چند منٹ میں ہم کھل مل گئے۔ جنجوعہ صاحب اپنے تجزیے مزے لے لے کر سناتے رہے۔ انہوں نے لندن شہر سے اپنی محبت کا قصہ بھی سنایا۔

جب جنجوعہ صاحب نے سپری پر اپنی ٹریننگ مکمل کر لی اور جب انہیں پہلی دفعہ لندن جانے کا موقع نصیب ہونے والا تھا تو لندن شہر کے دیدار کے اضطراب میں ان کی نیندان سے ایک دو دن روکھی رہی۔ آخر کار وہ دن بھی آپہنچا جب ان کا خواب پورا ہونا تھا۔ ان کی فلائٹ رات کے وقت لندن پہنچا

تھی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات کے تین بج گئے لیکن لندن دیکھنے کا شوق عروج پر تھا۔ وہ اپنا کوٹ کمرے میں پٹنگ پر پھینک کر لندن گھومنے نکل گئے۔ لندن سوچکا تھا۔ جنجوعہ صاحب کہنے لگے۔

”اب یہ حال ہے کہ لندن جاتا ہوں تو ہوٹل جا کر سو جاتا ہوں جب واپسی کی فلائٹ کا وقت ہوتا ہے تو کمرے سے نکل کر اڑ پورٹ چلا جاتا ہوں۔ لندن میں کوئی جاذبیت نہیں۔ مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے۔“

تین بج چکے تھے دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ جنجوعہ صاحب سے کل اسی جگہ اسی وقت کے وعدے پر جدائی ہوئی۔ اگلے دو دن ہم اسی طرح وقت گزارتے رہے۔ تیسرے روز جنجوعہ صاحب کی نئے جہاز پر ٹریننگ شروع ہونے والی تھی۔

جنجوعہ صاحب کی صحبت میں وقت آسانی سے گزر جاتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد لاہیری خالی خالی سی محسوس ہونے لگی۔ مینول کی ہیبت ایک دفعہ پھر طاری ہونے لگی تو ہم نے سعید صاحب کے دفتر کا رخ کیا۔ وہ حسب معمول میز پر سر جھکائے کچھ لکھ رہے تھے۔ ہماری بے جا مداخلت پر کچھ برہم دکھائی دیے۔ سر اٹھا کر سوال کیا۔ ”کی گل اے؟“ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ”ہمارا خیال تھا کہ شاید ہمیں پی آئی میں کچھ کام بھی کرنا پڑے گا۔“

جواب ملا۔ ”میرا سر نہ کھانٹو راج جا کے جہاز دامعائنہ کر۔“ ہم جہاز کا معائنہ کرنے بیگر روانہ ہو گئے۔ شفت انچارج کے دفتر میں پہنچ کر انہیں بتایا کہ سعید صاحب نے ہمیں جہاز کا معائنہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور جہاز کو فی الفور ہمارے معائنے کے لیے پیش کر دیں گے لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔

وہ رکھائی سے بولے۔ ”تو جا کر جہاز دیکھ لے۔“ ہمیں خیال ہوا کہ شاید انہیں ہماری اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا اس لیے ہم نے دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا کہ سعید صاحب نے ہمیں خاص طور پر بھیجا ہے اور اس مشن کے ساتھ بھیجا ہے کہ ہم جہاز کا معائنہ کر کے انہیں رپورٹ پیش کریں۔

وہ جھلا گئے پوچھنے لگے۔ ”آپ لوگ ہیں کون؟“ اب انہیں پتا چلے گا۔ ہم نے دل میں سوچا۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہم ہیں کون تو یہ اپنے اس رویے کی معافی مانگیں گے۔ ہم انہیں کھلے دل سے معاف کرنے کو تیار تھے مگر وہ آدمی

ڈھیٹ نکلے۔ تمام تر تفصیل بتانے کے باوجود ان کے رویے میں وہ انکساری نہیں آئی جو آنا چاہیے تھی۔ اسی بیزاری اور روکھے لہجے میں مخاطب کیا۔

”میرا سعید صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ کو جہاز اندر سے دیکھنا ہے تو دیکھ لیجیے۔“ پھر اپنا پیچھا چھڑانے کے انداز میں بولے۔ ”سعید صاحب کی یہی عادت ہے، انہوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے آپ دونوں کو بیگر بھیج دیا۔“

ہم نے چپ چاپ جہاز کا رخ کیا۔ ایک سیڑھی چڑھ کر جہاز کے دروازے میں داخل ہوئے تو ایک صاحب سے مڈ بھڑ ہوئی۔ سپروائزر قسم کی چیز لگ رہے تھے۔ پوچھنے لگے۔ ”آپ لوگ کون ہیں؟“

ہمیں جو محنت شفت انچارج کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی معدوم ہوتی دکھائی دی۔ گردن میں تھوڑی سی اکڑ واپس آ چکی تھی مگر معاملہ کچھ ہماری توقعات کے برعکس نکلا۔ ہم نے اپنا تعارف کروایا تو بجائے اس کے ہم سے مرحوب ہوئے، الٹا کہنے لگے۔ ”آپ صرف مسافروں والا حصہ دیکھ لیں۔ کاپٹ میرے ساتھ جائیے گا۔“

غصہ تو بہت آیا مگر اظہار کا موقع نہ تھا خدشہ ہوا کہ کہیں وہ ہم دونوں کو جہاز سے نیچے اتارنے کا حکم نہ دے دیں۔ ایسے آدمی کا کیا بھروسہ۔

ہم نے مسافروں والے حصے کے تین چار چکر لگائے۔ ٹائلٹ اور گیلی دیکھی۔ اکوئی سیٹ قابل اعتنا نہ تھی البتہ فرسٹ کلاس کی ہر سیٹ پر باری باری بیٹھ کر، سیٹ بیلٹ کئی دفعہ باندھ کھول کر دیکھا پھر کاپٹ کا رخ کیا۔ سپروائزر صاحب وہاں موجود تھے کہنے لگے۔ ”ہر چیز کو فاصلے سے دیکھیں۔ کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے گا۔“

یہ عزت افزائی ناقابل برداشت تھی، ہم دل برداشتہ ہو کر جہاز سے نیچے اتر آئے۔ جہاز کا معائنہ اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے اور تیسرے دن بھی جب سعید صاحب نے ہم دونوں سے جہاز کے معائنے کی فرمائش کی تو ہمیں شفت انچارج کی بات میں کچھ کچھ صداقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں کہ سعید صاحب شاید ہم سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہمیں بیگر بھیج دیتے تھے گو کہ مکمل یقین اب بھی نہیں تھا۔

تیسرے دن بیگر میں میری مگر ایک مستری سے ہو گئی جو ڈانگری پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ میں کچھ اوزار اٹھائے

ہوئے تھے اور جہاز کی جانب جارہا تھا۔ اس نے انتہائی شائستہ طریقے سے ٹکر لگنے کی معافی مانگی جو میں نے کمال مہربانی سے قبول کر لی حالانکہ غلطی میری تھی بہر حال۔

باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ مستری نہیں تھے بلکہ جونیئر ایکویٹیو تھے یعنی ہم دونوں کے ہم قبیلہ تھے۔ انہیں پی آئی اے میں کام کرتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے، دو مہینے بعد لائسنس کا امتحان دیں گے۔ ایک جونیئر ایکویٹیو کو ڈانگری میں دیکھ کر جو صدمہ پہنچا وہ ناقابل بیان اور ناقابل برداشت تھا مگر یہ لائسنس کا معاملہ کیا تھا؟ کیا جونیئر ایکویٹیو کی ذمہ داریوں میں جہاز کا اڑانا بھی شامل تھا کہ جس کے لیے اسے لائسنس کی ضرورت پڑے۔ اس معنی کا حل ہمیں چند دن بعد مل گیا۔ جونیئر ایکویٹیو کے قبیلے سے ہونے کے ناتے غلام نبی سے ہم بہت جلد شیرو شکر ہو گئے۔ انتہائی نفیس اور سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ صوبہ سندھ سے تعلق تھا۔ غلام نبی سے دوستی انتہائی سودمند ثابت ہوئی۔ انہوں نے ہمیں پی آئی اے کے پورے انجینئرنگ کے نظام کی اندرونی جھلک دکھائی جو بعد میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ لائسنس کا عقدہ بھی انہوں نے حل کیا۔

سب سے اہم بات جو غلام نبی نے بتائی وہ یہ تھی ”چاہے آپ لوگ لاہریری واپس جائیں یا نہ جائیں اس سے سعید صاحب کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

یہ بلا کی امید افزا خبر تھی۔ میں اور اعجاز بیگم کی بلا مقصد اور بے معنی زیارتوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اعجاز نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بیگم سے باہر جانے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے سے باہر نکل کر اعجاز نے کہا۔ ”کا کا بوہری بازار چلتے ہیں۔“

بوہری بازار جانے کا تعلق ہمارے این ای ڈی کا لُج کے زمانے سے تھا۔

این ای ڈی کا لُج میں صرف لُج کے پڑھا کرتے تھے، لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ نتیجتاً اس ضمن میں وہاں صرف خشک سالی رہتی تھی۔ 1965ء میں پہلی بار ایک اکلونی لڑکی کو داخلہ دیا گیا۔ صنف نازک کو دیکھنے کے لیے این ای ڈی کے لُج کے چھٹی کے وقت برنس روڈ کے بس اسٹاپ پر منڈلایا کرتے تھے کہ اس وقت اس بس اسٹاپ پر آس پاس کے کالجوں سے آنے والے آچل لہرایا کرتے تھے۔

برنس روڈ کے بس اسٹاپ کی اس افادیت کی اطلاع این ای ڈی کے لُجوں کو ڈی جے کا لُج کے وال پیپر میگزین سے دستیاب ہوئی تھی۔ یہ میگزین بڑے سائز کے چار چھ صفحات پر

مشتمل ہوتا تھا جو کالج کی عمارت کی سب سے نمایاں دیوار پر چکا دیا جاتا تھا۔ ان صفحات میں غیر معمولی قسم کی معلومات کے مضامین بھی ہوتے تھے۔

وال پیپر میگزین میں ایک دفعہ ایک بہت ہی معلوماتی مضمون چھپا جس کا عنوان تھا گرلز۔ اس مضمون کو اس طرز پر لکھا گیا تھا جس طرح کیمسٹری کے طلبہ کیمیائی عناصر پر لکھتے ہیں کہ جن میں اس عنصر کے متعلق ساری معلومات درج ہوتی ہیں۔

مضمون گرلز میں ان کی طبیعتی خصوصیات میں درج تھا۔ نمبر 1: بلا کی وجہ کے ان میں ایال آسکتا ہے۔ نمبر 2 کمرے کے معمولی درجہ حرارت میں بھی منجمد ہو سکتی ہیں۔

کہاں پائی جاتی ہیں کے کالم میں درج تھا۔ نمبر 1 برنس روڈ کا بس اسٹاپ۔ نمبر 2 ڈی جے کا لُج کا لُجوں کا کاسن روم این ای ڈی کے طلبہ میں زیادہ تعداد میں وہ لڑکے ہوتے تھے جنہوں نے ڈی جے کا لُج سے ہی ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا ہوتا تھا۔ پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے این ای ڈی کے اکثر لڑکے ڈی جے کا لُج کے اس کاسن روم کے سامنے جمع رہتے تھے۔ کبھی کبھی سرد آہیں بھی سننے کو ملتی تھیں۔

ایک صاحبزادی تھیں جن کے بازو پر پرانے پیسے کے برابر تل تھا۔ خاصی خوش شکل بھی تھیں۔ ان کے مداحوں نے ان کا نام پیسا رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دفعہ وہ بک اسٹال سے کچھ خریدنے آئیں۔ قیمت ادا کرتے وقت ایک پیسا ان کے ہاتھ سے نیچے گر گیا جس کو ان کے جانے کے بعد ان کے کسی مداح نے اٹھا لیا۔ دوسرے مداح سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے رقیب رویا سے وہ پیسا ایک روپے کے عوض خرید لیا۔ پیسا کو شاید اس واقعے کا علم نہیں ہوا ورنہ وہ بہت جلد لکھتی بن سکتی تھیں۔ قدم قدم پر پیسے گراتی جاتیں اور نوٹ چھتی جاتیں۔

برنس روڈ کا بس اسٹاپ اور ڈی جے کے کاسن روم کی اطلاع تو وال پیپر میگزین سے موصول ہوئی تھی مگر تیسری جگہ بوہری بازار لُجوں کی اپنی دریافت تھی۔ اس کے کولبس وہ خواہ تھے۔ فرصت کے اوقات میں لُج کے بوہری بازار کے چکر لگاتے تھے کہ وہاں پر ہر نمونے کی لڑکیوں کا دیدار ہر وقت ہو سکتا تھا۔

اسکول کے لُجوں کی طرح بیگم سے بھاگنے کے بعد میں اور اعجاز نے تھوڑی دیر بوہری بازار کا چکر لگایا تھا کہ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس زمانے میں صدر میں دو تین چائینیز ریستورنٹ ہوا کرتے تھے۔ انہی ریستورنٹ میں سے ایک کا نام اے بی آئی

اور ایک کا ہانگ کانگ تھا۔ ہم دونوں نے انہی دو میں سے کسی ایک ریستورنٹ میں کھانا کھایا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے اور اعجاز نے متفقہ فیصلہ کیا کہ سعید صاحب کو ہماری کوئی ضرورت نہیں ہے لہذا ہمیں انٹرپورٹ کے بجائے گھر واپس جانا چاہیے۔ سعید صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ناقدری کیا چیز ہے۔ گاڑی صرف اعجاز کے پاس تھی میں پیدل تھا۔ اعجاز نے مجھے میرے گھر چھوڑا پھر اپنے گھر کا راستہ پکڑا۔ آج کا دن خاصا اچھا گزرا تھا۔ ہم نے بہت کچھ اچھو کیا تھا، اگلے دو ہفتے ہمارا یہی معمول رہا۔

صبح سویرے ہم سب سے پہلے جا کر سعید صاحب کو اپنی شکل دکھاتے۔ حاضری رجسٹر میں دستخط کرتے۔ تھوڑی دیر لاہریری میں کتابیں الٹ پلٹ کر بیگم کا چکر لگاتے پھر بوہری بازار۔ دوپہر کا کھانا کسی دن اے بی آئی میں کسی دن ہانگ کانگ میں۔ وہاں کے پیرے بھی اپنے روز کے گا ہوں کو پہچان گئے تھے۔ جس کے یہاں ہم ایک دن نہیں جاتے وہ دوسرے دن ہماری خیریت پوچھتے۔ خیر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی یہ معمول ہمیشہ نہیں چل سکتا تھا۔

اس صبح ہم حاضری رجسٹر میں حاضری لگانے کے بعد حسب معمول سعید صاحب کو سلام کرنے ان کے آفس میں داخل ہوئے۔ وہ حسب معمول میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ہماری آہٹ سن کر انہوں نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ یکا یک ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”کل کتھے سی؟“ انہوں نے سوال کیا ہمیں سانس سوگھ گیا۔ ہمارا آزمائشی دورانیہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ سخت تشویش ہوئی کہ کہیں یہ ہماری اور پی آئی اے کی رفاقت کا یوم آخر نہ ہو۔

ہم نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”جہاز کا معائنہ کر رہے تھے۔“ سعید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا صرف قہر آلود نظروں سے ہمیں گھورا اور ہمیں مطلع کیا کہ وہ بہت جلد ہمیں پی آئی اے کے گراؤنڈ ٹریننگ اسکول (GST) کے حوالے کرنے والے ہیں جو ہمیں سیدھا کر دیں گے۔ گویا عیاشی کے دن اختتام کو پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

کراچی کے پرانے انٹرپورٹ کا داخلہ جس سڑک سے ہوتا تھا وہ اشار گیٹ کہلاتی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ وہ بڑا ستارہ تھا مونیومنٹ ہے جو وہاں اب بھی نصب ہے۔ اس سڑک پر دو گھر ہوئے ہیں جو پرانے زمانے کی یادگار ہیں۔ اسٹے ہاتھ پر BOAC کا برڈ ہاؤس اور سیدھے ہاتھ پر KLM

فیروز خان نون 1893-1970ء
پاکستانی ماہر قانون و سیاستدان۔

سرگودھا (پاک پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور لنکسٹران سے قانون کی ڈگری لے کر لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ 1920ء میں پنجاب مجلس قانون ساز کے ممبر بنے۔

جنوری 1936ء میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ 1936ء سے 1941ء تک انگلینڈ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی رہے۔ 1941ء میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ 1946ء میں سان فرانسسکو میں اقوام متحدہ کی پہلی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ 1945ء میں پنجاب کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور بیرونی ممالک میں متعدد پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ 1950ء سے 1952ء تک مشرقی پاکستان کے گورنر رہے۔ جولائی 1953ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ جنوری 1955ء میں اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے۔ 1957ء میں مسٹر آئی آئی چندر بیگر کے مستعفی ہونے پر آپ نے مرکز میں نئی وزارت بنائی۔ اکتوبر 1958ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی حکومت نے آپ کو ”سز“ کا خطاب دیا تھا جسے آپ نے 1946ء میں مسلم لیگ کی ہدایت پر واپس کر دیا۔ انگریزی میں پانچ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے ایک From Memory آپ کی سرگزشت ہے۔ اس کا اردو ترجمہ چشم دید کے نام سے شائع ہوا۔

سرگودھا میں انتقال کیا۔
مرسلہ: حیات جاوید، سرگودھا

کاڈوے ہاؤس۔ ہوٹل پی آئی اے کا گراؤنڈ ٹریننگ اسکول (GTS) کاڈوے ہاؤس کی حدود میں واقع تھا۔ GTS میں پی آئی اے کے مختلف شعبوں کے ملازمین کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اب بھی دی جاتی ہے۔ جس میں پائلٹ ٹریننگ سے بھی نجات حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ ملازمت میں ہیں۔ ہر نئے جہاز کے ساتھ اس کے متعلق ٹریننگ حاصل کرنا ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں جب ٹریننگ کا زیادہ عرصہ گزر جائے تو ریفریش کورس کرنا پڑتا ہے۔

GTS میں ٹریننگ کی ابتدا ایک تعارفی کورس سے ہوتی۔ یہ ایک معلوماتی کورس تھا جو ہر شعبہ کو کروایا جاتا تھا باقی کورس ہر شعبہ کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ اس کورس کی ابتدا اورینٹلٹ اورینٹلٹ سے ہوتی تھی۔ اورینٹلٹ اورینٹلٹ کے ترقی و کمال کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ پی آئی اے پر ختم ہوتی تھی۔ پی آئی اے کی ابتدا اورینٹلٹ اورینٹلٹ سے ہی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کورس میں جہاز رانی کے متعلق معلومات اور کچھ عام معلومات بھی شامل ہوتی تھیں۔ ہماری کلاس میں پندرہ بیس مرد و زن شامل تھے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا سوائے ایک کے۔ اس کورس کے انسٹرکٹر ایک جواں سال مارکننگ ڈیپارٹمنٹ کے جونیئر آفیسر تھے۔ وہ اپنے بچوں کی ذہانت آزمانا چاہتے تھے کہنے لگے۔ ”کراچی اور لندن کے درمیان معیاری وقت میں پانچ گھنٹے کا فرق ہے۔ ہم لندن سے پانچ گھنٹے آگے ہیں۔“ پھر کوئی والا سوال پوچھا۔ ”اگر ایک ہوائی جہاز کراچی سے دن کے بارہ بجے اڑتا ہے اور شام پانچ بجے لندن پہنچتا ہے تو اس کی پرواز کا دورانیہ کتنا ہوگا؟“ سوال ختم ہوتے ہی اعجاز نے کہا۔ ”دس گھنٹے۔“ انسٹرکٹر صاحب ناراض ہو گئے۔ جھنجھلا کر بولے۔ ”آپ کو جواب دینے سے پہلے ہاتھ اٹھانا چاہیے تھا۔“ دراصل وہ اپنے سوال کا پورا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ اعجاز نے ان کا سارا مزہ کر کر دیا تھا۔ دوسرا دن خیریت سے گزرا۔ کورس ختم ہو چکا تھا۔ اب اصل ٹریننگ کا آغاز ہونا تھا۔

سعید صاحب نے بتایا کہ ہمارا اگلا کورس Basic electricity یعنی بجلی کے بارے میں بنیادی معلومات کا ہوگا۔ یقین نہ آیا کہ این ای ڈی سے چار سال کا کورس پاس کرنے کے بعد بھی بجلی کے متعلق ہماری بنیادی معلومات کا امتحان لیا جائے گا۔ ہم سراپا احتجاج تھے مگر سعید صاحب نے صاف صاف بتا دیا کہ آگے کی ٹریننگ کے لیے ہمارا اس کورس

کو پاس کرنا شرط ہے، کوئی راستہ نہیں تھا۔ انسان کی زندگی میں اکثر خوشگوار واقعات پیش آتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے نفسیاتی ماہروں کو اندازہ تھا کہ شاید ہماری زندگی میں کبھی ایسا موقع آجائے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ان لوگوں نے کئی سال پہلے سے ہی اس کی تیاری شروع کر دی تھی اور ہر سال برس کی تحقیق کے بعد ان کے اقبال کا نچوڑ یہ تھا کہ جب بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو سب سے پہلے انسان بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے جو ہم ہو چکے تھے۔ دوسرے مرحلے میں اس کو شدید غصہ آتا ہے۔ ہم اس مرحلے سے بھی گزر چکے تھے۔ تیسرے مرحلے میں وہ سمجھنا کرنے کی سوچتا ہے۔ یہاں پر ہم پھنس گئے کہ کس قسم کا سمجھنا کیا جاسکتا ہے۔ سوچا کہ ہمیں اس کورس کا انسٹرکٹر بنا دیا جائے تو ہمیں یہ کورس کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر یہ ناممکن تھا۔ سب سے آخری مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں انسان حالات کو قبول کر لیتا ہے۔ ہم نے بھی وہی کیا۔

GTS میں کورس شروع ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ موقع اچھا تھا ہم نے سوچا کہ اس اثنا میں این ای ڈی کے پریسل سے رابطہ کریں اور ان کو آگاہ کریں کہ بی ای کی ڈگری کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے۔ اصل چیز بجلی کے متعلق بنیادی معلومات ہیں لہذا بہتر ہوگا کہ وہ بی ای الیکٹریکل کے تمام فارغ التحصل طلباء کے لیے Basic electricity کا پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کر دیں اور اس کورس کو کراچی یونیورسٹی کے بجائے پی آئی اے کے گراؤنڈ ٹریننگ اسکول سے کروانا نہ بھولیں بعد میں یہ خیال ترک کر دیا۔ دو دن بعد ہم GTS کی عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔

کلاس روم کا معلوم کر کے وہاں داخل ہوئے تو دیکھا ہمارے انسٹرکٹر صاحب گرین بورڈ صاف کر رہے تھے۔ اس اہم کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنے ہاتھوں کو جھاڑ کر صاف کیا۔ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کلاس میں جملہ دس لوگ تھے۔ سب کا تعارف ہوا۔

چار سال کا انجینئرنگ کورس کامیابی سے مکمل کر کے بی ای کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بنیادی الیکٹریسیٹی کا کورس کرنے کی عزت افزائی کا خرم ابھی تازہ ہی تھا کہ ایک اور کاری ضرب پڑی۔ ہمیں ابھی یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ ہمیں ایک گھنٹے کے اندر ایک پرچہ حل کرنا ہوگا۔ اگر اس میں پاس ہو گئے تو ٹھیک ورنہ واپس سعید صاحب کی گود میں۔

غصہ اور شرمندگی اور رحم کے ملے جلے جذبات دل

دماغ میں موجزن تھے۔ اپنے لیے نہیں این ای ڈی اور کراچی یونیورسٹی کے لیے کہ جن کے چار سالہ انجینئرنگ کے کورس پر کسی کو اعتماد نہیں تھا۔ انکار ناممکن تھا مردہ دلی سے ہاتھ بڑھا کر پرچہ لے لیا۔

بنیادی قسم کے انگریزی، حساب، فزکس وغیرہ کے سوال تھے جو پندرہ منٹ میں حل ہو گئے۔ آخری سوال کو دیکھ کر این ای ڈی کی ڈگری کی اکثر یکا یک پانی میں کھلتی نظر آئی۔ سوال بہت معمولی تھا جس کو ہم پانچویں جماعت میں کئی کئی دفعہ حل کر چکے تھے۔ عدد دو کی اسکوئر روٹ نکالنا تھا۔ یہ ناقابل تخیل معاملہ نکلا۔

انجینئرنگ کی کلاسوں میں ہر لمحہ حساب کتاب سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اگر یہ حساب کتاب ہاتھ سے بنیادی اصولوں فرسٹ پریسل سے حل کیے جائیں تو یہ بہت زیادہ مشکل اور وقت طلب ہوتے ہیں۔ اس کا حل سلائیڈ رول کا استعمال ہے جس کے استعمال کے ہم اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ حساب کے بنیادی طریقوں کو بالکل بھول چکے تھے۔ میں نے ہر طرح سے اس سوال کا جواب نکالنے کی کوشش کی اور سائنس کالج اور اسکول کی تمام مشقوں کو ذہن میں دہرایا کئی صفحے ضائع کیے تب کہیں جا کر عین وقت پر اس کا جواب نکل سکا۔ تکبر

کے بت کو پہلی ضرب لگ چکی تھی۔ اس کے بعد ہمیں بنیادی انسٹرکٹس کا کورس کرنا تھا جو ہم نے بے چون چرا۔ قبول کر لیا۔

اب ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی کورسز سے انکار ہمارے اپنے حق میں کافی نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ انا کی تسکین تو ہو جاتی مگر لالہ وگل سے بھرے ماحول کو چھوڑ کر واپس جا کر لائبریری میں رکھی ہوئی قطار در قطار کتابوں کو گھورتا پڑتا۔ چائینز کھانوں کا دوبارہ شروع ہونا ناممکن تھا۔ GTS بوہری بازار سے بدرجہا بہتر تھا کہ یہاں ہر وقت زیر تربیت اثر ہو سٹرس کا جھگھا لگا رہتا تھا۔ مینا بازار کا سماں تھا۔

شکر ادا کیا کہ سعید صاحب ہماری بنیادی تربیت پر مصر رہے۔ صد افسوس کہ یہ ٹریننگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ ٹریننگ کا دوسرا دور شروع ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا۔ چونکہ ابھی GTS واپس جانے میں وقت تھا اور میکینیکل انجینئرنگ میں کام کرنے کے لیے جس ٹریننگ اور تجربے کی ضرورت تھی وہ ہمارے پاس ابھی نہیں تھا۔ طے یہ ہوا کہ ہم دونوں کو بدست خود کام کرنے کا شوگر بنایا جائے۔ اعجاز کو الیکٹریکل شاپ اور مجھے بونگ بیئر بھج دیا گیا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم بہار کی گل کاریاں
مارچ 2014ء کی تقریریں

اولین صفحات ● افریقا کے مراسرار جنگلات میں ہولناک واقعات اور درندگی کو اجاگر کرتا سنسنی خیز ناول **امجد رئیس** کی قابل تحسین کاوش

گرداب ● رکی میاں شکیل کی خدایاں بھانوی ڈوبیں۔ اسماعیل قادری کے قلم کی جولائیاں

جواہری ● **احمد اقبال** کے شہرِ بلاقلم سے ایک جواہری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نرالیے انداز ● مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں

سزورق کی کہانیاں

بھلی کہانی ● جڑی عیسیٰ کی لکھی ہوئی کہانی کا انوکھا بلطف انداز تیش۔ **احمد اقبال** کے مخصوص نگ میں

دوسری کہانی ● جڑی اور محبت کے ملاپ سے بنی کہانی۔ **سمیرا یعقوب** کے قلم کی جولائی



آپ کے تہرے...
مشوئے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھاتیں

یونگ پیگرم میں تعیناتی سے مجھے خاصا اطمینان ہوا۔ اس لیے کہ غلام نبی بھی اسی پیگرم میں کام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ میرا وقت اچھا گزرنے لگا مگر ہمیں پر غلام نبی نے وہ انکشاف کیا کہ انا کابت جو کافی حد تک سرنگوں ہو چکا تھا پورے جوش اور شدت کے ساتھ دوبارہ سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

جس چیز نے اس سرنگوں بت کو دوبارہ اٹھ کھڑا کیا تھا وہ تھی اس لائنس کی تفصیل جس کی تیاری غلام نبی کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پی آئی اے میں تنخواہوں کے دو اسکیل ہیں۔ ایک اداری اور دوسرا ٹیکنیکل۔ ٹیکنیکل اسکیل حاصل کرنے کے لیے لازم تھا آپ کے پاس انٹر کرافٹ سائنس انجینئر (AME) کا لائنس یا شاپ اپروول ہو۔ صرف بی ای کی بنیاد پر لائنس نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ آپ کے پاس بدست خود جہاز پر کام کرنے کا تین تا پانچ سالہ تجربہ ہو جس کے بعد آپ لائنس کا امتحان دینے کے اہل ہوتے تھے۔ یہ امتحان محکمہ شہری ہوا بازی سول ایویشن (Civil aviation) کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد لائنس ملتا تھا جس کے بعد اگر بی آئی اے کے پاس انجینئر کی اسامی خالی ہے تو آپ کو ٹیکنیکل اسکیل ملتا تھا ورنہ اسامی کے خالی ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔ یہ بی ای کی ڈگری کی پہلی توہین تھی جو کسی حد قابل برداشت تھی۔ جس ناقابل برداشت توہین نے ہمیں دلی صدمہ پہنچایا تھا جس کے نتیجے میں ہماری انا کا سویا ہوا بت جاگ کھڑا ہوا تھا وہ تھی لائنس حاصل کرنے کے لیے بنیادی تعلیمی قابلیت جو صرف ایف ایس سی تھی۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے تھے، یہ ناممکن تھا۔ ہم نے فوری طور پر D.E سے ملنے کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔

اعجاز صاحب انتہائی بردبار، سنجیدہ اور سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ ہم ان سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس انداز سے ہمیں ہر چیز سمجھائی کہ ہمیں اپنے روئے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ انا کے بت کو ایک اور کاری ضرب لگی مگر وہ ابھی سانس لے رہا تھا۔ یہ بت اس وقت پاش پاش ہوا جب ہم نے باقاعدہ جہازوں پر کام کرنا شروع کیا اور ہمیں اپنے ساتھیوں سے ہمارے ساتھ کام کرنے والے مکینکس سے پذیرائی ملی۔ عزت اور محبت کے ساتھ ساتھ عملی کام کے کرنے میں ہمیں ان سے بہت مدد ملی۔ جس کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ہمیں بہت سے ایسے پُر خلوص مکینک دوست ملے جن کی خواہش ہوتی تھی کہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے گندے نہ ہوں۔ وہ ہمارے جیسے کا

کام بھی کر دیں۔

لیکن ہم اپنے جامہ میں واپس آ چکے تھے۔ کام اور مزدور کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ ہر کام ہم خود اپنے ہاتھوں سے کریں تاکہ ہمیں واقعتاً تجربہ ہو کہ کام کیسے ہوتا ہے اور کیسے کیا جاتا ہے۔ ہم اس منزل کی طرف گامزن ہونا چاہتے تھے کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنی ذاتی میراث سمجھ لیتے ہیں اور کبھی اپنے خاندان، اپنی ذہانت، اپنی دولت اور قد و قامت کی بنیاد پر خود کو دوسروں سے برتر اور بہتر سمجھتے ہوئے تکبر کا عکار ہو جاتے ہیں۔ اس انکسار کی بنیادی وجہ ہماری اس عظیم کتاب سے دوری ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال فرما گئے ہیں اور تم خوار ہوئے تارک قراں ہو کر

AME لائنس کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ A انٹر فریم (Air frame) کے لیے۔ C انجن کے لیے اور X ایوینکس کے لیے۔

X لائنس کی ذیلی قسمیں ہوتی ہیں جن میں آٹو پائلٹ (Auto pilot) نیویگیشن (Navigation) وغیرہ شامل ہیں۔

ہمارا ٹریننگ کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس دور میں ہمیں فوکر F27 اور یونگ B-707 کے کورس کرنے تھے جو چند مہینے میں ہو گئے۔ اب ہم باقاعدہ جہاز پر کام کرنے کے لائق ہو چکے تھے۔ کاپٹ میں نصب ہر چیز کو ہاتھ لگا سکتے تھے۔

☆☆☆

ٹریننگ کی تکمیل کے بعد میری تعیناتی یونگ B-707 کے پیگرم میں کر دی گئی تھی۔

پیگرم کے عملے کی ذمہ داریوں میں لائن سٹیننس اور پیگرم سٹیننس دونوں شامل تھے۔

لائن وہ جگہ کہلاتی ہے جہاں ہوائی جہاز اترنے کے بعد آکر پارک ہوتا ہے اور پرواز کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ لائن پر جہاز روزانہ چیک کیے جاتے ہیں۔ ان چیکس کے دوران اگر کوئی خرابی ظاہر ہو تو اسے ٹھیک کر دیا جاتا ہے بشرطیکہ یہ خرابی معمولی نوعیت کی ہو۔ اگر خرابی اس نوعیت کی ہو کہ اس پر لمبا کام کرنا پڑے گا تو جہاز کو پیگرم میں لا کر اس کام کو مکمل کیا جاتا ہے۔

پیگرم کی ڈیوٹی کے پہلے دن صبح سات بجے پیگرم کے شفٹ انچارج صاحب کو اپنے آنے کی خوش خبری سنائی لیکن

خوشی سے اچھلنے کے بجائے انہوں نے مجھے ایوینکس (Avionics) سپر وائزر کے حوالے کر دیا۔ جو لڑکوں کے درمیان کام تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ شفٹ ابھی شروع ہوئی تھی، کہنے لگے۔ ”آپ جہاز پر چلیں میں آپ کو تھوڑی دیر میں بلاتا ہوں۔“

میں کاپٹ میں چلا گیا کہ ایک دفعہ اور کپتان کی سیٹ پر بیٹھ کر دیکھوں کہ یہ کیسی ہوتی ہے۔

میرے پیچھے پیچھے غلام نبی بھی کاپٹ میں داخل ہوئے۔ سپر وائزر کا نام لے کر کہنے لگے۔ ”آپ کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا بی ای کر کے آیا ہے مگر میرے انڈر کام کرے گا۔“

میرا تو بی ای کے تکبر کا بت ٹوٹ چکا تھا مگر اکثر لوگ بی ای کی ڈگری کو رشک اور کچھ رقابت و حسرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مجھے اس کا کئی دفعہ تجربہ ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ میں ٹرین سے سز کر رہا تھا اوپر کی سیٹ پر لیٹا تھا، نیچے کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ایک دادا اور پوتا اور چند دوسرے لوگ تھے۔ آپس میں حال احوال پوچھ رہے تھے۔ دادا، پوتے کا تعلق کسی ادبیت سے تھا پوربی زبان بول رہے تھے۔ ان کے دیہات میں زیادہ تعلیم کے مواقع نہیں تھے مگر ان کے پوتے نے کسی قریبی اسکول سے میٹرک کا کورس مکمل کر کے امتحان پاس کر لیا تھا جس پر دادا کو بجا طور پر فخر تھا۔ پوتے سے سوال کیا گیا کہ اب آگے کیا کرو گے تو اس نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا۔ ”پی آئی اے میں انجینئر بنوں گا۔“ بات آئی گئی ہو گئی، میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو گاڑی کو روہڑی کے انشیشن پر کھڑا پایا۔ نیچے اتر کر منہ ہاتھ دھویا کہ اگلے انشیشن پر مجھے اترنا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی تو میں ڈبے میں سوار ہو کر نیچے والی سیٹ پر دادا کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔

دادا نے پُر تپاک طریقے سے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔ میرا نام پوچھا اور پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں نے نام بتایا اور بتایا کہ میں پی آئی اے میں انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ یہ سن کر پوتے کا منہ حیرت، عقیدت اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کھلے کا بھلا رہ گیا۔ اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ پی آئی اے کا ایک جیتا جاگتا انجینئر اس کے روبرو ہو سکتا ہے۔

ابھی یہ صورت حال برقرار تھی کہ دوسرا دھماکا ہوا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاحب مجھ سے گویا ہوئے اور پوچھنے لگے۔ ”کیا آپ نے این ای ڈی کالج سے تعلیم حاصل

ڈیجیٹل ایوینکس

یونگ کمپنی کے جہاز B-757 اور B-767 اور اربس انڈسٹری کے جہاز A-310 اور A-300-600 نئی پود کے جہاز ہیں۔ ان جہازوں میں جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا ہے۔ خاص طور سے ایوینکس (Avionics) ٹیکنالوجی۔ پرانے جہازوں میں انا لاگ (Analogue) ایوینکس، استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن اب ایوینکس کی دنیا میں انقلاب آچکا تھا۔ انا لاگ کے بجائے ڈیجیٹل (Digital) ٹیکنالوجی استعمال میں آچکی تھی۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے شاید کلائی پر باندھنے والی گھڑی کی مثال سب سے زیادہ مناسب ہوگی۔ انا لاگ کی مثال پرانی گھڑی کی طرح ہے جو گراہیوں کے ذریعے گھڑی کے گھٹنے اور منٹ والی کمانیوں کو چلاتی تھی جن سے وقت کا تعین کیا جاسکتا تھا۔ ڈیجیٹل ایوینکس کی مثال ڈیجیٹل گھڑی کی طرح ہے جس میں گراہیوں اور گھٹنے اور منٹ کے ہاتھوں کے بجائے وقت یا تو گھڑی کے ڈائل (Dial) پر نمبروں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے یا پھر ڈائل پر گھڑی کی کمانیوں کا متحرک عکس بنایا جاسکتا ہے۔

کی ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بڑی حسرت سے کہنے لگے۔ ”میں نے ایم ایس سی پاس کرنے کے بعد بھی این ای ڈی میں داخلے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔“

ان دونوں واقعات یا سانحات میں میرا نہ تو کوئی ذاتی دخل تھا اور نہ ہی کوئی قصور مگر میں خود کو ان دونوں کا مجرم سمجھنے لگا۔ میرا انشیشن آچکا تھا۔ میں دل میں ندامت کا احساس لیے ٹرین سے اتر کرتا گئے میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان دونوں واقعات کا اثر میرے ذہن پر تھا۔ تمام راستے میرے ذہن کی کچھ عجیب کیفیت رہی۔ مجھے انسان کے ناشکرے پن پر سخت تاسف محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کیسی کیسی بہانوں سے نوازتا ہے اور ہم اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہمارا حق تھا کہ ہمیں یہ چیزیں ملیں اور ان چیزوں کا گلہ کرنے لگتے ہیں جن سے ہم محروم رہ گئے۔ کلام پاک میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے، جب اس سے

کوئی نعمت چھن جاتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور شکوے کرنے لگتا ہے اور جب کوئی نعمت مل جاتی ہے تو سچی خورہ بن جاتا ہے۔ میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور غلام نبی کے ساتھ ایوانکس سپروائزر صاحب کا انتظار کرنے لگا کہ وہ آکر مجھے کام بتائیں۔ وہ لڑکوں میں کام تقسیم کر کے فارغ ہو چکے تھے میرے پاس کاپٹ میں آگئے۔ مجھے غلام نبی کے ساتھ دیکھا تو کہنے لگے۔ ”آپ ان ہی کے ساتھ کام کریں۔“ پھر ایک جاب کارڈ میری طرف بڑھا کر کہنے لگے۔ ”آپ کے کام کی تفصیل اس میں درج ہے۔ غلام نبی آپ کو اس کا طریقہ کار سمجھا دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ جہاز سے نیچے اتر گئے۔

اس کارڈ کی نوعیت سمجھنے کے لیے اور جہاز کی تکنیکی دیکھ بھال اور مرمت کا نیکل (Concept) سمجھنے کے لیے چند خشک قسم کی تکنیکی اصطلاحات کا بیان ناگزیر ہے (جن لوگوں کے لیے یہ بیان آزمائش ثابت ہو وہ اگلے پیرا گراف نظر انداز کر سکتے ہیں)

ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے مسافروں کو اطمینان کا سانس لینا چاہیے کیونکہ دنیا بھر میں جتنی بھی سواریاں ہیں گدھا گاڑی سے لے کر سائیکل، موٹر کار اور ہوائی جہاز تک ان سب میں سلامتی، حفاظت اور آرام کا جس قدر اہتمام اور انتظام ہوائی جہاز کے لیے کیا جاتا ہے وہ کسی اور سواری کے لیے نہیں کیا جاتا۔ کتنی ہی دفعہ سننے کو ملتا ہے کہ مسافروں کی جو تعداد ہوائی حادثوں میں اپنی جان گنوا بیٹھتی ہے وہ اس تعداد سے کئی گنا کم ہے جس تعداد میں بے شمار مسافر موٹر سائیکل اور موٹر کاروں کے حادثوں میں گنوا بیٹھتے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

ایک وجہ تو ٹیکنالوجی کی وہ ترقی ہے جو پچھلی صدی سے ہوتی چلی آرہی ہے اور دوسری اور اہم ترین وجہ ہوائی جہاز کی بہت ہی سخت اور مربوط تکنیکی دیکھ بھال و مرمت۔ مینٹیننس کا وہ نظام ہے جس پر کسی قسم کی چلک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی جاتی ہے۔ اگر کوئی فرد یا ادارہ اس سے غفلت برتے تو یہ ان کی اپنی ذاتی ناقابل معافی کوتاہی ہوگی۔

اس دیکھ بھال اور مرمت کے نظام کے تحت سب سے پہلے تو اس جہاز کا..... جس کو اس دن پرواز کرنا ہوتا ہے..... ڈیلی چیک (Daily Check) کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر پرواز کی اڑان سے پہلے جہاز کا ڈیپارچر چیک (Departure Check) ہوتا ہے۔ ان چیکوں کے دوران اگر کسی بھی نظام میں کوئی خرابی پائی جائے تو پرواز سے پہلے ان کو دور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر جہاز کی مقررہ اڑان

کے دورانیہ کے بعد جو عام طور سے سو گھنٹے، تین سو گھنٹے اور ایک ہزار گھنٹے ہوتے ہیں جہاز زیادہ دقیق چیک کیے جاتے ہیں جو C.B.A چیک کہلاتے ہیں اور تقریباً آٹھ سال کے بعد ہر جہاز کا مکمل اوور ہال (Overhaul) ہوتا ہے۔ ہر چیک کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس چیک میں کیے جانے والے ہر کام کو تفصیل کے ساتھ اس کام کے جاب کارڈ (Job Card) میں درج کر دیا جاتا ہے۔ معمولی سے معمولی تفصیل بھی یادداشت پر نہیں چھوڑی جاتی۔

کام مکمل کرنے کے بعد ملکیت جاب کارڈ پر دستخط کرتا ہے کہ اس نے یہ کام کر لیا ہے اور انسپکٹر یا انجینئر کام کا معائنہ کرنے کے بعد کارڈ پر دستخط کرتا ہے کہ یہ کام ٹھیک اور مکمل طور پر کر دیا گیا ہے۔

سپروائزر صاحب میرا جاب کارڈ میرے ہاتھ میں تھا کہ جہاز سے نیچے جا چکے تھے۔ غلام نبی اپنا کام کرنے میں مصروف تھے، مجھ سے کہنے لگے۔ ”میں اپنا کام ختم کر کے آپ کو آپ کے کارڈ کی تفصیل سمجھاتا ہوں۔“

میں اپنا کارڈ پڑھنے میں مصروف تھا کہ یکا یک آواز آئی۔ ”وہوپ وہوپ پل اپ“ (Whoop Whoop Pull up) میں نے گھبرا کر اپنی پتلون پکڑ کر اوپر کھینچی کہ شاید یہ نیچے آگئی تھی اور کسی نے مجھے خبردار کیا ہے کہ اس کو اوپر کر لوں۔ میری اس مضحکہ خیز کیفیت پر غلام نبی کی نظر پڑی تو گھبرا کر پوچھنے لگے ”کیا ہوا؟“ میرے تفصیل بتانے پر انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے ”یاریہ کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں GPWS ٹیسٹ (Test) کر رہا تھا یہ اس کے کمپیوٹر کی آواز تھی۔“ آج کمپیوٹر وغیرہ سے اس قسم کی انسانی آواز سننا روا کا معمول ہے۔ آج کا ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ انسانی آواز کمپیوٹر سے آرہی ہے۔ مگر اس زمانہ میں..... آج سے تقریباً پینتالیس سال پہلے لفظ کمپیوٹر سے ہی لوگ نا آشنا تھے سوائے چند ایک کے۔ اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے غلام نبی نے بتایا کہ GPWS ایک ایسا نظام ہے کہ پرواز کے دوران یا اترتے وقت جہاز زمین یا پہاڑ وغیرہ سے خطرناک حد تک نزدیک آجائے تو GPWS کا کمپیوٹر پائلٹ کو وارننگ دیتا ہے کہ فوراً جہاز کو اوپر اٹھاؤ۔ اس کے علاوہ GPWS کے کمپیوٹر اور بھی کام ہوتے ہیں۔ خطرناک حد تک نزدیک آنے کی وارننگ کا تجربہ میرے بچپن کے دوست امام نذیر کو بھی ہوا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان کی منگنی ہو چکی تھی شادی کی تاریخ ابھی دور تھی۔ ان کے ہونے والے سانس

نے ان کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے ان کو یہ خاص رعایت دے رکھی تھی کہ وہ کبھی گھبراہٹ پر مگیتر سے مل سکتے تھے۔ مگر ایک خاص فاصلے سے۔ صوفے کے ایک سرے پر مگیتر اور دوسرے سرے پر امام نذیر۔ ایسے نازک موقعوں پر انسان اکثر ہلک جاتا ہے۔ زور جذبات میں فاصلوں کا خیال نہیں رہتا۔ جب بھی امام نذیر ان نازک جذبات سے سرشار ہو کر مگیتر سے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش کرتے تو ان کی مگیتر کا کمپیوٹر نمائشا بھائی بھی ”وہوپ وہوپ“ (Whoop Whoop) قسم کی وارننگ اتنی تیز آواز میں دیتا کہ باقی گھر والے ہوشیار ہو جاتے اور احتیاطی تدابیر کرتے۔ امام نذیر سنبھل کر بیٹھ جاتے۔

غلام نبی مجھے کارڈ پر کام کرنے کا طریقہ سمجھا چکے تھے۔ میں نے کام مکمل کر کے سپروائزر سے تصدیق کروائی۔ شفٹ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مگر کا پہلا دن ساتھ خیر کے گزرا۔

دوسرے دن میری ڈیوٹی لائن پر لگی۔ بوننگ B-707 کا ڈیپارچر چیک کرنا تھا جو معمول کے مطابق ہو گیا۔ جہاز پرواز کے لیے تیار تھا کہ یکا یک جہاز کا دروازہ کھلا اور اتر ہوئیں نے انجینئرنگ کو بڑے زور سے یاد کیا۔ بوننگ میں ایسے موقعوں پر دو طرح کی خرابی اکثر ہو جایا کرتی تھی جو معمولی نوعیت کی تھی۔ ایک کا تعلق مسافروں کے استعمال کی ریڈنگ لائٹ کے سوئچ (Switch) سے تھا اور دوسرے کا تعلق کبلی میں لگے ہوئے کافی میکر سے تھا۔ یہ دونوں سوئچ سولینائیڈ چیک کیے جاتے تھے جو کسی بنا پر یہ کام کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اس کا ایک ہی حل تھا۔ بہت آسان حل..... ایک زوردار ہچکچڑ جس کے کھاتے ہی یہ کام کرنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ اسی قسم کا واقعہ میرے ساتھ دوران پرواز پیش آیا۔

اس زمانے میں ڈھاکہ کا مشرقی پاکستان ہوا کرتا تھا۔ میں بحیثیت مسافر کراچی سے ڈھاکہ کا سفر کر رہا تھا۔ میری سیٹ سے دو سیٹ آگے بائیں جانب دو انگریز نوجوان بیٹھے تھے ان میں سے ایک کی سیٹ کے اوپر ریڈنگ لائٹ جل رہی تھی جس کو وہ بجھانا چاہتا تھا مگر اس کا سوئچ کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ اس نے اتر ہوئیں کو بلایا جس نے اپنی مقدور بھر کوشش کی مگر کام نہ بنا۔ مجھ کو گتے کا ایک ٹکڑا لائی کہ لائٹ کو ڈھانک دے مگر وہ لڑکے اس اتر ہوئیں کو تنگ کرنے کے موڈ میں آ چکے تھے۔ انہوں نے گناہ لگانے دیا وہ مصرعے کہ سوئچ ٹھیک کیا جائے۔ وہ اتر ہوئیں کی ہر التجا کو مسترد کر رہے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھ کے میں ان کی سیٹ کی طرف گیا اور اتر ہوئیں سے کہا کہ اگر وہ اجازت

دے تو میں کوشش کروں۔ اس کے بعد میں نے وہی تھپڑ والی ترکیب آزمائی جو کارگر ہو گئی۔ ان دونوں لڑکوں نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ان کی تفریح کا موقع ضائع ہو چکا تھا۔ ویسے تو جہاز کا زیادہ تر کام دلچسپ ہوتا ہے مگر بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو ہر کوئی کسی دوسرے پر ٹالنا چاہتا ہے۔ میں مگیتر میں نو وارد تھا اکثر ان کالوں کا قہر میرے نام نکلتا۔ ان ہی میں ایک کام تھا ٹیک جزیئر (Tach Generator) تبدیل کرنا۔

ٹیک جزیئر انجن کا گھماؤ معلوم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ انجن کے ایسے حصے میں لگا ہوتا ہے جہاں ہاتھ بڑی مشکل سے پہنچتا ہے۔ اس کا بدلنا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے جو خاص طور سے انجن نمبر 3 پر۔ انجن نمبر 3 وہ انجن ہے جو اشار بورڈ (Starbord) جہاز کے سیدھے ہاتھ کی جانب اندر کی طرف انبورڈ (Inboard) لگا ہوتا ہے۔ جگہ اتنی تنگ ہوتی ہے کہ پورے سائز کا پانا استعمال نہیں ہو سکتا۔ آدھا کٹا ہوا پانا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ ہر آدھے گھماؤ کے بعد پانے کا رخ بدلنا پڑتا۔ یہ تو ہے پانے کی داستان مگر خود بے چارے کلیئر کا یہ حال ہوتا کہ اس کا منہ سامنے کی طرف ہوتا ہے اور الٹا ہاتھ پانے کو پکڑے ہوئے پیچھے کی طرف۔ اندازے سے پانے کو گھماتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس کا کام اختتام کو پہنچتا تو اس کا ہاتھ شل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کام کے دوران کلیئر کی صورت حال کچھ اس طرح ہوتی۔

دینا کسی کا ساغر مہ یاد ہے نظام منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

دوسرا کام جس سے ہر کوئی بھاگتا تھا وہ تھا ٹائلٹ موٹر (Toilet Motor) تبدیل کرنا۔ خیال رہے کہ یہ جہاز میں کوئی ایسی موٹر نہیں ہے کہ جس میں سوار ہو کر مسافر ٹائلٹ کا فاصلہ طے کرے۔ یہ بجلی کی وہ چھوٹی سی موٹر ہوتی ہے جو ٹائلٹ کے فلیش (Flush) کو چلاتی ہے۔ مسافر تو آرام سے فلیش کا بٹن دبا کر آ جاتے ہیں لیکن ان کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ اس بٹن سے جو موٹر حرکت میں آتی ہے اس کو کیسے بدلا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ضروری نہیں میں صرف اس ضمن میں ایک واقعہ دہرانا چاہتا ہوں۔ PIA میں جو زیر تربیت اتر ہوئیں ہوتی ہیں ان کو GTS کے کلاس روم کے ساتھ ساتھ ٹیگٹر لاکر جہاز پر عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ جہاز سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک موقع تھا۔ میں تیل اور کالک میں الٹی ہوئی ڈانگری پنن کرنا کہ پر رومال باندھ کر خوشبوؤں سے

B-747

بونگ (Boeing) کمپنی کو صبح وقت پر صبح جہاز بنانے پر ملکہ حاصل تھا۔ اس کے بنائے ہوئے B-707 اور B-747 جہازوں کا شمار دنیا کے کامیاب ترین جہازوں میں ہوتا ہے۔ B-747 کے کئی ذیلی ماڈل بنائے گئے۔ بنیادی ماڈل B-747-100 تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ B-747-SP بھی بنایا گیا۔ SP مخفف ہے اسٹیشنل پرفارمنس کا۔ ایک ٹارل B-747-100 کی لمبائی تقریباً 232 فٹ ہوتی ہے۔ لیکن B-747-SP بناتے وقت اس کے فوولاج یعنی اس کے دھڑ میں... سے تقریباً 47 فٹ کا ایک ٹکڑا نکال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے B-747-SP کا وزن بہت کم ہو جاتا ہے۔ لیکن دونوں جہازوں کی ٹیکنیکوں میں ایندھن کی مقدار ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس ایندھن کو استعمال کرتے ہوئے B-747-SP جہاز B-747-100 کے مقابلہ میں بغیر ر کے ہوئے زیادہ لمبی اڑان پر جاسکتا ہے۔ اگر B-747-SP ائیر پورٹ پر کھڑا ملے تو یہ اپنے گٹھے پن سے فوراً اچھٹا جاسکتا ہے۔

جاسکتے تھے جن کے لیے دس فیصد کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ مگر ان ٹکٹوں کے ساتھ ایک دم چلا بھی تھا۔ ان ٹکٹوں پر سیٹ بک نہیں ہوتی تھی۔ ائیر پورٹ جا کر قسمت آزمائی کریں۔ اگر جہاز میں جگہ ہوتی تو آپ ہوا میں ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے جائیں۔

میں نے قسمت آزمانے کی ٹھانی اور سکھر کے سفر کے لیے اپنا پہلا ID90 ٹکٹ لے کر ائیر پورٹ روانہ ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی جہاز میں جگہ تھی۔ میں بورڈنگ کارڈ لے کر مسافروں کے لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پرواز کی روانگی کا اعلان سنائی دیا۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ جا کر جہاز میں بیٹھ گیا۔

جہاز فضا میں بلند ہو چکا تھا زمین کی چیزیں اور آدمی چھوٹے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ رفتار کا اندازہ نہ ہوتا تھا، لگتا تھا کہ پانچ دس میل کی رفتار ہے۔ انجن کی آواز بھی بہت ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ ابھی میں ان چیزوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے وہ قصہ یاد آ گیا جو ایک آٹھویں جماعت کے طالب علم کے متعلق تھا اور حسب حال تھا۔ اس لڑکے کی عادت تھی کہ خواہ

ساتھی ملینکس کے کتنا قریب آچکے تھے۔ آج کی شفٹ معرکوں کی شفٹ تھی۔

دودھ کے گلاس کے ساتھ ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا جس کا جہاز سے کوئی تعلق نہیں۔ بیگر کے باہر گاڑیاں پارک کرنے کی جگہ تھی جہاں بیگر میں کام کرنے والے ملازمین اپنی گاڑیاں پارک کرتے تھے۔ اس زمانے میں بہت کم لوگوں کے پاس گاڑیاں ہوا کرتی تھیں اس لیے گوکہ پارکنگ کی جگہ کم تھی۔ گزارا ہو جاتا تھا۔ اتفاق سے اس رات جب ہمارے ایک انجینئر گاڑی پارک کرنے آئے تو ساری جگہیں بھر چکی تھیں جس کی وجہ سے ان کو گاڑی اس طرح پارک کرنا پڑی کہ اس کی ایک سائیڈ (Side) بیگر کی دیوار کے ساتھ لگائی پڑی۔ ان کے پاس فیٹ 600 ہوتی تھی۔ فیٹ ایک اطالوی موٹر سائز کمپنی ہے جس کی گاڑیاں اب پاکستان میں نہیں آتیں مگر اس وقت خاصی مقبول تھیں۔ فیٹ 600 ایک چھوٹی سی گاڑی ہوتی تھی اسی لیے بیگر کی دیوار کے پاس والی مختصر سی جگہ پر آ گئی۔ اس کا انجن پیچھے کی طرف ہوا کرتا تھا۔ دو دروازے ہوتے تھے۔ صبح جب شفٹ کا وقت پورا ہو گیا تو انجینئر صاحب اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گاڑی اسٹارٹ کرنے گئے تو دیکھا گاڑی کی وہ والی سائیڈ جو بیگر کی دیوار کے ساتھ تھی اس کے نیچے اور اس کے بالکل پیچوں بیچ ڈالڈا کی گاڑی کا ایک گول بڑا ڈبا رکھا ہے جس کے سہارے گاڑی کھڑی تھی۔ اس جانب کے دونوں پیسے کوئی اتار کر فرو چکر ہو چکا تھا۔

رونے کی ہے بات آتی ہنی بھی ہے کچھ ساتھیوں نے انجینئر صاحب کو متنبہ کیا کہ پیسہ چور دوسری جانب کے پیسے چرانے کے لیے ڈالڈا کا دوسرا ڈبہ لینے گیا ہے۔ کچھ نے مشورہ دیا کہ اب گاڑی میں ان کو جیک (Jack) کے بجائے ڈالڈا کا ڈبہ رکھنا چاہیے کہ اس طرح اس کی مدد سے دونوں پیسوں کو بہ یک وقت اوپر اٹھایا جاسکتا ہے۔ جیک بے کار چیز ہے اس سے تو ایک وقت میں صرف ایک ہی پیسہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ شفٹ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اب تک میں نے صرف زمین پر کھڑے ہوئے ہوائی جہازوں کی تفریح کی تھی۔ ان میں بیٹھ کر اڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔ PIA میں ملازمین کو ہوائی سفر کی سہولت تھی۔ سال میں ایک کفرم ٹکٹ ملتا تھا جس پر سیٹ بک کروائی جاسکتی تھی۔ یہ ٹکٹ مفت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تین ID90 ٹکٹ خریدے

مہری کی فضا۔ ہم لوگ اس معاملے میں خوش نصیب تھے۔ جب بیگر میں کام نہ ہو تو وقت گزارنے کے لیے دوسرے تھے۔ ایک شفٹ انچارج اور انجینئروں کے لیے اور دوسرا ملینکس (Mechanics) کے لیے۔ ہمارا زیادہ تر وقت دوسرے کمرے میں گزرتا تھا۔ ایک رات ہم لوگ اس کمرے میں بیٹھے ہوئے ساری دنیا کے مسائل منہ زبانی حل کر رہے تھے کہ اچانک ایک ساتھی ملینک نے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ جب باہر نکلے تو وہاں دو اور ملینکس کو کھڑا پایا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ”دودھ پینیں گے؟“

عجیب سا سوال تھا۔ چائے پینے کو تو ہر کوئی پوچھتا ہے مگر دودھ پینے کے لیے پہلی بار پوچھا جا رہا تھا۔ میں نے شاید بے یقینی کے ساتھ سر ہلادیا ہوگا کہ اس کے بعد ہم سب کینٹین کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر ایک ساتھی نے نوکون قسم کی ایک پرچی کاؤنٹر پر کھڑے آدمی کے ہاتھ میں تھادی۔ تھوڑی دیر بعد گرما گرم دودھ سے بھرے چار بڑے بڑے گلاس ہماری میز پر رکھے تھے جو غٹا غٹ پی کر ختم کر دیے گئے۔ بعد میں تفصیل پتا چلی۔

جہاز میں بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو معزز صحت ہوتے ہیں لیکن ان کا کرنا بھی ناگزیر ہے۔ ورنہ جہاز نہیں اڑایا جاسکتا۔ مثلاً فیول ٹینک (Fuel Tank) کے اندر جا کر کام کرنا۔ یہ فیول ٹینک جہاز کے پروں میں نصب ہوتے ہیں۔ ان کے اندر جگہ بہت کم ہوتی ہے اور سانس لینے کی جگہ تو اور بھی کم۔ اس میں صرف دپلے پتلے لوگ ہی کام کر سکتے ہیں اور ہر تھوڑی دیر بعد ان کو سانس درست کرنے کے لیے تازہ ہوا کے لیے ٹینک سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ یہ چیز صحت کے لیے نقصان دہ ہے اور اس کے مداوے کے لیے کام کرنے والے کو دودھ فراہم کیا جاتا ہے۔ دودھ کا گلاس حاصل کرنے کے لیے خاص قسم کے کوپن ہوتے ہیں مگر اس پر سپروائزر یا انجینئر کے دستخط اور مہر ضروری ہیں۔ میرے ساتھیوں کے پاس کوپن بک تو تھی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو کہیں سے ریڈ پوشاپ کے سپروائزر کی مہر بھی ہاتھ لگ گئی تھی جس کو وہ استعمال کر رہے تھے۔ رات کی شفٹ کی احتیاط اس لیے تھی کہ پکڑے جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔

اس واقعے کو تحریر کرنے کا مقصد ان لوگوں کی تعریف و حوصلہ افزائی کرنا نہیں ہے جنہوں نے ایک ضروری سہولت کا بے جا استعمال کیا اور انجانے میں مجھے بھی اس نازیبا حرکت میں شامل کر لیا۔ یہاں صرف بتانا مقصود ہے کہ ہم لوگ اپنے

محفوظ رہنے کے لیے، ٹائلٹ کا کور (Cover) نکال کر اس پر جھک کر ٹائلٹ موٹر بدلنے کا خوشگوار فرض انجام دے رہا تھا۔ ماحول ایوننگ ان پیرس (Evening in Paris) کی خوشبو سے معطر تھا۔ اتنے میں نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اتر ہوٹس کے اس جھنڈ میں میرے ایک گہرے دوست کی ہمشیرہ بھی شامل تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا، معنی خیز انداز میں مسکرا کر اور ہاتھ ہلا کر چل دیں۔ انہوں نے اس قصے کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے بھائی کو جاسنایا۔ مریج مصالحو ان کا اپنا تھا جو قصے کو چٹا بنانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

اگلے دن ان کے بھائی نے مجھے فون کیا اور اطلاع دی کہ انہوں نے ایک دفتر کی صفائی کا ٹھیکہ لیا ہے جس میں ٹائلٹ کی صفائی بھی شامل ہے۔ ان کو تجربہ کار جمدار کی خدمات درکار ہیں اگر میں چاہوں تو وہ میری ملازمت کی درخواست پر غور کر سکتے ہیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مجھے اتنی ہنسی نہیں آئی جتنی ان کو آ رہی تھی۔ لیکن ہر فرعون رانموی۔

ان محترمہ کی ٹریننگ ختم ہو چکی تھی اور وہ باقاعدہ ڈیوٹی پر آچکی تھیں۔ میں لاہور سے کراچی کی فلائٹ پر سوار تھا۔ جب میں ٹائلٹ استعمال کرنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ ایک اتر ہوٹس اس کی صفائی کر رہی تھی۔ اتر ہوٹس کی پشت میری طرف تھی۔ صفائی بھی عام صفائی نہیں بلکہ مکمل جمداریوں والی صفائی۔ جب وہ صفائی مکمل کر کے پلیٹیں تو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کون تھیں۔ انہوں نے مجھے جھینپ کر دیکھا اور اپنا ساز و سامان لے لے یہ جاوہ جا۔ میں نے کراچی پہنچ کر ان کے بھائی کو فون کیا کہ مجھے جمدار کی نوکری منظور ہے بلکہ اب میں اپنے ساتھ ایک جمدارنی بھی لاؤں گا۔ وہ معلوم نہیں کس دھن میں تھے کہنے لگے ”یار عجیب آدمی ہو۔ لڑکی پسند کر لی بتایا بھی نہیں۔“ میں نے بات ٹال دی کہ مزید کچھ کہنا عداوت تھا۔ بیگر میں بدست خود کام کرنے کی بڑی افادیت تھی۔

ایک تو یہ کہ ہر قسم کے کام کی جانکاری ہو جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ ماتحت کام کرنے والوں کے ساتھ ایک گہرا دوستانہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ انجینئرنگ کالج کے زیادہ تر طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد ہی ایکویٹو انجینئر قسم کی آسامیوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور بقیہ زندگی میز کرسی پر گزار دیتے ہیں۔ ان کو ہاتھ گندے کرنے کے موقع بھی کبھار ہی ملتے ہیں۔ وہ بھی اگر وہ خوش قسمت ہوئے تب۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے قریب نہیں ہو پاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ ایک فاصلہ رہتا ہے، ایک سرد

اسے کسی موضوع پر مضمون لکھنے کو دیا جائے وہ دو چار لائن لکھنے کے بعد اپنے دوست غلام محمد کا ذکر لے آتا اور اس کے بعد ایک رٹا ہوا مضمون غلام محمد کے بارے میں لکھ دیتا جو ہر موضوع کے مضمون میں یکساں ہوتا۔ آخر تک آکر اس کے استاد نے کہا کہ تم ”ہوائی جہاز کے سفر“ پر مضمون لکھو اور یاد رکھو اس سفر میں غلام محمد تمہارے ساتھ نہیں ہے، تم اکیلے ہی سفر کر رہے ہو۔ اس لڑکے نے لکھا ”یہ میرا ہوائی جہاز کا پہلا سفر ہے۔ جہاز ہوا میں معلق ہو چکا ہے۔ میں نے نیچے دیکھا تو لوگ بہت چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ یکا یک مجھے ان لوگوں میں غلام محمد دکھائی دیا۔ غلام محمد میرا بہت پرانا دوست ہے۔“ پھر اس نے وہی رٹی رٹائی داستان لکھ دی۔ استاد محترم کی چال رانگ گئی۔ غلام محمد جوں کا توں موجود تھا۔

ان دنوں کراچی اور سکھر کے درمیان کم لوگ سفر کرتے تھے۔ ہفتے میں چند ایک پروازیں ہوتی تھیں۔ چھوٹا جہاز چلتا تھا فوکر F-27 جو فوکر کمپنی کا بنایا ہوا جہاز تھا۔ فوکر بہت پرانی جہاز ساز کمپنی تھی جس کی داغ بیل 1912 میں انتھونی فوکر نے جرمنی میں ڈالی تھی۔ 1919ء میں یہ کمپنی نیدر لینڈ منتقل ہو گئی اور 1996ء میں دیوالیا ہو گئی جس کے بعد اسے دوسری جہاز ساز کمپنی نے خرید لیا۔

فوکر F-27 اپنے وقت کا انتہائی کامیاب جہاز تھا۔ اس کے ڈیزائن کی شروعات پچاس کی دہائی میں اٹھائیس مسافروں کے لیے ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ 52 مسافروں تک پہنچ گئی۔ فوکر F-27 میں رولس رائس کے ڈارٹ انجن نصب کیے گئے۔ نئی نیکنالوجی کی آمد کے ساتھ فوکر F-27 کا ڈیزائن پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ فوکر کمپنی نے F-27 کا متبادل جہاز تیار کر لیا جس کا نام F-50 رکھا گیا۔ مگر F-50 کے آنے میں ابھی کئی سال باقی ہیں فی الحال میں F-27 میں سوار ہوں۔ جہاز مطلوبہ اونچائی پر پہنچ چکا ہے۔ سگریٹ نوشی کی اور سیٹ بیلت کی لائنیں بچھائی جا چکی ہیں۔ میں نے سیٹ بیلت کو کھولا اور تیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اچانک میری گود میں کوئی چیز ”دھب“ سے گری۔ یہ اسٹروٹس تھی..... جی نہیں۔ پورا جملہ پڑھ بیجے جو اپنے ساتھ دو ٹیکے لائی تھی۔ ایک کو میری گود میں رکھ دیا اور دوسرے کو میری برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کی گود میں۔

اس ٹیکہ کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ خیال ہوا شاید تھک گئی ہیں میری گود میں سر رکھ کر سونا چاہتی ہیں۔ مکمل لینے لگی ہیں، ابھی واپس آتی ہوں گی۔ وہ آتو گئیں مگر ہاتھوں

میں مکمل کے بجائے کھانے کی دوڑے تھیں۔ ان میں سے ایک ٹرے کو میری گود میں رکھے ہوئے ٹیکے کے اوپر رکھا اور مسکرا کر واپس چلی گئیں۔ اس ٹیکہ کی حکمت اب ظاہر ہو چکی تھی۔ دراصل میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا وہ بلک ہیڈ کے ساتھ تھی۔ ایسی سیٹوں کے آگے کھانے کی ٹرے نہیں ہوتی اس لیے اس کے بدلے ٹیکے استعمال کیا گیا تھا۔ کھانے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ میرا ٹیکہ مجھ سے واپس چھینا جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز نے نیچے اترنا شروع کیا۔ زمین دکھائی دینے لگی تھی۔ زمین کا منظر کراچی کے زمینی منظر کی طرح خشک سال نہ تھا، یہاں پر کھیتی باڑی اور ہریالی تھی۔ یہ ہریالی قدرت کی مہربانی کی مرہون منت ہے ورنہ یہ خطہ زمین ایک بنجر ریگستان ہوتا۔ جس طرح قاہرہ کو ”شہ نیل“ کہا جاتا ہے اسی طرح سکھر کو ”دریا ڈینو“ یعنی ”دریا کا تنہ“ کہا جاتا ہے۔ اگر قدرت نے دریائے سندھ کو یہاں سے نہ گزارا ہوتا تو سکھر کا نام ”بنجر“ ہوتا۔ سکھر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

سکھر نسبتاً نیا نام ہے اس سے پہلے اس کو ”اروڑ“ اور ”بھکر“ کہا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ لفظ ”سکھر“ سندھی کے لفظ ”سکھارو“ سے نکلا ہے جس کے معنی ”بہترین“ یا ”اعلیٰ“ کے ہیں۔

سکھر کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے، اس پر سکندر اعظم، محمد بن قاسم، سلطنت مغلیہ اور انگریزوں سمیت بہت سے حکمرانوں نے حکمرانی کی ہے۔ مگر انگریزوں کے زمانہ میں جو بہبود اور ترقی کا کام سکھر میں ہوا وہ کسی اور کے دور حکومت میں نہیں ہوا۔ انگریزوں نے سکھر کے مقام پر دریائے سندھ پر لائیڈز بیراج تعمیر کیا جس سے وہ آبیاری کا نظام وجود میں آیا جس کا شمار دنیا کے چند بڑے آبیاری نظاموں میں ہوتا ہے۔ یہ بیراج اب ”سکھر بیراج“ کہلاتا ہے۔ اس کے 66 دروازے ہیں۔ اس نظام میں سات بڑی نہریں ہیں جن میں چند ایک تو مصر کی سوئز کنال سے بھی بڑی ہیں۔ ان سے ایک کروڑ ایکڑ سے زیادہ زمین کو سیراب کیا جاسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب سکھر بیراج کا پانی کم سے کم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لائیڈز بیراج کی تعمیر 1923 میں شروع ہوئی اور 1932 میں مکمل ہوئی۔

جہاز سکھر اسٹریپورٹ پر اتر چکا تھا۔ یہاں پر صرف ایک لینڈنگ اسٹریپ تھی۔ جہاز اس کے سرے پر پہنچ کر واپس مڑا۔ اسٹریپورٹ کی عمارت کا رخ کیا۔ سکھر اسٹریپورٹ کی عمارت مختصری تھی۔ صرف اس وقت اس میں زندگی کے آثار نظر آتے جب کسی جہاز کے اترنے یا اڑنے کا وقت ہوتا۔ اسٹریپورٹ کی عمارت سے

باہر آئے تو پی آئی اے کی شہر جانے والی بس کو تیار کھڑا پایا۔ پی آئی اے کی بس سے شہر پھر وہاں سے کسی دوسری سواری سے پنوعاقل جو میری منزل مقصود تھی وہاں جایا جاسکتا تھا۔

پنوعاقل جانے کے دو ذرائع تھے۔ شہروں کے درمیان چلنے والی بسیں اور وینن یا پھر ٹیکسی جو پنوعاقل اور سکھر کے درمیان چلتی تھیں۔ مجھے ٹیکسی پکڑنا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پیٹرول ابھی مہنگا نہیں ہوا تھا۔ ٹیکسیوں کے نام پر بڑی بڑی امریکن گاڑیاں چلتی تھیں۔ ٹیکسی والے ان گاڑیوں میں آٹھ دس مسافر کسی نہ کسی طرح ٹھونس ٹھانس کر بٹھالیا کرتے تھے۔ مجھے جو ٹیکسی ملی وہ شیورلٹ یا بیوک نہیں تھی۔ یہ ایک جرمن گاڑی تھی کیزر جو اس وقت بننا بند ہو چکی تھی۔ پاکستان میں اس کی صرف چند ایک گاڑیاں تھیں، جو بطور ٹیکسی استعمال ہوتی تھیں۔ انتہائی آرام دہ اور کشادہ گاڑی تھی مگر دس مسافروں کے لیے نہیں۔ صرف چھ کے لیے۔ پنوعاقل پہنچا تو والد کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے پہنچنے میں دیر ہوئی تھی۔ جتنا وقت کراچی سے سکھر پہنچنے میں لگا تھا اس سے کچھ ہی زیادہ وقت سکھر سے پنوعاقل پہنچنے میں لگ گیا۔ جبکہ فاصلہ صرف 20 میل تھا۔ والد صاحب کا حکم ہوا ”تھوڑی دیر آرام کر کے تیار ہو جاؤ۔ دوپہر کا کھانا ہم کو سردار محمد حسین خان کے گھر کھانا ہے۔“ محمد حسین خان ”بلو“ قبیلہ کے سردار تھے۔ ان کا گاؤں ”بلو گوٹھ“ کہلاتا تھا جو پنوعاقل سے پانچ سات میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں ہم لوگوں کو تانگے سے جانا تھا۔ تانگے کا کرایہ ”اوٹ موٹ“ پر طے کیا جاتا تھا۔ سندھی زبان میں ”جانے اور آنے“ کو ”اوٹ موٹ“ کہتے ہیں۔

سردار محمد حسین خان (مرحوم) کا قد درمیانہ، اکھرا بدن، لمبی لہریا داڑھی اور پُر شفقت رعب و شخصیت۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا نام شاید ”تہور“ تھا۔ وہ صاحب شکار کے شوقین تھے اور لکھتے لکھاتے بھی تھے۔ ان دنوں وہ سندھ کی شخصیات کے بارے میں ایک ”ہواز ہو“ (Who is Who) قسم کی کتاب لکھنا چاہتے تھے اسی سلسلے میں وہ سردار صاحب کے پاس آئے تھے۔ ”ہواز ہو“ سے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ان کے مشرقی پاکستان کی مہمات دلچسپ لگیں جس کے نتیجے میں مجھے مشرقی پاکستان دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ شام تک ہم لوگ پنوعاقل سے بلو گوٹھ کا ”اوٹ موٹ“ مکمل کر چکے تھے۔ رات کا کھانا بھی ہو چکا تھا۔ صحن میں پانی چھڑکنے کے بعد سونے کے لیے چار پائیاں بچھائی جا چکی تھیں۔ گرمیوں کے دن تھے۔

اس زمانے (1966) میں PIA کے پاس فوکر کمپنی کے بنائے ہوئے F-27 بوننگ کمپنی کے B-720/B-707 اور ہا کر سڈلی کے ٹرائی ڈیٹ جہاز ہوا کرتے تھے۔ F-27 اور B-707 کا ڈیزائن پرانا تھا جبکہ ٹرائی ڈیٹ میں اس وقت کی جدید ترین نیکنالوجی استعمال کی گئی تھی PIA کے ایک جہاز پر فالتو آلات لگا کر اس جہاز کو آٹو لینڈنگ کے سرٹیفیکیشن کے لیے بھی استعمال کیا گیا تھا۔ PIA کے پاس لاکھ ہیڈ کے بنائے ہوئے سپر کاٹسٹیشن L-1049 جہاز بھی ہوا کرتے تھے مگر وہ حال ہی میں ریٹائر کیے جا چکے تھے۔

اس وقت ہم لوگ کرائے کے گھر میں رہتے تھے جو گاؤں کے روایتی انداز پر بنایا گیا تھا۔ آرمی بیرک کی طرح ایک قطار میں چار کمرے، ان کمروں کے آگے ایک بڑا سا ہال۔ ہال کے باہر چھت دار دروازہ۔ اس کے آگے کھلا چوڑا۔ چوڑے کے آگے کچا صحن، صحن کے ایک کونے میں غسل خانہ وغیرہ۔ گرمیوں میں رات کو کمروں میں سونا ناممکن تھا اس لیے گرمی کے دنوں میں سونے کا بندوبست باہر کیا جاتا تھا۔ رات دس بجے تک گرم ہوا چلتی تھی اس کے بعد بہتری آ جاتی تھی۔ آج کل کے دور کے انٹر کنڈیشن کی ضرورت نہ تھی۔ رات نیندا بھی آتی۔

صبح والد صاحب نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”بیٹا آج پراٹھے ملیں گے ناشتے میں۔ ڈبل روٹی نہیں ہے۔“ اس بات کو چالیس سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں پنوعاقل میں کوئی بیکری نہیں ہوتی تھی۔ ڈبل روٹی یا تو سکھر سے آتی تھی یا کراچی ایکسپریس کی ڈاننگ کار سے۔ ڈبل روٹی کھانے والے بہت کم لوگ ہوتے تھے زیادہ تر لوگ رات کا بچا ہوا کھانا ناشتے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ صاحب حیثیت لوگ انڈے پرائے کی عیاشی کر لیا کرتے تھے اور کھیتوں پر کام کرنے والے لوگ روٹی اور پیاز سے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ میکڈونلڈ میں ناشتے کا تصور کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔

میں نے کہا بھی خوابوں میں بھی شکل نہ تو نے دکھائی اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی جس طرح رات کے سونے کے لیے صحن اور چوڑے پر پانی چھڑک کر گرمی کی شدت کو کم کیا جاتا تھا اسی طرح دوپہر کے وقت بھی کچھ ایسا ہی بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ اس مرحلے پر آ کر

MARCH



مارچ

منظر امام

عیسوی سن کا تیسرا مہینا، موسم بہار کا مہینا۔ اس مہینے میں کب کون سے اہم واقعات رونما ہوئے اختصار کے ساتھ قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ایک اہم مضمون۔ اس مضمون کی تیاری میں بے شمار کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

صرف معلومات میں اضافے کی خاطر شامل کی گئی ایک دلچسپ تحریر

مارچ عیسوی سال کا تیسرا مہینا ہے..... عام طور پر یہ موسم بہار کی نوید ہوتا ہے کہ جب بے پناہ سردی اپنا اثر کم کرنے لگتی ہے اور خوبصورت پھولوں کو کھلنے اور خوشبو بکھیرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چلیں ہم مارچ کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی مارچ

اس تاریخ کو الاسکا کے برفیلے میدانوں میں ایک ریس منعقد ہوتی ہے۔ Tarod کہا جاتا ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

ہو سکا۔ ڈرائیور راستہ بھول گیا تھا اندھیرا پھیل چلا تھا ہم کھیتوں میں بھٹک رہے تھے۔ امید کی کرن ہندھی کچھ دور پر روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم ٹریکٹر دوڑاتے ہوئے اس بستی میں جا گئے۔ جیسے ہی ہم وہاں داخل ہوئے وہاں کی عورتوں اور بچوں نے بھاگنا شروع کیا..... بھوت بھوت..... کی آوازیں آرہی تھیں۔ بھوت روشنی ان کے اوپر پھینکتا بے ہنگم آوازیں نکالتا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ ہم نے ٹریکٹر روک کر اس کا انجن بند کیا۔ لائٹیں بجھائیں اور آہستہ آہستہ نیچے اتر کر ان لوگوں کو آوازیں دیں۔ وہ بڑی مشکل سے واپس لوٹے اور ہم کو سلطان پور کا راستہ بتایا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ ایسا ہی اپنا ایک واقعہ میرے نانا نے مجھے سنایا تھا۔ ان کے لڑکپن میں موٹریا موٹریا سائیکل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کو نئی نئی سائیکل چلانے کو ملی تھی۔ اندھیرے میں رہنمائی کے لیے اس میں سامنے ایک لائٹ لگی ہوئی تھی۔ ایک رات جب وہ گاؤں میں گھر واپس آ رہے تھے راستے میں کسی کھیت سے ایک کسان اور اس کی بیوی گزر رہے تھے جب سائیکل کی لائٹ ان کا پیچھا کرنے لگی تو انہوں نے بھی بھوت کا نعرہ بلند کیا تھا۔

☆☆☆

چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ آج مجھے کراچی واپس جانا تھا۔ میں سکھر کے لیے بنوعاقل سے وقت سے کافی پہلے نکل آیا۔ انٹرپورٹ جانے سے پہلے میں مینارہ معصوم شاہ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ مینارہ سید نظام الدین میر محمد معصوم شاہ نے 1607ء میں تعمیر کروایا تھا۔ سید معصوم شاہ مغل شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں گورنر ہوتے تھے جن کو اکبر بادشاہ نے سکھر کا نواب مقرر کیا تھا۔ یہ مینارہ لال اینٹوں کا بنا ہوا ہے جو بہت دور سے ہی نظر آتا ہے۔ اس کی اونچائی 31 میٹر اور گھیراؤ تقریباً 26 میٹر ہے۔ اوپر جانے کے لیے اس میں اندرونی سیڑھی بنائی گئی ہے جو پتھروں کی ہے۔ مینارہ دیکھنے کے بعد میں انٹرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ گاؤں پر جا کر اپنا بورڈنگ کارڈ لیا۔ اس دفعہ مجھے بلک ہیڈ کے سامنے والی سیٹ نہیں ملی تھی۔ میں تکیہ کی نعمت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

سکھر کا سفر تو بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا تھا مگر، سکھر سے آگے جہاں اور بھی ہیں

مجھے ان پر کمندیں ڈالنی تھیں۔ خاص طور سے مشرقی پاکستان پر کہ تہور صاحب کی قصہ گوئی نے میرے ذہن میں مشرقی پاکستان کے لیے تجسس پیدا کر دیا تھا۔

اس گھر میں کمروں کے سامنے بنائے ہوئے لمبے ہال کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ اس کمرے کا فرش اور دیواریں مٹی اینٹوں کی بنائی گئی تھیں جن پر دوپہر کے وقت خوب پانی چھڑک دیا جاتا تھا۔ چھت کے اوپر ایک بڑے سے چوکھٹے میں جو کھڑی کا بنا ہوا تھا ایک جھانرنا پکھا تھا جس کو اسی کے ذریعے آگے پیچھے کھینچا جاتا تھا جس سے ہوا کا بندوبست ہوتا تھا اور کمر آرام سے وقت گزارنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ لیکن آج ہم کو اس ہال میں وقت گزارنا ضروری نہیں تھا۔ ہمارے پاس اس کا توڑ موجود تھا۔ یہ توڑ ایک ٹیوب ویل کی صورت میں تھا۔

بنوعاقل سے چند میل کے فاصلے پر صالحانی کا گاؤں تھا جہاں پر لمبے سڑک ہماری کچھ زمین تھی جس کو نہر کا پانی نہیں لگتا تھا۔ اس زمین کو سیراب کرنے کے لیے ٹیوب ویل لگایا گیا تھا۔ یہ بنوعاقل کے علاقے میں لگنے والا پہلا ذاتی ٹیوب ویل تھا گوکہ حکومت کے چند ٹیوب ویل لگے ہوئے تھے۔ اس ٹیوب ویل کی موٹر اور پمپ ایک تہ خانہ میں نصب تھے۔ پانی پہلے بڑے حوض میں گرتا تھا جہاں سے یہ پانی تالیوں کے ذریعے کھیت میں پہنچایا جاتا تھا۔ گرمی کی دوپہر اس حوض میں گزر سکتی تھی اور گزاری جاتی تھی۔ لیکن آج ہم کو صالحانی سے ذرا جلد گھر لوٹنا تھا کہ ہم ایک جگہ کھانے پر مدعو تھے۔

یہ دعوت ہمارے ایک منشی نے کی تھی۔ اس کا گھر سلطان پور میں تھا۔ سواری کے لیے ہم کو اپنا ٹریکٹر استعمال کرنا تھا۔ ہمارے پاس لائسنس ہڈاگ ٹریکٹر ہوتا تھا جس کے پچھلے پہیوں کے ڈگڑ ڈگول ہونے کے بجائے سپاٹ تھے۔ ڈگڑ ڈگول کے اوپر کشن رکھ کر ان کو بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ جس طرح بنوعاقل کا ”پہلا ذاتی ٹیوب ویل“ میرے والد نے لگایا تھا اسی طرح بنوعاقل میں خریدا جانے والا سب سے پہلا ٹریکٹر میرے والد نے خریدا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ فرسودہ کاشتکاری کے طریقوں کے بجائے مشینی دور کی کاشتکاری کی طرف بڑھا جائے۔ اس وقت بنوعاقل میں ٹریکٹر کے استعمال کا یہ عالم تھا کہ جب دو سال بعد ٹریکٹر کا اوور ہال کروانا تھا تو اس کے لیے مکینک کراچی سے بلوایا گیا تھا۔ مگر آج صورت حال کچھ اور ہے۔ اب بنوعاقل میں باہیچی چوک پر ٹریکٹروں کی بیسیوں دکانیں موجود ہیں جن میں ایک وقت میں پچاس ساٹھ ٹریکٹر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

ہم لوگ سلطان پور جانے کے لیے وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل گئے۔ پکارا ستنہ تھا کھیتوں میں سے ہو کر جانا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ مغرب سے پہلے سلطان پور پہنچ جائیں۔ یہ نہ

کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ریس مارچ کی پہلی ہی تاریخ کو ہو لیکن یہ احتمال ضرور کیا جاتا ہے کہ مارچ کا پہلا ہفتہ ضرور ہو۔ اس ریس میں سیکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں جبکہ اس وقت بھی ہر طرف برقانی کاٹتی ہوئی ہواؤں کا راج ہوتا ہے۔

پہلی مارچ 1994ء کو جسٹن صبر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس تاریخ کو بھی ایک ڈے منایا جاتا ہے اور یہ ایک صحت مندرجہ جان کا صحت مند دن ہے۔ پوری دنیا تاج پر زندہ ہے۔ اس لیے اس دن کسانوں کو صحت مند فصلوں کی طرف دھیان دلا یا جاتا ہے کہ وہ ایسی فصلیں پیدا کریں جو انسانی صحت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں۔

اسی لیے شاید اس تاریخ کو منایا جاتا ہے جو اصولاً سارا سال ہونا چاہیے یعنی مسکراہٹوں کے تبادلے کا دن۔ Share A Smile day اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ صرف اسی تاریخ کو مسکرائیں بلکہ آپ کو سال کی ہر تاریخ کو مسکراتے رہنا چاہیے۔

1872ء کو ویلو اسٹون نیشنل پارک کا قیام مل میں آیا تھا۔ اسے امریکا کا قومی پارک کہا جاتا ہے۔ ویلے تو یہ دو منگ (Wyoming) کے علاقے میں ہے۔ لیکن IBAHO اور Montana تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی منظوری مارچ 1901ء میں اس وقت کے امریکی صدر نے دی تھی۔ یہ پارک بائیس لاکھ انیس ہزار سات سو ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے (اسے پورا شہر سمجھ سکتے ہیں)۔

ایجادات میں پہلی مارچ 1921ء کو ہیری ہنڈائی نے غوطہ خوری کا لباس بنایا تھا اور اس کا تجربہ بھی کیا۔ پہلی مارچ 1970ء میں پاکستان میں ایک نئی سیاسی پارٹی تحریک استقلال وجود میں آئی۔ اس کو بنانے والے تھے انر مارشل اصغر خان۔

پہلی مارچ 1977ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے آری چیف کا عہدہ سنبھالا۔ پاکستان میں پہلی مارچ 1981ء کو پورے ملک میں مردم شماری کا آغاز ہوا۔

2 مارچ دو مارچ 1904ء میں ڈاکٹر Seuss کی پیدائش ہوئی۔

یہاں میں ایک بار پھر واضح کر دوں کہ ویلے تو یہ سب ہی نامور لوگ تھے۔ لیکن میں نے ان کا ہی مختصر سا تعارف

کر دیا ہے۔ جنہیں دنیا کے بہت سے لوگ جانتے ہیں یا زیادہ نامور ہیں۔ اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے۔ اسے Read across America day کہتے ہیں۔

دنیا کے لوگ پڑھنے کے لیے امریکا جاتے ہیں اور امریکا میں امریکا سے باہر جانے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ 2 مارچ 1961ء کو پاکستان اور چین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔

2 مارچ 1981ء کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے پورے ملک میں ہلچل مچادی تھی۔ پی آئی اے کے ایک طیارے کو اغوا کر کے کابل لے جایا گیا تھا۔ 3 مارچ

1923ء میں ایرک بلیک کی پیدائش ہوئی۔ اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے جسے National antham day کا نام دیا گیا ہے۔

3 مارچ 1847ء ایک بہت ہی اہم آدمی کی پیدائش کی تاریخ ہے اور وہ ہے مشہور موجد الیکٹرونڈرگراہم بیل۔ گراہم بیل کی پیدائش ایڈن برگ برطانیہ میں ہوئی تھی اور اس کی وفات 1922ء میں کینیڈا میں ہوئی۔ اس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔

گراہم بیل بچپن ہی سے ذہین تھا اور ہر وقت اس کا ذہن کچھ نہ کچھ بنانے کی سوچتا رہتا۔ اس نے صرف بارہ تیرہ برس کی عمر میں گندم سے بھوسی الگ کرنے کی مشین بنائی تھی جس کو بعد میں آنے والوں نے اور بہتر کر دیا لیکن اس کا آغاز گراہم ہی نے کیا تھا۔

1874ء میں اس نے امریکا کے شہر بوٹن میں ایک ایسے آلے کا کامیاب تجربہ کیا جس نے مواصلات کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور وہ آلہ ہے ٹیلی فون، جس سے پوری دنیا واقف ہے اور قائد اعظم نے اٹھائی ہے۔ 1881ء میں اس نے ٹیل ڈکٹیٹر بنایا تھا۔

ایک بڑے موجد ہونے کی وجہ سے اسے پوری دنیا میں احترام کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا مجسمہ بھی پائلٹ اسی انداز کا بنایا گیا ہے جس انداز کا ٹنکن کا مجسمہ ہے۔ امریکا میں اس کے نام کا ایک میوزیم بھی قائم ہے۔

3 مارچ 1821ء میں تھامس جیننگ نام کے ایک شخص

نے کیلے کپڑوں کو سکھانے کا ایک سسٹم متعارف کروایا۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ تھامس پہلا سیاہ فام موجد تھا۔ 4 مارچ

تسموں کی تاریخ دس پندرہ برسوں میں نہیں بنا کرتی بلکہ صدیوں کا سفر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ جیسے امریکی کانگریس کی پہلی میٹنگ 1789ء میں ہوئی تھی۔ یعنی ڈھائی سو برسوں کا سفر۔ اور ہم ابھی سے پریشان ہونے لگے۔

اسی تاریخ کو 1955ء میں پہلی بار ریڈیو فریکوئنسی سمندر پار بھیجی گئی تھی اور اسی تاریخ کو 1997ء میں لیونارڈو نے ٹیلی فون کے انعامات جیتنے کا فارمولا پیش کیا تھا۔ 4 مارچ بہت سے اہم افراد کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ جنہوں نے آگے چل کر پوری دنیا کے لیے بہت کچھ کیا۔

5 مارچ 5 مارچ 1872ء کو جارج ویٹنگ ہاؤس نے ایٹم انٹربریک متعارف کروایا۔ اور 1963ء میں اسی تاریخ کو ایک دل چسپ کھیل کا تعارف ہوا۔ یہ کھیل ہے Hula Hoop جسے آرٹھر مینن نے متعارف کروایا تھا۔ اس میں کمر کے گرد پلاسٹک کا ایک دائرہ بنا کر گردش دیا جاتا ہے۔ دنیا میں اس کے مقابلے بھی ہوا کرتے ہیں۔ 5 مارچ 1574ء انگلینڈ کے ریاضی دان ولیم کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے سلائیڈرول ایجاد کیا تھا۔

یہاں میں پھر یہ کہنا چاہوں گا کہ انسان کی ارتقا کا سفر صدیوں پرانا ہے۔ ذہین اور پڑھے لکھے لوگ آج کی نہیں سوچتے بلکہ ان کی نگاہیں آنے والے کل پر ہوتی ہیں۔ اسی تاریخ کو 1637ء میں ڈچ جینیٹر جان وان کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ شخص آگ بجھانے کے آلے کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اندازہ لگائیں کہ یہ کتنی مفید ایجاد ہے۔

5 مارچ 1825ء جرمن فوٹو گرافر جوزف البرٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے دنیا کو البرٹو ٹائپ دیا تھا۔ 5 مارچ (3 جمادی الاول) ملتان میں حضرت رکن الدین عالم کا عرس منایا جائے گا۔ آپ ایک بہت مشہور اور بڑے بزرگ ہیں۔ آپ کو ملتان کا مخدوم بھی کہا جاتا

ہے۔ حضرت رکن عالم کے والد کا نام حضرت صدر الدین عارف تھا۔ آپ کی پیدائش 9 رمضان 649 ہجری میں ملتان میں ہوئی تھی۔ آپ مشہور بزرگ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے پوتے اور جانشین ہیں۔ آپ کا اصل نام ابوالفتح ہے لیکن رکن عالم کے نام سے مشہور ہیں۔

پہلے ان کا مزار دادا کے مزار کے ساتھ تھا پھر موجودہ مزار میں منتقل کیا گیا۔ اس مزار کو ملتان کی پہچان کہا جاتا ہے۔ یہ نیلے ٹائلز کی بنی ہوئی بہت خوبصورت عمارت ہے۔ آپ شیخ نظام الدین اولیا کے دوستوں میں سے تھے۔

6 مارچ 6 مارچ 1475ء کو مشہور زمانہ آرٹسٹ اور انجینئر مائیکل انجیلو کی پیدائش ہوئی۔ مائیکل انجیلو نے کئی جہت میں کام کیے اور ہر ایک میں اپنے کمال فن کی دھاک بٹھادی۔ مجسمہ سازی سے لے کر انجینئرنگ کے شاہکار تک۔ اس تاریخ کو 1899ء میں ہاف مین نے ایک پودے سے مشہور زمانہ دوا اسپرین دریافت کی جو ہزاروں لاکھوں افراد کو صحت اور شفا دے چکی ہے۔

6 مارچ 1939ء ایک ایسے آدمی کی پیدائش کی تاریخ ہے جس نے پوری دنیا کو کمپیوٹر کا تحفہ دیا۔ اس کا نام آدم اوسیرن تھا۔ 6 مارچ پاکستان میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ 1953ء میں لاہور میں احمد یوں کے خلاف فسادات پھوٹ پڑے تھے جس کے نتیجے میں مارشل لا لگا دیا گیا تھا۔ چھ مارچ 1969ء میں طالب علموں کے خلاف مقدمات واپس لے لیے گئے تھے۔

اس تاریخ کو مشہور براڈ اور یو پہلی بار فروخت کے لیے پیش ہوا تھا۔ 7 سات مارچ

1849ء میں سائنس دان لوئیس کی پیدائش ہوئی تھی۔ 7 مارچ 1876ء میں گراہم بیل نے ٹیلی فون ٹیسٹ کروایا۔

7 مارچ 1977ء کو پاکستان میں انتخابات ہوئے جس میں پیپلز پارٹی کو کامیابی ہوئی تھی۔ 7 مارچ ہنری ڈراپر کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ یہ وہ

پہلا شخص ہے جس نے چاند اور جیو پیٹر کی تصاویر لی تھیں۔
اس کے علاوہ 7 مارچ 1765 کو فزائیسوسی موجد
جوزف پیدا ہوا تھا۔ اس نے انسانی تاریخ میں کیمرے سے
پہلی تصویر لی تھی۔
8 مارچ

اس تاریخ کو ایک دن منایا جاتا ہے جسے انٹرنیشنل
وومن ڈے کہا جاتا ہے۔ یہ یوم پوری دنیا میں عورتوں کی
فلاح و بہبود کے لیے منایا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو عورتوں کے ماضی و حال اور مستقبل کے
امکانات کا جائزہ لے کر ان کے معاشی، ذہنی اور نفسیاتی
بہتری کی پلاننگ کی جاتی ہے۔ چین، روس، قیت نام اور
بلغاریہ وغیرہ میں عام چھٹی ہوتی ہے۔

1911 کے 8 مارچ کو خواتین کے ووٹ دینے کا
حق پہلی بار تسلیم کیا گیا تھا۔

8 مارچ 1965 کو رابرٹ سیوڈا کی پیدائش ہوئی
تھی۔

8 مارچ 1994 کو ڈان کو نے سوٹ کیس میں
ہینڈل کے ساتھ پیسے لگا دیے تھے۔ جس سے سوٹ کیس کو
ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہو گئی۔ بظاہر
یہ ایک بہت چھوٹی سی ایجاد تھی لیکن اندازہ لگائیں کہ اس سے
کنتنی آسانی ہو گئی ہے۔

8 مارچ 1787 میں کارل فریڈرک ٹائٹل کی پیدائش
ہوئی تھی۔ اسے پلاسٹک سرجری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔

8 مارچ 1862 میں جوزف لی کی پیدائش۔ جس
نے کھیل کے میدانوں کی پلاننگ پیش کی۔ آج دنیا بھر میں
کھیلوں کے جو میدان دکھائی دیتے ہیں وہ جوزف لی کے
منصوبے کی وجہ سے ہیں۔

1995 میں نوبل پرائز لینے والے کیمسٹ ایڈورڈ کی
پیدائش بھی 8 مارچ کو ہوئی تھی۔ سن تھا 1886۔

8 مارچ 1874 میں پیدا ہونے والے جرمن
سائنس دان نے 1944 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

8 مارچ 1956 پاکستان میں اس وقت کے صدر
اسکندر مرزا نے اسٹیٹ بینک کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

اسی تاریخ کو 1998 میں مردم شماری ہوئی۔
9 مارچ

Day light saving Time کی
ابتدا اسی تاریخ سے ہوتی ہے۔ یہ تجربہ ہمارے یہاں بھی

دہرایا جا چکا ہے۔
9 مارچ 1791 اس امریکی سرجن کی پیدائش کی
تاریخ ہے جس نے پہلی بار اپنے مریض پر ایسٹھنر کا استعمال
کیا تھا۔

9 تاریخ 1900 میں وارڈ آئی کن کی بھی پیدائش کی
تاریخ ہے جس نے مارک ون کمپیوٹر بنایا تھا۔

9 مارچ کو باری کی سال گرہ منائی جاتی ہے۔
9 مارچ کی تاریخ میں پاکستان میں دو بڑے واقعات

ہوئے۔ پہلا واقعہ 2007 میں ہوا تھا۔ جب اس وقت
کے صدر پرویز مشرف نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو
ہٹا دیا تھا اور دوسرا واقعہ 9 مارچ 2008 میں ہوا۔ جب
دہشت گردوں نے سری لنکا کی ٹیم کی بس پر حملہ کر دیا تھا۔
ویسے تو ہجری حساب سے 7 جمادی الاول ہے لیکن عیسوی
کیلنڈر کے حساب سے 9 مارچ کو جنگ موتہ ہوئی تھی۔ سن 8
ہجری میں۔

یہ جنگ مسلمان اور بازنطینی (رومن) فوجیوں کے
درمیان ہوئی تھی۔ اس کا مقام دریائے اردن کے کنارے
کرک تھا۔

اس غزوہ میں پہلے زید بن حارثہ کو سپہ سالار بنا کر
بھجوا تھا۔ پھر آپ تشریف لے گئے تھے۔ 9 مارچ 1923
کو ایک فرانسیسی ڈیزائنر نے منی اسکرٹ متعارف کروایا تھا۔
10 دس مارچ

دس مارچ کو پوری دنیا میں کاسن ویلٹھ ڈے منایا جاتا ہے۔
10 مارچ 1920 میں جیک کینٹ کی پیدائش
ہوئی۔

10 مارچ 1862 میں پہلے کاغذی نوٹوں کا اجرا
ہوا۔ یہ بیس ڈالر کے نوٹ تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ
کاغذی نوٹوں کا سب سے پہلا استعمال چین میں پانچ سو
سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے یہ ختم ہو گیا۔ پھر
مغرب میں اس کا استعمال شروع ہوا۔

10 مارچ 1891 کو آل من اسٹرونگ نے پہلا آفون
میک ٹیلی فون ایجاد کیا تھا۔

11 گیارہ مارچ
یہ ایک بڑے معصوم ایڈرا جیک کیش کی پیدائش کی
تاریخ ہے۔ 1916 میں پیدا ہوا تھا اور گیارہ مارچ

1893 وائٹ ایک کی پیدائش کی تاریخ بھی ہے۔
1947 میں جوئٹن لنڈن کی پیدائش ہوئی۔

13 مارچ کو گڈ سمر ڈے منایا جاتا ہے۔ 1928 میں
ایلن رسکن کی پیدائش ہوئی تھی۔
13 مارچ 1733 کو انگلینڈ کے سائنس دان
جوزف پر سٹلے کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے آکسیجن
دریافت کر کے کاربونیڈ وائر کا فارمولا پیش کیا۔
اسی تاریخ کو یورینس کی دریافت ہوئی تھی۔ یہ سورج
کے خاندان کا ساتواں سیارہ ہے۔ یہ پہلا سیارہ ہے جس کا
نام رومن روایات سے ہٹ کر یونانی روایت پر رکھا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا ITCPL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 قیر III کیمینیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

ممبران کی فہرست

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

گیا۔ اس کی دریافت کا سہرا ولیم ہارشل کے سر ہے۔ اس نے یورینس کو 13 مارچ 1731 میں دریافت کیا تھا۔ ولیم ہارشل کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔

14 چودہ مارچ

یہ تاریخ ایسے کئی لوگوں کی پیدائش کی تاریخ ہے جنہوں نے آگے چل کر بہت نام پیدا کیے اور اپنی فیلڈ میں کامیاب رہے۔

1889 میں مارگریٹ ایبل کی پیدائش ہوئی۔

14 مارچ 1800 میں امریکی ماہر تعمیرات جیمز بوگاردس کی پیدائش ہوئی جس نے عمارتوں کی تعمیر میں کاسٹ آئرن کا استعمال کیا۔

14 مارچ مشہور زمانہ سائنس دان البرٹ آئن اسٹائن کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ آئن اسٹائن کی پیدائش 1879 میں ہوئی تھی۔ اس نے جدید فزکس کو انقلابی نظریات دیے۔ کوانٹم تھیوری پیش کی۔ اس نے $E=MC^2$ پیش کیا۔

آئن اسٹائن کا شمار دنیا کے ذہین ترین افراد میں کیا جاتا ہے۔ اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے 1921 میں فزکس کا نوبل پرائز بھی دیا گیا تھا۔

اس کے اقوال بھی بہت زبردست اور دانش مندانہ ہیں۔ جیسے ماضی سے سبق سیکھو، آج میں زندہ رہو اور آنے والے کل کی اچھی امید رکھو لیکن اہم بات یہ ہے کہ سیکھنا کبھی ترک نہ کرو۔

ذہانت اور بے وقوفی میں فرق یہ ہے کہ ذہانت کی ایک حد ہوتی ہے۔

دنیا رہنے کے لیے بہت خطرناک جگہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس میں بڑے لوگ رہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اچھے لوگ اسے سنوارنا نہیں چاہتے۔

وہ شخص جو کبھی غلطی نہیں کرتا، وہ کبھی کچھ سیکھ بھی نہیں سکتا۔

ذہانت کی علامت علم نہیں بلکہ تصور کی قوت ہے۔ ہم اپنی پریشانیوں کو اس سوچ کے ساتھ کبھی حل نہیں کر سکتے جس سوچ کے ساتھ ہم نے پیدا کی ہیں۔

ملاحظہ فرمایا۔ ایک سائنس دان کے اقوال کتنے اہم اور دانش مندانہ ہیں۔

14 مارچ 1794 کو ال وہائٹ نے سوت کی

پیداوار بڑھانے کے لیے کاشن بنایا۔

14 مارچ 1956 میں پاکستان میں وزیراعظم چوہدری محمد علی نے پہلا پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا۔ اس تاریخ کو نیشنل وائلڈ لائف ڈے منایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دن اور بھی ہے جسے PI day کہتے ہیں۔ PI ایک یونانی نشان ہے۔ اسے حساب میں استعمال کیا جاتا ہے۔

15 پندرہ مارچ

Absolutely incredibil kid day منایا جاتا ہے۔

15 مارچ 1994 میں ولیم ہارٹ مین نے ہائی ویز پر نشانات کا سسٹم متعارف کروایا۔

15 مارچ 1858 امریکی یونائٹڈ لبرٹی ہائٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے پلانٹ بریڈنگ کا فارمولا پیش کیا۔

15 مارچ جولیس سیزر کے قتل کی تاریخ ہے۔ یہ واقعہ 44 BC کا ہے۔ جولیس سیزر تاریخ کی ایک مشہور شخصیت ہے۔ وہ رومن جنرل اور سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ اس نے بہت دنوں تک روم پر حکومت کی۔ اس نے اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے ایک سیاسی مثلث بھی بنایا۔ اسے ڈکٹیٹر بھی کہا جاتا ہے۔ جولیس سیزر کا تعلق مشہور زمانہ حینہ قلو پطرہ سے بھی رہا ہے۔

60 BC میں اس نے کونسل کا انتخاب جیتا تھا۔ پھر جب یہ سینٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچا تو کئی لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جس میں اس کا ساتھی Marcus junius Brutus سب سے آگے

تھا۔ اس طرح سیزر کی کہانی ختم ہو گئی۔

15 مارچ 1955 میں پاکستان میں آزادی کے بعد سب سے بڑے آبی منصوبے کوٹری بیراج کا افتتاح کیا گیا۔

پندرہ مارچ کو پیر سوا کروڑ کا عرس ہوگا۔ بمطابق 13 جمادی الاول، اور یہی تاریخ حضرت فاطمہ الزہرا کے وصال کی بھی تاریخ ہے۔

16 سولہ مارچ

سولہ مارچ کو پیدا ہونے والی قابل ذکر شخصیات میں امریکی چوتھے صدر جیمز میڈیسن تھے جن کی پیدائش 1951 میں ہوئی تھی۔

ان کے علاوہ اینڈریو اسمتھ تھا جس کی پیدائش

1836 میں ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے کیبل تار متعارف کروایا تھا جو آج کل پوری دنیا میں موجود ہے۔

سولہ مارچ کو ناسمہ میں پیر یعقوب کا عرس منایا جاتا ہے۔

17 سترہ مارچ

سترہ مارچ کو کیٹ گرین وے کی پیدائش کی تاریخ ہے، 1842 اس کے علاوہ Wandell minor کی پیدائش بھی 17 مارچ 1944 کو ہوئی تھی۔

سترہ مارچ 1834 کو جرمنی کے Gott lieb Daimler کی پیدائش بھی ہوئی تھی۔ یہ شخص پہلے گاڑیاں بنایا کرتا تھا۔ پھر اس نے دنیا کو موٹر سائیکل کا تختہ دیا۔ پہلی موٹر سائیکل اسی نے بنائی تھی۔

17 مارچ میں لندن کے اسٹیفن ہیری نے پہلا ریز بیڈ متعارف کروایا تھا۔ بظاہر یہ ایک عام چیز ہے لیکن اس کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پوری دنیا میں لاکھوں کروڑوں ٹن روزانہ استعمال ہوتا ہے۔ ریز بیڈ کسی بھی سائز کا ہو سکتا ہے۔ یہ ریز اور لاسٹک کے امتزاج سے بنایا جاتا ہے۔

17 مارچ عیسائیوں کے لیے بہت اہم بھی ہے کیونکہ یہ تاریخ سینٹ پیٹرک کی وفات کی ہے۔ وہ AD 387 میں انگلینڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور 17 مارچ AD 460 میں انتقال ہوا۔ سینٹ پیٹرک نامور بشارت تھے۔ اس تاریخ کو پوری دنیا کے عیسائی سینٹ پیٹرک کا ڈے مناتے ہیں۔

17 مارچ 1885 نیٹ براؤن کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ اس شخص نے بلاسٹ فرنس چارج بنایا تھا۔

سن 2014 کی سترہ مارچ کی تاریخ امام زین العابدین کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ آپ کی پیدائش سن 38 ہجری ہے۔ آپ حسین بن علیؑ کے بیٹے تھے۔ حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے زمانے میں حدیث بن جابر کو خراسان کے بعض شہروں کا حاکم مقرر کیا تھا۔

حدیث کو شہناہ یزد جو کی تین لڑکیاں، مہربانو، ماہ بانو اور شاہ بانو غنیمت میں ملیں۔ اس نے حضرت علیؑ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بادشاہ کی لڑکیاں ہیں۔ معزز شخصیات کی خدمت میں انہیں دینا چاہیے۔

چنانچہ مہربانو کو محمد بن ابی بکر کی زوجیت میں دیا اور ماہ بانو کو عبداللہ بن عمر کی زوجیت میں دیا اور شاہ بانو کو امام

میلین اخضر

یہ صفا و مردہ کے درمیان دوستوں ہیں۔ جو قدرے فاصلے پر ہیں۔ یہاں پہنچ کر حاجی ایک ستون سے دوسرے ستون تک عام رفتار سے قدرے دوڑ کر گزرتے ہیں۔

مرسلہ: نوروز خان، شیخوپورہ

حسینؑ کی زوجیت میں دیا۔ ان سے حضرت زین العابدین پیدا ہوئے۔

آپ بے پناہ متقی تھے۔ پیشانی میں بجدول سے گھٹا پڑ گیا تھا۔ آپ بھی تابعین میں سے ہیں۔ آپ جب دمشق سے مدینہ میں آئے، محمد حنفیہ بن علی کرم اللہ وجہہ وہیں تھے۔ امامت کے بارے میں ان سے ٹکرا رہے تھے۔ دونوں صاحبان مکہ میں آئے اور حجر اسود کو حکم بنایا۔

محمد حنفیہ نے حجر اسود کے سامنے ہاتھ اٹھا کر اپنا مدعا کہا۔ کچھ جواب نہ ملا۔ جب امام زین العابدین نے ایسا کیا تو حجر اسود سے آواز آئی کہ امامت بعد امام حسینؑ کے علی بن حسینؑ کو پہنچی۔

محمد حنفیہ اس واقعہ کو دیکھ کر آپ کی امامت کے قائل ہوئے۔

زین العابدین آپ کا لقب کثرت عبادت کی وجہ سے تھا۔ آپ کے القابات لاتعداد ہیں۔ آپ کی وفات کی تاریخ پچیس محرم ہے۔

آپ کے صاحب زادوں کے نام، محمد باقر، زید، عمر، اشرف، عبدالرحمان، سلیمان، عبداللہ، علی، حسن اور اصغر ہیں۔

18 مارچ

18 مارچ 1858 میں جرمن انجینئر روڈلف ڈیزل کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ڈیزل انجن بنایا تھا۔

18 مارچ پاکستان کے لیے ایک نہ بھولنے والی تاریخ اس لیے بن گئی کہ 18 مارچ 1978 میں لاہور ہائی کورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ اور

انسانی تاریخ میں 18 مارچ اس لیے اہم اور یادگار ہے کہ اسی تاریخ کو 1965 میں انسان نے خلا میں پہلی بار پھل قندی کی تھی۔ اس روی خلا باز کا نام الیکوندر پونو تھا۔

پیدائش 30 مئی 1934 کی ہے۔ اس نے امر فورس

میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہیں سے اس نے خلا بازی کی تربیت لی اور وہ کارنامہ انجام دیا جو اس سے پہلے کسی انسان نے نہیں کیا تھا۔

الیکوندر نے بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ جیسے آرڈر آف لینن۔ آرڈر آف دی ریڈ اسٹار وغیرہ۔

اس تاریخ کو جودن منایا جاتا ہے اسے Sparky the fire dog کا نام دیا گیا ہے۔ اس تاریخ کو 1837 میں کیولینڈ کی پیدائش ہوئی تھی یہ دوبار امریکا کا صدر منتخب ہوا۔ یہ امریکا کا بائیسواں اور چوبیسواں صدر تھا۔

18 مارچ 1984 کو پاکستان میں الطاف حسین نے ایم کیو ایم کی بنیاد رکھی تھی۔

19 مارچ انیس مارچ انیس مارچ کو اسلامی تاریخ کی ایک جنگ ہوئی تھی جسے تاریخ میں جنگ جمل کہا جاتا ہے۔

19 مارچ 1994 میں جاپان میں ایک ایسا آلیٹ تیار کیا گیا جسے بلاشبہ دنیا کا سب سے بڑا آلیٹ کہنا چاہیے۔ اس کو تیار کرنے کے لیے ایک لاکھ ساٹھ من انڈوں کا استعمال ہوا تھا۔

پوری دنیا کو ریکارڈ بنانے کے خطبہ میں جتلا کر دیا گیا ہے۔ بس کوشش بھی ہوتی ہے کہ کسی طرح کنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام شامل ہو جائے۔ چاہے اس کے لیے کتنی ہی الٹی سیدھی حرکتیں کیوں نہ کرنی پڑیں۔

20 مارچ 1856 میں فریڈرک لاک کی پیدائش ہوئی تھی۔

20 مارچ... موسم بہار کے پہلے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو سیسی اسٹریٹ کا مشہور کردار بگ برڈ وجود میں آیا تھا۔

21 مارچ اس تاریخ کو کئی دن منائے جاتے ہیں جیسے چلڈرن پوسٹری ڈے۔ نیشنل ٹین ایجر ڈے اور سنٹل پرنس ڈے وغیرہ۔

21 مارچ 1869 البرٹ کاہن کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ آج ہم پوری دنیا میں جس قسم کی جدید فیکٹریاں دیکھتے ہیں وہ اسی شخص کی بدولت ہے اسی نے جدید فیکٹری کا نقشہ بنایا تھا۔

21 مارچ 1958 کو پاکستان میں مارشل حکومت نے سیاست دانوں پر PRADA کی پابندی لگا دی تھی۔ 21 مارچ 1965 میں نیشنل اسمبلی کا انکیشن ہوا تھا جس میں پاکستان مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی۔

اسی تاریخ کو 2006 مشہور سماجی رابطہ ٹویٹر پر پہلا پیغام بھیجا گیا تھا۔ یہ پیغام ٹویٹر کی ابتدا کرنے والوں کی طرف سے تھا۔ یہ ابتدا کرنے والے جیک ڈارسی، نوگلاس اور ایون ولیم تھے۔

22 مارچ 1841 کو آرنالڈ جان نے کپڑوں کے لیے کلف بنایا (اندازہ لگالیں کہ کتنی معمولی سی اختراع ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی مغرب ہی ہمارے کام آیا۔ کاش ان تاریخوں میں کہیں یہ ہوتا کہ فلاں مسلمان موجد نے فلاں مشین بنا کر دے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسپین کے مسلمان سائنس دانوں نے پوری دنیا کو بہت کچھ دیا ہے لیکن ہم پر صدیوں سے جو جو طاری ہے اس کا کیا علاج ہے)

22 مارچ 1868 امریکی سائنس دان رابرٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے فوٹو الیکٹرک فیکٹ دریافت کیا تھا۔ جس کی بنیاد پر 1923 میں نوبل پرائز دیا گیا۔

23 مارچ یہ تاریخ بھی ایک دن منانے کی ہے۔ اور وہ دن ہے ٹوسٹ ڈے۔ اس تاریخ کو 1775 میں سیاسی لیڈر پینک ہنری نے آزادی کا نعرہ لگایا تھا۔

23 مارچ 1881 جرمن کیمسٹ اسٹاؤنگر کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ اس نے پلاسٹک پر ریسرچ کی اور 1953 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

23 مارچ 1907 سوئٹزرلینڈ کو لو جسٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس کا نام ڈینیئل بوویٹ تھا۔ اس نے 1957 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

23 مارچ کی تاریخ پاکستان کے لیے بہت اہم ہے۔ اس تاریخ کو ہم یوم پاکستان مناتے ہیں۔ جسے قرارداد لاہور بھی کہا جاتا ہے۔

23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کا ایک کھلا اجلاس منعقد ہوا۔ جس کے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت اس اجلاس میں بنگال کے وزیر اعلیٰ شیر بنگال مولوی فضل الحق نے اپنی تاریخی قرارداد پیش کی۔

مولوی فضل الحق کی پیش کردہ اس تاریخی قرارداد کی تائید چوہدری خلیق الزماں، قاضی محمد علی، مولانا ظفر علی خان، نواب اسماعیل خان، حاجی سر عبداللہ ہارون، آئی آئی چندر نگر، سردار اورنگزیب خان، مولانا عبدالحمید بدایونی، سید ذاکر علی، بیگم مولانا محمد علی جوہر وغیرہ نے کی۔

23 مارچ 1960 میں مینار پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اور 23 مارچ 1962 میں آئین کو محفوظ کیا گیا۔

23 مارچ 1985 کو ضیاء الحق کی صدارت میں محمد خان جو نجو نے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔

2003 میں کراچی سے ایک نئے ٹی وی چینل "آج" کا اجرا ہوا۔

24 مارچ 1874 کو ہیری ہنڈائی کی پیدائش ہوئی تھی۔

24 مارچ 1871 برطانوی سائنس دان ارمنٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص کو نیوکلیر فزکس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ 1908 میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

24 مارچ 1911 میں جوزف باربرا کی پیدائش ہوئی۔ یہ بہت بڑا Animator تھا۔ اس نے ایک کردار باربرا متعارف کرایا۔

24 مارچ 2008 میں پاکستان میں یوسف رضا گیلانی نے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔

25 مارچ اس تاریخ کو 1882 میں چین کی پہلی بار بنایا گیا تھا۔

1902 میں ارونگ... نے شیشے کی کھڑکیاں بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

25 مارچ 1992 پاکستان میں کھیلوں کی تاریخ کا ایک بہت اہم دن ہے۔ اس تاریخ کو پاکستان نے میلبورن میں انگلینڈ کو ہرا کر کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتا تھا۔

26 مارچ 1876 کو ایک بڑے شاعر رابرٹ فراسٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ فراسٹ ایک امریکی شاعر تھا۔ لیکن کلام کی اشاعت انگلینڈ میں ہوتی رہی۔ اس کی پیدائش سان فرانسسکو میں ہوئی تھی اور جنوری 1963 کو بوسٹن میں وفات پائی۔

بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ جن میں پلسٹر پرائز

1902 میں ارونگ... نے شیشے کی کھڑکیاں بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

25 مارچ 1992 پاکستان میں کھیلوں کی تاریخ کا ایک بہت اہم دن ہے۔ اس تاریخ کو پاکستان نے میلبورن میں انگلینڈ کو ہرا کر کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتا تھا۔

26 مارچ 1876 کو ایک بڑے شاعر رابرٹ فراسٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ فراسٹ ایک امریکی شاعر تھا۔ لیکن کلام کی اشاعت انگلینڈ میں ہوتی رہی۔ اس کی پیدائش سان فرانسسکو میں ہوئی تھی اور جنوری 1963 کو بوسٹن میں وفات پائی۔

بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ جن میں پلسٹر پرائز

اور امریکن پوسٹری پرائز بھی ہے۔ 1895 کو چارلس جیکسن نے موشن پکچر کمر بنایا۔ 27 سٹاکس مارچ 27 مارچ 1964 یہ تاریخ الاسکا میں ایک زبردست زلزلہ کی تاریخ ہے جس کا پیمانہ 8.1 تھا۔

اس تاریخ کو ڈک کنگ اسمتھ کی پیدائش ہوئی۔ 27 مارچ 1790 کو جوتوں کے لیے پہلی بار فیتے بنائے گئے تھے اور 27 مارچ 1990 کو دو موجدوں نے مل کر پورٹ اسٹیل آئس کریم مشین بنائی تھی۔ 27 مارچ پیر عبدالقادر گیلانی ثانی کے عرس کی تاریخ ہے۔ یہ مطابق 25 جمادی الاول۔

27 مارچ 1845 کو لے ہم کوٹارڈ کی پیدائش ہوئی۔ ایکس رے کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہے اور 1901 میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

27 مارچ 1948 کو قلات پاکستان کا حصہ بنا تھا۔ 28 اٹھائیس مارچ 28 مارچ 1899 کو ولیم فلیٹنگ نے پیانو کو بجلی سے چلانے کا تجربہ کیا۔

29 مارچ مشہور مشروب کوکا کولا سامنے آیا۔ 1886 میں۔ اٹلانٹا کے ایک فارماسٹ Pemberton نے اسے متعارف کرایا تھا۔

29 مارچ 1973 میں امریکی افواج کا ویت نام سے انخلا ہوا تھا۔ 30 مارچ اس تاریخ کو ڈاکٹر ڈے منایا جاتا ہے۔

اسی تاریخ کو 1867 میں الاسکا کو روس سے لیا گیا تھا اور اس تاریخ کو پہلی بار 1858 ربڑ کے ساتھ مینسل متعارف کروائی گئی تھی۔

اسی تاریخ کو 1853 میں مشہور زمانہ مصور وان گوگ کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ مصور ہالینڈ کا رہنے والا تھا۔ 31 مارچ 31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔

اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

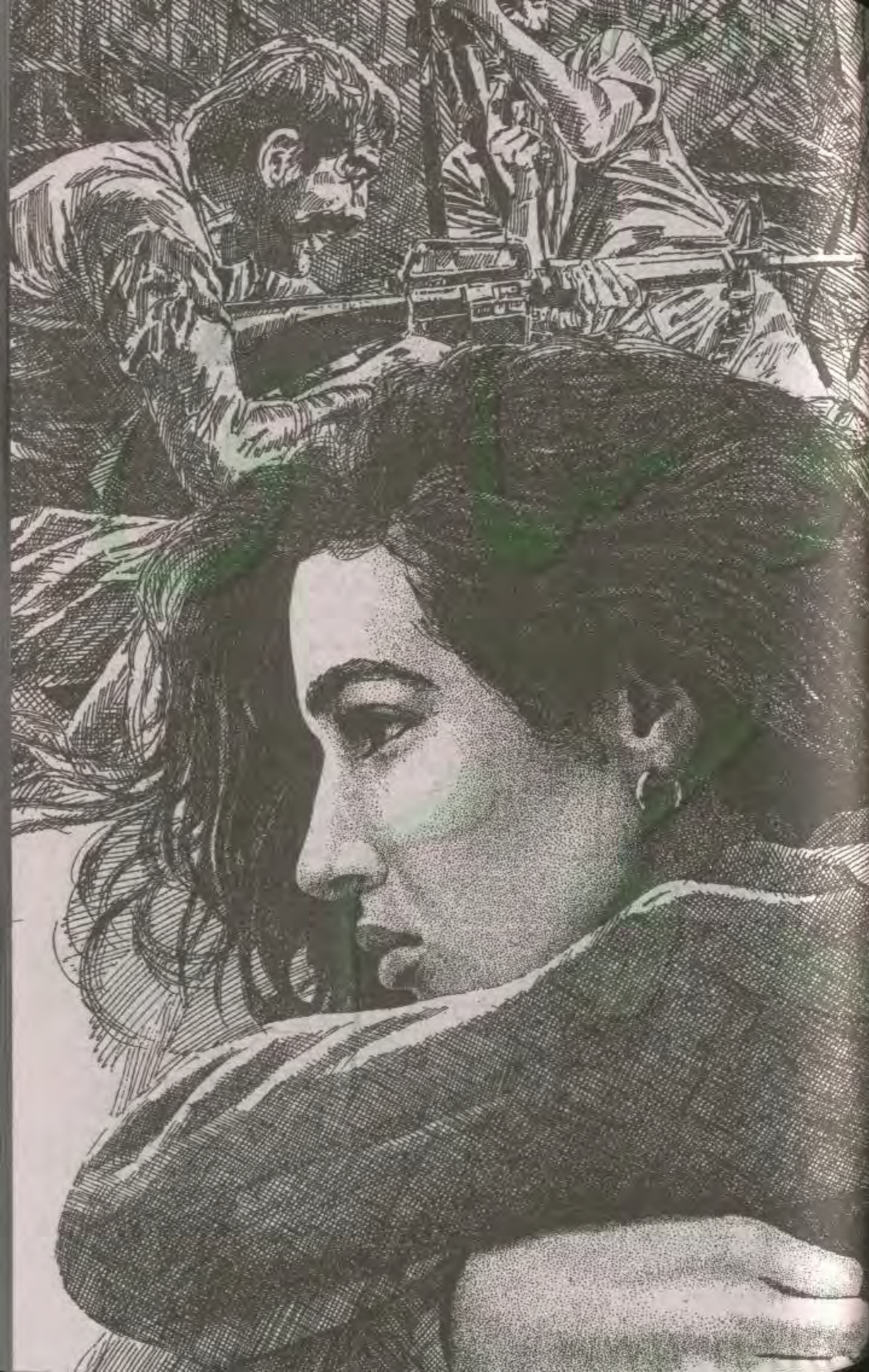
31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

31 مارچ 1784 میں امریکا کا پہلا نقشہ بنایا گیا۔ اس تاریخ کو TaToy day منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1596 میں مشہور ریاضی دان رین ڈسکارٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔



سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 83

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بہٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزرتی رہتی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

باپا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آری میں چاہتا تھا۔ میری محنت سو پر امیر بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں بیٹ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادریلی سے نگر آؤ ہو گیا پھر یہ نگر آؤ ذاتی اتالی میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیے دشمن تھے تو

دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریفنگ آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائینز بریفنگ میں بینک میں سیفٹ بریفنگ کس نکال سکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے ریٹال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیرو کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمین کو بھی بلا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "مارتھ۔۔۔ ہکٹ۔۔۔" دم توڑتے ہی برٹ شا کی آواز صرف میں نے ہی سنی تھی، ٹھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، یہی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ وہاں ایمین بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھر کر کے بس کر لیا اور ایمین کو خود کش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوشش میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ شہلا کے گھر کی تلاش لینے پہنچا تو باہر سے گیس، بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو اینڈرین آری کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بنا کر نکل بھاگا۔ جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرونگی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے اینڈرین آری کے تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بی بی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوشی میں بم دھماکا۔ کوشی یاوری کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے یاوری کوشی کی جانب توجہ دی تھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابری نامی شخص سے ملے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابری کو پکڑ لیں۔ صابری تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر بائیسہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر تھی۔ وہ ہمیں بریفنگ کیس تک لے گئی مگر وہاں بریفنگ کیس نہ تھا۔ کرنل زرونگی بریفنگ کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریفنگ کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریفنگ کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پایا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریفنگ کیس نہیں تھا۔ اس نے میں میری امداد کو اس کی جھڑپ والے بھیجے گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریفنگ کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریفنگ کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوشی پر آ گئے۔ سفیر کو دینی بھیجتا تھا اسے ان پورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسٹنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی کی تھی جس نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوشی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ بیٹی کا پتہ پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکي کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں اینڈرین میں تھا۔ بالو بھی انہو کو پکڑ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کور کی حویلی میں پہنچا گیا۔ وہاں اندرونی سازش شروع ہو چکی۔ چھوٹے کور نے سازش کر کے بالو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوش کی حالت میں بٹھا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشاک کے ساتھ رات گزار لی۔ تو باور ہا ہو جائے گی۔ میں نے راسن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ کوشی دل آ گیا اور اس نے راسن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بالو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ تائیک اور راسن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پایا پھر راج کور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کٹور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز بھیا پھینک کر باہر آ جاؤ۔۔۔" میں نے بروقت راج کور کے ہاتھ پر ہاتھ ملا پستول۔۔۔ دور جا کر ابھر وہاں سے نکل کر راستے میں شام نے۔۔۔ گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شہلا پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوش میں کمراد لوادیا۔ میں ناراض کٹور کو ریٹال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کٹور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ گئی اور راسن کی آواز ابھری۔ "چلنا مت شہباز۔" میں نے اسے ٹھونسنے مار کر بے ہوش کیا اور غصی گئی سے نکل آیا، ہوش پہنچ کر اسکا پ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھروالوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کٹور کو انہو کے بلی کا پتہ کے ذریعہ بارڈر کراس کر لوں گا۔ اسے انہو کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نافٹ تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کر لیا۔ اس نے بتایا کہ راسن راج کور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ بلی کا پتہ سے راج کور کا پیچھا کروں گا اور اسے انہو کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو انہو کر لیا گیا ہے اور اسے واپس اینڈرین لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپس کے لیے بلی کا پتہ لائے کو کہا۔ سنکاری جب بلی کا پتہ واپس لا رہا تھا کہ میزائل چھٹ گیا اور ہمارا ڈن تارک ہو گیا۔ دھماکے سے بلی کا پتہ پانی پر گر گیا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔

کون کھانے کا کمرہ آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر ستر سفر پر چل پڑے۔ شہلا پہنچے پھر وہاں سے راج کور کے عمل کی ناکابندی کرنے پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی جیتنے لگی۔ پرنس کی ٹیلی ویژن بچا دی گئیں۔

(اب آگے پڑھیں)

رہی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ پٹی کے بعد اس نے اٹنے ہاتھ سے راقل تھام لی۔ وہ رات ہیڈر تھا اور اٹنے ہاتھ سے پستول کا استعمال بیکار تھا۔ ہاں راقل استعمال کی جا سکتی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ "اب کیا کرتا ہے؟"

میں نے سائنکس لگا پستول استعمال کیا اور اندر موجود فرد نے چھوٹے کیلی برک پستول استعمال کیا تھا اس لیے آواز کم تھی مگر کیا کہا جاسکتا تھا کہ فائر کی یہ آواز کٹور جیسے تک پہنچی ہو اور وہاں سے گاڑی اڑنے والے ہوں۔ اس سے پہلے ہمیں اپنا کام کرنا تھا۔ میں نے واک کی پر آئی کن سے رابطہ کیا۔ "آئی کن میری آواز سن رہے ہو؟"

"ہاں صاحب سن رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "تم گاڑی ہائی وے سے اندر لے آؤ مگر پیچاس گز کے بعد رک جانا اس سے آگے کیلیں پیچھی ہیں، سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا صاحب۔" اس نے کہا تو میں نے واک کی جیب میں رکھ لیا۔ میں بہت ہلکی آواز میں بات کر رہا تھا اس لیے امکان تھا کہ آواز گاڑی میں موجود فرد تک نہیں جا رہی ہوگی۔ اس دوران میں ایک ترکیب سمجھ میں آئی تھی۔

"گاڑی الٹی ہوگی۔" میں نے بیٹو سے کہا۔ "تم پیچھے ہٹ جاؤ میں یہ کام کرتا ہوں۔"

"ہم ٹھیک ہے ایک ہاتھ سے کام کر سکتا ہے۔" بیٹو نے کہا۔

بحث کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے بات مان لی۔ "ٹھیک ہے تم فرنٹ سیٹ والی طرف آؤ میں پیچھے سے دھکا دیتا ہوں اور دھکا دیتے ہی فوراً ڈھلان پر درخت کی آڑ میں چلے جانا اور وہاں سے نارنج کی روشنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالنا ٹھیک ہے؟"

بیٹو نے سر ہلایا اور ہم گاڑی کے نچلے حصے کی طرف آئے یہ پہلے ہی کسی قدر تر تھا تھا کیونکہ گاڑی ڈھلان پر بھی چڑھ گئی تھی۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے پوری قوت سے گاڑی کو دھکا دیا۔ بیٹو نے بھی حسب توقع مدد کی اور گاڑی چڑھا کر ایک دم چھت کے بل گر گئی۔ بیٹو واپس بھاگا اور میں کسی قدر غصی سمت میں ہو گیا۔

اچانک ہی ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ گاڑی لہرائی اور پھر پہاڑ کی طرف آئی۔ رفتار کی وجہ سے ڈرائیور بریک نہیں لگا سکا تھا اور گاڑی ڈھلان پر چڑھی اور پھر الٹ گئی۔ اب وہ پہلو کے بل ڈھلان سے رگڑتی آگے آرہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تک آ گئی۔ ہم پیچھے ہوئے درندہ گھسٹی گاڑی کی زد میں آ جاتے۔ یہ فوراً ہیل ڈرائیو تھی۔ اس کا نچلا حصہ ہمارے سامنے تھا اور کیبن والا حصہ پیچھے تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی ہم اس کی طرف دوڑے۔ بیٹو اور میں نے نارنج روشن کر لی تھیں۔ سامنے آتے ہی ڈرائیو تک سیٹ پر ایک شخص دکھائی دیا اور اس نے روشنی دیکھتے ہی ایک پستول سامنے کیا تھا۔ میں نے بے اختیار اس پر گولی چلائی گولی ونڈا اسکرین سے گزرتی ہوئی اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ جھٹکا لے کر سیٹ بیلٹ سے بندھے بندھے ساکت ہو گیا تھا۔ بیٹو گھوم کر پیچھے والے حصے میں جھانک رہا تھا۔ مجھے سادی کی فکر تھی کہ گاڑی اس طرح اٹنے سے اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی ہو۔

بیٹو بھی بے تابی سے اسے آواز دے رہا تھا۔ اچانک اندر سے ایک فائر ہوا اور بیٹو گھوم کر گرا تھا میرا دل رک گیا۔ مگر فوراً ہی بیٹو ریٹکتا ہوا میری طرف آیا۔ چھت سے آنے والی گولی بیٹو کو لگی تھی مگر وہاں میں نے اسے سرگوشی میں کہا۔ "اندر کوئی ہے۔"

گولی چلانے والے نے چھت سے گولی ماری تھی جو سوراخ کرتی بیٹو کے شانے میں اتر گئی تھی۔ بیٹو نے زخم کس کر دیا رکھا تھا تاکہ خون نہ بہے اور آفرین ہے، اس نے ذرا بھی آواز نہیں نکالی تھی۔ اگر وہ سادی کو آواز دینے کی غلطی نہ کرتا تو اندر موجود فرد کو پناہ نہ چلتا۔ اپنے ساتھی کے مارے جانے کے بعد اس نے بے دھڑک فائر کیا تھا۔ اب ہم اس پر اس طرح اندھا دھند فائر نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹو نے سرگوشی میں کہا۔ "سادی اندر ہے۔"

میں نے نارنج کی روشنی میں اس کا زخم دیکھا۔ گولی اندر ہی تھی اور خون بہت تیزی سے نہیں بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال اس کے زخم پر رکھا اور اپنی شرٹ کا دامن پھاڑ کر اس کی پٹی سی بنا کر بیٹو کے زخم پر باندھ دی۔ بیٹو کا ہاتھ اور جسم کا دایاں حصہ خون سے بھر گیا تھا۔ یقیناً اسے تکلیف ہو

اندر موجود فرد نے گولیاں چلائی تھیں مگر ہم اس کے سامنے نہیں تھے۔ پھر بیٹو نے درخت کی آڑ میں ہوتے ہوئے نارنج کی روشنی گاڑی کی عقبی سیٹ پر ڈالی اور ایک لہو لہان مردانہ چہرہ سامنے آیا۔ وہ باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میری موجودگی محسوس کر کے اس نے ہتھیار والا ہاتھ آگے کیا تھا کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا، گولی اس کے سر پر لگی اور وہ فوراً مر گیا۔ پھر میں تیزی سے دوسری طرف آیا اور نارنج کی روشنی اندر ڈالی۔ ایک چادر پوش گول مول سا ہو کر پڑا تھا۔ مجھے وہ سادی لگی اور میں نے بے اختیار اس پر سے چادر ہٹائی۔ مجھے جھٹکا لگا تھا میرے سامنے راج کنور تھا، وہ سبھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس گاڑی میں راج کنور تھا تو پھر سادی کہاں تھی؟ اسی لمحے آسمان کی طرف سے ہیلی کاپٹر کا شور سنائی دیا میں نے پلٹ کر دیکھا ایک ہیلی کاپٹر کنور پیلس کے ہیلی پیڈ پر اتر رہا تھا۔

کنور پیلس کا ہیلی پیڈ کا حصہ ہتھ نور بنا ہوا تھا لیکن وہ حصہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ گاڑی میں بس یہ دو ہی لوگ تھے۔ تیسرا فرد راج کنور تھا۔ میں نے بیٹو کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ اسے دیکھو۔“

بیٹو نے اسے دیکھ لیا تھا اور میری طرح حیران تھا۔ راج کنور کو ہم اسپتال میں جمع کرا کے آئے تھے اور بیٹو زخمی تو تھا مگر یہاں تھا۔ میں نے بیٹو کو واکی ٹاکی دیا اور کہا۔ ”آئی کن کو بلاؤ اور اسے گاڑی میں منتقل کر کے میرا انتظار کرو۔“

”آپ کدھر جاتا۔“

”سوال مت کرو۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وقت نہیں ہے جو کہا ہے وہ کرو۔“

میں پیلس کی طرف دوڑا۔ میرے ذہن میں ایک اندیشہ سرسرا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر ہیلی پیڈ کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ میں اس طرف جا رہا تھا جہاں سے میں ہیلی کاپٹر کو پیلس میں اترتے دیکھ سکوں۔ اس جگہ پہنچ کر میں ڈھلان پر اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی تک پیلس کی طرف سے کسی کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میں پہاڑ کی ڈھلان پر اوپر چڑھ رہا تھا اور مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا جب مجھے ہیلی پیڈ نظر آنے لگا تو میں نے رک کر دور بین آنکھوں سے لگائی۔ سارا منظر یک دم سمٹ کر آنکھوں میں آ گیا۔ ایک شخص مخصوص بلا اٹھائے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کی رہنمائی کر رہا تھا اور وہ ہیلی کاپٹر نیچے لا رہا تھا۔ یہ کنور پیلس کا ہیلی کاپٹر تھا اور مجھے یاد آیا میں نے پہلے اسے ہیلی پیڈ پر نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس وقت توجہ نہیں دی

تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر نیچے اتر گیا۔ میں دور بین ہیلی کاپٹر پر مرکوز کر دی۔ نیچے اترتے ہی اس کا انجن بند ہو گیا تھا کیونکہ شور میں یک لخت کمی آئی تھی۔

مجھے آس پاس حرکت محسوس ہوئی تو میں نے دور بین گھمائی اور مجھے بڑا کنور دکھائی دیا۔ وہ چار محافظوں کے ساتھ تھا جنہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا اترنے والا دروازہ دوسری طرف تھا یہ سائیڈ میری نظروں سے اوجھل تھی لیکن ہیلی کاپٹر سے اترنے والا کوئی فرد میری نظروں میں آئے بغیر پیلس میں نہیں جاسکتا تھا۔ بڑے کنور کو خود ہیلی پیڈ پر دیکھ کر میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ وہ کسی عام فرد کے لیے ہیلی پیڈ تک نہیں آسکتا تھا۔ اب ہیلی کاپٹر کے دوسری طرف حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دور بین مرکوز رکھی اور پھر میں نے ایک عورت کو ایک شخص کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا۔ میری ساری بینائی سمجھ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ وہ چال ڈھال اور جسامت سے سادی لگ رہی تھی۔ اس نے لان کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سردی سے بچاؤ کے لیے اسے ہلکی شال دی گئی تھی۔ وہ آگے آئی اور بڑے کنور کے سامنے رک گئی۔ بڑے کنور نے اسے دیکھ کر بازو پھیلانے۔ میرے خیال تھا کہ وہ اس کے سینے سے لگ جائے گی۔ کچھ بھی سمجھ وہ اس کا بڑا بھائی تھا مگر وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ پا کر بڑے کنور کے ہاتھ خود نیچے ہو گئے۔ وہ اچانک مڑا اور اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہدایت دے گیا تھا کیونکہ ان میں سے دو اس کی طرف آئے اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور پیچھے مڑی تب میں نے سادی کا معصوم اور روتا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت سبھی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ بڑے کنور سے جو روٹہ تھا، وہ عکاسی کر رہا تھا کہ اپنے بھائیوں کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش تھی تو اسے یوں اغوا کرنے سے وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا مگر کہا ضرور ہو گا۔ وہ ان دونوں آدمیوں کے ساتھ اندر کی طرف روانہ ہو گئی اور میں بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ میری ساری کوشش اور جدوجہد رائیگاں گئی تھی۔ میرا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ بھارتی حدود میں آنے کے بعد سادی کو کنور پیلس تک لانے کا سب سے آسان اور تیز ترین طریقہ ہیلی کاپٹر ہے۔

سادی کے اندر جانے کے بعد میں نے دور بین سے پیلس کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا وہاں سب معمول

کے مطابق تھا اس کا مطلب تھا کہ حادثے اور اس کے بعد ہونے والی فائرنگ کی آواز وہاں پہنچ نہیں پائی تھی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ اول اسی دوران میں ہیلی کاپٹر آگیا تھا اور اس کے انجن کے شور میں فائرنگ کی آواز دب گئی تھی، دوسرے فائرنگ دو ہتھیاروں سے ہوئی تھی۔ میرے پستول پر سالنکسز تھا اور مارے جانے والے کے پاس کم آواز والا ہتھیار تھا۔ پھر یہ جگہ پیلس سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اب یہاں رکنا بیکار تھا۔ راج کنور ہاتھ لگا تو تھا مگر وہ ہاتھ سے نکل بھی گیا تھا اور بیٹو زخمی تھا۔ مجھے ان دونوں کو دیکھنا تھا۔ میں واپس گیا۔ حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی میں اب صرف لاشیں تھیں۔ بیٹو راج کنور کو لے کر جا چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور دور سے لائٹ مار کر سگنل دیا۔ میں نے نارنج سے جوابی سگنل دیا اور سڑک پر پچیس کیلوں سے بچتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔ بیٹو فرنٹ سیٹ پر تھا اور اس نے شانہ تمام رکھا تھا۔ راج کنور پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہی کہا۔ ”اب نکلو یہاں سے۔“

بیٹو نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا شوٹی، سادی....؟“

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”وہ پیلس پہنچ گئی ہے ہیلی کاپٹر اسے ہی لے کر آیا تھا۔“

آئی کن نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ بیٹو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہم بلا وجہ سڑک کا نگرانی کرتا رہا۔“

”ہاں ساری کوشش بیکار گئی۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”زخم کیسا ہے؟“

”شوٹی درد ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے کم تھا اب بڑھ رہا ہے۔“

”کہاں جانا ہے صاحب؟“ آئی کن نے ہائی وے پر گاڑی روک کر پوچھا۔

”بائیں طرف چلو۔“ میں نے کہا۔ ”جس قصبے سے کیلیں لی تھیں ہمیں وہیں جانا ہے۔“

وہاں بیٹو کو طبی امداد مل سکتی تھی۔ پہلے بھی ڈاکٹر شوکیہ گیتا نے ریم کے بدلے ہماری مدد کی تھی اور مجھے امید تھی کہ وہ اس بار بھی انکار نہیں کرے گا۔ آئی کن کو ہدایات دے کر میں راج کنور کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بالکل خاموش اور بے تاثر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر انجکشن کا اثر تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”راج کنور تمہیں اسپتال سے کس نے نکالا۔ تم بڑے کنور کے آدمیوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟“

”وہاں راوا لے آ گئے تھے۔ انہوں نے سنکاری اور مجھے گرفتار کر لیا۔“ راج کنور نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اسی کا خدشہ تھا۔ انہی جنس والے بہت تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ انہوں نے آڈیسی کا پیارہ ٹریس کیا اور شملہ تک آئے اس کے بعد کب تک رسائی حاصل کی جس نے ہمیں اسپتال پہنچایا تھا۔ وہاں پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے آگے ہم خود گئے تھے۔ اگر انجنی والوں نے اس بازار میں بھی پوچھ بچھ کی ہوگی تو عین ممکن ہے انہیں کوئی فرد مل جائے جس نے ہمیں آئی کن کے ساتھ جاتے دیکھا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تھا تو جلد یہاں بھی ہمیں بھارتیوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”اگر وہ راوا لے تھے تو انہوں نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا؟“

”میں نہیں جانتا وہ مجھ سے اور سنکاری سے سوالات کرتے رہے لیکن ہم نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ پھر وہ سنکاری کو لے گئے اور دو گھنٹے بعد یہ لوگ مجھے وہاں سے لے آئے۔“

”کون لوگ؟“

”جنہیں تم نے مار دیا۔“

”تمہیں معلوم تھا کہ وہ بڑے کنور کے آدمی ہیں؟“

”اس وقت نہیں معلوم تھا لیکن جب وہ پیلس کے پاس پہنچے تو مجھے اندازہ ہو گیا۔“

راج کنور کے جسم پر اسپتال کا لباس تھا اور اس کے پاؤں سے پلاسٹر اتار کر ایک جدید قسم کی بینڈیج چڑھا دی گئی تھی۔ یہ پاؤں کو پلاسٹر کی طرح پکڑ لیتی تھی مگر اسے اتارنا بھی جاسکتا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزار کر اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رانے اسے اتنی آسانی سے کیسے بڑے کنور کے سپرد کر دیا تھا جب کہ وہ انہیں ایک اہم ترین کیس میں درکار تھا۔ وہ ملزم نہیں تھا مگر بھارت کے ملزموں کے ساتھ ضرور تھا۔ اس نے سرحد پار کرنے کا کوڈ اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور پاکستان کی طرف سے شوٹ کیے جانے والے ہیلی کاپٹر میں وہ بھی موجود تھا۔ پھر اس نے میری ہدایت کے مطابق سوالوں کے جواب دینے سے بھی انکار کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی رہائی کے پس پشت بڑے کنور کا دباؤ اور ضمانت ہو۔ اس نے ضمانت دی ہوگی کہ جب راکو تفتیش کی ضرورت ہوگی تو راج کنور تک رسائی دی جائے گی۔ اسپتال والے اور را کے افسران بھی اندازہ

نہیں لگا سکے تھے کہ راج کنور اور سنکاری دوا کے زیر اثر تھے۔ راج کنور فی الحال آزاد تھا مگر سنکاری ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور جلد یا بدیر وہ سب اگل دیتا اور اس کے بعد وسیع پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جاتی۔ گویا میرے پاس وقت کم تھا۔

”راوا لے کب اسپتال پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے دو بجے کا وقت تھا۔“ راج کنور نے سوچ کر کہا۔ ”مجھے صبح سے یاد نہیں ہے، میں سو رہا تھا جب انہوں نے مجھے اٹھایا، اس کے کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی تھی اس میں سوا دو بج رہے تھے۔“

میں نے اسے اور سنکاری کو زیادہ تر سونے کی ہدایت کی تھی۔ وہ اس پر عمل کرتے رہے تھے۔ راج کنور بدستور دوا کے زیر اثر تھا۔ مگر میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔ اس سے پہلے بھی میں دھوکا کھا چکا تھا جب میں فاضلی کو دوا کے زیر اثر سمجھ رہا تھا اور دوانے اس پر اثر نہیں کیا تھا۔ عین ممکن تھا راج کنور جو کہانی سن رہا ہو وہ اس کی اپنی بنائی ہوئی ہو۔ اس کی کہانی میں واحد مشکوک بات راکا اسے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت دینا تھا۔ اگرچہ اس کی وجوہات تھیں مگر یہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ آئی کن میری ہدایات پر ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”کنور پبلس سے باہر جانے کا کوئی اور خفیہ راستہ ہے، اس کے علاوہ جہاں سے ہم باہر نکلے تھے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہی ایک راستہ ہے اور اب وہ بھی بند ہو گیا ہوگا کیونکہ اب وہ خفیہ نہیں رہا تھا اسے ڈائنامائٹ سے اڑا دیا ہوگا اور محل میں داخل ہونے والے راستے کو کنکریٹ ڈال کر بند کر دیا ہوگا۔ یہ طے شدہ فیصلہ تھا کہ سرنگ کا راز فاش ہوتے ہی اسے تباہ کر دینا ہے۔“

یہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ متبادل راستہ تیار کیے بغیر وہ اس سرنگ کو تباہ نہیں کر سکتے تھے ہاں اس کی نگرانی کی جاسکتی تھی۔ مگر راج کنور کہہ رہا تھا کہ سرنگ کو تباہ کیا جا چکا ہوگا۔ شاید اس لیے کہ میں اس سرنگ کے راستے کنور پبلس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ راج کنور بالکل معمول بنا ہوا تھا۔ وہ نہ تو خود سے کوئی حرکت کر رہا تھا اور نہ بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر سیٹ سے نکال لیا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہو۔ اس کی ٹانگ پر جو جدید جینز لگائی تھی یہ گھٹنے کے پاس سے مڑ بھی سکتی تھی اس لیے وہ آرام

سے بیٹھا ہوا تھا ورنہ پہلے اس کے لیے سیٹ پر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے دوسرے زخم تقریباً بھر گئے تھے یا اب تک نہیں بھرے رہے تھے۔ خاص طور سے چہرے والے زخموں کے بس نشانات باقی رہ گئے تھے۔ میں نے راج کنور کو ہلایا۔

”اٹھو اب مت سونا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اب نہیں سوؤں گا۔“

”راج کنور تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“ ”دہلی میں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کیا راج کنور اور رامن جانتے ہیں کہ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“ اس نے سر ہلایا۔ ”جانتے ہیں۔“ ”تب تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ وہ ان کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں۔“

”وہاں میری سسرال ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں اور میرے بیوی بچوں کی حفاظت کر سکتے ہیں اس لیے میں ان کی طرف سے بے فکر ہوں۔“

اسی لیے راج کنور اپنے بیوی بچوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ ”راج بڑے کنور کی کمزوری کیا ہے؟“

”اس کی صحت۔“ راج کنور نے جواب دیا۔ ”اپنی صحت کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہے لیکن صرف اپنی صحت کی وجہ سے تمہارے آگے بھٹتا رہا ہے۔ مگر جیسے ہی اس کا مطلب نکلے گا وہ تمہیں عبرت ناک موت مارے گا۔“

”مجھے بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔“ میں نے آگے دیکھا جہاں قصبے کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ راستے میں آنے والا پہلا بڑا قصبہ تھا۔ میں نے آئی کن سے تصدیق چاہی۔ ”کیا ہم پہنچ گئے ہیں؟“

”جی صاحب۔“ ”شوبی ہم کدھر جاتا ہے۔“ بیٹو نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔ اس کے لہجے سے تکلیف بھلک رہی تھی۔ ”یہاں ایک ڈاکٹر ہے جو پیسے لے کر کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور آئی کن کو سمجھانے لگا کہ اس نے کس راستے سے گاڑی اور پر کی طرف موڑنی تھی اور یہ چڑھائی صرف فور وہیل چڑھ سکتی تھی۔ اس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ اسلحہ اور دوسرا سامان گاڑی کے پچھلے حصے

میں تھا۔ بیٹو زخمی ہونے کے باوجود سب سامان بھی ساتھ لے آیا تھا۔ رات ہونے کے ساتھ سردی شدید ہوتی جا رہی تھی اور اب ہمارے ہلکے سوتی کپڑے اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے اس کا اندازہ مجھے ڈاکٹر گپتا کے کلینک کے سامنے اترنے کے بعد ہوا۔ بند گاڑی میں اتنا پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”تم یہاں رکو اور ہوشیار رہو۔“ ”ہم ہوشیار ہے شوبی۔“

میں نے کلینک کے اوپری زینے کے ساتھ لگی کال بیل بجائی تو اوپر سے ڈاکٹر گپتا کی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ ”ایک پرائیوٹ۔“ میں نے کہا۔ ”نیچے آؤ۔“ ڈاکٹر گپتا اپنے آبائی علاقے سے دور اس پہاڑی قصبے میں یقیناً کمانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا اس لیے پیشرفت کا سنتے ہی ایک منٹ میں نیچے آ گیا۔ اس نے کوٹ کے بجائے صدری پہن رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ ”تم وہی ہے؟“

”ہاں میں وہی ہوں لیکن اس بار میرے ساتھ کچھ دوسرے لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم کیا پیشفت لاتا ہے۔“ اس نے شک سے کہا۔ میں نے جواب دیا۔ ”اگر تم کو اعتراض ہے تو میں کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔“

”اپن کا یہ مطلب نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ اسے یاد تھا کہ میں نے اس کی منہ مائی فیس دی تھی۔ ”پیشفت کدھر ہے؟“

”گاڑی میں۔۔۔ تم کلینک کھولو۔“ میں نے کہا۔ وہ کلینک پر لگا تالا کھولنے لگا اور میں گاڑی کی طرف آیا۔ پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے راج کنور سے کہا۔ ”نیچے اترو۔“

اس بار بھی اس نے بے چون چر امیرے حکم کی تعمیل کی اور باہر نکل کر گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”آئی کن کے ساتھ اندر آؤ اس سے کہنا گاڑی لا کر دو۔“

میں سہارا دے کر راج کنور کو اندر لے گیا۔ بیٹو خود اندر آیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا راج کنور کو مریض سمجھا اور اسے اندر والے کمرے میں لے جانے کا اشارہ کیا لیکن اسے میں نے وہیں بیٹھ دیا۔ ”پیشفت آ رہا ہے اسے گولی لگی ہے۔“ وہ پھر چونکا۔ ”ایک اور بلٹ پیشفت۔۔۔ بابا یہ تم ہر روز کہاں سے لاتا ہے۔“

”پھر سوال۔“ میں نے ڈانٹا۔ ”تم پیسے کس بات

کے لیتے ہو، علاج کرنے کے یا سوال کرنے کے؟“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”ناراج کاٹے کو ہوتا ہے۔“ بیٹو آئی کن کے ساتھ اندر آیا اس کی لہو میں بھیگی شرٹ بتا رہی تھی کہ بلٹ پیشفت وہی ہے۔ ڈاکٹر گپتا اسے اندر لے گیا اور آئی کن راج کنور کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ایک سے انداز میں آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں بیٹھو اور میرے آنے تک اپنی جگہ سے ہلنا مت نہ کسی سے بات کرنا۔“

انہوں نے سر ہلائے تو میں کلینک سے باہر آیا دروازہ بند کر کے میں نے جھری سے اندر جھانکا۔ یہ جھری میں نے تاڑ لی تھی۔ اس سے اندر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ دونوں بیچ پر ساکت بیٹھے ہوئے۔ میں کوئی پانچ منٹ باہر رہا اور وہ بیٹھے رہے۔ سردی نے مزاج پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ جب خاصی دیر راج کنور نے کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تو میں اندر آیا اور آئی کن سے گاڑی کی چابی لے کر اپنا کپڑے والا بیگ اندر لے آیا۔ ایک طرف اسکرین رکھی تھی اس کے پیچھے جا کر میں نے گرم لباس اور ہلکی جیکٹ پہنی تو ذرا سکون ملا تھا۔ راج کنور نے ہاسپٹل والا ہلکا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی البتہ آئی کن نے جیکٹ پہن لی تھی۔ میں نے ڈاکٹر گپتا کے آپریشن روم میں جھانکا تو وہ بیٹو کا زخم صاف کر کے گولی نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بیٹو کی شرٹ اتار دی تھی اور اب وہ صرف پتلون میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”یہ کام کر کے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کر دینا۔“

”ابھی بولتا ہے۔“ اس نے کہا اور دفتر میں آ کر انٹر کام پر مراٹھی زبان میں اوپر کچھ ہدایات دیں اور واپس آپریشن روم میں چلا گیا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اس نے ہانویا شام کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ ان کی فیس وصول کر چکا تھا اس لیے ان میں۔۔۔ دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ یہ بات میں نے بھارت میں شدت سے محسوس کی تھی یہاں بھی علیک سلیک کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اگر پیشہ ورا امور میں کسی سے دس بار بھی ملاقات ہو تو اسے پیٹھے کی حد تک محدود رکھتے تھے، اسے ذاتی سطح پر نہیں لاتے تھے۔ ڈاکٹر گپتا نے دس منٹ میں بیٹو کے زخم سے گولی نکال کر اس کی مرہم پٹی کر دی اور پھر اسے یکے بعد دیگرے کئی انجکشن دیئے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”فکر کا بات نہیں ہے گولی سامنے تھا زیادہ نقصان نہیں کیا۔ احتیاط کرے گا تو تین دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا اور ایک ویک بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے پہلے کی طرح اسے دو ہزار روپے جو اس نے خاموشی سے رکھ لیے۔ کچھ دیر میں اوپر سے کھانا آ گیا۔ حسب معمول یہ پورے پورے، ترکاری اور اچار پر مشتمل تھا۔ لیکن لذیذ اور چٹ پٹا تھا۔ بیٹو نے بھی شوق سے کھایا حالانکہ کچھ گھنٹے پہلے وہ ڈٹ کر پراٹھا اور بھاجی کھا چکا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا اس لیے اب ٹھیک سے کھایا۔ کھانے کے بعد سب کے لیے چائے آئی اور بیٹو کو دودھ میں گائے کا گھی... ڈال کر دیا گیا جو اس نے بڑی مشکل سے اور منہ بنا کر پیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اس کی ماں اسے مار مار اس طرح دودھ میں گھی ڈال کر پلاتی تھی کہ اس سے جسم اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ میں نے سر ہلایا۔

”ہڈیاں تو مضبوط ہیں تمہاری اور یہ اسی دودھ گھی کی وجہ سے ہے۔“

کیونکہ ڈاکٹر گپتا نے مزید رقم کا مطالبہ نہیں کیا تھا اس کا مطلب تھا کہ کھانا پینا بھی اسی رقم میں شامل تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے کہاں جائیں۔ اس قصبے میں کئی ہوٹل تھے لیکن ہم کسی ہوٹل میں نہیں رک سکتے تھے یو آئی کن کے اور کسی کے پاس کاغذات نہیں تھے۔ ہوٹل والے مشکوک ہو جاتے تو پولیس کو بتا سکتے تھے اور اگر نہ بھی بتاتے تو ہماری تلاش شروع ہوتے ہی سب سے پہلے ہوٹلوں میں تلاش کی جاتی۔ اس وقت کسی ہوٹل کا رخ کرنے کا مطلب خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے ڈاکٹر گپتا سے پوچھا۔

”ڈاکٹر ہمیں رات کو کہیں رکنا ہے یہاں کوئی گھر ہے جہاں ہمیں ایک آرام دہ کمرہ مل جائے۔“

”ادھر کئی ہوٹل ہے۔“

”ہم ہوٹل میں ٹھہرنا نہیں چاہ رہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”ہم ادائیگی کریں گے اگر کھانا پینا دیا تو اس کے پیسے بھی دیں گے۔“

ڈاکٹر گپتا نے سر ہلایا وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے ادھر میرا سسٹر ہے، بیوہ ہے، بچہ ہے اور اسے پیسے کا ضرورت رہتا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”ہم سے کوئی تکلیف نہیں گی۔ میں ہوٹل سے زیادہ ہی کرایہ دوں گا۔“

اس نے فون اٹھایا اور نمبر ملا کر مراٹھی میں جی جی کرنے لگا۔ کم سے کم اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ لڑ رہا ہو۔ شدید قسم کی بحث کر رہا ہو لیکن اس جی جی کا نتیجہ مثبت نکلا تھا۔ فون رکھ کر اس نے کہا۔ ”میرا سسٹر مان گیا ہے۔ ایک دن کا ہزار روپیہ مانگ رہا ہے کھانے پینے کا الگ دوں گا۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ہم چار ہیں اس لیے کمرہ ایسا ہو کہ ہم چاروں آرام سے رہ سکیں گھس گھسا کر نہ رہنا پڑے۔“

”اس کا کمانچ اچھا ہے، شوہر فاریسٹ کنٹرکٹر تھا۔ ایک حادثے میں مر گیا۔“

میں نے رکی افسوس کیا۔ مرہم بی اور کھانی کر بیٹا جاق چوبند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے کپسول اور گولیاں ایک ایک کا پتا دیا۔ کپسول اینٹی بائیوٹک تھے اور گولیاں تین کلر تھیں۔ اس نے کہا۔ ”کپسول ہر چھ گھنٹے بعد ایک گلاس سادہ دودھ کے ساتھ لینا ہے پر دودھ گرم نہ ہو اور پین کر اس وقت لینا جب درد بہت ہو اور سونا ہو۔“

”اس کی بیٹی کیسے تبدیل ہوگی۔“

اس نے بیٹی تبدیل کرنے کا سامان دیا اور طریقہ بھی بتایا۔ میں نے احتیاطاً لے لیا لیکن ساتھ ہی اس سے کہا۔ ”جب تک ہم یہاں ہیں تم بیٹی تبدیل کرنا میں نہیں دوں گا۔“

”میں کر دے گا۔“ اس نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کیا مسئلہ ہے۔“

”اسے گھنٹے میں فریج پر قابو ٹھیک ہے پر کبھی کبھی پین ہوتا ہے۔“

”پین ہو تو یہی گولی اسے بھی دے دینا پر ایک سے زیادہ مت دینا بہت ہائی پوینسی ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈاکٹر شوکیہ گپتا غلط کام کر رہا تھا لیکن وہ ہمارے بہت کام آیا تھا۔ اس نے تقریباً سارے مسائل حل کر دیئے تھے۔ ہم گاڑی میں آئے۔ ڈاکٹر نے کلینک بند کر دیا اور ہمارے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اس کی بہن کا گھر اس کے کلینک کے متوازی پہاڑی کے دوسرے حصے میں تھا۔ یہ قصبہ کا پوش حصہ تھا یہاں زمین چھوڑ کر کاجڑ اور جنگل بنے ہوئے تھے۔ یہاں راستے نسبتاً بہتر اور سڑکیں

ہموار تھیں۔ ڈاکٹر گپتا نے ایک دو منزلہ کمانچ کے سامنے گاڑی رکوائی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ کمانچ کے سامنے چھوٹا سا باغ تھا جس میں انگور کی بیلین اور اسٹرابیری کے پودے لگے تھے۔ باغ اور کمانچ کی حالت سے لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر گپتا کی بہن کھاتی بیٹی بیوہ تھی۔ جب کہ اس کا کہنا تھا کہ وہ ضرورت مند ہے۔

ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو شوہر تو رہا نہیں تھا تو آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر گپتا کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی بیوہ بہن بس بچوں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنے آرام سے چار اجنبی افراد کو اس کے پاس ٹھہرانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ حیرت اس کی بہن پر تھی۔ گپتا خاصی عمر کا سیاہ رنگت اور بد صورت نقوش والا شخص تھا اور پر سے اس کے کروت بھی اس کے چہرے پر آ گئے تھے۔ اس کی بہن اگر اس پر گئی تھی تو اس لحاظ سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر آبرو کے علاوہ جان اور مال کا خطرہ بھی تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گپتا کوئی دس منٹ بعد اندر سے برآمد ہوا اور اس نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ہمیں کمانچ کے برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں لایا اس کا دروازہ باہر کھلتا تھا اور ایک دروازہ اندر بھی کھلتا تھا۔ فرش پر دیزر قالین تھے اور دیواروں کے ساتھ گاؤں کیے اور سلیقے سے تہ کیے ہوئے چار کمبل رکھے تھے۔ کمرہ کارز کا تھا اور دو طرف کھڑکیاں تھیں۔ جن پر اچھے دیزر پردے تھے۔ کمرہ ظاہر بہت اچھا تھا لیکن یہاں کوئی تیسرا دروازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے دوسرے دروازے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ گھر میں کھلتا تھا۔ اندر سے بند تھا۔ گویا ہم باقی گھر سے الگ تھے۔ یہ ایک لحاظ سے اچھا تھا کہ کوئی ہمارے کمرے میں بھی اچانک نہیں آ سکتا تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا۔ یہاں کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”بعض اوقات فطرت آدمی کو پکارتی ہے۔“

وہ کنفیوژ ہو گیا۔ ”کیا... کیا بولا... کون کس کو پکارتا ہے؟“

”میرا مطلب ہے کال آف نیچر۔“ میں نے سلیس انگریزی میں سمجھایا اور مزید سمجھانے کے لیے چھوٹی انگلی بھی کھڑی کر کے دکھائی جو یونیورسل اشارہ ہے۔ اس نے دانت نکالے۔

”اچھا... اچھا... اس کا بھی انتظام ہے میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے کمانچ کے عقبی حصے میں لے گیا یہاں الگ سے ایک چھوٹا واش روم تھا جس میں حوائج ضروریہ کے علاوہ غیر ضروریہ سے فارغ ہونے کے بھی انتظامات تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے تسلی کرا کے ایک دن کا کرایہ پیشگی لیا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ صبح کے ناشتے کا بھی ابھی سے کہہ دوں۔ میں نے پانچ سو مزید دیئے اور اسے آرڈر نوٹ کرادیا۔ ناشتے میں ابلے اور تلے ہوئے انڈے، پراٹھے، ڈبل روٹی، چائے اور کافی درکار تھی۔ ڈاکٹر گپتا رقم لے کر اندر چلا گیا۔ ابھی تک اس کی بہن سامنے نہیں آئی تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم ڈاکٹر گپتا کے توسط سے آئے تھے اور وہی سب دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ بعد اس نے واپس آ کر مجھ سے کہا۔ ”تم لوگ اس کمرے تک رہے گا اور باہر بھی صرف واش روم کے لیے جائے گا۔ واک بھی نہیں کرے گا۔ اس کے لیے باہر جائے گا۔“

”ہم بلا ضرورت کمرے سے نہیں نکلیں گے، لیکن یہ گاڑی کھڑی کرنی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ یہ لوگوں کی نظر میں آئے اور وہ سوچیں کہ یہاں کچھ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”تم گاڑی ادھر مکان کے کونے میں سڑک پر کھڑا کر دو لوگ سمجھ گئے کہ کسی اور کا گاڑی ہے۔ بیتا کی گاڑی اندر کھڑی ہے۔“

”تمہاری سسٹر کا نام بیتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بیتا دیوی۔“

ڈاکٹر گپتا رخصت ہو گیا میں نے آئی کن سے گاڑی کمانچ کے کونے پر اس طرح کھڑی کروائی کہ یہ ظاہر اس کا تعلق کمانچ سے نہ لگے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور آئی کن اور راج کنور صبح نو بجے تک انجکشن کے زیر اثر رہتے لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سے پہلے انہیں دوسرا انجکشن دے دوں گا۔ ابھی تک راج کنور کا دائرہ یہاں تک دراز نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا تھا تو فی الحال اس قصبے تک نہیں آئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ یہ رات ہم سکون سے گزار سکیں گے۔ بیٹو کو آرام کی اشد ضرورت تھی۔ ابھی تو اسے پین کلر کا انجکشن دیا ہوا تھا۔ اس کا اثر تھا اس لیے وہ لیٹ کر آرام سے سو گیا۔ اس کے لیے خوراک سے زیادہ آرام ضروری تھا۔ میں نے راج کنور اور آئی کن کو سونے کا حکم دیا تو انہوں نے سعادت مندی سے اس کی تعمیل کی۔

میں نے بیٹو کو کمبل اوڑھا دیا تھا۔ آپریشن کے بعد

اسے گرم شرٹ پہنا دی تھی لیکن جیکٹ نہیں پہنی تھی۔ آئی کن نے جیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے اس نے صرف ٹانگوں تک کمبل لیا البتہ راج کنور کمبل میں گھس کر اچھی طرح لیٹ گیا تھا۔ اس نے سردی کے لحاظ سے ہلکا لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کے لیٹنے کے بعد میں نے اسلحے والا بیگ اپنے اور بیٹو کے درمیان رکھا۔ ان کو کمرے کے کونے میں جگہ دی تھی۔ میں اور بیٹو دروازے کے پاس تھے بلکہ میں نے اپنا ڈیرہ بالکل دروازے کے سامنے جمایا تھا۔ یہ اندر کی طرف کھلنے والا سنگل ڈور تھا اور جب تک میرا تکیہ نہ ہٹایا جاتا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ مگر میرا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ نکالا اور سب سے پہلے لیپ ٹاپ اور موبائل چارجر سے لگائے۔ یہاں کمرے میں ایک طرف دیوار پر مٹی سا کٹ لگا ہوا تھا جس میں ہر طرح کا ملگ لگ سکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کا آدھا آدھا چارج باقی تھا لیکن میں نے اسے فل کرنے کا فیصلہ کیا۔

چارج پر لگا کر میں نے لیپ ٹاپ سے انٹرنیٹ یو ایس بی ڈیوائس لگائی اور کنکشن آن ہوتے ہی اسکا پپ پرا گیا۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملا یا مگر وہ بند جا رہا تھا پھر میں وسیم کا نمبر ملانے لگا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے سفیر کا نمبر ملا یا۔ اسکا پپ سے میں نے ابھی تک سفیر کو کال نہیں کی تھی۔ عبداللہ اور وسیم کے نمبر ممکنہ طور پر بڑے کنور اور اس کے توسط سے بھارتی حکام کے علم میں آچکے تھے اس لیے ان پر کال کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے بلو تو تھ ہینڈ فری لگا لیا تھا۔ سفیر نے کال ریسپونڈ کی اور آہستہ سے بولا۔ ”یہ تو ہے؟“

”نہیں میرا بھوت ہے۔“

”ہم سب بھی مر چکے ہیں انتظار کر کے۔“ اس نے حسب معمول بھنا کر کہا۔ ”کہاں مر گیا تھا تو؟“

”بس یا سمجھ لے کام نہیں ہوا۔“

سفیر ایک لمحے کو چپ ہوا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”بھیا کے پاس پہنچ گئی، ہم زمینی راستے پر انتظار کر رہے تھے اور بھیا نے بائی ائر بلوایا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ سفیر نے تشویش سے کہا۔ ”اس کا ہوتا سوتا تو پاگل ہو رہا ہے۔“

”اسے قابو میں رکھو یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں، مئے کے شانے میں چوٹ آئی ہے۔ اس کی مرہم پٹی کرا کے ایک

جگہ آرام کر رہا ہوں۔“

”کیا ہوا اسے.... وہ ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ڈاکٹر نے آپریٹ کر کے مرہم پٹی کر دی ہے ابھی سو رہا ہے۔“

”ہوا کیا تھا؟“

”ہم نے ایک گاڑی روکی جو بھیا کے محل کی طرف جارہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس میں بہنا ہوگی، مگر اس میں دوسرا بھیا نکل آیا۔ اسے بڑے بھیا نے وہاں سے منگوا لیا تھا جہاں میں نے اسے محفوظ کیا تھا۔ اسے روکا تو سامھی جھگڑنے لگے۔ ان کو تو سلا دیا مگر مئے کے شانے پر بھی چوٹ آئی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے تین دن لگ سکتے ہیں ٹھیک ہونے میں۔“

”تب تک تو کیا کرے گا؟“

”آرام اور تم لوگ اب بڑے بھیا سے گفت و شنید کرو۔ اگر مجھ سے بات کرنا چاہے تو مجھے بتا دینا میں رابطہ کر لوں گا مگر اسے یہی بتانا کہ میں فی الحال صحت بحال کر رہا ہوں۔“

”تو ایک بات بھول رہا ہے پرندہ گرنے میں تیرا نام بھی آیا ہوگا۔“

میں سنکاری کو بھول گیا تھا۔ وہ راوا لوں کے پاس تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا اور سفیر کو مطلع کیا کہ بڑے بھیا تک میری یہاں موجودگی کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔ اب وہ اس کی طرف سے رابطے پر میرے بارے میں لاعلمی ظاہر کریں۔ بلکہ عبداللہ اور وسیم فی الحال اس کا فون بھی امیٹڈ نہ کریں۔ سفیر نے طعنہ دیا۔ ”تجھے کیا ہو گیا.... سامنے کی بات تھی۔“

”بس یار ذہن پر بوجھ اتارنا ہے کہ بعض اوقات سامنے کی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اچھا ہوا تجھ سے بات ہوگئی اور بات کلیئر ہوگئی۔ اب میں اس پر نئے زاویے سے سوچوں گا۔“ میں نے کہا اور مبہم انداز میں اپنی مہم جوئی اور بھارتیوں کی طرف سے تلاش کا بتایا۔ سفیر یہ سن کر فکر مند ہو گیا کہ ہم بدستور کنور پبلک کے پاس ہیں۔

”اب تیرا زیادہ دیر وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”ہاں، لیکن تو جانتا ہے میں اسے لیے بغیر واپس نہیں آ سکتا۔ پار میں نے اسے دیکھا تھا جب وہ بڑے بھائی کے سامنے آئی اور اس نے بازو پھیلائے تو وہ اس کی طرف نہیں بڑھی، بھائی کے سینے سے نہیں لگی۔ وہ ان لوگوں سے تعلق توڑ

چکی ہے۔ اب وہ ہماری ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے۔“

”تو میں کب انکار کر رہا ہوں یا ر، اسے اپنی بیگم کی طرح سمجھتا ہوں۔“

میں ہنسا۔ ”اس کے شوہر نامدار نے سنا تو تیرا مرڈر کر دے گا۔“

”وہ برابر میں بیٹھا دانت نکال رہا ہے لے اس سے بات کر۔“

”آپ ٹھیک ہیں؟“ وسیم کی آواز آئی۔

”تقریباً تم نے سب سن لیا ہے، نہیں تو یہ بتا دے گا، نام کسی کا بھی نہیں لینا۔“

”مئے کا سنا تھا، وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں تین چار دن میں فٹ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ وسیم کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ ان معاملات کا ماہر تھا اور مجھے اچھا مشورہ دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں مانی کی مدد سے انٹرنیٹ پر دیکھ کر آپ کو بہتر مشورہ دے سکوں گا۔“

”بالکل یا ر اس چیز نے بہت آسانی کر دی ہے، اس کی مدد سے میں بالکل اچھی علاقوں میں آسانی سے گھومتا رہا ہوں۔ اللہ مانی کا بھلا کرے اس نے بہت اہم چیزیں سکھائی ہیں، اس کا کیا حال ہے؟“

”مئے کے بغیر اداس ہے اور دوبارہ حویلی جانے کی ضد کر رہا ہے۔“

”کیونکہ وہاں شازیہ ہے۔“ پیچھے سے سفیر نے کہا۔ ”یہ دونوں ایک نمبر کے بد معاش ہیں۔“

”منا شریف ہے۔“ میں نے بیٹو کا دفاع کیا۔

”بد معاش مانی بھی نہیں ہے لیکن وہ بیٹو سے مختلف ذہن کا لڑکا ہے۔“

”آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے، آج ہی عدالت سے آپ کے خلاف تمام کیسز خارج کر دیئے گئے ہیں۔“ وسیم نے انکشاف کیا۔

”ارے واہ۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”اور تم لوگ اب بتا رہے ہو۔“

”وکیل صاحب نے ایک گھنٹا پہلے مطلع کرنے کی زحمت کی تھی۔“ وسیم ہنسا۔ ”اب ہمیں وعدے کے مطابق پیر زادے کو پیر جی کے حوالے کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو وکیل صاحب سے تصدیق

کر کے پیر زادے کو حوالے کر دو۔ ویسے اس کی حالت کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے، اب گزرنے کا خطرہ نہیں ہے۔“

”یہ کار خیر برادر کلاں کے ہاتھ انجام پائے تو زیادہ اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسکا پپ پر آسکتے ہو؟“

”ہاں میں آن لائن ہوتا ہوں۔“ سفیر نے کہا۔ میں نے کال کاٹ دی۔ اگرچہ ہمالیہ ہوٹل کے آئی ٹی کے ماہر نے ہزار منٹس کا کریڈٹ ڈلوایا تھا لیکن میں اسے محفوظ رکھنا چاہتا تھا نہ جانے کب کہاں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ ایک منٹ بعد سفیر آن لائن ہوا۔ لیکن وہ یو میں مانی نظر آیا۔ اس نے پرجوش طریقے سے علیک سلیک کی لیکن نام نہیں لیا غالباً اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کیونکہ مانی ان چیزوں کا ماہر تھا اس لیے میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس طرح اسکا پپ استعمال کر رہا ہوں اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”انڈیا والے اس معاملے میں خاصے آگے ہیں اور انہوں نے حکومتی سطح پر اس کا انتظام بھی کیا ہوا ہے۔ وہ کسی بھی انٹرنیٹ سرگرمی کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔“

”وہ کیسے؟“

”کم سے کم بات کریں اور جگہ بدلتے رہیں۔“

کیونکہ جگہ بدلنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے مانی کے دوسرے مشورے پر عمل کیا اور مختصر بات کر کے اسکا پپ بند کر کے لیپ ٹاپ بھی بند کر دیا۔ مانی کا کہنا تھا یو ایس بی ڈیوائس صرف استعمال کے وقت لگایا کروں ورنہ اس سے سنگٹل جاتے رہتے ہیں اور اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ یعنی میں نے خاصی دیر بات کی تھی۔ آئی کن باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا لیکن راج کنور خاموشی سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اب تک شک تھا کہ وہ اب دوا کے زیر اثر نہیں رہا تھا۔ اسے اسپتال میں امیٹی ڈوٹ دے دیا گیا تھا۔ امیٹی ڈوٹ کسی بھی دوا کے توڑ کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس کا پتا چلانا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک وہ خود کوئی حرکت نہ کرتا۔ راج کنور پر شک تھا ہی ساتھ ہی میں کسی ممکنہ ریڈ سے بھی ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔

یہ سوچنا کہ بھارتی یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے خوش فہمی تھی۔ وہ جتنی تیزی سے پیچھے آئے تھے اور اسپتال تک پہنچ کر سنکاری کو قبضے میں لیا تھا اس کا امکان تھا کہ میرے

بارے میں جانتے ہی وہ زیادہ مستعدی سے حرکت میں آجائیں اور اس سارے علاقے میں بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ پچھلے ایک عشرے میں ہماری سلامتی کے اداروں کو جتنے انتشار اور مسائل کا سامنا تھا۔ وہ قومی سلامتی کے بجائے دوسرے کاموں میں الجھا دیئے گئے اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان اداروں کی جو ساکھ تھی اسے شدید نقصان ہوا تھا۔ بعض ایسے دل گداز سانحے پیش آئے جن سے عوام کی نظروں میں ان اداروں کی ساکھ خراب ہوئی تھی۔

روشن خیال آمرانہ دور میں جہاں ایک طرف ملک کی نظریاتی اساس کو نقصان ہوا وہیں ہمارے بیرون ملک آپریشن متاثر ہوئے۔ دہشت گردی کی جنگ میں ایک بار سریندر کرنے کے بعد ہم گرتے ہی چلے گئے اور حتیٰ کہ بھارت جیسا زلی دشمن اور ریاستی دہشت گردی کا بانی ملک ہمیں طعنے اور گالیاں دینے لگا جو ہم خاموشی سے سننے لگے۔ بیرون ملک آپریشن بند ہونے سے بھارت کو فری ہینڈ ملا اور کشمیر میں اسے ریلیف دینے کا صلہ یہ ملا کہ اس نے ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں مداخلت شروع کر دی۔ جس عشرے میں ہمارے سلامتی کے ادارے انحطاط پذیر ہوئے اسی دوران میں بھارت نے مغرب کے تعاون سے اپنے سلامتی کے اداروں کو نئے سرے سے منظم اور مضبوط کیا اور اپنے ملک میں ان کا وسیع جال بچھا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب بھارت کے پاس ریاستی اداروں کا بہت بہتر نظام موجود ہے جو اس کی سلامتی کو لاحق کسی بھی خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس لیے مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ بھارتی یہاں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور درحقیقت میں مگر مجھ کے جڑے میں موجود ہونے جیسی خطرناک صورت حال سے دوچار تھا۔ جس لمحے یہ جڑے آپس میں ملتے ہیں ان کے ٹکڑے میں آجاتا۔ میں صرف اللہ کے بھروسے پر تھا اور یہ ظاہر اس کا امکان کم تھا کہ میں یہاں سے صحیح سلامت نکل سکوں گا یا سادی کو واپس حاصل کرنے کے مشن میں کامیاب ہوں۔ مگر ساتھ ہی مجھے تجربہ تھا کہ ممبر اور محل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے سے کوئی نہ کوئی راہ نکل آتی ہے۔ میں لیٹا ہوا تھا اور جب نیند کے جھوٹے آنے لگتے تو اٹھ کر ٹھیلے لگتا۔ رات میں راج کور نے اٹھ کر واش روم جانے کی فرمائش کی اور مجبوراً مجھے یہ ناگوار کام کرنا پڑا تھا اسے سہار دے کر واش

روم تک لے گیا اور پھر وہاں سے واپس لایا۔

باہر سردی اچھی خاصی تھی، اس کے مقابلے میں کالج میں سردی کم تھی۔ اس کی چلی منزل کافرش اور دیواریں پتھر سے بنی تھیں جب کہ چھت اور اوپری منزل کٹڑی سے بنی تھی یہی وجہ تھی یہاں موسم کی شدت کا اثر کم تھا۔ چھ بجے روشنی ہوئی اور اوپر کھٹ پٹ ہونے لگی تھی۔ شاید سیتا دیوی اور اس کے بچے جاگ گئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر گپتا سے کہا تھا کہ ہمیں نو بجے ناشتا درکار ہوگا۔ رات میں نے ایک بار بیٹو کو اٹھا کر انٹینی بائونک دوا دی تھی۔ اس وقت تک چین کلر انجکشن کا اثر تھا لیکن سات بجے اس کی آنکھ کھلی تو اسے تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”فکرت کرو ناشتے کے بعد تمہیں چین کلر دیتا ہوں۔“

”آپ جاگتار ہارات بھر؟“

”ہاں مجبوری تھی میں نہیں سو سکتا تھا خیر میں ناشتے کے بعد سو جاؤں گا۔ ابھی ان دونوں کو دوبارہ انجکشن دینا ہے۔“

”پہلے دے دو۔“ بیٹو نے مشورہ دیا۔

آٹھ بجے اثر ختم ہو جاتا۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ میں نے انجکشن لگا لے اور پہلے راج کور کو لگایا۔ اس نے بلا جھجک بازو آگے کر دیا۔ اس کے بعد میں نے آئی کن کو انجکشن دیا۔ اس نے بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ بیٹو جاگ رہا تھا اس لیے میں واش روم سے ہو کر آیا اس کے بعد بیٹو گیا۔ آخر میں آئی کن میرے ساتھ گیا۔ اس پریڈ میں ناشتے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ میں آئی کن کے ساتھ گیا تھا اور جب واپس آیا تو برآمدے میں ایک جوان اور دلکش عورت موجود تھی۔ اس نے سردی سے قطع نظر روایتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ مختصر سرخ بلاؤز اور ساڑی میں اس کا سراپا نمایاں تھا۔ صاف رنگت جسے گوری تو قرار نہیں دیا جاسکتا تھا مگر وہ سانولی بھی نہیں تھی۔ بندھے ہوئے لائٹ براؤن بال اور اسی رنگ کی آنکھیں تھیں۔ نقوش بھی اچھے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستہ کیا تو میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”ناشتا تیار ہے۔“ وہ بولی۔

”لے آؤ۔“ میں نے کہا پھر مجھے خیال آیا۔ ”سیتا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

وہ دل آویز انداز میں مسکرائی۔ ”آپ سیتا دیوی سے مل رہے ہیں۔“

میں دنگ رہ گیا۔ میرے خواب و خیال میں نہیں تھا کہ شوکیہ گپتا اور سبھاش گپتا جیسے منحوس صورت بھائیوں کی

ہیں اتنی خوب صورت ہوگی۔ وہ ان کے مقابلے میں کم عمر بھی تھی۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے محذرت کی۔ ”سوری میں سمجھا تھا کہ آپ ایجنڈ ہوں گی۔ اور آپ گڈ لک بھی ہیں۔“

”تھینک یو۔“ وہ مسکرائی اور پلٹ کر چلی گئی۔ اس کی چال بھی دلکش تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جوان اور خوب صورت عورت تھی اور اس نے اتنی آسانی سے چار اجنبی افراد کو اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ بے شک یہ کمر باقی گھر سے الگ تھا لیکن تھا تو گھر کا ایک حصہ اور اس کا کھانے کے لیے ہمارے پاس آنا جانا رہتا۔ اس کا اعتماد قابلِ داد تھا۔ دس منٹ بعد ایک دس سال کے بچے کے ساتھ ٹرائی میں ناشتا لے آئی۔ لڑکا صورت سے اس کا کا بیٹا لگ رہا تھا۔ اس نے سلیقے سے قالین پر دسترخوان بچھایا اور ٹرائی سے ناشتے کا سامان اٹھا کر جانے لگا۔ پراٹھے کپڑے میں لیے اور گرم تھے۔ انڈوں کا خاگینہ اور ابلے ہوئے انڈے الگ تھے۔ نمک اور کالی مرچ ساتھ تھی۔ ڈبل روٹی، مکھن اور ایک کنوری میں شہید بھی تھا۔ یہ اچھا اور بھرپور ناشتا تھا۔ چائے خاص کیتلی میں تھی جس میں یہ دیر تک گرم رہتی۔ سب سے اچھی بات کہ دودھ اور شکر الگ سے تھے۔ برتن بہت اچھے والے تھے۔ پانی کا جگ اور گلاس الگ سے تھے۔ ناشتہ لگانے کے بعد سیتا دیوی نے کہا۔ ”آپ ناشتا کر لیں میرا بیٹا پراوین برتن لے جائے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ آدھے گھنٹے بعد پراوین کو بھیج دیجیے گا۔“ میں نے کہا اور ان کے جاتے ہی سب ناشتے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ رات کا کھانا پیارات میں ہی ہضم ہو گیا تھا۔ اُن فٹ بیٹو اور راج کور بھی پورا ساتھ دے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے میں دسترخوان کی ہر چیز ہمارے پیٹوں میں منتقل ہو گئی تھی، اس میں دس پراٹھے بھی شامل تھے۔ اپنی اپنی پسند کی چائے پی کر سب خود کو آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ میں نے بیچ جانے والے دودھ کے ساتھ بیٹو کو دوا کھانے پر مجبور کیا۔ آدھے گھنٹے بعد پراوین آکر برتن لے جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹا اپنی ماتا جی سے کہو میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ برتن سمیٹ کر لے گیا اور میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ سیتا دیوی کچھ دیر بعد اندر سے برآمد ہوئی۔ وہ غالباً کام کرتی ہوئی آئی تھی کیونکہ اس نے ساڑی کا پلو اڑس رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اتنے اچھے ناشتے کا شکریہ۔ اب

ہم رات کو کھانا کھائیں گے۔“

”دو پہر میں نہیں کھائیں گے؟“

”نہیں“ میں آپ کو زیادہ مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

”مشکل تو نہیں ہوگی۔“ اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ شاید اس لیے کہ اب تین وقت کے بجائے دو وقت کے کھانے کی رقم ملے گی۔ وہ یقیناً اس سے بھی اچھا خاصا بچا رہی ہوگی۔ ”مجھے بتا دیں کیا کھانا ہے میں بنا لوں گی۔ گوشت والی ڈش بھی بنا سکتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے منن کڑا ہی بنا لیجئے گا اس کے علاوہ جو ہو وہ بھی ٹیرین ہو۔“ میں نے اسے پانچ سو کا ایک نوٹ اور دیا جو اس نے اپنے بلاؤز میں غائب کر دیا۔ ”دوسرے ہم اب کمرے میں رہیں گے بلا ضرورت کوئی باہر نہیں آئے، آپ بھی اگر کسی سے ہمارا تذکرہ نہ کریں تو اچھا ہوگا۔ ہمیں لوگوں کی توجہ نہیں چاہیے۔“

اس نے بغیر کسی تاثر کے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، ویسے آپ نے اور کتنے دن رکنا ہے؟“

”کم سے کم آج رات اور۔۔۔ میرے ساتھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہماری گاڑی مکان کے ساتھ کھڑی ہے اگر کوئی پوچھے تو آپ لائسنس ظاہر کر دیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے دن میں چائے، کافی، پانی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دروازہ بجبا کر بول دیجیے گا۔“ اپنے بھائیوں کی نسبت اس کی زبان صاف ستھری اور کسی حد تک دیہی والوں کی سی تھی۔ شاید وہ اچھے کالج سے پڑھی ہوئی تھی۔ اب مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بہن بھی یا گپتا نے اسے منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے یہ سوال پوچھ لیا تو وہ ہنسی۔

”سب یہی سمجھتے ہیں، لیکن میں شوکیہ اور سبھاش کی اکلوتی بہن ہوں۔ ان سے پورے پندرہ اور تیرہ سال چھوٹی ہوں۔ وہ پتا جی پر گئے ہیں میں ماتا جی پر گئی ہوں۔ ابھی کچھ چاہیے؟“

اس نے خود پیش کش کی تھی اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”ہاں اگر کافی مل جائے۔۔۔ کھانے کے علاوہ بھی جو آپ دیں گی اس کی بھی ادائیگی ہوگی۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بھیجتی ہوں۔“

میں کمرے میں آیا تو راج کور اور آئی کن اونگھ رہے تھے حالانکہ وہ ساری رات سوئے تھے۔ شاید بھاری ناشتا

کر کے انہیں اونگھ آگئی تھی۔ ابھی تک آئی کن نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ اسے جانا ہے اور اس کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اچانک اس کی جیکٹ سے موبائل کی بیل بجی اور اس نے موبائل نکالا۔ ”ایک منٹ کال ریسیومٹ کرنا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کس کی کال ہے؟“ آئی کن نے موبائل دیکھا۔ ”میری بیوی کی۔“ ”اوکے اسے بتاؤ کہ تم سیاحوں کے ساتھ ہو اور کچھ دن میں واپس آؤ گے وقت کا بتا نہیں سکتے۔“

اس نے سر ہلا کر کال ریسیو کی اور تارمل انداز میں جو میں نے کہا تھا وہ اپنی بیوی سے کہہ دیا لیکن اس کا انداز مناسب تھا اس لیے اس کی بیوی کو شک نہیں ہوا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ مجھے خیال نہیں آیا کہ اس کے پاس موبائل ہو سکتا ہے۔ جب اس نے بیوی سے بات کر لی تو میں نے اس سے موبائل لے کر آف کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ گاڑی کی چابیوں پہلے ہی میرے قبضے میں تھیں۔ راج کنور کے پاس کچھ نہیں تھا پھر بھی میں نے احتیاطاً اس کی تلاشی لی۔ بیوہ غور سے دیکھ رہا تھا اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”شوہی انجکشن نے بچا لیا ورنہ ان دونوں کے ساتھ تو مارا جاتا۔“ ”یہ دوا بڑے کام کی چیز ہے شیر کو بکری بنا دینے والی۔“

”یہ شیر نہیں کتا ہے۔“ بیوہ نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”پرا بھی دم دیا ہے بیٹھا ہے۔“ اس بے عزتی پر بھی راج کنور نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اس وقت وہ یقینی طور پر انجکشن کے زیر اثر تھا۔ اگر دوا میں گڑبڑ ہوتی تو آئی کن پر بھی اثر نہ ہوتا۔ ”تکلیف میں کمی ہوئی ہے؟“

بیوہ نے سر ہلایا۔ ”ابھی بہتر ہے۔ آپ سو جاؤ۔“ ”کافی منگوائی ہے وہ پی کر سوؤں گا۔“

پراوین کافی کاگ لایا تھا۔ یہ سلیقے سے چھوٹی ٹرے میں اور ڈھکا ہوا کپ تھا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ایک گھر میں اچھے ہوٹل والی سہولتیں حاصل کر رہے تھے اور یہاں ہم سے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ سیتا دیوی سادہ مزاج عورت تھی۔ اس نے صورت دیکھ کر مجھ پر اعتبار کر لیا تھا اور صرف کنڈی کے سہارے خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہماری جگہ سچ مچ کے مجرم اور جرائم پیشہ ہوتے تو اس کی جان، مال اور آبرو سب خطرے میں ہوتی۔ کافی پی کر میں لیٹ گیا اور سونے سے پہلے بیوہ سے کہا۔ ”تم ٹھیک چار بجے

مجھے جگا دینا، درمیان میں تمہیں دوا بھی لینی ہے۔“ ”شوہی اب کھانا کب ملے گا؟“ ”شام میں....“ میں نے کہا۔ ”اس دوران میں کمرے سے باہر مت جانا اور کوئی ایمر جنسی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔“

”آپ فکر مت کرو۔“

میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ گزشتہ چھتیس گھنٹے سے زیادہ وقت میں مجھے مشکل سے دو ڈھائی گھنٹے سونے کا موقع ملا تھا مگر پریشانی کی وجہ سے نیند حاوی نہیں ہو پارہی تھی، اس وقت بھی سونے میں کچھ وقت لگا۔ مگر یہ مدہوش اور بے خواب نیند تھی۔ ساڑھے چار بجے بیوہ نے مجھے اٹھا دیا۔ میں نے انگریزی لی۔ چھ گھنٹے کی نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دوران میں کچھ ہوا تو نہیں؟“

”نہیں۔“ بیوہ بولا۔ ”ہم نے دوا لے لیا ہے درد بڑھ گیا تھا اب ٹھیک ہے۔“

میں اٹھ کر باہر آیا اور دروازہ بجایا۔ ایک چھوٹی بچی نے دروازہ کھولا اور معصومیت سے بولی۔ ”جی انکل۔“

”بیٹا اپنی ماما جی سے کہو ہمیں چائے چاہیے۔“ بچی سات آٹھ سال کی تھی اس لیے مجھے امید تھی وہ ماں تک بات پہنچا دے گی۔ میں واش روم میں آیا۔ ابھی دن تھا اور موسم اتنا سرد نہیں تھا لیکن پانی خاصا سرد تھا۔ اس کے باوجود میں نے دل کڑا کر کے غسل کر لیا۔ دریا کی ریت اب تک جسم سے چپکی محسوس ہو رہی تھی، غسل کر کے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے تھے۔ اس علاقے میں پسینا آتا ہے اور نہ دھول مٹی ہوتی ہے۔ میں خوش خوش واپس آیا تو بیوہ نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ ”آپ مزے سے نہا لیا ہم ابھی نہیں نہا سکتا۔“

”ہاں جب تک زخم ٹھیک نہیں ہو جاتا تم نہیں نہا سکتے۔“ میں نے تائید کی۔ ”واش روم جانا ہے کسی نے؟“

آئی کن اور راج کنور دونوں نے جانا تھا۔ میں باری باری انہیں لے گیا۔ اس دوران میں چائے آگئی تھی یہ صبح کی طرح گرم رکھنے والی کیتلی میں اور دودھ و شکر الگ سے تھی۔ چائے کی پتی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ بیوہ نے غسل تو نہیں کیا تھا لیکن تقریباً نہا لیا تھا۔ نچلے حصے پر پانی بہایا تھا اور اوپر کیلے کپڑے پھیر لیے تھے۔ وہ بھی آیا تو تکلیف کے باوجود خوش تھا۔ ”شوہی مزہ آگیا۔“ اس نے سرور لہجے میں

پانی ٹھنڈا پر مڑے کا ہے ہم کو یاد آ گیا، بچپن میں ماں ہم کو پکڑ کر نہلاتا تھا، ہم بھاگتا تھا، نہیں نہلاتا تھا۔
”بچپن میں سب ایسا کرتے ہیں۔“
”شوہنی آپ خوش قسمت ہے۔“ اچانک وہ اداس ہو گیا۔
”آپ کا ماں باپ.... بہن بھائی سب آپ کے پاس ہے.... آپ سے محبت کرتا ہے.... ہمارا ماں باپ بہن بھائی سب بھگوان کے پاس چلا گیا۔“

میں اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”ہاں یہ اوپر والے کی مرضی ہے۔ پر وہ تم سے محبت کرتے ہوں گے اور اب تم ہمارے ساتھ ہو کیا تمہیں ہم میں سے کسی کی محبت پر شک ہے۔ سفیر تم سے کتنا لڑتا ہے تمہیں تنگ کرتا ہے لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ تم زخمی ہو تو وہ بے قرار ہو گیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن تم سو رہے تھے۔“

بیٹو کا چہرہ چمکنے لگا۔ ”ہم جانتا ہے آپ سب ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم کو پتا ہے آپ کا حویلی کے زنانے میں کوئی باہر کا مرد نہیں جاسکتا پر ہم بابا سے چھپ کر وہاں گھس رہا تھا۔ بابا بھی منع نہیں کرتا، پر ہم کو اچھا نہیں لگتا تھا اور کوئی منع نہیں کرتا تھا۔ ماں جی ہم کو بہت پیار کیا۔ ہم کو بیٹا بتالیا۔ سویرا اور شمی دیدی نے ہم سے کہا کہ شوہنی جب حویلی واپس آئے گا ہم آپ کے ساتھ ہوگا۔“

”ہاں تم میرے ساتھ ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی سب میرے ساتھی ہیں لیکن تم میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔“
”سفیر بھائی بولتا ہم آپ کا دست نارا ست ہے۔“
بیٹو نے شکوہ کیا۔

میں ہنسا۔ ”حالانکہ وہ نالائق خود ایسا ہے۔ تم میرے کارآمد بازو ہو۔“

بیٹو بہت سادہ انسان تھا وہ اس خیال سے خوش ہو گیا کہ اب ساری عمر میرے ساتھ رہے گا۔ وہ سارا دن جاگتا رہا تھا اور جھکن بھی ہو رہی تھی پھر اسے آنے والی رات میں بھی جاگنا تھا اس لیے وہ سو گیا۔ پراوین چائے کے برتن لینے آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹے اپنی ماما جی سے کہو ڈاکٹر گپتا کو بلا لیں، میرے ساتھی کی پٹی تبدیل کرنی ہے۔“
مجھے شبہ ہوا تھا کہ بیٹو نے بے احتیاطی سے کام لیا تھا اور پانی کا اثر زخم تک نہ گیا ہو اس لیے میں چوبیس گھنٹے سے پہلے پٹی تبدیل کرانا چاہتا تھا۔ پراوین نے کچھ دیر بعد بتایا۔ ”انکل.... شوکیہ ماما سات بجے آئیں گے۔“
یہ بھی اچھا تھا بیٹو اتنی دیر سولیتا اور پھر اس کے بعد

ماہنامہ سرگزشت

کھانا کھا کر دوبارہ سو جاتا میں اسے دو تین بیٹے سو سکتا تھا۔ ابھی تک میں نے سوچا نہیں تھا کہ مجھے اسے میں چاہتا تھا کہ بیٹو اس قابل ہو جائے کہ مجھ سے کر سکے۔ اس میں اسے کم سے کم تین دن لگتے۔
دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن یہاں سے نکل جاتے۔ اگر شملہ کی طرف جاتے تو امکان تھا کہ ایجنسیاں سب سے زیادہ وہیں سرگرم ہوں گی۔
بھیڑیوں کے بھٹ کے جانے کے مترادف ہوتا۔ اس سے بہتر یہی تھا جب تک ہمیں یہاں کوئی مسئلہ نہ ہو۔
رکیں۔ ڈاکٹر گپتا اور اس کی بہن اپنے کام سے کام لے والے لوگ تھے۔ سات بجے ڈاکٹر آ گیا اس نے بیٹو کو کچھ اس کے زخم کی دوسری ڈرینک شروع کی۔ تو صبح کے برخلاف اس کا زخم بہت بہتر حالت میں تھا۔ وہ خشک اور تھا اور اس کا منہ بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے سفال کی ضرورت محسوس نہیں کی اس نے پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے روئی رکھ کر دوسری پٹی رکھ کر اسے ٹیپ سے چپکا دیا۔
اس نے بیٹو کو ایک اور اینٹی بائیوٹک انجکشن دے دیا۔
”اس سے زخم جلدی بھرے گا۔“ اس نے اپنا ہیکل بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”نہیں بلکہ بہت آرام ہے، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔“
سیتا دیوی ہمارا زیادہ ہی خیال رکھ رہی ہیں۔
”وہ اچھی عورت ہے پر قسمت خراب ہے۔“ ڈاکٹر گپتا نے کہا۔ ”ابھی جوان ہے خوب صورت ہے دوسرا ہیکل مل جائے گا پر مانتی نہیں ہے۔“

”اسے اپنے سوگمباشی پتی سے بہت محبت ہوگی۔“
اس بات پر ڈاکٹر گپتا کا چہرہ عجیب سا ہوا تھا مگر صرف ایک دو لمحے کے لیے پھر وہ نارمل ہو گیا اور سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”کوئی بات کہتی ہے۔“
”نہیں رات کے کھانے کا میں نے صبح ہی کہہ دیا تھا۔“

اس شام بادل آ گئے تھے اور کچھ سرد ہوا بھی چل رہی تھی کبھی کبھی پھواری پڑتی تھی اس سے موسم اور سرد ہو رہا تھا۔ آٹھ بجے کھانا آ گیا اور کھانا کے بعد چائے پی کر سب کمرے میں گھر گئے۔ آج موسم کل سے زیادہ سرد تھا۔ نو بجے بارش شروع ہو گئی تھی۔ بارش تیز نہیں تھی لیکن ایک مستقل رفتار سے ہو رہی تھی۔ بوندیں گرنے کی آوازیں

کہا۔ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ ”دروازہ کھول۔۔۔“
”ارون۔“ سیتا کی برہم آواز آئی۔ ”تو یہاں کیوں آیا اب تیرا میرا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔“
”سمبندھ تو ہے، یہ دو بچے تو اپنے میکے سے لائی تھی۔ دروازہ کھول۔“

”تو مجھے طلاق دے چکا ہے۔“ سیتا کی آواز تیز ہو گئی۔ ”اب یہاں سے چلا جا اس سے پہلے میں پولیس کو کال کروں۔“

ارون ہنسا۔ ”کردے تو جانتی ہے یہاں کی پولیس میرا نام سنتے ہی فون بند کر دے گی۔ وہ میرے کتے ہیں میرا کھاتے ہیں مجھ پر کیسے بھونک سکتے ہیں۔“

سیتا کو چپ لگی تھی۔ یہ انکشاف تھا وہ بیوہ نہیں مطلقہ تھی اور اس کا سابق شوہر ارون بد معاش قسم کی چیز تھی۔ اس وقت بھی وہ بد معاشی کے ارادے سے آیا ہوا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سیتا کے شوہر کے ذکر پر ڈاکٹر گپتا کا چہرہ متغیر کیوں ہو گیا تھا۔ سیتا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تو کیا چاہتا ہے؟“

”بچوں کو دیکھوں گا تجھ سے کچھ پیار بھری باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔“ ارون کے لہجے سے خیانت جھلک رہی تھی۔

”تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، پیار کی باتیں ان کتیاؤں سے کر جن کے پاس تو اس وقت گھس رہا تھا جب میں تیری بیوی تھی۔ بچوں سے ملنا ہو تو صبح آنا دن کی روشنی میں، تو اچھی طرح جانتا ہے میں شریف عورت ہوں۔“

ارون نے دروازے پر لات ماری۔ ”کھول دروازہ.... ورنہ....“ اس کی آگے کی بات ناقابل بیان تھی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ مگر میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”ارون چلا جا.... یہاں سے چلا جا....“ سیتا رونے لگی۔ ”میرا تجھ سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”تعلق ہو جائے گا تو دروازہ کھول....“ ارون نے مزید بکواس کی۔ ”آخر تو نے گھر میں ہوٹل بھی تو کھول رکھا ہے غیر مردوں کی سیوا کرتی ہے آج میری کر لے اور تیرے لیے کون سی نئی بات ہوگی۔“

”ارون چلا جا.... یہ دروازہ تجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔“

جواب میں ارون نے دروازے پر مزید چند ٹھوکریں

میں چونکا ہوا کر اٹھا اور سامنے والی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کالج کے دروازے کے سامنے ایک بڑی جیب رکی تھی اور پھر اس سے ایک شخص اتر کر اندر آیا۔ اس نے ہاتھ اندر ڈال کر گیٹ کی کڑی کھولی اور بے تکلف اندر آ گیا۔ جاگنے کے بعد میں نے خطرہ محسوس کیا تھا اور مجھے خیال آیا کہ میری یوسونگھنے والے کتے بالآخر یہاں تک آ گئے تھے مگر حواس بحال ہونے اور ایک شخص کے یوں بے تکلفانہ اندر آنے سے مجھے اپنا خیال غلط لگا تھا۔ اول تو اتنے زور و شور سے گاڑی نہیں روکی جانی دوسرے آنے والا ایک نہیں ہوتا اور نہ وہ یوں منہ افٹائے آتا۔ اس کے باوجود میں نے پستول نکال لیا اور بیٹو کو بلایا وہ جاگ گیا۔ ”کیا کیا ہوا شوہنی؟“

”باہر کوئی ہے۔“ میں نے کہا اور کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں تین چھوٹے انرجی سیور جلتے تھے، رات کو ان میں سے دو آف کر دیے جاتے تو تیسرا لائٹ بلب بن جاتا۔ میں نے اسے بھی آف کر دیا اور اب کمرے میں اندھیرا تھا صرف برآمدے میں جلنے والی لائٹ کی ہلکی سی روشنی پردے سے چھلک کر اندر آ رہی تھی۔ آنے والا لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتا اور عملاً انہیں بجاتا ہوا برآمدے میں آیا اور اس نے سیتا دیوی کے دروازے کی کال بیل بجائی۔ اندر کہیں ہلکی سی مترنم گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں نے اٹھ کر اپنا تکیہ اور کمرے دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ گھر کے اندر جانے والا دروازہ مشکل سے پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مجھے جھجس تھا کہ آنے والا کون تھا اور اتنی رات گئے یہاں کیوں آیا تھا۔ سیتا نے دروازہ نہیں کھولا تھا اس نے ایسے ہی پوچھا۔

”کون ہے؟“
”تیرا پتی....“ آنے والے نے لڑکھرائی آواز میں

ماریں اور بکواس کی۔ مجھے لگا کہ اب میری برداشت کی حد جواب دے جائے گی اور میں باہر نکل کر اس گھٹیا شخص کو ماروں گا۔ مگر ایسی نوبت آنے سے پہلے وہ بکنا جھٹکا وہاں سے دفع ہو گیا اور جانے سے پہلے اس نے جان بوجھ کر جیب کا پارن زور زور سے بجایا۔ سیتا شاید دروازے سے لگی کھڑی تھی کیونکہ اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ جو دروازے کے کھلے حصے سے لگا ہوا تھا برف ہو رہا تھا۔ ٹکیہ اور کمبل ٹھیک کر کے میں نے بیو سے سونے کو کہا تو وہ بولا۔ ”اس کا آدمی کتنا خراب ہے ہمارا دل چاہ رہا تھا باہر نکل کر اس کا زبان کھینچ لے۔“

”اگر وہ ایک دومنٹ اور نہ جاتا تو اس کے ساتھ یہی ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی اچھی عورت اور قسمت دیکھو... ایسا لگتا ہے اس دنیا میں اب خوشیاں کم ہو گئی ہیں اور ہر گھر میں دکھ زیادہ ہو گئے ہیں۔“

”اس سے شادی کر کے غلطی کیا۔ پراچھا کیا جو طلاق لے لیا۔“

مجھے پیاس لگ رہی تھی میں نے پانی پیا۔ سیتا نے دو لیٹر کی بوتل اور گلاس بھیج دیا تھا تاکہ ہمیں پانی کا مسئلہ نہ ہو۔ تین بجے بیو کو جگا کر اسے دوادی اور میں سو گیا۔ رات کے کھانے کے برتنوں کے ساتھ ہی اگلے چوبیس گھنٹے کا کرایہ اور صبح ناشتے کی رقم دے دی تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے بیو نے اٹھایا۔ ”شوہی سیتا دیوی آپ کو بلاتا۔“

پراوین آیا تھا۔ میں جوتے پہن کر اس کے ساتھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ سیتا دیوی باہر ہوگی مگر وہ دروازے کے اندر تھی۔ اس نے مجھے اندر بلایا۔ اس نے شال لپیٹ رکھی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس نے تصدیق بھی کر دی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا نہیں بنا سکوں گی۔“ اس نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں ہم باہر سے ناشتا منگوا لیتے ہیں کیا آپ کا بیٹا لادے گا؟“

”ہاں... آں۔“ اس نے مشکل سے کہا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اچانک وہ لہرائی اور اس سے پہلے وہ گرتی میں نے اسے تھام لیا۔

”سیتا دیوی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ مگر وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ میں نے

اسے بازوؤں میں اٹھالیا اور پراوین سے پوچھا۔ ”بیٹا آپ کی ماما کی طبیعت خراب ہے۔ ان کا کمر کہاں ہے؟“

وہ ماں کی حالت دیکھ کر پریشان تھا۔ ”اوپر ہے۔“

”مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا اور اس کی رہنمائی میں سڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ سیتا دیکھنے میں مناسب جسامت کی لگتی تھی لیکن اس کا وزن اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اس کا بیڈروم خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ بیڈروم بل تھا، فرش پر قالین بچھا تھا۔ ایک طرف شیشم کی ڈریسنگ اور الماری تھی۔ میں نے اسے بیڈر لٹا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے ٹھیک کی۔ نبض ست مگر خطرے کی بات نہیں تھی۔ اس نے یقیناً رات والے واقعے کی مینشن لی تھی اور اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ جب تک میں نے اس کا معائنہ کیا پراوین نے اپنے ماموں کو کال کر دی۔ کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ واپس چلا جاؤں۔ پراوین کو اپنی ماں کا خیال رکھنے کا کہہ کر میں نیچے آیا اور دروازے سے باہر نکلا تھا کہ ٹھیک گیا۔ سامنے ارون موجود تھا۔ وہ گورے چنے رنگ کا مگر مکر وہ صورت شخص تھا۔ ممکن ہے اس کے کروتات اتنے سیاہ نہ ہوتے تو وہ خوب صورت لگتا۔ اس نے چھتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم کون ہو اور اندر کیا کر رہے تھے؟“

”میں یہاں بے انگ گیسٹ ہوں، ناشتے کا کہنے گیا تھا مگر بچے نے بتایا کہ سیتا دیوی کی طبیعت خراب ہے۔“

”اچھا طبیعت خراب ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”رات ایسا کیا کیا؟“

”تم کون ہو؟“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے فضول کی باتیں کیوں کر رہے ہو جب کہ میں تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں۔“

”بہتر ہے مجھے جان لو، میں ارون کمار ہوں۔“

”ایک اور کمار۔“ میں نے زیر لب کہا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”سچ سچ کے کمار ہو یا بنے ہوئے ہو؟“

وہ سڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور میرے قریب آکر اچکنے کی کوشش کی۔ اس کا قد مجھ سے چار انچ کم تھا اس لیے کوشش کے باوجود وہ میرے چہرے کے سامنے نہ آسکا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا نام پیدائش سے ارون کمار ہے۔“

”او کے مسٹر ارون کمار، اگر تم یہاں رہائش کے

ارادے سے آئے ہو تو یہاں کا واحد کمرہ میں لے چکا ہوں۔“

”کمرہ۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ پورا گھر میرا ہے۔ میں سیتا کا پتی ہوں۔“

”ریٹلی میں نے سنا ہے تم مر چکے ہو، آئی مین سیتا دیوی بیوہ ہے تو اس کا شوہر مر چکا ہے۔“

”اس نے بکواس کی ہے، ہر ایک سے جھوٹ بولتی ہے۔ کسی سے کہتی ہے بیوہ ہے اور کسی کو ڈائیورس کا بتاتی ہے۔“

”یہ تمہارا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے ڈاکٹر گپتا کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ درحقیقت میں اسی لیے اس گھٹیا آدمی سے باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر آجائے ورنہ بے اندر کھس جاتا اور نہ جانے وہ کس ارادے سے آیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا اسے دیکھ کر تیزی سے آگے آیا اور اس نے نفرت سے کہا۔

”تم... اب یہاں کیوں آیا ہے؟“

”یہ میرا گھر ہے۔“ ارون نے ڈھٹائی سے کہا۔

”مجھ سے بھی اس نے یہی کہا ہے۔“ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”سیتا دیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ شاید بے ہوش ہو گئی۔“

”تم سے بعد میں بات کرتا ہے۔“ ڈاکٹر گپتا نے کہا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ اندر سے بند کر گیا تھا۔ کیونکہ ارون نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو ناکام رہا۔ میں مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا پیچھے سے میں نے ارون کو دبی زبان میں گالیاں دیتے سنا نہ جانے اس کا ہدف کون تھا۔ سب سراپا انتظار تھے۔ میرے نہیں ناشتے کے کیونکہ رات کا کھانا ہضم ہو چکا تھا۔ میں نے اطلاع دی۔

”فی الحال صبر کیونکہ سیتا دیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر گپتا اسے دیکھنے آیا ہے۔ وہ ٹھیک ہوگی تو پراوین ہمیں باہر سے ناشتا لادے گا۔“

بیو کا منہ لٹک گیا۔ ”باہر کا ناشتا... ڈبل روٹی اور مکھن۔“

”حلوہ پوری بھی مل سکتی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”بہت دن ہو گئے کھائے ہوئے۔“

”ہم کو بھی حلوہ پوری کھائے بہت دن ہو گئے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم لوگ دن رات باہر سے کھاتے

تھے تو حلوہ پوری کیسے نہیں کھائی ہوگی؟“

بیو جھینپ گیا۔ ”آنے سے بس ایک دن پہلے کھایا تھا۔ سفیر بھائی لایا تھا نہیں سے، بہت مزے کا تھا۔“

”یعنی صرف تین دن پہلے اور ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے ایک سال سے حلوہ پوری نہیں کھائی۔“

”آپ نے آخری بار کب کھایا تھا؟“

”جب یہاں سے نکلے تھے۔ شملہ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔“

بیو ہنسا۔ ”یعنی تین دن ہوا ہے۔“

اس بار میں جھینپ گیا۔ ”مٹھے تم سچ سچ تیز ہو گئے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں سرحد پار چین بھیج دیا جائے۔“

”ہم چین نہیں جائے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا ہے ہم آپ کے پاس رہے گا۔“

کچھ دیر وقت گزاری کر کے میں باہر آیا۔ ارون کمار جا چکا تھا۔ گھر والا دروازہ کھلا اور پراوین باہر آیا۔ ”اب آپ کی ماما کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ ٹھیک ہیں، ماموں نے انجکشن لگایا تھا۔ ماما ہوش میں آ گئیں انہوں نے کہا ہے آپ کے لیے ناشتا لے کر آؤں۔ مجھے پیسے بھی دیئے ہیں۔“ اس نے پانچ سو کا نوٹ دکھایا۔ ”آپ بتائیں کیا کیا لاؤں؟“

”یہاں شہد والا ایک اور حلوہ پوری بھاجتی ملتی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بہت اچھی ملتی ہے۔“

”بس تو چالیس پوریاں لے لیما۔ اگر حلوہ الگ سے ملتا ہو تو لیما اور شہد والے کیک لے آنا۔ تعداد تم خود دیکھ لیما اور چائے کافی کا کیا ہوگا۔“

”چائے میں بناؤں گا۔ ماما نے مجھے بنانا سکھائی ہے کافی نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے چائے چلے گی اب فنانٹ لے آؤ۔“

وہ چلا گیا تو میں برآمدے میں پیچھی کین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں چار کرسیوں اور میز کا سیٹ تھا۔ اندر سے بھی مکان بہت اچھا اور اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ مجھے لگا کہ ارون کمار مکان کی ملکیت کے بارے میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر مکان سیتا دیوی کے نام پر تھا تب بھی یہ اسی نے بنایا ہوگا۔ ڈاکٹر گپتا اور اس کے بھائی کی اتنی اوقات نہیں لگ رہی تھی کہ وہ بہن کو جہیز میں اتنا شاندار مکان دے سکتے۔ علیحدگی کی وجہ تو رات کو ہی سامنے آ گئی تھی۔ ارون کمار ایک اوباش اور بد فطرت شخص تھا۔ کوئی بھی عورت شوہر کی یہ

فرخندہ لودھی

1938ء میں پیدا ہوئیں۔ اردو و پنجابی

زبان کی ادیبہ و شاعرہ۔ ہوشیار پور میں حق نواز خاں کے ہاں پیدا ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج برائے خواتین ساہیوال سے بی اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے کتاب داری کے فن میں ڈپلوما حاصل کیا۔ 1963ء میں اردو ادب میں ایم اے اور 1979ء میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ جنگ ستمبر 1965ء کے موضوع پر کہانی ”پارتی“ لکھ کر ادبی دنیا میں متعارف ہوئیں۔ 1969ء میں پہلا ناول ”حسرت عرض تمنا“ شائع ہوا۔

دیگر تصانیف میں یہ شامل ہیں۔ (1) شہر کے لوگ (کہانیاں) (2) خوابوں کے کھیت (کہانیاں) (3) رومان کی موت (4) آرسی (5) چنے دے اوہلے (پنجابی کہانیاں) (6) ہر دے وچ تریڑاں (پنجابی کہانیاں) (7) زنانی دے روپ (مقالہ) (8) نقل حرفی ٹیکنیکی مقالہ (9) بہادر شہزادہ (بچوں کی طبع زاد کہانیاں) (10) پیار کا پیچھی (کہانیاں) تراجم ان کے علاوہ ہیں۔ وہ متعدد ادبی تنظیموں کی رکن ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی چیف لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ چنے دے اوہلے پر 1982ء میں انہیں راشٹرز گلڈ ایوارڈ ملا۔

مرسلہ: فہمیدہ فیاض، ساہیوال

تھا۔ ناشتے کے بعد پراوین برتن لینے آیا اس نے کہا۔ ”اما آپ کو کافی پر بلا رہی ہیں۔“ شاید وہ اس طرح شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“ پراوین کے جانے کے بعد بیٹو معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”سیتا دیوی آپ پر مہربان لگتا ہے۔“ میں نے بیٹو کو بتایا کہ اس کی طبیعت خراب تھی اس حالت میں بھی میں نے اس کی مدد کی وہ اسی کا شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔ اس وضاحت پر بیٹو کے چہرے پر مزید شرارت بھرے تاثرات نمودار ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے

مارچ 2014ء

ہاتے۔ ”یہ میرا فرض تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے آپ کو ابھی آرام کرنا چاہیے۔“

”نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں، بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ بھیا نے انجکشن دیا تو اب ٹھیک ہے۔ لائیے چائے میں لے چلوں۔“

”میں لے جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اجازت دیجئے ناشا کرنا ہے۔“

”جی.... جی ہاں۔“ اس نے کہا۔ میں چائے لے کر آیا تو وہ تینوں آدھا ناشا صاف کر چکے تھے۔ مجھے بچے کچھے پر گزار کرنا پڑا، پیٹ بھرا نہیں تھا بس گزارا ہو گیا تھا۔ اس دوران میں آئی کن اور راج کنور انجکشن کے اثر سے نکل آئے تھے اور بیٹو نے اب انہیں پستول کی مدد سے قابو کیا ہوا تھا۔ راج کنور پرسکون تھا لیکن آئی کن کا تشویش سے برا حال تھا۔ وہ بار بار خوفزدہ نظروں سے بیٹو کے برابر میں رکھے پستول کو یوں دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی جاندار چیز ہو اور موقع پاتے ہی اس پر حملہ کر دے گی۔ البتہ ناشتے میں اس نے اپنی تشویش کو ذرا بھی آڑے آنے نہیں دیا تھا۔ ناشتے کے بعد چائے نوشی کے دوران اس نے التجا کی۔

”صاحب ہم کو جانے دو.... میرا بیوی بچہ پریشان ہو گا۔“

”فکرمات کرو تم کو جانے دیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ابھی ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں تمہاری خدمت کا پورا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“

اس نے دہشت زدہ نظروں سے پستول کی طرف دیکھا۔ ”صاحب تم ہم کو گولی تو نہیں مارو گے۔“

میں نے نظروں میں بیٹو کو اشارہ کیا اور اس نے پستول اپنے لباس میں چھپا لیا۔ ”ہم بلا وجہ کسی کو نقصان پہنچانے والے لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا بدترین دشمن ہے لیکن یہ ہمارے ساتھ زندہ ہے اور اس سے پوچھو میں نے کتنی بار اس کی جان بچائی ہے اور کتنی بار میں اسے مار سکتا تھا لیکن نہیں مارا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ راج کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم فکرمات کرو تم کو کچھ نہیں ہوگا۔“

آئی کن کی مزید تسلی کے لیے میں نے اسے اس کا مزید تین دن کا معاوضہ بھی دیا تھا۔ نوٹ پا کر وہ خوش ہو گیا

ماہنامہ سرگزشت

حد تک بھرنے تک میں ہم نہیں رہیں۔ اب اس پرسکون پرارون کمار نامی شیطان آگیا تھا۔ میں ڈاکٹر گپتا سے بات کر رہا تھا کہ پراوین ناشتے کا سامان اٹھا کر لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”انگل میں ابھی سب ٹرائی میں رکھ کر رہا ہوں۔“

”بیٹے آپ اکیلے سب کر لو گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ دس سال کا بچہ تھا۔

”جی انگل کر لوں گا۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ کام کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ڈاکٹر گپتا کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں یا سیتا دیوی کو اعتراض نہ ہو۔“

”نہیں.... نہیں تم اچھا آدمی ہے، تم اندر بھی جاسکتا ہے۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب جاتا ہے کھینک کا ٹائم ہو گیا ہے۔“

میں پراوین کے ساتھ کچن میں آیا۔ یہ جدید امریکن طرز کا کچن تھا۔ میں نے چائے کا پانی چڑھایا اور پراوین حلوہ پوری پاٹ پاٹ میں رکھنے لگا۔ بھاجی اور چنے کا سامان اس نے ڈونگوں میں نکالا۔ ہنی کیک ٹرے میں رکھے اور پھر سارا سامان ٹرائی میں رکھا۔ بیٹو اور باقی دونوں بھی بھوک سے بیتاب تھے۔ میں نے پراوین سے کہا۔ ”یہ آپ لے جاؤ جب تک چائے تیار ہوتی ہے۔ مجھے کیتلی دے دو۔“

اس نے کیتلی دی اور ٹرائی لے کر چلا گیا۔ چائے تیار ہوئی تو میں نے اسے کیتلی میں ڈالا۔ ملک اور شوگر پاٹ موجود تھے۔ سارا سامان ٹرے میں رکھ کر میں جانے کو تیار ہوا تھا کہ اوپر سے سیتا نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر چونکی۔ ”ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”سوری آپ کی اجازت کے بغیر آپ کا کچن استعمال کیا۔“ میں نے معذرت کی۔

”میں اس کی بات نہیں کر رہی آپ چائے خود کیوں بنا رہے ہیں؟“

”پراوین بچہ ہے، مجھے اچھا نہیں لگا سارا بوجھ اس پر ڈال دوں۔ خاص طور سے گرم چائے ہینڈل کرنا اس کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا اس لیے چائے میں نے خود بنا لی۔“

سیتا کی حالت بہتر تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی بحال ہو گئی تھی اور وہ چاق چو بند نظر آ رہی تھی۔ ”میں آپ کی شکر گزار ہوں اگر آپ نہ ہوتے تو بچے بہت پریشان ہو

مارچ 2014ء

حکمتیں برداشت نہیں کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر گپتا اندر سے برآمد ہوا اور میرے پاس آگیا۔ ”کھینک یو، تم نے سیتا کا مدد کیا۔ ابھی مجھے بتایا اس نے اور پراوین نے۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ شخص رات کو بھی یہاں آیا تھا اور نشے میں دھت تھا۔“

”ارون۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”اس نے سیتا کا زندگی تباہ کر دیا.... اپن اور سمجھنا بہت سمجھایا پر سیتا نہیں مانتا.... اس پرارون کا بھوت سوار تھا۔“

”لو میرج۔“

”ہاں وہ دلی میں پڑھتی تھی، ادھر رہی ساری عمر.... اپنی موسی کے پاس پھر موسی کا انتقال ہوا تو ادھر آگیا۔ ادھر آکر اس کا ملاقات ارون سے ہوا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ سیتا بالکل سیدھا.... ایک دم بدھو.... شہر میں رہا پڑا ابھی چالاک نہیں تھا۔ اس نے ارون سے شادی بنایا اور پھر پچھتاہیا۔“

”ڈاکٹر کب ہوئی؟“

”ابھی سال پہلے.... عدالت سے لیا.... یہ مکان اور خرچ بھی ملا۔ پرارون نے خرچ بند کر دیا اور اب تنگ کرتا ہے۔“

”کیوں تنگ کرتا ہے؟“

”بس بلا وجہ یہاں آتا ہے سیتا اور بچوں سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ کورٹ اسے دور رہنے کا کہا ہے پر یہ آ جاتا ہے۔“

”یہ مکان اسی نے سیتا دیوی کو دیا تھا؟“

ڈاکٹر گپتا نے سر ہلایا۔ ”عدالت کے آرڈر سے سیتا اور بچوں کو ملاوڑ اس حرامی نے کچھ نہیں دیا۔“

ڈاکٹر گپتا کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ لوگ ارون کمار سے ڈرتے تھے۔ وہ اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”تم لوگ کورٹ کیوں نہیں جاتے۔“

”سیتا تیار نہیں ہے۔ ارون نے اسے دھمکی دی ہے اگر وہ کورٹ گئی تو وہ بچے کڈ نیپ کر کے لے جائے گا۔ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔“

مجھے سیتا اور اس کے بچوں سے ہمدردی تھی لیکن میں ان کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاملے میں اتنی دل چسپی لینے کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ارون کمار ہمارے لیے کس حد تک خطرہ بن سکتا تھا۔ یہ جگہ فی الحال پرسکون پناہ گاہ ثابت ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ بیٹو کا زخم مناسب

ماہنامہ سرگزشت

وہ کچھ کہتا میں نے کہا۔ ”لگتا ہے مئے سفیر کی صحبت نے تم پر اثر ڈالا ہے۔“

سفیر کے نام پر اس نے برا سامنا بنایا۔ ”ہم سفیر بھائی جیسا نہیں ہے۔“

”تب باتیں اس جیسی کیوں کر رہے ہو؟“

بیٹو کے زخم کو تقریباً اڑتیس گھنٹے گزر گئے تھے اور اب تکلیف ایسی نہیں تھی کہ اسے پین ٹکڑ لیتا پڑتی۔ معمولی تکلیف تھی جسے وہ برداشت کر رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی اس طرح وہ جلدی عادی ہو جاتا کیونکہ زخم مکمل طور پر بھرنے میں ایک ہفتہ دس دن لگ سکتا تھا۔ راج کنور ہوش میں آگیا تھا میں نے پوچھا۔ ”تمہیں یاد ہے گزشتہ دو دن میں کیا کیا ہوا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”سب یاد ہے، بس اس وقت میرا ذہن قابو میں نہیں تھا۔ یہ اس دوا کا اثر ہے نا جو تم انجکشن سے دیتے ہو؟“

”ہاں یہ قوت ارادی کو ختم کر دیتی ہے۔“

”میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری بات پر عمل کرتا رہا۔“

”راج تم جانتے تھے کہ سادی ہمارے پاس ہے؟“

”میں بتا تو چکا ہوں۔“

”تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اسے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے؟“

”ہاں لیکن دوسرے معاملات میں الجھ کر مجھے موقع نہیں ملا۔“

”وہ تمہاری سگی بہن ہے۔“

”وہ میری بہن تھی، اب وہ میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔“

”یعنی تمہیں اب بھی موقع ملے گا تو تم اسے قتل کر دو گے؟“

اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، کم سے کم اس وقت میرا یہی خیال ہے۔ آگے کا مجھے نہیں معلوم۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تم نے اچھا کیا جو کھل کر بات کر لی اب میں ذرا کھل کر بات کروں گا۔ بڑے کنور نے سادی کو پاکستان سے اغوا کر لیا ہے۔“

راج کنور چونکا۔ ”لیکن کیوں؟ اس کا ارادہ سا دھنا کو چھیڑنے کا نہیں تھا۔“

”یہ درست ہے، اس نے مجھے مجبور کر کے یہ کام کیا ہے اور دو دن پہلے شام کے وقت سادی یہاں تک آئی ہے۔ میں نے خود اسے کنور پیلس کے ہنگامے پر لے کر دیکھا ہے۔“

راج کنور ذرا بے چین ہو گیا۔ ”تمہیں یقین ہے؟“

”میں سادی کو واپس لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہارے اور سنگاری کے توسط سے بڑے کنور کو علم ہو گیا ہے کہ میں واپس آگیا ہوں۔“

”میں نے کچھ نہیں بتایا، میں دوا کے زیر اثر تھا بڑے کنور نے ڈوریاں ہلائی اور ابجیسی والے مجھے اس کے آدمیوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ سنگاری سے انہوں نے تمہارے بارے میں معلوم کر لیا ہوگا۔“

”راج کنور تم جانتے ہو میں دشمن کو بھی بے وجہ صرف اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لیے مارنے کا قائل نہیں ہوں لیکن میں منافقانہ انہماک پجاری بھی نہیں ہوں۔ مجھے محسوس ہوگا کہ اگر تم آئندہ میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے خطرہ بنو گے تو میں مار دوں گا۔ اب تک میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لیے رکھے ہوئے ہوں، کئی بار تمہاری جان میری وجہ سے بچی ہے۔ یہ سب اس لیے کہ شاید کبھی تم میرے کام آ جاؤ۔ اب تمہارے پاس چار گھنٹے کا وقت ہے تم سوچ لو کہ تم کس طرح میری مدد کر سکتے ہو اور مجھے قائل کر لو دوسری صورت میں۔“

”تم مجھے مار دو گے؟“ راج کنور نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

میرے بجائے بیٹو نے جواب دیا۔ اس نے پستول نکال کر اسے راج کنور کی طرف کیا اور یوں پستول سے نشانہ لینے لگا جیسے فرضی مشق کر رہا ہو مگر اس کی حرکت راج کنور کو سمجھانے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارے پاس چار گھنٹے ہیں۔“

ان دونوں کو انجکشن نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے پاس ایک ہی سیٹ رہ گیا تھا۔ دوسرے انجکشن بھی تھے لیکن ڈاکٹر امرتسر کے مطابق وہ زیادہ موثر نہیں تھے اس لیے اب میں کچھ وقت گزار کر ضرورت کے وقت انہیں انجکشن دیتا تب تک یہ گن پوائنٹ پر بھی رکھے جاسکتے تھے۔ میں جانے لگا تو آئی کن نے کہا۔ ”صاحب آپ اجازت اور موبائل دو تو میں اپنی بیوی کو بتا دوں۔“

”تم بتا چکے ہو وہ اتنی جلدی پریشان نہیں ہوگی۔“

اس نے لجاجت سے کہا۔ ”صاحب وہ پریکٹس ہے، صاحب تھوڑی بات بات کروں گا۔“

اس بار میں نے اسے موبائل دے دیا اور خبردار کیا۔ ”کوئی ایسی سیدھی بات مت کرنا ورنہ تمہارا بچہ یتیم پیدا ہوگا۔“

”ہم نہیں کرے گا۔“ اس نے کہا اور اپنی بیوی کو کال کرنے لگا۔ اس نے دو منٹ بعد کی اور اس دوران میں کوئی مشکوک بات نہیں کی۔ بات کر کے اس نے موبائل مجھے واپس کر دیا۔ ”آپ کا بہت شکریہ صاحب۔“

میں بیٹو کو ہوشیار رہنے کا کہہ کر باہر آیا اور کال ٹیل بجائی۔ ایک منٹ بعد سیتا کی بیٹی نے دروازہ کھولا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی۔ نقوش میں ماں پر گئی تھی اور رنگ باپ کی طرح بہت گورا تھا۔ میں اندر آیا تو سیتا اوپر سے نیچے آ رہی تھی۔ وہ مجھے کچن میں لے آئی۔ ”تھینک یو کہ آپ نے میری دعوت قبول کی؟“

”شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ کافی مجھے بہت پسند ہے۔“

”میں جان گئی ہوں۔“ اس نے کہا اور کافی تیار کرنے لگی۔ یہ نیس کیف گولڈ تھی۔ اس کی میک اپ اور ڈانقہ دونوں لا جواب ہیں۔ سیتا نے ساڑی بدل لی تھی صبح وہ سادہ ساڑی میں تھی لیکن اس وقت اس نے دھنک رنگ ریشمی ساڑی پہن لی تھی۔ سیاہ رنگ کے بلاؤز میں اس کا سنہری رنگ دمک رہا تھا۔ وہ اپنے لیے بھی کافی تیار کر کے لائی تھی۔ اس نے مگ میرے سامنے رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ ”آپ ارون کمار سے مل چکے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کیسے مجھے تنگ کر رہا ہے۔“

اس کی بات پر میں محتاط ہو گیا۔ ”جی اور مجھے افسوس ہے کہ آپ مشکل میں ہیں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عذاب سے کیسے بچوں؟... ارون یہاں کا طاقتور اور دولت مند شخص ہے۔ اس کے پاس بد معاشوں کا ایک ٹولہ ہے۔ قصبے کے عام لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور پولیس اس کی دولت کی وجہ سے اس کے پیچھے دم ہلاتی ہے۔ میں کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ میرے بھائی شریف لوگ ہیں۔ ان میں بد معاشوں سے لڑنے کی سکت نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ اس مکان کے چکر میں ہے کسی

طرح اسے آپ سے واپس حاصل کر لے۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”بالکل یہی بات ہے، آپ نے کیسے جانا؟“

”جب آپ بے ہوش ہوئی تھیں اور میں آپ کو بیڈ روم تک پہنچا کر واپس جا رہا تھا تب میرا اس سے سامنا ہوا تھا اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا۔“

”بالکل یہی بات ہے، اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے اس کے باوجود اس سے برداشت نہیں ہو رہا کہ یہ مکان میرے اور بچوں کے پاس رہے۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ میں مکان اس کے حوالے کر دوں تو وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن یہ مکان میرے بچوں کا مستقبل ہے۔“

”آپ کے بچوں کا مستقبل آپ ہیں اور یہ جگہ زیادہ بڑی نہیں ہے آپ چاہتی ہیں کہ ان کا مستقبل بنے تو انہیں یہاں سے لے جائیں اور یہ مکان سیل کر دیں۔“

”میں دہلی میں رہی ہوں، وہاں میری موسیٰ تھیں۔ ماما جی کے مرنے کے بعد انہوں نے میری پرورش کی پھر ان کا بھی دیہانت ہو گیا تو میں یہاں آنے پر مجبور ہوئی اور ارون کے چکر میں پھنس گئی۔“

”غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ آپ اس غلطی کو اس طرح ٹھیک کر سکتی ہیں کہ واپس دہلی چلی جائیں اور وہاں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں، آپ پڑھی لکھی ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دہلی یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہی تھی جب موسیٰ کا دیہانت ہوا۔ ماسٹر ادھورا چھوڑ کر یہاں آنا پڑا تھا۔“

”آپ واپس جا کر ماسٹر مکمل کر سکتی ہیں۔ دہلی بڑا شہر ہے وہاں مواقع زیادہ ہیں۔ یہاں تو آپ کو جاب بھی نہیں ملے گی۔ بے انگ گیسٹ سے تو کام نہیں چلتا ہوگا۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”یہی بات ہے، میرے پاس واحد چیز یہ مکان ہے۔ میں اسے سیل کرنا چاہتی ہوں لیکن ارون کے ڈر سے کوئی لینے کو تیار نہیں ہے۔“

”آپ کسی اسٹیٹ والے کی مدد حاصل کریں وہ بکوا سکتے ہیں ان کو زیادہ کمیشن کا لالچ دیں۔“

”یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کئی گاہک آئے اور لینے کو بھی تیار ہو گئے مگر ارون نے انہیں بھگا دیا۔ اب تو وہ ایک اور چکر میں ہے۔“ کہتے ہوئے سیتا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے مشکل سے کہا۔ ”وہ میرے چکر میں ہے۔“

میں نے انجان بن کر کہا۔ ”لیکن آپ کو ڈائیورس دے چکا ہے۔“
”وہ تھرڈ کلاس شخص ہے اس کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ سیتا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ عزت بے عزتی کا مطلب ہی نہیں سمجھتا ہے۔ سب کو اپنی طرح سمجھتا ہے۔“

میں ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیتا مجھے یہ سب کیوں بتا رہی تھی۔ کیا وہ صرف دل کی بات کر رہی تھی یا پھر مجھ سے کسی قسم کی مدد طلب کر رہی تھی۔ میں قبل از وقت کوئی تاثر دے کر غلط فہمی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے مناسب ردِ عمل دیتے ہوئے کافی کی چکیاں لیتا رہا۔ سیتا کے بچے پراوین اور سوہیتا اسکول میں پڑھ رہے تھے، اس کی گزر اوقات بے انگ گیسٹ اور بھائیوں کی مدد سے ہوتی تھی۔ وہ خود ملازمت کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں کوئی ملازمت بھی ہی نہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ بچے کے پورے حصے کو ہوٹل میں بدل دے۔ لیکن اس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اصل مسئلہ ارون کمار تھا وہ چاہتی تھی کہ کسی صورت اس سے نجات مل جائے۔

اس نے کھل کر نہیں کہا لیکن اس کی باتوں سے ایسا تاثر آیا جیسے وہ ارون سے جانے چھڑانے میں کسی کی مدد چاہتی ہو کیونکہ پولیس ارون کی مٹھی میں تھی اور دوبارہ عدالت تک جانے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ ارون کا دباؤ بھی تھا۔ مگر وہ مکان بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے مسئلے یہی تھے اور اسی لیے میں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔ جس طرح اس نے اپنی بات کی تھی اسی طرح میں نے بھی کھل کر کہے بغیر اپنی بات کہہ دی کہ میں خود بہت مشکل میں تھا اور اسی وجہ سے عارضی طور پر یہاں رکھا ہوا تھا۔ میں کسی چکر میں پڑنے کا محتمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سیتا کا چہرہ مجھ سا گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ نہ جانے کیا بات تھی جو اس نے مجھ سے مدد کی توقع کی تھی۔ وہ اچھے مزاج کی عورت تھی۔ اگر اس کے کردار میں خرابی ہوتی تو وہ ارون کی بات نہ مان لیتی۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کسی اور نقطہ نظر سے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں اور میرے ساتھی شاید ایک یا دو دن اور یہاں رکیں گے پھر ہمیں جانا ہوگا۔ جب تک ہم یہاں ہیں کوئی آپ کو یا آپ کے بچوں کو تنگ نہیں کر سکے گا۔ اس سے آگے کا میں کہہ نہیں سکتا۔“

میری اس بات سے اس کے چہرے پر کسی قدر اطمینان آیا تھا۔ میں کافی کا شکر یہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہج نے گھر کو بہت صاف ستھرا اور قریب سے رکھا تھا۔ باغ بھی پر بھرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی اچھی خاصی مالیت تھی۔ یہ تقریباً نصف کنال رقبہ پر تھا۔ پہاڑی قصبہ ہونے کے باوجود یہاں ہر سہولت تھی۔ اس علاقے میں ہر گھر خوب صورت اور بڑا تھا۔ یہ امر آ کی آبادی تھی۔ ممکن ہے یہاں بہت سارے گھر میدانی علاقوں میں رہنے والے امرا کے ہو سکتے تھے جو گرمیاں گزارنے یہاں آتے ہوں گے۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ سامنے سڑک سے بہت کم لوگ یا گاڑیاں گزرتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں واپس آیا تو بیٹو ادنگھ رہا تھا۔ وہ رات سے جاگ رہا تھا مگر ادنگھتے ہوئے بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”تم سو جاؤ۔“

بیٹو نے مشورے پر عمل کیا اور لیٹ کر کچھ ہی دیر میں خراٹے لینے لگا۔ دوپہر میں وہ کچھ دیر کے لیے اٹھا جب سیتا نے سوٹ ڈش بھیجی تھی جو خوبانی، سیب اور شہوت ملا کر بنائی گئی تھی اور بہت مزے کی تھی۔ پراوین نے بتایا کہ یہ اس کی ماما کی طرف سے تھی یعنی اس کا کوئی چارج نہیں لیا جائے گا۔ رات کے کھانے کا میں نے ملاقات میں ہی بتا دیا تھا اور رقم بھی دے دی تھی۔ دوپہر کا کھانا گول کرنے کا مقصد ہماری یہاں موجودگی کو کم سے کم ظاہر کرنا تھا۔ مگر اس کے باوجود آمدورفت کم نہیں ہوئی تھی۔ کمراباہر کی طرف تھا اور سڑک پر آتے جاتے لوگ یہ آسانی برآمدے تک دیکھ سکتے تھے۔ مجھے خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اب سیتا سے ملاقات ہوئی تو میں اس سے درخواست کروں کہ ایسے تمام کاموں کے لیے گھر کے اندر کھلنے والا دروازہ استعمال کرے۔ بے شک صرف مخصوص وقت کے لیے کھولے اور پھر بند کر لے۔

میرا مقصد تھا کہ سامنے کی طرف سے آنا جانا کم سے کم ہو۔ ہم خود دن میں صرف دو بار باتھ روم جاتے تھے۔ ایک صبح سویرے اور دوسرے سورج غروب ہونے کے بعد یہ دونوں وقت ایسے تھے جب سڑک پر اور آس پاس لوگ کم نظر آتے تھے۔ پراوین شام کی چائے لایا تو میں نے اس کے توسط سے سیتا کو پیغام بھجوا دیا۔ راج کنور سارا دن خاموش پڑا رہا تھا۔ چائے نوشی کے دوران اس نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”شہباز تم کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا

نہیں اندازہ نہیں ہے تمہارے گرد خطرات گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔“
”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر میں فی الحال یہاں رکنے پر مجبور ہوں۔“
”اس کی وجہ سے؟“ راج کنور نے بیٹو کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی وجہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے دوپہر میں تمہیں وقت دیا تھا اور اس سے زیادہ ہی وقت گزر گیا ہے۔“

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تمہاری مدد کیسے کروں کیونکہ میں بیس کی حد تک تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔ وہاں اب میرا کوئی وفادار نہیں رہا ہے۔“

”تب تم میرے لیے بیکار ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم مدد نہیں کر سکتے تو بیکار کے بوجھ ہو، تم سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی مناسب ہو گا۔“

”ہم بھی یہی کہہ رہا ہے ادھر سے نکلے ہی اسے کسی کھائی میں ڈالو۔“ بیٹو نے مشورہ دیا۔

”میرا خیال ہے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“
راج کنور دہشت زدہ ہو گیا۔ اس سے زیادہ آئی کن خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”صاحب میرا تصور نہیں ہے۔“

”تم نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن اگر تم نے ہمارے بارے میں زبان کھولی تو پھر ہم تمہارے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ مشکل نہیں ہے تمہارے ڈرائیونگ لائسنس پر پتا دیکھ لیا ہے اگر تم کہیں اور رہتے ہو تب بھی تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہمیں خود نہیں آنا پڑے گا صرف چند ہزار خرچ ہوں گے اور کرائے کے قاتل آکر تم سمیت تمہارے پورے گھر کا خاتمہ کر دیں گے۔“

آئی کن کا چہرہ سفید پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”بدھا کا سوگند میں کسی سے کچھ نہیں کہے گا صاحب۔“

”اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“
شام سات بجے ڈاکٹر گپتا خود آ گیا تھا۔ اس نے بیٹو کی پٹی ہٹائی تو زخم کی حالت دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ اس نے

کہا۔ ”مزید ٹریٹ منٹ کا ضرورت نہیں ہے بس اوپر سے پٹی رکھ کر ٹیپ کرنا ہوگا زخم کو گزرتہ لگے۔“
”دوا کب تک کھانی ہے؟“
”ابھی پورا ہفتہ کھانی ہے۔ میں نے تین دن کی دلی تھی۔“

”باقی چار دن کی اور دے دو۔“ بیٹو نے کہا۔ ”اب پین کمر نہیں کھانا۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، جوان آدمی ہے تھوڑا درد برداشت کر لے گا۔“ ڈاکٹر گپتا نے اپنے بیگ سے اینٹی بائیونک کپسول کا ایک پتا اور نکال کر دیا۔ وہ ضروری دوا میں ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے کچھ خشک پٹیاں اور میڈیکوٹیپ کا ایک رول بھی دیا۔ میں نے رکھ لیا کہ بعد میں کبھی کام آئے گا۔ میں نے ڈاکٹر سے زخم صاف کرنے والا محلول اور خشک کرنے والا پاؤڈر بھی لیا۔ وہ حیران تھا کہ میں بلاوجہ یہ سب کیوں لے رہا ہوں مگر اس نے انکار نہیں کیا میں اسے قیمت دے رہا تھا۔ یہ اچھی خبر تھی کہ بیٹو کا زخم تیزی سے بھر رہا تھا۔ اب کوئی امیر جیسی ہوتی تو ہم کل ہی یہاں سے جاسکتے تھے ورنہ میرا ارادہ پرسوں تک نکلنے کا تھا۔ اس شام بھی موسم ابر آلود تھا اور نو بجتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ آج گزشتہ روز کی نسبت تیز بارش تھی اور بادل بھی گرج رہے تھے۔ تیز ہواؤں کا شور الگ ماحول پر حاوی ہو گیا تھا۔ آٹھ بجے کھانے اور چائے کے بعد سب ادنگھ رہے تھے۔

سیتا نے ہمیں رات کا کھانا اندر والے دروازے سے فراہم کیا تھا۔ وہیں سے ٹرائی لائی اور برتن واپس لے گئی۔ سامنے سے آنا جانا نہیں ہوا تھا۔ سیتا نے کہا کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو اسی دروازے پر ناک کر کے مانگ لیا کریں۔ وہ معاوضہ لے رہی تھی مگر اسے پوری طرح حلال بھی کر رہی تھی۔ کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔ چائے کافی دونوں لا جواب بناتی تھی۔ دوپہر میں ٹیٹھا بھی بہترین تھا۔ وہ یقیناً بہت محنت سے کھانا بناتی تھی۔ برتن اعلیٰ درجے کے اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔ ہمیں تو ہوٹل سے زیادہ یہاں آرام تھا۔ بے شک ایک کمرے میں چار افراد تھے لیکن اس میں بھی کوئی مشکل نہیں تھی۔ فرش بردیز اور آرام دہ... قالین تھا۔ صاف ستھرے گاؤں کیے اور مکمل تھے۔ مسلسل آرام، بہترین علاج اور خوراک سے بیٹو کی توانائی بھی بحال ہو گئی تھی۔ اس نے شام سے دایاں ہاتھ ہلانے اور اس سے کام لینے کی مشق شروع کر دی تھی۔ میں نے اسے بھاری

چیزیں اٹھانے سے منع کیا تھا ورنہ وہ شاید یہ کام بھی شروع کر دیتا۔ میگزین نکال کر وہ خالی پستول سے مشق کر رہا تھا اور جان بوجھ کر راج کنور کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف پستول کر کے ٹریگر دباتا اور اس کی جان پر بن آتی تھی۔

دس بجے میں باہر آیا اور آئی کن کی جیب میں قبضے کا ایک راؤنڈ لگا کر آیا۔ مقصد ذرا جسم کھولنا اور جیب کی بیٹری کو رنگ کنڈیشن میں رکھنا تھا۔ اس دوران میں بارش جاری تھی مگر لینڈ کروزر کے بہترین ٹائر سڑک پر گرپ کر رہے تھے اور مجھے ہلکی رفتار سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ جیب کا ٹینک دو تہائی بھرا ہوا تھا اور پیچھے بھی ایک دس لیٹر کا گین رکھا تھا۔ میں واپس آیا تو کسی قدر جھجک گیا تھا۔ جیکٹ پیراشوٹ کی تھی اس لیے پانی اندر نہیں گیا بس بال اور چہرہ بھیگا تھا۔ بیوقوف منہ تھا اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”آپ کہاں گیا تھا؟“

”جیب لے کر نکلا تھا۔ کیوں کیا ہوا؟“

”شوہن ابھی اندر سے تھوڑا آواز آیا جیسے کچھ گرا ہو۔ پھر بچہ بھی چلا یا تھا۔“

”ہو سکتا ہے بچے کو چوٹ لگی ہو؟“

”نہیں شوہن اس کے بعد بالکل خاموشی ہے بچہ روتا تو سیتا دیوی کچھ کہتا پر ایسا لگ رہا ہے سب سو گیا ہے۔“

میرا سیتا کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اگر اس کے گھر میں کچھ ہوا تھا اور بات پولیس تک جاتی تو ہم بھی اس کی پلیٹ میں آسکتے تھے پولیس کے ہاتھ نہ بھی آتے تو تب بھی ہمیں بھاگنا پڑتا اور اس کے بعد سکون ختم ہو جاتا۔ بیٹو کا شک نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا اگر سیتا کے گھر میں کچھ غلط ہوا تو جلد یا بدیر ہم بھی اس میں ملوث ہو جاتے۔ میں نے درمیانی دروازہ چیک کیا وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا۔ ”دروازہ اندر سے بند ہے۔“

وہ چونک گیا۔ ”شوہن سیتا دیوی نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا۔ یہ کس نے بند کیا؟“

اس کا ممکنہ جواب یہ تھا کہ اندر آنے والے یا والوں نے یہ دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ ہماری طرف سے مداخلت کا خدشہ نہ رہے۔ ”تم نہیں رکو اور ہوشیار رہو۔“ میں نے بیٹو سے کہا اور باہر نکل آیا۔

میں نے پہلے داخلی دروازے سے سن گن لی مگر اس

طرف سنا تھا۔ تالے کے سوراخ سے اندر لاؤنچ میں تیار کی نظر آ رہی تھی۔ جب کہ عام طور سے یہاں روشنی ہوتی تھی۔ میں گھوم کر اور برآمدے سے اتر کر مکان کے بائیں طرف آیا۔ یہاں لاؤنچ اور بچن کی کھڑکیاں تھیں ان سے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر شور تھا اس لیے اگر اندر کچھ آوازیں ہو رہی تھیں تو وہ اس شور میں باہر سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں پیچھے کی طرف آیا یہاں بچن کا دروازہ تھا اور اس کے ساتھ نشست گاہ کی کھڑکی تھی۔ نشست گاہ کے ساتھ ہی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ عجبی دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ میں کھڑکیاں بھی چیک کر رہا تھا۔ ان پر گرل نہیں تھی اس لیے اگر کوئی کھڑکی کھلی ہوتی تو میں اندر جا سکتا تھا۔ لاؤنچ اور بچن والی کھڑکیاں بند تھیں مگر جب نشست گاہ والی کھڑکی چیک کی تو اس کا ایک پٹ کھلا پایا۔ اسے اندر سے کھٹکا نہیں لگایا تھا۔ شاید کسی بچے نے کھول دیا تھا اور پردے کی وجہ سے پتا نہیں چلا کہ کھٹکا کھلا ہے۔ میں نے آہستہ سے پٹ اندر دھکیلا اور ساتھ ہی پردہ پیچھے کیا۔ کوشش کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ اندر جا سکوں۔

میرے جوتے مٹی اور کچھ زرد ہو رہے تھے اور میرے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ سیتا کے قالین کا حشر ہو رہا تھا۔ میں نے اندر آ کر کھڑکی بند کی اور دبے قدموں لاؤنچ کی طرف آیا۔ نشست گاہ کا دروازہ اوپن تھا اور پردے کے طور پر موتیوں کی جھال لگی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاط سے کونے سے جھال ہٹا کر لاؤنچ میں قدم رکھا۔ اندر آنے کے بعد باہر کا شور بہت کم سنائی دے رہا تھا اور میرے کان مکان میں ہونے والی کسی آہٹ پر مرکوز تھے لیکن اب تک سنا تھا ہی تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں بیٹو نے غلط تو نہیں سن لیا تھا اور میں بلاوجہ یہاں کھس آیا تھا۔ اگر سیتا یا اس کا کوئی بچہ مجھے یہاں دیکھ لیتا تو میں مشکل میں پڑتا یا نہ پڑتا لیکن میری ساکھ ضرور خراب ہو جاتی میں مشکوک بن جاتا۔

میں سوچتا رہا پھر میں نے جوتے اتارے اور دبے قدموں اوپر کی طرف بڑھا۔ پیچھے میں دیکھ چکا تھا کہ کوئی نہیں ہے یہاں چھپنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور بہت آہستگی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ یہ لکڑی کی تھیں اور زیادہ زور سے وزن ڈالنے پر جرجراتیں۔ میں ابھی نصف سیڑھیوں پر تھا کہ مجھے اوپر سے کھٹی ہوئی نسوانی آواز آئی جیسے کسی کا منہ بند ہوا اور وہ ناک سے آواز نکالے۔ اوپر دو بیڈرومز تھے ایک سیتا کا تھا اور

دوسرا یقیناً بچوں کا تھا۔ باتھ روم کا من تھا یہ اس باتھ روم کے اوپر تھا جسے نیچے ہم استعمال کرتے تھے۔ دونوں بیڈرومز ساتھ ساتھ تھے۔ سیڑھیاں گھوم کر جا رہی تھیں اور یہ لاؤنچ میں داخلی حصے کے عین اوپر نکلتیں۔ جہاں سے سیڑھیاں گھوم رہی تھیں وہاں سے بیڈرومز کے دروازے نظر آ رہے تھے اور اگر وہاں کوئی ہوتا تو مجھے دیکھ لیتا اس لیے میں جھک کر نظروں سے بچتا ہوا اوپر آیا اور پھر کونے سے اوپر جھانکا مگر دونوں کمروں کے دروازے بند تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں اوپر آیا اور سیتا کے کمرے کے دروازے سے کان لگائے۔ چند لمحوں سنا رہا پھر دبی ہوئی مردانہ آواز آئی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے لیکن لہجہ نشیلا تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے ہینڈل گھمایا دروازہ کھلا تھا کیونکہ آزاد ہوتے ہی وہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے پستول آگے کیا اور یک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ارون بیڈ کے پاس کھڑا تھا اور نہایت شرمناک حالت میں تھا۔ سیتا بستر سے بندھی تھی اور حالت اس کی بھی اچھی نہیں تھی۔ ارون نے مجھے دیکھتے ہی منہ کھولنا چاہا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر پستول کی نال اس کے کھلے منہ میں رکھ دی۔ غالباً میرے تاثرات بھی خونخوار نہ تھے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور پھر اچانک وہ لہرا کر نیچے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اگر وہ دھوکا دے رہا تھا تو میں دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے نہایت بے دردی سے اس کے سر پر وار کیا اور وہ اب سو فیصد بے ہوش تھا۔ اس سے مطمئن ہو کر میں سیتا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ساڑی اور بلاؤز غائب تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک مختصر سا بٹنی کوٹ اور انڈر گارمنٹ تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اس کا منہ کھولا اور پھر اس کے ہاتھ آزاد کیے۔

”میں اسے باہر لے جا رہا ہوں تم اپنا حلیہ درست کر کے آؤ، ویسے تم ٹھیک ہونا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے بچے۔۔۔“

”میں دیکھتا ہوں ویسے ان کو ہاتھ چلے تو اچھا ہے۔“

ارون کے کپڑے وہیں بکھرے ہوئے تھے میں نے اس کے کپڑے اس پر ڈالے اور اسے ٹانگ سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں نے یہ مشکل اسے پتلون پہنائی۔ یہ بھی صرف پتھر پوشی کے لیے۔ اتنی دیر میں سیتا کپڑے پہن کر آگئی تھی۔ اس نے نفرت سے ارون کو دیکھا اور پھر اس پر تھوک

دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ اکیلا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، میں سو رہی تھی۔ مجھے کسی بچے کے چلانے کی آواز آئی۔ میں باہر نکلی اور سیڑھیوں سے نیچے آئی تھی کہ اس نے ڈرائنگ روم سے نکل کر میرے منہ پر کچھ رکھا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو میں بستر پر بندھی تھی۔۔۔“ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کس حالت میں تھی۔

”تم بچوں کو دیکھو کہیں وہ بھی بے ہوش نہ ہوں۔“

وہ جلدی سے بچوں کے کمرے کی طرف لپکی۔ فوراً ہی اس کی آواز آئی وہ بیٹے اور بیٹی کو پکار رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”پلیز انہیں دیکھو یہ جاگ نہیں رہے۔“

میں بچوں کے کمرے میں آیا۔ دونوں بچے گہری بے ہوشی میں تھے ان کے سانس اور دل کی دھڑکن ذرا سست تھی مگر خطرے کی علامت نہیں تھی۔ ان کے منہ سے کلوروفارم کی بو آ رہی تھی۔ ارون نے کلوروفارم استعمال کیا تھا۔ مجھے خیال آیا میں نے سیتا سے پوچھا۔ ”یہ بے ہوش ہیں پھر تم اتنی جلدی کیسے ہوش میں آگئیں۔ میرا خیال ہے یہ سب آدمے گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہوا۔“

سیتا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”مجھے ہوش میں آتے ہوئے کھٹی سی بو کا احساس ہوا تھا۔“

میں اس کے کمرے میں آیا۔ سیتا میرے پیچھے تھی۔ میری تجسس نگاہیں دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”کیا تلاش کر رہے ہیں؟“

”ہے۔۔۔“ میں نے ڈرینگ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی بوتل اٹھائی یہ مشعل سے تین انچ لمبی اور انچ بھر قطر کی تھی میں نے ڈھکن ہٹا کر سوگھا اور امونیا کی تیز کھٹی بو نے تصدیق کر دی۔ ”یہ امونیا ہے وہ تمہیں اس کی مدد سے ہوش میں لایا تھا۔ اب میں اسے لے جا رہا ہوں اور تم بچوں کو ہوش میں لاؤ اور اگر انہیں متلی کی شکایت ہو تو کرنے دینا۔ پانی پلاتا، پھر یہ بوتل مجھے نیچے لا دینا۔“

”آپ اسے کہاں لے جا رہے ہیں، پولیس کو دینے؟“

میں رک گیا۔ ”سیتا میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ اگر تم اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتی ہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ بے ہوش ہے اور میں اسی وقت اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ اس نے بیٹابی سے کہا۔ ”پلیز

آپ نہ جائیں.... مجھے معلوم ہے پولیس اسے چھوڑ دے گی اور یہ دوبارہ آجائے گا۔“

”یہ اندر کیسے آیا؟ کیا تم نے گھر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں کی تھیں؟ میں خود نشست گاہ کی کھلی رہ جانے والی کھڑکی سے آیا ہوں لیکن یہ وہاں سے نہیں آیا ہے۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”میں باہر گیا تھا۔ میرے ساتھی نے تمہارے بچے کی چیخ سنی تھی۔“

”میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر آپ نہ بچاتے تو آج میں خود کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔“

”بچانے والا اوپر بیٹھا ہے۔“ میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ”تم بچوں کو دیکھو میں اسے لے جا رہا ہوں بچوں کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ وہ بچے ہیں بعد میں کسی اور کے سامنے بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”میں خیال رکھوں گی۔“ اس نے کہا۔ میں نے ارون کو بغلوں سے پکڑ کر اٹھایا حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ اسے اوپر سے دھکا دے دوں یا ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جاؤں۔ مجھے کسی کو قتل کرنے والے سے اتنی نفرت محسوس نہیں ہوتی جتنی کسی عورت سے زیادتی کرنے والے سے ہوتی ہے۔ ارون کو مردہ کتے کی طرح کھینچتا ہوا میں.... اسے لاؤنج میں کھٹنے والے دروازے سے اندر لایا۔ بیٹو بے تاب سے میرا منتظر تھا۔ اس نے بے ہوش ارون کو دیکھ کر پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”سیتا دیوی کا سابق شوہر نامدار.... اسی کے چکر میں آیا تھا، کلوروفارم سوکھا کر سب کو بے ہوش کر دیا تھا مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ میں نے ارون کو رسی سے باندھتے ہوئے کہا۔ رسی بیٹو سامان کے ساتھ لایا تھا۔ راج کنور نے مسکرا کر کہا۔

”ایک بوجھ اور اٹھا لائے اب اسے بھی لیے لیے پھرو گے۔“

”نہیں جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو تمہارے ساتھ اس کا بھی فیصلہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ارون کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے اور پھر اس کے منہ پر مضبوط میڈیکو ٹیپ لگا دیا۔ بیٹو نے پوچھا۔

”سیتا دیوی، اس کا بچہ ٹھیک ہے؟“

”سیتا ٹھیک ہے اور وہ بچوں کو دیکھ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک منٹ میں اپنے جوتے آؤں۔“

میں لاؤنج میں آیا اور نشست گاہ کے پاس رکے جوتے اٹھائے تھے کہ اوپر سے سیتا نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے آئی۔ ”دونوں ہوش میں آگئے ہیں میں نے پانی پلایا تو ان کی حالت ٹھیک ہو گئی۔ میں یہ دیکھ آئی تھی۔“ اس نے امونیا کی بوتل مجھے تھما دی۔ ”ان کو کچھ دے سکتی ہوں؟“

”ہاں سیاہ چائے یا کافی دو اس سے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”میں بناتی ہوں آپ کے لیے بھی بناؤں؟“

”زحمت ہوگی ہم چار افراد ہیں۔“

”میرا خیال ہے باقی سو رہے ہوں گے آپ یہیں آکر پی لیں۔“

”نہیں وہ جاگ رہے ہیں۔“

”تب میں سب کے لیے بناتی ہوں لیکن آپ یہیں آئیے گا۔“

مجھے عجیب لگ رہا تھا، اگرچہ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ مجھے کوئی خاتون ٹکرائی اور میں نے کسی معاملے میں اس کی مدد نہ کی ہو مگر پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بیٹو میرے ساتھ تھا۔ وہ مجھ سے محبت اور مجھ پر اعتماد کرتا تھا مگر کسی کے ذہن میں سوچ آنے سے خود انسان بھی نہیں روک سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ ”نہیں مجھے ارون سے نمٹنا ہے تم وہیں لا دینا۔“

اس کا چہرہ ذرا بجھا تھا مگر میں توجہ دے بغیر واپس آ گیا۔ ارون کی ٹاک سے امونیا کی بوتل لگائی تو وہ فوراً کھلبلائے لگا اور چند سانس لینے کے بعد ہوش میں آ گیا۔ میں نے بوتل ہٹالی اور سرد لہجے میں کہا۔ ”تم میری آواز سن رہے ہو؟“

اس نے سر ہلایا اور خود کو ہلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ”تم بندھے ہوئے ہو۔ میں نے مطلع کیا۔“ یہ بتاؤ تم ہوش میں ہو؟“

اس بار اس نے ذرا دیر سے سر ہلایا۔ میں نے خبردار کیا۔ ”میں تمہارے منہ سے ٹیپ ہٹا رہا ہوں لیکن اگر کوئی غلط آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔“

اس نے سر ہلایا تو میں نے ٹیپ ہٹا دیا اور ساتھ ہی

خنجر نکال لیا، یہ بھی بیٹو نے لیا تھا۔ وہ دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ ایک کمزور عورت پر ظلم کی تیاری کرنے والا سورما پستول اپنے حلق میں موجود پا کر بے ہوش ہو گیا تھا، اس لیے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ شور مچا کر بے ہوش ہو گیا تھا، اس کی ٹھکی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن سے لگائی تو اس نے لرزنا شروع کر دیا اور ہٹلا کر بولا۔ ”مم... مجھے... معاف... کر... کر دو۔“

”تم مکان میں کیسے گھسے؟“ میں نے اس کی التجا نظر انداز کر کے خنجر کی نوک گردن میں گھسائی تو اس نے بلبلا کر کہا۔

”سو... سویتا سے کھلوایا... در... دروازہ...“

”اور پھر اسے بے ہوش کر دیا۔“ میں نے اس کی بات مکمل کی۔ ”تم سیتا سے اور کیا چاہتے ہو؟“

”میں... اپنا مکان واپس لینا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے اس کی عزت سے کھیلنا ضروری نہیں تھا۔“ میں نے خنجر کی نوک سے شغل جاری رکھا۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا تھا۔

”مجھے معاف کر دو، میں پاگل ہو گیا تھا۔“

میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا اور وہ خنجر کی نوک کے سامنے فر فر جواب دیتا رہا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے پاس اس علاقے میں خاصی جائیداد تھی۔ بینک بیلنس تھا اور اس نے جنگل کٹائی کے دو بڑے ٹھیکے لے رکھے تھے۔ یہاں وہ اکیلا آیا تھا اور اسی وجہ سے مارا گیا۔ اگر اس کے ساتھی ہوتے تو وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا لیکن اس کا خیال تھا کہ سیتا اس کے لیے ترنوالہ ہو گی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ یہاں ہے۔ اس کی گاڑی بھی مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں نے اس کے منہ پر دوبارہ ٹیپ لگایا۔ اس کی جیب سے پرس اور دوسری چیزیں میں پہلے ہی نکال چکا تھا، اس میں گاڑی کی چابیاں اور ایک جدید ترین آئی فون تھا۔ یہ میرے کام آ سکتا تھا۔ سیتا سب کے لیے چائے اور میرے لیے کافی بنا لائی تھی۔ کافی پی کر میں باہر آیا اور دو گلی پیچھے کھڑی ارون کی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ قصبے سے باہر نکل کر گاڑی ایک کھائی میں گرا دی اور پیدل واپس روانہ ہوا۔ گاڑی میں ایک چھتری اور برساتی موجود تھی، میں نے وہی استعمال کی اور بھیکے بغیر واپس پہنچ گیا۔ اس کام میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا مگر اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ارون یہاں موجود ہے۔

میں مکان میں داخل ہوا تو کسی کو برآمدے میں دیکھ کر رک گیا۔ لائٹ آف تھی لیکن ہیولا نظر آ رہا تھا۔ پہلے میں چوکیا ہوا مگر اندر داخل ہوتے ہی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ سیتا تھی۔ وہ اس سردی میں باہر موجود تھی۔ میں اوپر آیا تو اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”ارون کی گاڑی ٹھکانے لگانے گیا تھا۔ وہ یہاں ملتی تو اس کی گم شدگی کا شک تم پر جاتا۔“

”گم شدگی۔“ اس نے فکر مندی سے کہا پھر بولی۔ ”اندر چلیں یہاں بہت سردی ہے۔“

اس سے پہلے میں کچھ کہتا وہ بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”بچے ٹھیک ہیں اب؟“

”ہاں... شکر ہے انہیں کچھ نہیں ہوا، اب سو رہے ہیں۔ میں نیچے آئی تو آپ کے ساتھی نے بتایا آپ باہر گئے ہیں۔“

وہ کچن میں لے آئی۔ میں نے برساتی اتار دی تھی اور ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے کافی کا پانی رکھ دیا۔ اندر اتنی سردی نہیں تھی۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس نے کافی تیار کر کے سامنے رکھا۔ ”مجھے آپ کا نام نہیں معلوم۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کل تک میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”کیوں یہاں کوئی پریشانی ہے کیا؟“

”تم میرے بارے میں نہیں جانتیں، میں دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ اگر وہ یہاں آگئے تو مجھ سمیت سب کو قتل کر سکتے ہیں۔ ارون ان کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے وہ تمہارے ساتھ تمہارے بچوں کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ اس گھر کو آگ لگا سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی سفاک لوگ ہیں۔“

سیتا کا رنگ اڑ گیا۔ ”ہائے بھگوان... تو اتنے خطرناک لوگوں سے دشمنی کیوں کی؟“

”کون خوشی سے دشمنی کرتا ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”سیتا مجھے تم سے ہمدردی ہے تمہارے لیے میں جو زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ارون سے ہمیشہ کے لیے تمہاری جان چھڑا دوں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”امید ہے اس بات سے تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ

میں کس قسم کا آدمی ہوں اور میرے کتنے نزدیک آنا مناسب ہے۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر میرا بازو تھامتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ”آپ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”میں تمہیں حقیقت سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بیٹا تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے بہتر ہے کہ تم بھول جاؤ کہ یہاں کچھ لوگ آئے تھے تو وہ کون تھے اور انہوں نے کیا کیا۔ تم نے ہمیں کرائے پر کمر اور تین وقت کا کھانا دیا اور اس کے معاوضہ لیا۔ اس سے زیادہ تم ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں۔“

”پولیس اور ممکن ہے کچھ دوسرے لوگ بھی آئیں۔ اگر تم نے اس سے ہٹ کر کچھ اور کہا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گی اور میں یا کوئی اور تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“

اس نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ ”اب تم مجھے ڈرا رہے ہو ایسی کیا بات ہے آخر؟“

”یہ سب مت پوچھو۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ یہ جو تمہارے ساتھ دو آدمی اور ہیں۔“

”ان میں سے جو گورا ہے مقامی نقوش والا ہے۔ اسے تم ارون ثانی سمجھو دوسرا صرف ڈرائیور ہے۔ اسے میں چھوڑ دوں گا وہ دوبارہ نہیں آئے گا لیکن ارون اور یہ شخص دوبارہ آسکتے ہیں اس لیے علاج ضروری ہے۔“ میں جانے کے لیے پلٹا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ ”سنو تم ارون سے الگ ہو گئی ہو لیکن اس کی اولاد ہی اس کی وارث ہوگی کیا اس کا کوئی اور وارث بھی ہے؟“

”نہیں... اس دنیا میں اس کی ایک ماں اور ایک بھائی تھا دونوں مر چکے ہیں۔ بھائی کو اس نے خود مارا تھا۔ یہ پولیس کا شبہ ہے وہ گرفتار بھی ہوا تھا مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے رہا ہو گیا۔ ماں اس صدمے سے مر گئی۔“

”گویا یہ قاتل بھی ہے؟“

”ایک شخص کا نہیں۔“ بیٹا نے انکشاف کیا۔ ”ارون پر کئی افراد کے قتل کا شبہ ہے، ان میں جنگل سے لکڑی کاٹنے والے مزدوروں کا لیڈر مدن موہن بھی شامل ہے۔ کسی نے اس کے گھر میں گھس کر اسے اور اس کی بیوی دونوں کو کھپاڑی سے قتل کر دیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ مدن کی ارون سے

دشمنی تھی کیونکہ وہ مزدوروں کی مزدوری کم دیتا ہے اور لکڑی چوری کرتا ہے۔“

”گویا اس شخص کا وجود اس دھرتی پر بوجھ ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اگر یہ نہ رہے تو اس کی ساری دولت و جائیداد اس کے بچوں کو ملے گی؟“

”ہاں اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے۔“ بیٹا بولی۔

”کانی کا شکریہ۔“ میں نے کہا اور اندر والے دروازے کے بجائے باہر کے دروازے سے واپس کمرے میں آیا۔ بیٹو ہوشیار تھا۔ وہ سارا دن سولیا تھا اس لیے اسے نیند کی اتنی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے بیٹو کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور سونے کے لیے اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ گرم کبل میں نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے بیٹو سے کہا تھا کہ مجھے صبح چار بجے اٹھادے لیکن اس نے پانچ بجے اٹھایا اور جہاں لیٹے ہوئے بولا۔

”شوہن اب نیند برداشت نہیں ہوتا ہم سو جاتا۔“

”تم نے چار بجے اٹھانا تھا۔“ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”بس دو منٹ اور جاگ لو میں واش روم سے آتا ہوں۔“

واش روم سے آکر میں نے بیٹو کو سونے کی اجازت دے دی۔ راج کنور اور آئی کن سور ہے تھے حتیٰ کہ ارون بھی کروٹ کے بل پڑا سو رہا تھا حالانکہ وہ خاصے مشکل پوز میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے سر کی ضرب والی جگہ کا درم خاصا کم ہو گیا تھا۔ میں نے لپ ٹاپ نکالا اور اسکا پ سے سفیر کو کال کی۔ وہ سورہا تھا اور کسی قدر دیر سے کال ریسپونڈی۔ وہ جہاں لیٹے کر بولا۔ ”یہ تو ہے میری نیند کے دشمن نمبر دو۔“

”اول نمبر موت کا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہاں غائب تھا بڑی مشکل سے خود کو کال کرنے سے روکا ہوا تھا۔“

”اچھا کیا... یہاں معاملات جوں کے توں ہیں۔“

”بتاؤ بڑے بھیا نے رابطے کی کوشش تو نہیں کی؟“

”بہت... اس کے ذرائع وسیع ہیں۔ اس نے راجا عمر دراز سے رابطہ کر لیا تھا مگر اس نے بھی ہمارے بارے میں لاعلمی ظاہر کی ہے۔“

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتابے تاب ہے۔“

”اسے معلوم ہو گیا ہے کہ تو وہ ہیں ہے اس نے کہا تو اس سے جلد رابطہ کر لے کیونکہ تیری تلاش جاری ہے اور اگر تو کسی مشکل میں پڑ گیا تو وہ بھی تیری مدد نہیں کر سکے گا۔“

میں سمجھ رہا تھا، مشکل میں پڑنے سے بڑے کنور کی کیا مراد تھی، یقیناً بھارتی ایجنسیاں اور خاص طور سے راجا عمر دراز کی تلاش میں تھی۔ اگر میں ان کے ہاتھ آجاتا تو بڑا کنور بھی مجھے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے مجھے دھمکا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس نے سادی کے حوالے سے کوئی بات کی۔“

”نہیں لیکن راجا عمر دراز سے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہے اور اگر اس کا شوہر اس سے بات کرنا چاہے تو پیلس کے نمبر پر کال کر کے کر سکتا ہے۔“

”وسیم کا کیا تو عمل ہے؟“

”اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔“

”یہ اس نے اچھا کیا۔“ میں نے کہا اور مختصر اے یہاں کے احوال سے آگاہ کیا۔ ”مئے کی حالت بہتر ہے زخم تقریباً بھر گیا ہے بس کوئی بھاری کام نہیں کر سکتا ہے۔“

”تو نے اچھا کیا جو ٹھکانا تلاش کر لیا۔ راجا نے ایک مشورہ دیا ہے؟“

”راتا سے مدد حاصل کرنے کا؟“

”تو سمجھ گیا... ہاں اس نے یہی مشورہ دیا ہے۔“

”فی الحال میں نے اس کا نہیں سوچا ہے لیکن اگر مجبوری ہوگی اور کوئی راستہ نہ نکلا تو راتا سے بھی مدد مانگ سکتے ہیں۔ وہ منع نہیں کرتا ہے لیکن اس کا انداز خاصا لیا دیا سا ہوتا ہے جیسے وہ میرے معاملے میں ذاتی طور پر شامل نہیں ہونا چاہتا ہے۔“

”وہ راجا عمر دراز کا دوست ہے۔“

”یار اول تو یہ دوستی ہماری دوستی جیسی نہیں ہے اور اس بات کو نصف صدی سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ ظاہر ہے اب ان کے تعلق میں وہ گہرائی نہیں ہوگی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں لیکن رانا ویاس اس کے لیے اپنی پوزیشن خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ اس نے اپنی عمر گزاری ہے اب اس کی اولادیں ہیں۔ اس کے بھائی کی اولادیں ہیں۔ ان کا وقت ہے اور رانا ویاس کی کسی حرکت کی سزا انہیں ملے گی۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہے گا۔“

سفیر کی حد تک قائل ہوا۔ ”کہہ تو تو ٹھیک رہا ہے۔“

”اسی لیے میں اس سے رابطہ کرنے سے ہچکچاتا رہا تھا۔ اب بھی جب تک مجبور نہ ہوں میرا اس سے رابطے کا ارادہ نہیں ہے۔“

”اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”میں یہاں سے نکل کر سوچوں گا۔ میں ایک آبادی میں ہوں اور راج میرے پاس ہے۔ میں اس کے خلاف کھل کر کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ اسے کسی ویرانے میں لے جاؤں گا۔“

”تو بلاوجہ اسے اٹھائے گھوم رہا ہے، کہیں ٹھکانے لگا دے۔“

”یہ کام تو کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اس سے مجھے کچھ معلوم ہوگا۔ وہ کنور پیلس کے مالکوں میں سے ہے اور وہاں کے رازوں کے بارے میں جانتا ہو گا۔ کامیابی کے لیے اس کی زبان کھلوانا لازمی ہے۔“

”ٹھیک ہے یار اور رابطہ کرتا رہا کر... ہم لوگ ٹیشن میں پڑ جاتے ہیں۔“

”میں رابطہ رکھوں گا۔“ میں نے کہا اور اسکا پ سے لاگ آف ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس علاقے کے بارے میں کچھ سرچنگ کرتا رہا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انٹر نیٹ اس قدر کارآمد چیز ثابت ہوگا۔ دو دن کے آرام سے نہ صرف ذہنی اور جسمانی تھکن اتر گئی تھی بلکہ میرے ذہن میں ایک خاکہ بھی واضح ہونے لگا تھا۔ بیٹو کی وجہ سے میں نے میٹا سے ناشتا نو بجے لانے کو کہا تا کہ وہ کچھ دیر اور سو لے۔ ارون اور باقی سب صبح جاگ گئے تھے۔ جب ناشتے کا وقت آیا تو میں نے بیٹو کو جگا دیا۔ وہ چار گھنٹے سو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ واش روم سے فارغ ہو کر سب نے ناشتا کیا سوائے ارون کے۔ وہ بے بسی سے بندھا ہوا ہمیں کھاتے پیتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال اسے بھوکا پیاسا رکھنا تھا۔ راج کنور نے اس کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن میری جھڑکی کھا کر چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے بیٹو سے کہا۔ ”میرے ساتھ باہر چلو تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”یہ لوگ...“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

میں نے اسلحے اور سامان کا بیگ اٹھا لیا۔ ”یہ یہیں رہیں گے تم یہ لپ ٹاپ والا بیگ اٹھا لو۔“ میں نے بیٹو سے کہا اور پھر راج کنور کو خبردار کیا۔ ”ہم سامنے موجود ہیں کوئی احتیاط نہ حرکت مت کرنا۔“

”میں کچھ نہیں کروں گا۔“

میں بیٹو کو باغ میں لایا اور بولا۔ ”بیٹو کنور پیلس کے عقب میں موجود علاقہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔“

”ہاتھ کا لکیر کی طرح۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”ہمارا سارا بچپن ادھر ہی گزرا ہے۔“

”اگر ہم وہاں چھپنا چاہیں تو کوئی مناسب جگہ ملے گی جو کنور پبلس سے زیادہ دور بھی نہ ہو؟“

”بہت جگہ ہے، ادھر ہمارا گھر بھی ہوتا تھا اور غار بھی ہوتا جہاں ہم ٹھہرتا تھا۔“

”گھر تو ختم کر دیئے گئے ہوں گے، غار مناسب رہیں گے۔“

”ادھر ایک غار ہے جدھر ہم بھائیوں کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ ہمارا غار تھا اور اوپر ہے، اس لیے کوئی اور نہیں جاتا تھا۔ وہ ہم کو یاد ہے۔“

”مشکل تو نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آنے جانے اور فرار ہونے کے لحاظ سے۔“

”اس لحاظ سے تو اچھا ہے شوبی.... اس کا ایک راستہ پیچھے بھی نکلتا ہے۔ مگر وہ چھوٹا ہے، جب ہم بچہ تھا تو آسانی سے نکل جاتا تھا ایک بار بابو جی نے پکڑ لیا اور بہت مارا کیونکہ ادھر پہاڑی بہت خطرناک تھا پھر اس نے راستہ بند کر دیا پر وہ کھولا جاسکتا ہے۔ شوبی کیا ارادہ ہے؟“

”ہمیں یہاں سے نکلتا ہو گا۔ میں راج کنور سے سکون سے پوچھ چکے کرنا چاہتا ہوں۔“

”ان دو کا کیا کرنا ہے؟“

”سیتا کے شوہر کو کسی کھائی میں پھینکنا ہے اور آئی کن کو انجکشن لگا کر چھوڑ دیں گے۔“

”شوبی اس کا گاڑی بہت اچھا ہے ایسا کرو آپ اسے خرید لو۔“

بیو کی بات سے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ارون کا پرس نکال کر دیکھا اس میں ایک ڈبیٹ کارڈ اور ایک کریڈٹ کارڈ بھی تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے ادا ہوگی ارون سے کرائی جائے۔“

بیو خوش ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا۔“

ہم اندر آئے، میں نے ارون کو انجکشن دیا اس نے مزاحمت کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں اسے خطرناک انجکشن دے رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ پرسکون ہو گیا اور مخصوص انداز میں پلکیں جھپکاتے لگانے لگا۔ اسے کھولنے سے پہلے میں نے آزمائش کے لیے کچھ سوالات کیے اور اس نے فر فر جواب دیئے خاص طور سے مزدور لیڈر اور اس کی بیوی کے قتل کے اعتراف سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پوری

طرح دوا کے زیر اثر آ گیا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اسے پانی پینے کو دیا۔ پانی پی کر اس نے بھوک کی شکایت کی۔ میں نے تسلی دی۔ ”ہم باہر جا رہے ہیں تم کو کھانے کو ملے گا۔“

میں نے سامان والا بیگ خالی کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم باہر آئے۔ میں نے اسے آئی کن کی گاڑی کی پچھلی نشست پر لیٹنے اور سر نیچے رکھنے کو کہا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے جیب اشارت کر کے آگے بڑھائی اور اس سے پوچھا۔ ”تمہارا اکاؤنٹ کس بینک میں ہے؟“

اس نے بینک کا نام بتایا۔ اکاؤنٹ کرنٹ تھا اور وہ اسے ٹی ایم سے لامحدود مقدار میں رقم نکالوا سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے اصل میں دو اکاؤنٹس تھے، ایک میں گیارہ لاکھ پچھتر ہزار کی رقم تھی اور دوسرے میں سترہ لاکھ پچاس ہزار سے اوپر رقم تھی۔ مجھے حیرت ہوئی وہ جس حیثیت کا آدمی تھا یہ رقم خاصی کم تھی۔ میں نے مزید سوالات کیے تو اس نے انکشاف کیا کہ اصل رقم تو اس کے گھر کی تجوری میں تھی۔ اس کی مالیت ایک کروڑ روپے سے اوپر تھی اور یہ ساری رقم ڈالرز اور یورو میں تھی۔ اس سے زیادہ مالیت کا سونا اور جواہرات تھے۔ اس کا گھر اسی قصبے میں سڑک کے دوسری طرف تھا اور میرا اس طرف جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے نیچے پینچنے سے پہلے بیگ تھما کر جیب سے اتار دیا۔ ”اب تم پیدل بینک تک جاؤ گے اور اسے ٹی ایم سے بھٹی رقم نکالوا سکتے ہو وہ نکالوا کر اس بینک میں ڈال لو گے۔ دونوں اکاؤنٹس سے نکالو۔ اگر ایک بینک کے اسے ٹی ایم سے رقم نہ نکلے تو دوسرے اور پھر اس سے آگے والے سے ٹرائی کرنا اس کے بعد رقم لے کر واپس یہیں آنا بینک میں کسی صورت نہیں جاؤ گے، سمجھ گئے؟“

اس نے سر ہلایا اور جیب سے اتر کر پیدل روانہ ہو گیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے خاص طور سے اس کا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا تاکہ بینک جانا پڑے تو وہ مشکوک نظر نہ آئے۔ بینک والے عام طور سے اسے ٹی ایم میں بیس پچیس لاکھ سے زیادہ رقم نہیں رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا مگر اس قصبے میں مرکزی سڑک پر مجھے کئی بینک نظر آئے تھے۔ یہ قصبہ یقیناً آس پاس کی کاروباری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ میں نے جیب ایک جگہ روک دی جہاں سے ارون پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ پہلے اس بینک کے اسے ٹی ایم میں داخل ہوا جہاں اس کا اکاؤنٹ تھا۔ انڈیا میں ہزار سے زیادہ کا

بٹ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ارون کو خاصی کرنسی ملتی اور اسے ایسے ہی بیگ میں بھرنا پڑتی کیونکہ نوٹ گڈی کی صورت میں بھی نہیں ہوتے۔ ساری رقم کھلی ملتی۔ وہ تقریباً دس منٹ بعد اسے ٹی ایم سے نکلا اور واپس پیچھے ایک بینک کے اسے ٹی ایم تک آیا یہاں اسے زیادہ وقت لگا تھا شاید دوسرا بینک ہونے کی وجہ سے اسے ٹی ایم پروسیس میں زیادہ وقت لے رہا تھا بہر حال وہ چندر منٹ بعد وہاں سے بھی نکل آیا۔

پہلے اسے ٹی ایم سے نکلنے وقت بیگ ہلکا تھا مگر اب وہ واضح بھاری ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ساری رقم نکالوا لی تھی مگر وہ تیسرے بینک کے اسے ٹی ایم کی طرف بڑھا۔ یہاں اسے دس منٹ لگے اور جب وہ باہر آیا تو بیگ مشکل سے اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے واپسی اس جگہ کا رخ کیا جہاں میں نے اسے اتارا تھا۔ وہ اپنی دھن میں میرے پاس سے گزر گیا۔ میں جیب تک آیا اور اشارت کر کے اسے ارون کے پیچھے لایا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ انجکشن اتنے کمال کے نکلیں گے۔ گلی میں داخل ہونے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا اور جیب لے جا کر ارون کے پاس روکی۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہری اپ اندر آ جاؤ۔ پہلے کی طرح لیٹ جاؤ اور بیگ نیچے رکھ لو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے جیب آگے بڑھا دی۔ جیب سیتا کے گھر کے سامنے روک کر میں نے پھر آس پاس دیکھا اور کسی کو نہ پا کر ارون کو بیگ سمیت اندر جانے کا حکم دیا۔ میں جیب لگا کر اندر آیا تو ارون کمرے میں بیگ سمیت موجود تھا۔ بیو اسے اکیلے آتے دیکھ کر کسی قدر پریشان ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”ہم تو ڈر گیا تھا۔“

”فکرمات کرو یہ پوری طرح قابو میں ہے۔“ میں نے بیگ لے کر اسے قالمین پر الٹ دیا اور اندر بھرے کرنسی نوٹ بھر گئے تھے۔ یہ ہزار اور پانچ سو کے کرنسی نوٹ تھے جب کہ سو والے نوٹ بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے ارون، آئی کن اور راج کنور کو لگا دیا کہ وہ نوٹ الگ کر کے سب کی سو سو والی گڈیاں بنائیں۔ پھر میں نے درمیانی دروازے سے لاؤنج میں جھانکا سیتا کچن میں تھی۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔ ”مجھے چھوٹے ربر بینڈز کی ضرورت ہے تمہارے پاس ہیں؟“

”دیکھتی ہوں ورنہ پراوین سے منگوادیتی ہوں۔“

”پلیز ضرورت ہے۔“

”چائے کافی....؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے لیے کافی باقی کے لیے چائے۔“

وہ میرے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔ ”ارون کہاں ہے؟“

”نہیں ہے۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ”لیکن تم فکرمات کرو وہ پوری طرح میرے قابو میں ہے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے، تم نے اسے آزاد کر دیا تو وہ پھر میرے لیے مصیبت بن جائے گا۔“

”تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔“ میں نے کہا۔

سیتا نے پراوین کو بلا کر اس سے ربر بینڈز کا پوچھا تو اس نے پوری تھیلی لادی۔ اس میں کئی سو اچھی کوالٹی کے چھوٹے ربر بینڈز تھے جیسے مجھے درکار تھے۔ پراوین کے جانے کے بعد میں نے سیتا سے کہا۔ ”چائے کافی خود لے کر آنا پراوین کو مت بھیجنا۔“

”میں سمجھتی ہوں وہاں ارون ہے۔“

”ہاں لیکن ایک وجہ اور بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب تم آؤ گی تو دیکھ لو گی۔“

میں واپس آیا اور ربر بینڈز ان کے حوالے کیے۔ وہ نوٹوں کی گڈیاں بنا کر ان پر ربر بینڈز چڑھانے لگے۔ اسی طریقے سے نوٹ سمٹ کر رہ سکتے تھے۔ ارون پوری رقم نکالوا لیا تھا اور یہ انتیس لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ زیادہ نوٹ ہزار اور پانچ سو کے تھے اس لیے کام جلد ختم ہو گیا۔ جب تک سیتا چائے اور کافی لے کر آئی نصف نوٹ گڈیوں کی صورت میں آچکے تھے۔ سیتا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں لیکن میں نے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے منع کیا اور وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ٹی بڑیک کے بعد ان تینوں نے باقی کام نمٹایا۔ اب ہزار کے نوٹوں کی سولہ گڈیاں تھیں اور کچھ نوٹ الگ سے تھے۔ پانچ سو والی چوبیس گڈیاں تھیں اور کچھ نوٹ الگ سے بچ رہے تھے جب کہ سو والی دس گڈیاں تھیں۔ گڈیوں کی صورت میں کل انتیس لاکھ روپے کی رقم آئی تھی۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ ”میں تمہاری گاڑی خریدنا چاہ رہا ہوں۔ کتنے میں سودا کرو گے؟“

وہ حیران ہوا تھا۔ ”تم جیب کیوں خرید رہا ہے؟“

”مجھے ضرورت ہے تم اس سے اچھی لے لیتا۔“

وہ ہچکچایا۔ ”یہ دو ہزار پانچ کا ماڈل ہے میں نے ایک سال پہلے بیس لاکھ میں لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے اس میں سے بیس لاکھ لے لو۔“ میں نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔
اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تم بیس لاکھ دے رہو؟“

”ہاں تو اور کیا کہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن خیال رہے، اگر تم یہاں سے جانے کے بعد پولیس کے پاس دوڑے گئے تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

”اس صورت میں تم آزاد ہو گے اپنی جان بچانے کے لیے جو چاہے بیان دو مگر اس سے پہلے تم نے زبان گھولی تو وہی ہوگا جو میں نے کہا تھا۔ کوئی کرائے کا قاتل آکر تمہیں تمہارے بیوی بچے سمیت مٹا دے گا۔ اگر منظور ہے تو رقم لے لو۔“

آئی کن نے سوچا اور پھر ڈھیر سے بیس لاکھ کی گڈیاں الگ کرنے لگا۔ البتہ میرے کہنے پر اس نے سوا اور پانچ سو والی گڈیاں لے لی تھیں۔ اب صرف نو گڈیاں بچی تھیں۔ آئی کن نے اپنی رقم بیک میں ڈال لی۔ میں باقی رقم لے کر بیٹا کے پاس آیا۔ اس وقت وہ بچوں کو کھانا دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے اکیلے میں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ نشست گاہ میں لے آئی۔ میں نے اسے نوا لاکھ کی رقم دی تو وہ حیران رہ گئی۔ ”یہ کہاں سے آئی.... مجھے کیوں دے رہے ہیں؟“

”یہ اردن کی رقم ہے..... کیسے حاصل کی اس چکر میں مت پڑو لیکن میرا خیال ہے اس پر تمہارا اور تمہارے بچوں کا حق ہے۔ پھر تمہیں اپنے بچوں کے وراثتی حق کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہوگی۔“

”لیکن یہ بہت بڑی رقم ہے۔“
”نوا لاکھ روپے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اردن کی دولت میں سے یہ کچھ بھی نہیں ہے، وہ کروڑ پتی ہے۔ زمین جائیداد کے علاوہ کروڑوں تو صرف نقدی اور سونا و دیگر قیمتی اشیاء کی صورت میں ہیں اس کے پاس۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک اجنبی میرے لیے اتنا کچھ کرے گا۔“ وہ کہتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔
”تم نے ان چند دنوں میں میرا اور میرے ساتھیوں

کا خیال رکھا اور ہم پر اعتماد کیا، یوں سمجھ لو کہ یہ اس کا شکر کیا ہے میں نے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ایک مشورہ ہے اگر تم مانو، اردن سے چھٹکارے کے بعد یہاں سے چلی جاؤ۔ اردن کے اور ساتھی اور رشتے دار ہوں گے وہ تمہارے لیے مشکل پیدا کر سکتے ہیں۔“
”میں ایسا ہی کروں گی۔“

”یہاں اردن کا جو بنگلا ہے اس کی تجوری میں اس نے اپنا سارا اثاثہ رکھا ہوا ہے، یقیناً زمین و جائیداد کے کاغذات اور دوسرے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی اسی میں ہوں گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں وہ بہت بڑی اور مضبوط تجوری ہے۔ بیک وقت نمبروں اور چابیوں سے کھلی ہے۔“

”ایک منٹ رکو میں اردن سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور واپس آکر اردن سے تجوری اور اسے کھولنے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے آرام سے بتا دیا کہ اس کی چابیاں اس کے بیڈروم میں ایک خفیہ جگہ رکھی تھیں۔ اس نے خفیہ جگہ بتائی اور پھر تجوری کھولنے کا پورا طریقہ کار بتایا۔ اس میں نمبرز بھی شامل تھے۔ میں نے اسے ذہن نشین کر لیا اور واپس بیٹا کے پاس آکر اسے لکھوا دیا۔ اس طرح امکان نہیں تھا کہ وہ کوئی غلطی کر جائے۔ تجوری میں کوئی ٹریپ نہیں تھا لیکن اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کرنٹ آجاتا تھا۔ بیٹا خوش تھی۔

”اس مکان میں صرف ایک ملازم ہوتا ہے۔ اردن اگر دنیا میں کسی پر اعتماد کرتا ہے تو وہ یہی آدمی ہے۔“
”اس کا مطلب ہے تم اس وقت تک تجوری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں جب تک کورٹ سے آرڈر نہ لے لو۔“

”ایسا ہی لگ رہا ہے۔“
”اس صورت میں نوا لاکھ روپے کم ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ مکان بھی سیل کر دینا اب تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا اور مقامی وکیلوں کے بجائے شملہ جا کر وکیل کر لینا۔ شملہ بڑا شہر ہے اور وہاں ہر طرح کی سہولت ہے۔“
”اگر تمہارا مشورہ ہے تو میں شملہ منتقل ہو جاتی ہوں۔“

”یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا، میرا مشورہ یہاں سے جانے کا ہے۔“

”تم یہاں سے جا رہے ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔
”ہاں کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ سب بھول جاؤ اگر یہاں کوئی پوچھ گچھ کرنے آئے تو انجان بن جانا۔“
”کون آسکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ممکن ہے سرکاری لوگ آئیں۔ لیکن تم پر بھی لکھی اور سمجھدار عورت ہو، ان کو اس طرح سے ہینڈل کرنا کہ وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ میرا اور تمہارا خلاف معمول کوئی تعلق ہے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

وہ پریشان ہو گئی۔ ”اس صورت میں میں انکار نہ کر دوں کہ یہاں کوئی ٹھہرا ہی نہیں۔“

”یہ تا جی بھی ہوگی، کیونکہ سرکار کے لیے جھوٹ پکڑنا مشکل نہیں ہوگا۔ تم جانتی ہو کہ پولیس اور دوسری ایجنسیاں کیسے تفتیش کرتی ہیں، اس لیے وہ جھوٹ بولو جو قابل قبول ہو خود کو مشکوک مت بنانا اور یہ اچھا ہوا کہ بچوں کے سامنے کچھ نہیں آیا تم بھی چھپا کر رکھنا ان سے بھی پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔“

”اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“
”ڈر رومت حوصلہ رکھو.... تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے اس لیے تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک تم خود نہ اقرار کر لو اور ہاں یہ رقم اور کوئی ایسی چیز جس سے ہماری نشان دہی ہو اس مکان سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دو یہاں کی مکمل تلاشی لی جاسکتی ہے ایک سوئی بھی چھپی نہیں رہے گی۔“
”میں ایسا ہی کروں گی۔“

مجھے کچھ کام اور تھے اس لیے میں واپس اس کمرے میں آیا۔ میں نے اردن سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی ایسا سپر اسٹور ہے جہاں سے کپڑے اور ڈبا بند خوراک مل سکے؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”سب مل جائے گا لیکن ایک جگہ نہیں۔“

”میرے ساتھ چلو۔“ میں نے اس سے کہا اور بیٹو سے ہوشیار رہنے کا کہہ کر اردن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ اسی طرح گاڑی میں چھپا رہا۔ مارکیٹ کے پاس اسے اتار کر رقم دی اور بتایا کہ کیا کیا لینا ہے۔ میں نے اسے اپنے اور بیٹو کے کپڑوں کا سائز بھی دے دیا تھا۔ ہمارے پاس سردی کا مقابلہ کرنے کے لحاظ سے بس ایک ہی سوٹ تھا اور ہمیں ایسے ایک سوٹ کی مزید ضرورت تھی۔ بیٹو

کے پاس جیکٹ تھی میرے پاس نہیں تھی۔ اردن تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا اس نے کئی شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ میں نے جیب ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں زیادہ چہل پھل نہیں تھی۔ اردن نے شاپرز اندر رکھے اور خود بھی اندر آ گیا۔ میں نے وہیں چپک کر نے کے بجائے واپس گھر پہنچ کر دیکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ میں اردن کے ساتھ جتنی دیر باہر رہتا زیادہ لوگوں کی نظر میں آتا۔

واپس آکر میں نے دیکھا۔ ایک اچھی اور گرم جیکٹ تھی۔ بیروں میں گھنٹوں سے اوپر تک آنے والے گرم موزے تھے۔ میرے اور بیٹو کے ٹاپ کی اوٹی پینٹ اور جرسی کی ہائی نیک شٹس تھیں۔ اوٹی ٹوپے اور دستاں پہلے سے ہمارے پاس تھے۔ شام کے چار بجے اچانک ہی بادل گھر آئے اور بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈ کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر بارش ہو جائے تو موسم بہت سرد ہو جاتا ہے اور نارمل میں بھی رات کو سردی ہوتی ہے۔ سب کمبلوں میں دبک گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جب سے میں نے بیٹا کو پولیس یا ایجنسی کا حوالہ دیا تھا وہ اور اس کے بچے یہاں نہیں آئے تھے ورنہ وہ ہر تھوڑی دیر بعد پوچھتی تھی۔ کبھی خود پوچھتی اور کبھی بچوں سے کہلاتی تھی۔ کچھ دیر بعد پراوین نے درمیانی دروازے سے جھانکا اور چائے لانے کا بتایا۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنے ہوئے سموے، پکوڑے اور پجوری تھی۔ ساتھ ہی اس نے بیٹا کا پیغام دیا وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

بیٹو خوش ہو گیا تھا کیونکہ اسے تین وقت کھانے کی عادت تھی اور یہاں دوپہر کا کھانا گول ہوتا تھا۔ اگرچہ ناشتا اور رات کا کھانا ساری کسر پوری کر دیتا تھا مگر درمیان میں کچھ وقت کے لیے پیٹ بالکل خالی ہو جاتا تھا۔ میں تمام چیزوں سے انصاف کر کے اور چائے کا گگ لے کر لاؤنج میں آیا جہاں سیتارات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے معذرت کی۔ ”سوری میں نے اتنی دیر سے پوچھا نہیں۔ اصل میں یہ سب تیار کرنے میں مصروف تھی۔“

مجھے اپنی سوچ پر اندر ہی اندر شرمندگی ہوئی تھی۔ ”کوئی بات نہیں میں بھی آرام کر رہا تھا۔“
”کل کس وقت جاؤ گے؟“
”صبح سویرے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا ہے قصبے میں چہل پھل ہونے سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں۔“

”ناشاکب کرو گے؟“

”جھجکے۔“

وہ افسردہ ہو گئی۔ ”پھر کبھی نہیں آؤ گے؟“

”امکان تو یہی ہے۔“

”میں تمہیں یاد کروں گی۔“ اس نے دھیمے لہجے میں

کہا۔ ”تمہارا احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”میرے لیے یہی بہت ہے کہ کوئی مجھے اچھے الفاظ

میں یاد کرے گا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”پوچھو۔۔۔ اگر جواب دے سکا تو ضرور دوں گا۔“

”تم مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی قدر تعجب کے ساتھ کہا کیونکہ

میں نے گفتگو میں بہت خیال رکھا تھا کہ ایسی کوئی بات نہ

کہوں مگر شاید کہیں بے احتیاطی ہو گئی تھی۔ ”تمہیں کیسے پتا

چلا؟“

”میں جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں اکثر لڑکیاں

مسلمان تھیں۔ میری ساری سہیلیاں مسلمان تھیں مجھے معلوم

ہے مسلمان کس طرح بات کرتے ہیں۔“

”لیکن میں نے اپنی گفتگو میں ایسا کوئی لفظ استعمال

نہیں کیا جو خاص مسلمان بولتے ہیں۔“

”ہاں لیکن تم نے ہندی کے وہ لفظ بھی نہیں بولے جو

ہر ہندو بولتا ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”اس سے مجھے

اندازہ ہوا کہ تم مسلمان ہو۔“

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ”امید ہے اس سے تمہارے

مذہبی جذبات کو نہیں پہنچی ہوگی؟“

”نہیں ہم چھوت چھات کے قائل نہیں ہیں۔“ وہ

بولی۔ ”میں نے کہا نا میری ساری سہیلیاں مسلمان تھیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ صرف اللہ کی مدد تھی کہ

مجھے اب تک ہمدرد اور مددگار لوگ ملے تھے۔ بے شک

انہوں نے پیسے کے لیے مدد کی تھی لیکن یہ بھی بڑی بات تھی۔

اس متعصب ملک میں جہاں بعض اوقات صرف مسلمان ہونا

جرم بن جاتا تھا اور اس پر اعلیٰ عدالتیں تک سزائے موت

جیسی انتہائی سزا دے دیتی ہیں۔ مسلمان سب سے بڑی

اقلیت ہوتے ہوئے بھی سکھوں اور عیسائیوں حتیٰ کہ

بدھستوں سے بھی گئے گزر رہے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے

مطابق سرکاری ملازمتوں میں ان تینوں قوموں کا حصہ

مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ عام لوگوں میں اب تک کوئی ایسا

شخص نہیں ملا تھا جو صرف مسلمان یا پاکستانی ہونے کے

میں میرا دشمن ہو جاتا۔ میں نے سیتا کو مزید رنج و مصائب

اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

”تم نے اتنا کیا ہے کہ میں کسی صورت اس کا بدلہ

نہیں چکا سکتی۔ اس لیے پلیز اب میں جو کر رہی ہوں اسے

میرا غلط سمجھو۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ جذباتی ہو رہی تھی اور جب

میرے پاس آنے والی کوئی عورت جذباتی ہوتی ہے تو میں

اجنبیوں میں پڑ جاتا ہوں کہ نہ جانے اس کی جذباتیت کیلئے

اختیار کرے۔ یہ چیز بعض اوقات مشکل کا باعث بن جاتی

تھی۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔ اس کے بچوں

کے بارے میں بات کرنے لگا۔ پراوین چھٹی کلاس میں تھا

اور مومیتا چوتھی میں تھی۔ دونوں سرکاری اسکول میں پڑھ رہے

تھے کیونکہ سیتا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کو

نچی اسکول میں پڑھا سکتی۔ وہ خوش تھی کہ اب وہ اپنے بچوں

کو بہترین اسکول میں پڑھا سکے گی۔ اس نے سرور لہجے

میں بتایا کہ شملہ میں انڈیا کے بہترین اسکول تھے۔ وہ ان

میں سے کسی میں پراوین اور مومیتا کو داخل کرائے گی۔ اب

اس کے وسائل بھی تھے۔ اس کا موڈ بدل گیا تھا۔ میں وہاں

آیا تو بیٹو اوگھر رہا تھا، وہ آج صبح سے جاگ رہا تھا، رات میں

بھی صرف چار گھنٹے سویا تھا۔ میں نے پٹی ہٹا کر اس کا ذمہ

دیکھا جو مکمل طور پر خشک ہو گیا تھا اور جہاں سے کھال غائب

ہوئی تھی وہاں اب سرخ رنگ کی جھلی آگئی تھی۔ ذمہ بہت بہتر

حالت میں تھا۔“

”شونی ہم نے اس ہاتھ سے بیگ اٹھا کر دیکھا اور

سادر دھوا پر کوئی مشکل نہیں ہوا۔“ بیٹو نے انکشاف کیا۔

”ایسا کرو ابھی سو جاؤ تمہیں رات کو جاگنا ہوگا۔ کھانا

آنے میں تین گھنٹے ہیں۔“

”نیند نہیں آ رہی ہے شونی کیا ادھر والوں سے بات

سکتی ہے۔“ بیٹو نے دبی زبان میں کہا۔ ”وہ سب یاد آ رہا

ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن بس بات نہیں کرنا۔“ میں نے کہا اور

اسکاٹپ سے سفیر کو کال کر کے اسکاٹپ پر آنے کا کہا۔ چہ

منٹ بعد وہ اسکاٹپ پر تھا۔ بیٹو نے ہینڈ فری لگا لیا تھا اور

لیپ ٹاپ سامنے رکھ لیا۔ کچھ دیر میں مانی اور دوسرے بھی

آگئے تھے۔ سب بیٹو کو دیکھ کر خوش تھے البتہ سفیر چیئر خالی کر

رہا تھا مگر بیٹو نے برا نہیں مانا وہ ہنستا رہا۔ اس نے سفیر سے

کہا۔ ”ہم جانتا ہے آپ ہم سے بس اوپر اوپر سے ایسا

کرتا ہے۔ ہم مر گیا تو سب سے زیادہ آپ یاد کرے گا۔“

جواب میں سفیر نے کچھ کہا تو وہ پھر ہنسا۔ ”ہاں منہ ہی

ایسا ہے۔ پر آپ سے اچھا ہے۔“

چندرہ منٹ بعد میں نے بیٹو سے ہینڈ فری لیا اور باہر

برآمدے میں آ گیا۔ یہ یہاں سے بھی کام کر رہا تھا۔

میں نے وسیم اور سفیر کو مختصر اپنے پلان سے آگاہ کیا۔ ”میں

کل یہاں سے نکلوں گا اور کنور پبلش کے پاس کوئی جگہ تلاش

کروں گا۔“

”وہاں آپ سے رابطہ مشکل ہوگا۔“ وسیم نے کہا۔

”ہاں وہاں موبائل سنگل مشکل سے ہوں گے، انٹر

نیٹ کا نہیں پتا لیکن مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے ایک لینڈ کروزر

لے لی ہے اس کی مدد سے کسی ایسی جگہ تک رسائی حاصل کی

جاسکتی ہے جہاں سنگلز ہوں۔ میں اگر روز نہیں تو دو دن بعد

لازمی رابطہ کروں گا۔ وہاں کی کیا صورت حال ہے؟“

”ناور کو مرشد کے حوالے کر دیا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم لوگ زیادہ محتاط رہو۔“

”آج کل محتاط رہنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے

ہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”بڑے کنور کا راجا عمر دراز سے رابطہ ظاہر کرتا ہے کہ

وہ ہمارے بارے میں کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ لازمی مرشد

سے بھی واقف ہوگا۔ اگر اس نے مرشد سے رابطہ کر لیا تو

ہمارے لیے پھر سے مشکلات کا آغاز ہو جائے گا۔ فتح خان

کی انڈیا میں موجودگی کا مطلب ہے کہ ڈیوڈ شا بھی یہیں ہے

ورنہ فتح خان کی دل چسپی کی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ہمارے دشمن آپس میں مل

رہے ہیں؟“ وسیم نے صورت حال کا خلاصہ کیا۔

”بالکل یہی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جیسے ہی

راج کنور کی مدد سے مجھے کنور پبلش میں گھسنے کا موقع ملا میں

سادی کو وہاں سے نکال لوں گا۔“

”اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو۔۔۔“ وسیم نے کسی قدر جذباتی

لہجے میں کہا۔

”یاد رہے مفروضات پر بات نہیں کر سکتے بہر حال ایک

بات طے ہے کہ سادی کو بڑے کنور کی قید میں نہیں چھوڑا جا

سکتا۔۔۔ اسے آزاد کرانے کے لیے اگر مجھے خود کو بڑے کنور

کے حوالے کرنا پڑا تو میں۔۔۔“

”آپ اپنے طور پر ایسا کوئی فیصلہ نہیں کریں

گے۔“ وسیم نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”سوری میں جذباتی

ہو گیا تھا۔“

”یار ایک دوسرے کے لیے یہ جذبات ہی تو

ہمارا سرمایہ ہیں ورنہ کسی کو دوسرے سے کیا غرض ہو سکتی

ہے۔“

”ٹھیک کہا تو نے۔“ سفیر نے تائید کی۔

میں نے کچھ دیر بات کر کے کال کاٹ دی اور لیپ

ٹاپ بند کر کے اسے اور موبائل دونوں کو چارج پر لگا

دیا۔ اردن کے پاس سے جو آئی فون لگلا تھا اس کا چارج

نہیں تھا لیکن بیٹری فل تھی۔ اسے آف رکھا ہوا تھا۔ ابھی تو

اس کا کام نہیں تھا لیکن ممکن تھا کہ آگے چل کر اس کی

ضرورت پڑ جاتی۔ اسے بھی سامان میں شامل کر لیا تھا۔ اس

بار میں نے تفصیل سے دیکھا کہ بیٹو نے کیا کیا لیا تھا۔ اس

میں بہت ساری کام کی چیزیں تھیں۔ حتیٰ کہ اس نے ماچس

اور لائٹرز بھی لیے تھے۔ اسلئے سمیت سارا سامان دو بیگز

میں آ گیا تھا۔ سب سے بات کر کے بیٹو خوش تھا، وہ لیٹ

گیا۔ وہ مسلسل اپنی باپوکس کھا رہا تھا اور یہ دوائیں انسان

کو کمزور بھی کرتی ہیں۔ مگر ان کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ آج

رات بیٹو کے ذمہ کو چار دن ہو جاتے۔ ڈاکٹر گپتا نے تین دن

کا کہا تھا اس لحاظ سے اب وہ حرکت کر سکتا تھا۔

بیٹو نے جس جگہ کا بتایا تھا وہاں تک جیپ کی رسائی

مشکل لگ رہی تھی اور یقیناً کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا

پڑتا۔ یہاں سے اس کا امتحان شروع ہوتا۔ سفر کی مشکل پھر

سامان اٹھانا اور غار کی بے آرامی بیٹو کے لیے مشکل کر سکتی

تھی۔ بہر حال اس کا ذمہ بڑھنے کا اندیشہ بہت کم تھا اور پھر

ہمارے پاس دوائیں بھی تھیں۔ میں نے جو سامان منگوایا تھا

اس میں ٹیڑا ایک دودھ بھی شامل تھا، بہ وقت ضرورت یہ

کھانے اور پینے دونوں کے کام آ سکتا تھا۔ چائے کی پتی اور

کافی بھی شامل تھی۔ خاصی چیزیں تھیں جو اس بے سرو سامانی

میں ہمارے کام آئیں۔ یہ سب ایک الگ شاپر میں پیک

تھیں۔ رات کا کھانا آیا تو میں نے بیٹو کو جگا دیا۔ کھانے

کے بعد وہ دوبارہ سو گیا تھا۔ نو بجے باہر شدید سردی اور شدید

سناٹا تھا۔ بارش رک گئی تھی لیکن درختوں سے چپکتے قطروں کی

آواز اندر تک آرہی تھی۔ چائے اور کافی نے وقتی طور پر نیند

کو بھگا یا تھا لیکن جب کبھل میں لیٹ کر بیٹھتا تو غنودگی حملہ

کرتی تھی۔ یہاں ٹھنڈے کی گنجائش کم تھی اس لیے میں کبھل

اتار دیتا تا کہ سردی سے جسم چاق چو بند ہو جائے۔ ایک بار

میں کبل میں تھا کہ درمیانی دروازہ کھلا اور میں آنکھ بند کر کے سوتا بن گیا۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا لیکن چوڑیوں کی کھٹک نے بتایا کہ آنے والی سیتا بھی شاید وہ مجھے بلانے آئی تھی مگر میں بیٹو کو سوتا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے بیٹو کو تین بجے اٹھایا۔ وہ چہ گھٹے سویا تھا اور اب چاق پھونک رہا تھا۔ وہ واش روم سے ہو کر کانپتا ہوا آیا تو میں سونے کے لیے لیٹا۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوبی باہر بہت سردی ہے۔“

”کل سے ہمیں اسی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“
”ادھر زیادہ سردی ہوگا۔“ بیٹو نے خبردار کیا۔ ”ادھر برف والا پہاڑ پاس ہے نا وہاں سے ٹھنڈا آتا ہے۔“
”دیکھ لیں گے یا زیادہ نہیں ہے ہم نے کئی دن کیسے برفانی علاقے میں گزارے تھے جہاں سوائے برف کے اور کچھ نہیں تھا۔“

”ادھر تو بہت سردی تھا۔“
کچھ دیر بعد میں سو گیا تھا۔ چہ بجے بیٹو نے مجھے اٹھا دیا۔ ”شوبی سیتا دیوی ناشتے کا بول کر گیا ہے۔“
”ہاں بس ہمیں روانہ ہونا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ واش روم سے ہو کر آیا اور درمیانی دروازے سے اندر جھانکا جہاں سیتا اکیلی ناشتا بنا رہی تھی۔ اتنی صبح بچے یقیناً سو رہے تھے۔ میں لاؤنج میں آیا اور کھنکھارہ اس نے چونک کر دیکھا اور مسکرائی۔

”اٹھ گئے۔“
”ہاں فریش ہوں۔“ میں میز کے کنارے ٹک گیا۔
”کافی پیو گے ناشتے میں ذرا دیر ہے، سوری میری آنکھ وقت پر نہیں کھلی۔“
”کیوں نہیں اور کوئی بات ہم ذرا تاخیر سے نکل جائیں گے۔“

اس نے کافی کا پانی رکھ دیا۔ ”تم شملہ جاؤ گے؟“
”ہاں لیکن ہماری منزل اس سے دور ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ پراٹھے بنا رہی تھی۔ ”میں نے راستے کے لیے بھی کچھ چیزیں بنادی ہیں، ایک دو وقت کھا سکتے ہو۔“
”اس کی ضرورت نہیں تھی تم نے زحمت کی۔“
”میں نے سوچا کہ راستے میں بھی باہر کا کھاؤ گے تو میں کیوں نہ بنادوں ٹھنڈا ہوگا پر گھر کا ہوگا۔“
اس نے کافی بنا کر میرے سامنے رکھی اور آہستہ سے

بولی۔ ”مجھے ارون کا سوچ کر ڈر لگ رہا ہے۔“
”میں نے کہا نا اس کی گم شدگی کے بارے میں ابھی واپس نہیں آئے گا لیکن اس کی گم شدگی کے بارے میں ابھی طرف سے کچھ مت کہنا۔ میرا خیال ہے جلد اس کی گم شدگی کی خبر پھیلے گی اور پولیس تمہارے پاس آئے گی تب تم وراثت کے لیے کارروائی کرنا اور وہ بھی اس وقت جب پولیس اس کا کیس بند کر دے۔ تم پولیس سے رابطے میں رہو گی تو خود پتا چلتا رہے گا۔ پراوین اور سیتا اس کے وارث کی حیثیت سے عدالت میں درخواست دے سکتے ہیں۔“
”تم فکر مت کرو میں کسی اچھے وکیل سے مشورہ کر کے یہ کام کروں گی۔“

جب تک میں نے کافی پی لی اس نے ناشتا تیار کر دیا اور خود ہی دینے آئی۔ ارون اسے دیکھ کر چونکا مگر وہ اسے دیکھ کر زیادہ چونکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم نے اسے ایسے ہی چھوڑ رکھا ہے؟“
”میں نے اسے ایسی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے جو نظر نہیں آتی لیکن فولاد سے زیادہ مضبوط ہے یہ صرف بے بس ہی نہیں پوری طرح میرے قابو میں ہے۔“
”وہ کیسے؟“

”اے ارون ادھر آؤ۔“ میں نے اسے حکم دیا۔ ”میں نے اسے اس طرح چاروں ہاتھ پیروں پر چل کر آؤ۔“
اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے سیتا کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے قدموں میں سر رکھو۔“
اس بار بھی اس نے حکم کی تعمیل کی تو سیتا اچھل پڑی تھی۔ ”یہ کیسے کیا؟“

”مجھے جادو آتا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور ارون کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ سیتا ناشتا لگا کر واپس چلی گئی تھی۔ ہم نے ناشتا کیا۔ اس دوران میں باہر دھوپ پھیل رہی تھی جب کہ مجھے توقع تھی کہ موسم ابر آلود ہوگا مگر خلاف توقع دھوپ نکل آئی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد میں نے سارا سامان ارون اور آئی کن پر لادوایا۔ چاروں کے آرام سے راج کنور کے پاؤں کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی لیکن وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ کوئی بوجھ اٹھا سکے۔ بیٹو کو ان کے ساتھ روانہ کر کے میں اندر آیا۔ جہاں سیتا دیوی کچن کی میز پر ہنسر چہرے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

”ہم جارہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

لاکھ روپے لے کر دھوکا دے سکتے ہوں اور پولیس کے پاس جا سکتے ہو۔
دس منٹ بعد انجکشن نے اس پر غلبہ پالیا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا۔ ”اب تم شملہ کی راہ پکڑو گے پھر سیدھا دہلی جاؤ گے وہاں سے بمبئی جانے والی فلائٹ میں بیٹھ جاؤ گے اور پھر وہاں سے مدراس کی فلائٹ پکڑو گے۔“
”میں ایسا ہی کروں گا۔“ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

”مگر اب روانہ ہو جاؤ اور جلد از جلد شملہ پہنچنے کی کوشش کرو اس کے لیے کوئی پرائیویٹ گاڑی ہائر کر لو۔“
آئی کن سعادت مندی سے قصبے کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ گاڑی اسے وہیں سے مل سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیب کا رخ شملہ کی طرف کر دیا۔ بیٹو نے اسلحے والا بیگ اور دوسرا بیگ پیچھے رکھ دیا تھا۔ اگرچہ یہ حصہ بھی جیب کے اندر ہی تھا لیکن اس تک رسائی صرف مخفی دروازے سے ممکن تھی اس لیے راج کنور کی طرف سے خدشہ بھی نہیں تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے ایک بار پھر اس کی تلاشی لی تھی کہ اس نے موقع پا کر کوئی جج یا کاتھانہ چھپالیا ہو۔ وہ اب خود چل رہا تھا۔ اگرچہ ہلکا سا ٹکڑا رہا تھا مگر اب اسے سہارا نہیں دینا پڑتا تھا۔ آگے کا کہہ نہیں سکتے تھے کہ جب ہمیں پیدل سفر کرنا پڑتا تو اس کی کیا حالت ہوتی؟ ذرا دیر بعد ہم قصبے سے باہر نکل آئے تھے۔ یہاں سے کنور پولیس ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ بیٹو نے ارون کمار کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا کیا کرنا ہے؟“
”راستے میں کہیں اتار دیں گے۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ بیٹو سمجھ گیا۔ اس نے دانت نکالے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”زخم میں تکلیف کیسی ہے؟“
”بہت کم شوبی بس بھی اچانک زور سے ہاتھ ہلائے تو میں اٹھتا ہے۔ لگتا ہے ہم ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشا اللہ۔“ میں نے جیب کی رفتار بڑھائی تھی کیونکہ یہاں سڑک تقریباً سیدھی اور ہموار تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران میری نظر ڈھلان پر بھی لگی ہوئی تھی بعض جگہ جیب روک کر میں نے گہرائی کا جائزہ بھی لیا تھا۔ مگر جگہ موزوں نہیں لگی۔ بالآخر ایک جگہ مجھے ٹھیک لگی۔ سڑک کے ساتھ یہ تقریباً نوے درجے زاویے کی گہرائی تھی اور اس کی

فیروز شاہ تغلق

1308-1388ء

محمد تغلق کا چچا بھائی اور ولی عہد۔ اسی کی آغوش میں تربیت پائی۔ محمد تغلق کی وفات پر 1351ء میں ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ نیک طبع اور نرم دل آدمی تھا۔ عابد و زاہد اور ترک دنیا پر مائل تھا۔ امراء کے اصرار اور محمد تغلق کی وصیت پوری کرنے کے خیال سے بادشاہی قبول کر لی۔ دوسرے بنگال پر چڑھائی کی لیکن نرم دلی کی وجہ سے قتل از وقت محاصرہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ 1359ء میں دوسری مرتبہ واپسی پر اڑیسہ فتح کر لیا۔ 1363ء میں سندھ کے رئیس پر حملہ کیا اس نے ہتھیار ڈال دیے تو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ عزت سے رکھا۔ گراں قدر وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے بھائی کو سندھ کا ”جام“ بنادیا۔ نگرکوٹ (کاٹھڑہ) بھی فتح کر لیا لیکن دکن کی بازیافت کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ تمام قوانین اور ضابطے جو شریعت اسلام کے خلاف تھے، موقوف کر دیے۔ امیروں کی جاگیریں بحال کر دیں جو علاء الدین غوری کے عہد میں ضبط ہوئی تھیں۔ زمین کا لگان نئی تخفیف کے مطابق مقرر کیا، کاشتکاروں کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں، اس وجہ سے نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ کنوئیں، تالاب اور بند بنوائے، نہریں جاری کرائیں، نئے قصبے اور شہر آباد ہوئے، مل، شفاخانے اور حمام بنوائے۔ دہلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے کوٹلہ فیروز شاہ اسی کی یادگار ہے۔ وہ فیروز شاہ رعایا پر ور اور علم دوست تھا۔ علماء کی سرپرستی سے علم کو فروغ ہوا۔ طلباء کے لیے وظیفے مقرر ہوئے۔ 1375ء میں فیروز شاہ کا بڑا اور قابل فرزند فتح خاں فوت ہوا۔ بڑھاپے میں اس المناک صدمے سے دل برداشتہ ہو کر بادشاہ نے سب کام کاج چھوڑ دیے۔ خواجہ جہاں وزیر مطلق العنان ہو گیا۔ بادشاہ کو اس کے دوسرے بیٹے محمد خان کے خلاف اکسانے لگا۔ محمد خان نے حقیقت حال بیان کی تو خواجہ جہاں نے موت کی سزا پائی۔ تمام اختیارات محمد خان کو ملے۔ وہ نااہل تھا۔ انتظام بگڑا تو فیروز شاہ نے اپنے پوتے (فتح خان مرحوم کے بیٹے) شہزادہ تغلق کو ولی عہد بنایا۔

مرسلہ: نوشین ملک، جہانیاں

فرنج ایسٹ انڈیا کمپنی

دوسری یورپی قوموں کی طرح اہل فرانس نے بھی 1664ء میں ہندوستان میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی۔ دوسرے ممالک کی تجارتی کمپنیوں کے برعکس اس کے نظم و نسق پر حکومت فرانس کا قبضہ اختیار تھا۔ فرانسیسی کمپنی کا اصل نام French Compagnie Des Indes تھا۔ اس کمپنی کے قیام کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانسیسیوں اور انگریزوں میں مقابلہ شروع ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے حسد اور رقابت کا رنگ اختیار کر لیا۔

ابو فراس ہمام، فرزدق

641-732ء

شاعر، اموی خلافت کے عہد میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ اپنے عہد کا نامور ہجو گو تھا۔ معاصر ہجو گو شاعر جریر سے اکثر معرکہ رہتا تھا۔ فرزدق جریری کی ہجو کہتا اور جریر جواب دیتا۔ ہجو گوئی میں دونوں، بعض اوقات سو قیامہ الفاظ اور اسلوب بھی اختیار کر جاتے۔ فرزدق کی زبان سے امراء اور سلاطین بھی محفوظ نہ رہے۔ ایک بار خلیفہ ہشام کی ہجو کی تو اس نے غضبناک ہو کر قید کر دیا۔ فرزدق اہل بیت رسول کا مدح خواں تھا۔ اموی خلفاء اس سے خوش نہیں رہتے تھے۔

فرید وجدی

1878-1954ء

مصری ادیب عالم صحافی اور مصنف۔ اصل نام محمد فرید وجدی تھا۔ بہت سے علمی مقالات کے علاوہ کئی کتب تالیف اور تصنیف کیں۔ شہرت کا باعث زیادہ تر دائرۃ المعارف ہے۔ طباعت مصر (1938ء) میں جلدوں پر مشتمل ہے اور علمی اور تاریخی اعتبار سے محمد فرید وجدی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اسی طرح ان کی تفسیر قرآن مجید بھی بہت اہم کارنامہ ہے۔

مرسلہ: خاقان خان شوری، کوئٹہ

”بالکل تم فکر مت کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی اور دل ہی دل میں اللہ سے اپنے اس جھوٹ کی معافی مانگی جو میں ایک عورت اور اس کے بچوں کو اس موذی شخص سے نجات دلانے کے لیے بول رہا تھا۔ ارون پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رک گیا تھا۔ آج سے پہلے میں نے بے شمار لوگوں کو مرتے دیکھا تھا کتنے ہی میرے ہاتھ سے مارے گئے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی شخص کو ایسے مرتے دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے کہنے پر از خود موت کے منہ میں چھلانگ لگا رہا تھا۔ ارون نے کنارے پہنچ کر ایک لمبی چھلانگ لگائی اور خلا میں غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک تیز جھج نکلی اور اس وقت تک نکلتی رہی جب تک وہ نیچے نہیں جا کر۔ دھب کی ایک رو ٹکٹے کھڑے کرنے والی آواز آئی تھی۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے جھپکتے ہوئے کنارے سے نیچے جھانکا تو ارون کا ٹوٹ پھوٹ جانے والا جسم ایک چٹان پر پڑا تھا اور اس کے آس پاس کا پتھر خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھ سے اس سے زیادہ نہیں دیکھا گیا اور میں نے بے اختیار پلٹتے ہوئے قے کر دی۔ صبح کا کھانا پانا ناشائستہ لگ گیا تھا۔ بیٹو اتر کر میرے پاس آیا اور میری پشت سہلانے لگا۔

”شوہن ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔“

میں نے پانی کی بوتل لے کر کھلی کی اور پھر چند گھونٹ پانی کے پیے۔ ”ہاں یار پر میں نے کسی کو اس طرح راضی خوشی مرتے نہیں دیکھا ہے، اس نے میرے حکم پر چھلانگ لگائی ہے۔“

”آ جاؤ ادھر سے چلو کوئی آگیا تو بلا وجہ شک ہوئے گا۔“ بیٹو مجھے جیب تک لایا اس نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ میں نے تھرماس سے کافی نکال کر پی لی اس سے میری حالت تیزی سے سنبھل گئی تھی۔ راج کنور سائنت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ دو اتنی بھیا تک ہوگی۔“

”پتا نہیں کیا بلا ہے اور ذرا سوچو میڈیکل اسٹور پر عام مل رہی ہے بغیر ڈاکٹر کی ہدایت تو ایسی دوائیں کتنی خطرناک ہوں گی جو اسی مقصد کے تحت بنائی گئی ہوں گی اور وہ مارکیٹ میں دستیاب بھی ہوں گی۔“

بیٹو نے کہا۔ ”شوہن اس پر بھی آزمائش چاہتا ہے یہ

نہ کم سے کم بھی دو سو فٹ نیچے تھی میں نے جھانک کر دیکھا جھاڑیوں کے درمیان بڑے بڑے پتھر ابھرے ہوئے تھے اور اگر کوئی اوپر سے ان پتھروں پر گرتا تو اس کے نیچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیٹو اور راج کنور سمجھ رہے تھے کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اور ارون کمار انجکشن کے زیر اثر بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے جیب سے اترنے کو کہا وہ سعادت مندی سے نیچے اتر آیا۔ بیٹو اندر رہا تھا۔ میں نے ارون سے کہا۔

”ارون تمہیں ایک بہادری کا کام کرنا ہے۔“

”کیسا کام؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

”تم یہاں سے دوڑتے ہوئے جاؤ۔ گے اور اس خلا میں چھلانگ لگا دو گے۔“ میں نے کھائی کی طرف اشارہ کیا تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔

”تب تو میں نیچے گر کر مر جاؤں گا۔“

”نہیں مرو گے نیچے ایک جال ہے جیسا کہ سرکس میں ہوتا ہے تم اس پر گرو گے اور بچ جاؤ گے۔“

پچھلچھاٹ کے ساتھ اس نے سر ہلایا۔ ”میں بچ جاؤں گا نا؟“

”ہاں لیکن زور سے خلا میں چھلانگ لگانا تاکہ سیدھا جال پر جاؤ ورنہ ڈھلان پر گرو گے تو لڑھکتے ہوئے نیچے پہنچو گے۔“

میں ایک بار پھر تجربہ کر رہا تھا کہ یہ دوا کس حد تک آدمی کی قوت ارادی ختم کرتی ہے اور وہ کس حد تک آپ کے حکم پر عمل کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ارون کمار اس صریحاً خودکشی سے انکار کر دے گا۔ قوت ارادی ختم ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آدمی کہنے پر خودکشی کر لے۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ تیار ہو گیا۔ وہ ذرا پیچھے گیا اور میری طرف دیکھا۔ ”کیا چھلانگ لگا دوں؟“

میں ہاں کہنے والا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں رک جاؤ۔۔۔ یہ گاڑی گزر جائے اس کے بعد چھلانگ لگانا۔“

یہ بڑے سائز کی نیلے رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ اب یہ ماڈل آنا بند ہو گیا مگر برصغیر پاک و ہند میں نظر آتا ہے۔ وہ پاس سے گزری اور جب آگے جا کر ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ارون کمار سے کہا۔ ”اب چھلانگ لگا دو۔“

وہ پچھلچھلایا۔ ”میں بچ جاؤں گا؟“

”شکریہ تو مجھے کہنا چاہیے۔“ اس نے رندھے لہجے میں کہا پھر یک دم اٹھ کر میرے سینے سے لگ گئی۔ ”شوہن میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔“

میں نے نرمی سے اسے خود سے جدا کیا۔ ”میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔“

اس نے آنچل سے آنسو صاف کیے۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی تم کال کرو اگر ملنے نہ آسکو تو؟“

”کوشش کروں گا۔“ میں نے سر ہلایا حالانکہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اس نے ایک بڑا سا ٹفن مجھے پکڑ لیا۔ ”اس میں کھانا ہے، یہ بارہ گھنٹے گرم رہے گا۔“ پھر اس نے دو تھرماس پکڑائے۔ ”اس میں چائے ہے اور اس میں کافی ہے۔“

”میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ گزار ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر جانے لگا تو اس نے ساتھ چلنا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔ ”نہیں تمہارا میرے ساتھ نظر آنا مناسب نہیں ہے اگر بعد میں کوئی پوچھے تو تم کہہ سکتی ہو کہ کمرے میں رکنے والے صبح سویرے تمہارے علم میں آئے بغیر یہاں سے چلے گئے۔“

اس نے سر ہلایا اور میں کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ جب میں گیٹ سے نکل رہا تھا تو سیتا لاؤنج کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے متوجہ پا کر اس نے ہاتھ ہلایا میں نے جواب دیا اور جیب کی طرف آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی کن تھا۔ بیٹو اس کے ساتھ تھا۔ جب کہ ارون اور راج کنور پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ آگیا۔ آئی کن نے جیب آگے بڑھائی اور ہم اترائی میں جانے لگے تھے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ مرکزی سڑک پر کسی ایسی جگہ نکلے جہاں زیادہ رش نہ ہو۔ اس نے مختلف سڑکوں پر گھماتے ہوئے جیب کو جنوب میں بالکل قصبے کے آخری حصے میں نکالا تھا۔ یہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ سڑک پر آ کر اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”اب کدھر جانا ہے؟“

”بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور عقب سے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کیا۔ اس نے تڑپ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن بیٹو نے بھی اسے جکڑ لیا اور میں نے آخری انجکشن آرام سے اگلے ہاتھ میں اتار دیا۔ انجکشن دے کر اسے چھوڑ دیا۔ اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ”تم کوٹرسٹ نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”تم میں

ہیں۔ وہ سب جدید ترین واکسینز کی مدد سے آپس میں رابطے میں ہوتے ہیں۔“
”ان کی تعداد پچاس ہے لیکن سب ہر وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوتے ہوں گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”عام حالت میں ایک وقت میں بیس ڈیوٹی پر ہوتے اور آٹھ گھنٹے بعد ڈیوٹی بدلتی ہے۔ اسی طرح باہر ایک وقت میں پچاس گارڈز ہوتے ہیں لیکن تمام گارڈز ہمہ وقت چوکنے ہوتے ہیں اور پانچ منٹ کے نوٹس پر وہ پورے پیس میں کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں اس کی باقاعدہ ریسرسل ہوتی ہے۔“

راج کنور پیس کی سیکورٹی کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں ان معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جا رہا تھا۔ بیو توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔ ”شوٹی ایک نیلا ویکن آ رہا ہے۔ یہ پہلے ہمارے پاس سے گزرا تھا دوسری طرف گیا تھا اب پیچھے آ رہا ہے۔“
میں نے غبی آئینے میں دیکھا تقریباً سو گز پیچھے نیلی فاکس ویکن آ رہی تھی لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ وہی فاکس ویکن تھی یا کوئی دوسری گاڑی تھی۔ میں نے بیو سے کہا۔ ”رفار تیز کرو۔“

بیو نے ایکسی لیٹر دیا اور چند لمحوں میں لینڈ کروزر بیس میل سے چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار پر آگئی۔ فوراً ہی میں نے فاکس ویکن کی رفتار میں اضافہ ہوتے دیکھا۔ رفتار کے معاملے میں وہ کسی طرح لینڈ کروزر سے کم نہیں تھی مگر اس کے ٹائر سڑک کو اتنا اچھا گریب نہیں کر سکتے جتنا لینڈ کروزر کے ٹائر کرتے ہیں۔ یہاں سڑک سیدھی تھی اس لیے فاکس ویکن کو دوبارہ سو گز تک پیچھے آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بیو نے مہارت سے ایک موڑ کاٹا اور فوراً ہی پورا بریک لگایا تھا کیونکہ سامنے ہی دو عدد جیپیں کھڑی تھیں اور ان کے ساتھ کم سے کم نصف درجن اسلحہ خود کار ہتھیاروں سے لیس پوزیشن سنبھال کر کھڑے تھے۔
میں نے بیو سے کہا۔ ”ریورس کرو۔“

لیکن اس سے پہلے بیو جیپ ریورس کرتا عقب سے فاکس ویکن نمودار ہوئی اور اس نے ترچھا ہو کر راستہ بند کر دیا تھا۔ ہم پھنس گئے تھے۔ پھر فاکس ویکن کا سلائیڈنگ ڈور کھلا اور اس سے ایک شخص نیچے اترا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔

جاری ہے

کتے کی طرح بھونکے، ہمارے پاؤں چاٹے اور پھر ہم اسے کتے مار زبردے کر کھانے کو بولے تو یہ کھالے۔“
راج کنور بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ”تم... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ہم اس سے بھی زیادہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بیو کا آئیڈیا اچھا ہے۔ اگر تم نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ بیو راستے میں آنے والے اگلے قصبے سے کتے مار زبردے کر لیتا۔“

”میں بتا چکا ہوں میں تمہاری کنور پیس کی حد تک کوئی مدد نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔“ اس نے لیوں پر زبان پھیری۔ ”بڑا کنور جانتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ لگ چکا ہوں اس لیے اس نے وہ سارے راستے بند کر دیئے ہوں گے جہاں سے تم میری مدد سے اندر داخل ہو سکتے ہو۔“

”تمہارا اشارہ خفیہ راستے کی طرف ہے؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”وہ لازمی بند ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ کنور پیس کی سیکورٹی میں کچھ لوپس تھے وہ بھی بڑے کنور نے بند کر دیئے ہوں گے۔“
”کیسے لوپس؟“

”مین گیٹ اور اگلی سیکورٹی لائن کے درمیان فاصلہ تھا اگر کوئی گیٹ کے گارڈز پر قابو پالیتا تو وہ اندر داخل ہو جاتا۔ اگرچہ پیس کی اصل عمارت تک پہنچنا پھر بھی ناممکن حد تک مشکل ہوتا لیکن آدمی اندر جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پیس کے دائیں طرف ایک کھائی ہے یہ وہی کھائی ہے جس سے پیس میں جانے والا پل گزرتا ہے یہ سامنے سے ہوتی ہوئی دائیں طرف جاتی ہے۔ اس کی ڈھلان کے ساتھ لگی دیوار صرف بارہ فٹ اونچی تھی اور اس پر بارڑھ بھی نہیں تھی لیکن اب یہ راستہ بھی بند ہو گیا ہوگا کیونکہ میں نے خود اسے اونچا کر کے اس پر کیمرے لگانے کا حکم دیا تھا، بس... کام شروع ہونے والا تھا۔“

”اندر سیکورٹی گارڈز کی تعداد کیا ہے؟“
”ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ باہر کے گارڈز سو سے زائد ہیں لیکن پیس کی اصل سیکورٹی ان پچاس گورکھاؤں کے پاس ہے جو ہائی ٹرینڈ اور مرنے مارنے کو کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے پیس کے اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔ وہ بلٹ پروف جیکٹوں اور گیس ماسک سے مسلح ہوتے ہیں۔ ان کے پاس خود کار رائفلیں، خطرناک چھوٹے دستی چاقو اور تاریکی میں دیکھنے والی عینکیں بھی ہوتی

(طالب حسین طلحہ سینئر جیل ملتان کا جواب)

سلیم کامریڈ..... کھاناں

میں بھی جنت سے نکالا ہوا ایک بندہ ہوں
ذوقِ تخلیق تجھے کیسے ستم آتے ہیں
عثمان احمد وٹو..... لاہور

میں لائقِ زنداں ہوں زنداں میں مجھے ڈالو
میں نے ہی حقیقت کا اظہار کیا ہوگا

فاروق قیصر..... کراچی

ماحول نے ہنسنے کی ترغیب تو دی ہوگی
رسم بھی مرا چہرہ یوں بن نہ سکا ہوگا

مریم اشفاق بٹ..... میرپور خاص

موتیوں کی درمیاں لے کے ہاتھ میں اوشا
ہر کرن سے بچتی تھی پھر بھی لٹ گئی تو بہ

(منشی خورشید احمد کنول لڈن دہاڑی کا جواب)

محمد اشفاق..... کراچی

وعدہ کیا تھا شب میں کہ آئیں گے خواب میں
مارے خوشی کے نیند نہ آئے تو کیا کروں

نوشین عارف..... میرپور اے کے

وہ روز بھی آئے گا یہ ارض بتائے گی
اس ارض پر اے عاجز، جو کچھ بھی لکھا ہوگا

(محمد عمران جوناٹی کراچی کا جواب)

احمد توحید فاروقی..... حیدر آباد

رحمت نے اس کی اشکِ ندامت کو دیکھ کر
موتی لٹا دیے کرم ہے حساب کے

شیخ فہد..... چنیوٹ

راس آئی تنہائی، عمر کی بسر تنہا
زندگی کی منزل کا طے ہوا سفر تنہا

نسیم توقیر فاطمہ..... لاہور

رازِ وفائے عشق کسی پر عیاں نہیں
سننے میں آگ جلتی ہے لیکن دھواں نہیں

وحید بانو..... کراچی

رہا نہ ایک تبسم بھی گلستاں کے لیے
چمن کی ساری بہاریں ہیں باغباں کے لیے

(محمد عقیل چٹھہ کا جواب)

سید خرم کرمانی..... فیصل آباد

ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے اہو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

واصف علی..... کراچی

اس کو چاہا تو محبت کی سمجھ آئی فراز
ورنہ اس لفظ کی تعریف سنا کرتے تھے

(کاننات کراچی کا جواب)

محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد

سلگ رہی ہیں اگر بتیاں سی مجھ میں دھبی
تمہاری یاد نے مہکا دیا، جلا بھی دیا

(منشی محمد عزیز لڈن کا جواب)

نیاز اختر..... لاہور

یہی تو درد ہے دل کا جو دھڑکتا ہے سینے میں
یہی تو ایک دولت ہے جو انسانوں کے ہاتھ آئی

ناہید اشرف ممتاز..... کراچی

یہ خندہ لبی ایک اعجاز ہے
یقین وفا دل کو آجائے ہے

اختر حسن خان..... کوئٹہ

یہ کیا جگمگا کے اندھیروں میں ڈوب جاؤں
دنیا ہے گر عروج تو پھر لازوال ہے

عمر دراز خان..... پشاور

یہی ہوا ہے میرا دل کے ساتھ سمجھوتا
کہ پاس ہی رہے اس کے مگر بدل جائے

آفاق علی شاہد..... کراچی

یہ آتشِ ہمسایہ کہیں گھر نہ جلا دے
کی دلی سوزاں نے میرے پہلو کی جاگر دم



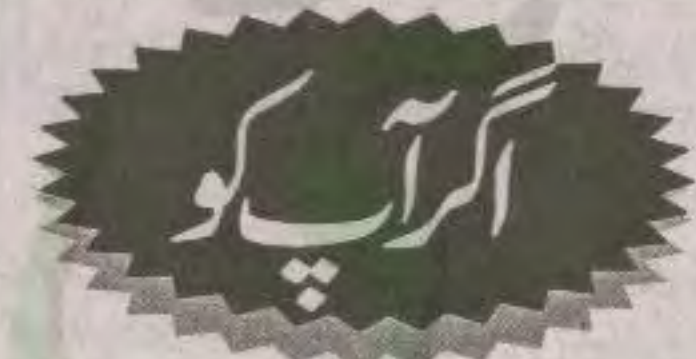
میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا یا جائے کسی ایک پر [✓] کیجیے۔

کوہن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2014ء تک علمی آزمائش 100 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

بدالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیئر II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مارچ 2014ء

183

ماہنامہ سرگزشت

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) **61**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

نگار اختر لاہور
نہ دب سکیں گے کبھی سلطنت کی قوت سے
وہ جاں سپار جو خوفِ خدا سے جاگے ہیں
فہیم الدین کراچی
نہیں اس کو واسطہ وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
اگر اس میں دل کا لہو نہیں اگر اس میں جاں کا زیاں نہیں
(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

رنگ شکستہ اپنا بھی ہے دید کے تئیں
اک آدھ رات آکے یہاں بھی باس کرو
(ناہید افروز کا جواب)

راجا ابرار خان ملتان
میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے باز نہ آؤں
بہن گے نت نئے خاکے میرے تمہارے
(طالب حسین طلحہ ملتان کا جواب)

ذیشان قریشی حیدرآباد
مایوس نگاہوں سے سمجھ لیجئے حالت
ڈٹے ہوئے دل کی ہیں یہ خاموش صدائیں
(انتظار حسین کراچی کا جواب)

نسرین یاسین حیدرآباد
اس کے بغیر آج بہت دل اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم
طلحہ یاسین لطیف آباد

اس دل کے بھلنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان بہت ہے
محمد عمار لطیف آباد
اس قحطِ دوستی میں کوئی مجھ سے کیا ملے
خود اپنے آپ کو بھی میسر نہیں ہوں میں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا
ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔
اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان
کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر
ہی شعر ارسال کریں۔

فاطمہ بانو ترمدی ملتان
یہ شعلہ خود بھڑک اٹھتا ہے دل میں
محبت کا سبب کوئی نہیں ہے
سرمہ عباس کراچی
یہ حکم ہے کہ اندھیروں کو روشنی سمجھو
لمے کشیب تو کوہِ دامن کی بات کرو
(نوشین افضل بہاولپور کا جواب)

محمد افضل ساہیوال
وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
نگار اختر لاہور

واقف نہیں ہیں لفظ ہجر کے مفہوم سے
ہم تو ہر شب چشمِ تصور سے ترا دیدار کرتے ہیں
(کائنات حزیں کراچی کا جواب)

طالب حسین طلحہ ملتان
سحر ملی نہ ہمیں شامِ غم گزار کے بھی
وہی حساب رہا قرضِ جاں اتار کے بھی
(فاروق تبسم کا جواب)

شگفتہ مشتاق لاہور
تھیں شامیں جو گزر گئیں
تھیں امانتیں کئی سال کی
(منشی صفدر حسین گاڈرلڈن کا جواب)

امتیاز تو قیر شاہ شیخوپورہ
اے پاسبانِ گلشن تجھ کو خبر نہیں ہے
شعلے بھڑک رہے ہیں پھولوں کی انجمن میں
ندرت بانو ساہیوال

افلاس کا سایہ جو انساں پہ رہا ندرت
فقدانِ محبت کا ہر لمحہ سرا ہوگا
مسرور حسن دینہ

آئے بھی عیادت کو احباب تو کیا ہوگا
اک زہر بھرا خنجرِ دامن میں چھپا ہوگا
(رانا حبیب الرحمن لاہور کا جواب)

نوشین مصطفیٰ لاہور
نہیں واقف میں آدابِ سحر سے
نہیں واقف میں آدابِ وفا سے
زمانے میں ہر اک سے مانگتا ہوں
نہیں مانگا تو اس اپنے خدا سے

182

ماہنامہ سرگزشت

مارچ 2014ء

علمی آزمائش - 100

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ اختصاری

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صفحہ سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیں کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے نوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 26 فروری 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

والد کا نام ایزدخشا تھا۔ 1837ء میں مشرقی پنجاب کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں رہے تو غالب کا ساتھ رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد نواب آشفتم کے ساتھ رہے پھر لاہور آ گئے۔ سرسید سے روابط بڑھے تو ایک طویل نظم لکھی جس نے برصغیر میں دھوم مچادی۔ آج بھی وہ نظم ہر ایک کی زباں پر ہے۔ 31 دسمبر 1914ء میں فوت ہوئے۔

علمی آزمائش 99 کا جواب

محمد حسین آزاد 1833 میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ جنوری 1910ء میں بمقام لاہور انتقال کیا۔ اردو کے بڑے انشا پردازوں میں شمار ہوتا ہے۔ اردو کی پہلی کتاب تارود کی چوتھی کتاب آپ ہی نے تصنیف کی۔ تصنیفات کی تعداد 41 سے زائد ہے۔

انعام یافتگان

- 1- طیب شاہین، گجرات 2- کرن سعید، کوئٹہ 3- خالد محمود، کراچی
- 4- شیخ عامر، لاڑکانہ 5- شاہد خان، فیصل آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

مردان سے محمد انور (باڑی چم وٹی) کراچی سے احمد خان رضا خان ناہید میر، سید عباس رضا رضوی، نور، نسیم علی سید عامر، تحریم، امیر السلام، جمیل عثمانی، واحد خان، اختر بلقیس کوکب، شاہ بخاری، آفتاب منصور، اقبال احمد چشتی، اختر حسین، نوشین ملک، احسن خان اچکزئی، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نسیم اختر، اقبال قریشی، واحد شاہ نعمت مرزا، جاوید اقبال، فیضان

ماہنامہ سرگزشت

184

مارچ 2014ء

انصاری، فیض مسیح، شاہوکی۔ لاہور سے نسیم بٹ، ثار سل، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سلیم درانی، شاہینہ بتول، چوہدری نیاز مسلم خان، زینت انصاری، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر، شاہ بخاری، کوکب گروہی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف خان، ابراہیم شاہ، محمد پہلوان اختر، نگار ملک، نسیم زور شاہ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے مفتی فضل اللہ، عقیل احسن، حبیب الرحمن، شہروز، اصغر خان۔ پشاور سے زاہد خان، احسان خان، بشیر فاروقی، قاسم جان، احمد مجاہد، مرتضیٰ زیدی، نسیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندامتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان عقیل فیضان، ڈیرا غازی خان سے غالب علی، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، نسیم الدین، ڈیرا اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، ارشد آفاق۔ ملتان سے عطا اللہ، عتیق الرحمن، فیض الحسن، قیام خان، شیریں عدنان، زہیب سلطان، نور خان ترمذی، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جہلم سے ابراہیم شاہ، ابرار شیخ، جاوید محمد خان، تقی عثمان، نیاز حسن، حلیم اللہ خان، محمد فراز، محمد ندیم، کاظم بیگم، فرحت اللہ، ارتضیٰ حسین، نسیم حسن، عباس۔ حیدر آباد سے ماہ رخ (لطیف آباد) بہاولنگر سے نوشین عتیک۔ بہاولپور سے وقار احمد، فراز احسن فاروقی۔ میانوالی سے سہاب خان، ملک انور۔ لیہ سے خاقان الحسن۔ مظفر گڑھ سے حبیب الرحمن، فیضان عثمانی، عقیل سید، عبادت حسن، قیصر خان، عطا خان، فیروز حسن، اصغر محمود، امجد ملکائی، بشیر خان، نسیم وٹو، ماہم حسن۔ جھکڑ سے فقیر غلام حسین ضیاء۔ اسلام آباد سے حیات علی، ذیشان شاہ، سنجیدہ شاہ، انعم بٹ، شاہ نواز، زاہد خان، ذوالقرنین، فصاحت مرزا، بلال مصطفیٰ، سلام خان، شریف الحسن، نادر خان، صلاح الدین، مرید علی خاگوانی، اسلم خان، نسیم امتیاز علی دستوری، مہر خان، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، ڈاکٹر سعادت علی خان، ملک نوریز، فتح الدین، قیصر خان، عدنان سعیدی، غنصر عباس، ابراہیم حسن، شریف شاہ، جتن نواز، صاحب جان، بشیر کمال، فیض خان، صلاح الرحمن، سید عباس زیدی، عباس کاظمی، قاسم جان۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ کوئٹہ سے سلطان شاہ، تقی علی سید تقی چنگیزی، نور الحسن زیدی، نور فرید خان، ارباب خان، محمد فیضیاب، مستقیم اللہ، تقی کاظمی، عائشہ بختاور، نور فاطمہ، ارباب چنگیزی، فرحت بابر، خاقان عباس، عنایت، اچکزئی، فیاض ناصر، سید شاہد حسین، انعام اللہ، مفتی فیض، فیصل آباد سے سید خرم کرمانی، منڈی بہاؤ الدین سے زاہد علی، تاشیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ۔ ساہیوال سے محمد افضل خان سیالکوٹ سے منظر خان، حسن عالم، درویش خان، محمد مظہر، سید محمد بشیر رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ثنا اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نسیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضل میو، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، شاہبتول، نسیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔ نگار جہاں، محمد خواجہ، سید احترام حسین رضوی، مریم ریاض، سید عزیز الدین، بختاور شاہ، عارضہ سلطان، کبکشاں نسیم، وجاہت علی، ابراہیم احمد، عنایت مسیح، کاوش اختر، علی احمد، نجم الدین حیدر، تنویر حسین زیدی، کلیم اللہ چشتی، رجب علی مرزا، نواز علی شاہ، منور علی، نجم الدین حیدر، ناصر افروز، ملک سرفراز کوندل، نصرت فاروقی، ممتاز الحسن، کاشف حیدر، نسیم احمد، وجاہت ایثار، جاوید علی، انعام خان، انصار حسین، مظفر حسن، سیام فاروقی، خالد عثمانی، افتخار احسن، قائم علی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، نذر علی برمانی۔ لاہور سے مسرت اسلم، ارشد علی، تابش عطاری، احمد علی مشرقی، نیاز احمد ملک، ممتاز الحسن، برق ضیائی، خالد علی، عقیل سندھو، احمد بشیر بٹ، نعمان اشرف، نسیم مرزا، ارباز خان، حدیقہ اشرف، گل زیب، اکرم صدیقی، پروین ضیاء، ملک واحد الحق، نعمان اشرف، ثار اختر، ابراہیم احمد انعام، نازش خان، ہما جیس، حمیرا خاتون، تابش اطہر، نازش حسین، زبیر اسلم، ممتاز الحق۔ راولپنڈی سے نزجس علی، زویا بخاری، بخت خان، کائنات بانو، سید محمد تقی، زبیر شاہ اشرفی، تنویر الحسن، رانا فتح یاب، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، زاہد عباسی، خاقان خان، محمد رفیق خان۔ اسلام آباد سے شاہین اشفاق، خضر حیات، عباسی، محمد متین، سعید اختر بشیر فاروقی، ردامتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد شہزاد، نسیم جاوید، ڈاکٹر ثروت جاوید۔ میرپور خاص سے نوریز اختر۔ کوئٹہ سے راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، تقی چنگیزی، قتل سید پوری، نگار بٹ، صالح بشیر، خاقان عمران، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزمان، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، خلیق الحق، خضر حیات، سید امتیاز حسین بخاری، چکڑ الوی، ظفر اقبال جاوید (سلاوالی)۔ ملتان سے قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان اچکزئی، لبنی ظہیر، نصیر الدین واصف، اقبال حمیدی، فاروق ابراہیم، صلاح الدین احمد، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش، محمد احمد۔ جہانیاں سے محمد سہیل انجم، رانا وجدانی، اصغر میٹو، نصیر الدین، کاشف زیدی، زبیر ملک، فرہاد اصغر، نوشین سلطان۔ کوٹ ادو سے ممتاز احمد، فرخ بشیر، نعمان بشیر، احمد یار خان، ناصر رند، فیاض چوٹالہ، الہ دینو، آفاق سعید۔ ممالک غیر سے مایا حمید (لندن)، ممتاز جہاں (العبین یو اے ای)، ظہیر خان، نصرت جاہ (جدہ سعودیہ)، انعام ملک (جرمنی)، فہد فاروق (ٹوکیو، جاپان)، اشفاق کیانی (جرمنی)، انعام اللہ، فصاحت خان (العبین)، شاہد طاہر محمود، ٹی ایک (یو اے ای)

ماہنامہ سرگزشت

185

مارچ 2014ء



وقت واپس آتے ہوئے۔
روبینہ ایک سرکاری اسکول
میں پڑھاتی تھی۔ ملازمت اگر
سرکاری نہ ہوتی تو وہ کب کی
ملازمت چھوڑ کر گھر کے نزدیک
ہی کسی اسکول میں ملازمت کر لیتی
لیکن سرکاری ملازمت بہر حال
پرائیویٹ اسکول کی ملازمت سے
بہتر تھی۔

روبینہ کو صبح بہت مشکل سے
اندر داخل ہونا نصیب ہوتا۔ کبھی کبھی
تو بس میں اتار دیا جاتا کہ اسے
چڑھنے کا موقع ہی نہ ملتا اور وہ بے
بسی سے بس کو نکلتی رہ جاتی۔

بس میں چڑھ بھی جاتی تو
اندر موجود عورتوں سے لاکھ بچنے
کی کوشش کرتی لیکن اس دھینگا
مشتی سے کپڑوں اور چلوں۔۔۔

بچائے رکھنا بہت مشکل تھا سستے
کامیوں سے بچے چہرے اور گھٹیا
پرفیوم کی تیز بو اس کے دماغ میں
چڑھ جاتی۔ خاموش کھڑے رہنے

کے باوجود ایک دوسرے کی سانسیں اور پسینے کی بوناک اور
منہ میں گھس کر کراہیت پیدا کرتی تھی۔

واپسی کا سفر نسبتاً پرسکون ہوتا۔ صبح کو تو جیسے تیسے بس
پکڑنے کے لیے بھاگتا پڑتا، پھر اسٹاپ سے اسکول تک تیز
تیز قدموں سے پیدل چلتا پڑتا۔ اور افراتفری میں روبینہ
کے کپڑوں اور میک اپ کا ستیاناس ہو جاتا۔ چائے اور دو
پاپے پیٹ میں چھینے لگتے۔ پھر اسکول کی ہیڈ مسٹریس اور
بچوں سے مغز ماری۔ یوں تو واپسی میں بھی یہی حکم چل
ہوئی لیکن گھر جا کے اطمینان سے کھانا کھانے اور سکون سے
سونے کا خوش گوار احساس تو ہوتا تھا۔

وہ سال کا گرم ترین دن تھا لیکن سفر چونکہ واپسی کا تھا
اس لیے دھکم پیل اور دھینگا مشتق کے باوجود روبینہ کو اتنی
کوفت نہیں ہو رہی تھی۔ ناظم آباد کا اسٹاپ آتے ہی روبینہ کو
باہر نکلنے کی فکر ہوتی۔ چپاگیر روڈ سے وہ ایک سیٹ کے ساتھ
لیک لگا کر کھڑی ہوئی تھی تو ناظم آباد ایک نمبر تک وہاں

سے بل بھی نہیں سکی تھی۔ مردانہ حصے میں بیٹھا ہوا موٹا آدمی
حلیے سے دودھ والا لگ رہا تھا جو مسلسل اسے گھورتا رہا تھا۔
یوں جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے کھا جائے گا۔

بس سے اترنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ وہ دھکے کھاتی اور
دھکے دیتی، برابر کھڑی عورت کی گود میں چڑھتی تھی سے بچتی
بیچتی یہ مشکل تمام باہر نکلنے میں کامیاب ہوتی اور کھلی فضا میں
نکل کر وہ کچھ دیر تک گہرے گہرے سانس لیتی رہی، پھر گرتی
پڑتی گھر کی طرف روانہ ہوتی۔ اس نے سوچا، روز کی طرح
آج بھی کھانے پکانے میں امی کی مدد کرنا پڑے گی۔ امی
کے بعد وہی تھی جو چوبیس کے نزدیک جاسکتی تھی۔ اس سے
چھوٹی افشاں ابھی بہت چھوٹی تھی اور بھائی مرد ہونے کے
اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ بل کر پانی پینا بھی اس کے منصب کی
توہین تھی۔

وہ تیز تیز قدم رکھتی گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ شدید
گرم ہوا میں اس کے رخساروں پر پھیڑے برس رہے تھے۔

لیسی پیرا

جناب مدیر اعلیٰ
آداب!

میں نے پہلی بار ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہانی لکھی ہے۔ یہ میری اپنی
کہانی نہیں ہے۔ اسے آپ میری دوست کی خودنوشت بھی کہہ
سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔

امیمہ سلیم

(کراچی)

راوی: روبینہ روبی

XX

وہ پاپے اور چائے کا ناشتا کر کے گھر سے نکلی اور تیز
تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف بڑھی۔ بس اسٹاپ اس
کے گھر سے خاصا دور تھا۔ ان دنوں موسم زیادہ گرم نہیں تھا،
ورنہ گرمیوں میں تو بس اسٹاپ تک جاتے جاتے اس کا حلیہ
بگڑ جاتا تھا۔ کپڑے پسینے میں بھیگ جاتے تھے اور اکلوتی
چپل پر دھول جم جاتی تھی۔ روبینہ اب تو ان معمولات کی
عادی ہو گئی تھی لیکن بہر حال ذہنی کوفت تو اپنی جگہ تھی۔

بس آئی تو وہ بھی کچھ کچھ بھری ہوئی تھی۔ یہ مشکل
اسے کسی طرح اندر گھسنے کی جگہ ملی۔ پھر بس کھڑکھڑائی، گاڑھا
گاڑھا دھواں چھوڑتی روانہ ہو گئی۔ بس کے مردانہ اور زنانہ
دونوں حصے کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔ روبینہ کا دم گھٹا جا رہا
تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں مختلف رنگوں کے قہقروں، دوپٹوں،
بالوں بھرے سروں اور بات بات پر ایک دوسرے کو برا بھلا
کہتے لوگوں سے اٹے ہوئے تھے۔ بس کے پائیدان پر
لوگوں کا اتنا جگمگاتا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا۔ بس کے
دروازوں سے لوگ دودھ کی طرح ابلے پڑ رہے تھے۔ ہر
طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ بس بھی کبھی اسٹاپ پر سڑکوں کے
بچ میں ٹھہرتی۔ اس کے باوجود ہر روز دو مرتبہ روبینہ کو بس کا
سفر کرنا ہی پڑتا تھا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے اور سہ پہر کے

وہ بنگلا بہت عالی شان تھا۔ اس کا لان اتنا بڑا تھا کہ
وہاں کرکٹ کھیلی جاسکتی تھی۔ لان کی سبز سبز تراشیدہ گھاس
آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ پھر کیاریوں میں لگے
رنگ برنگ کے خوش نما پھول نہ صرف منظر کا حسن بڑھا رہے
تھے بلکہ ان کی مسور کن خوشبو سے پوری فضا معطر ہو رہی تھی۔
روبینہ ایک باوردی بیرے کی رہنمائی میں اندر بڑھی۔
ابھی اس نے چمکدار چمکتی ٹانگوں پر قدم رکھا ہی تھا
کہ ہڑبڑا کر آنکھ مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی اماں کی درشت
آواز کانوں سے ٹکرائی ”اٹھ جا رو بی!“

”اٹھ رہی ہوں اماں!“ روبینہ نے منہ بنا کر کہا۔
اماں نے اچھے بھلے خوبصورت خواب کا ستیاناس کر دیا تھا۔
روبینہ نے کسل مندی دور کرنے کو انگڑائی لی اور بستر
سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خوابوں کی دنیا جتنی خوبصورت اور
حسین تھی، حقیقت کی دنیا اتنی ہی ناگوار اور بد صورت تھی۔

اس نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھوئے اور کپڑے
بدل کر تیار ہو گئی۔ وہ رات ہی کو کپڑوں پر استری کر کے
لٹکا دیتی تھی کیونکہ صبح اتنا وقت نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی لائٹ
بھی عین وقت پر غائب ہو جاتی تھی تو بہت پریشانی ہوتی
تھی۔

اسے گلی میں کھیلتے ان بچوں پر حیرت ہوئی جو گری کے احساس سے عاری اپنے کھیل میں مگن تھے۔ کچھ گھروں میں ریڈیو اور ٹی وی بلند آواز میں چل رہے تھے۔ اس نے گھر میں داخل ہو کر پرس ایک طرف پھینکا اور اپنی اکلوتی سیاہ سینڈل سے پیروں کو آزاد کرتی ہوئی وہ ہاتھ روم میں صس گئی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اسے بہت طمانیت کا احساس ہوا۔

”ارے روہی! آگئی، آج دیر کیسے ہوگئی؟“

”امی! بس ڈرائیور میرا تو کر نہیں ہے کہ میں اسے جلدی پہنچانے کا حکم دیتی یا اسے سواریاں ٹھونسنے سے روکتی۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”ناراض کیوں ہو رہی ہو بیٹا!“ امی نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں کہ آج آپا شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہی ہیں۔ بس تم پکڑے بنا لو۔ باقی چیزیں تو میں نے بازار سے منگوا لی ہیں۔“

سلمان کا خیال آتے ہی روبینہ کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی بال سنوارے اور مختصر سے باورچی خانے میں داخل ہوگئی۔ پھر اس نے ایک چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھ دیا اور دوسرے چولہے پر کڑھائی رکھ کر پکڑے تلنے لگی۔ اس نے بیسن کے ساتھ ساتھ زندگی کی مشکلات کو بھی کھولتے ہوئے تیل میں ڈالنے کی کوشش کی اور زیر لب مسکرا کر آنے والے خوش کن وقت کا تصور کرنے لگی۔

☆☆☆

کپڑوں کے چند جوڑے، معمولی سا بیڈ اور سستا سا صوفہ، کالج کے کچھ برتن، سلمان کو دی جانے والی شیروانی، انگوٹھی اور گھڑی، اتنے سے سامان کے لیے روبینہ کے والدین نے سات مہینے تک انتظار کیا تھا۔ جہیز کے نام پر یہ سامان لے کر وہ سلمان کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ وہی محلہ، وہی لوگ! بس دو گلیوں کا فاصلہ طے کرنے میں اسے بیس برس لگے تھے۔

وہ کافی دیر سے سر جھکائے ایک ہی زاویے سے بیٹھی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ سلمان نے اس کے نزدیک ایک ٹیبل فین رکھ دیا تھا ورنہ گرمی اور جھپ کے مارے اس کی جان ہی نکل جاتی۔ محلے کی عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

”کیا مصیبت ہے؟“ روبینہ نے سوچا۔ ”لوگ اتنے فالتو کیوں ہوتے ہیں؟ ان ہی عورتوں کے سامنے میں جوان

ہوئی ہوں۔ کیا وہیں بننے ہی میرے سر پہ سنگ نکل آئے ہیں جو یوں مجھے دیکھنے کو بے تاب ہیں؟“

محلے کی عورتیں اب اسے کم اور اس کے لائے ہوئے سامان کو زیادہ دیکھ رہی تھیں۔ کچھ اپنے شوہروں کے قہقہے مزے لے لے کر سنار ہی تھیں اور روبینہ کے سامنے ڈوموسی جملے بول کر پھٹکوتے پن سے ہنس رہی تھیں، بھوک سے الگ اس کا برا حال تھا۔ رخصتی کی آواز آتے ہی بریانی کی پلیٹ اس کے آگے سے ہٹائی گئی تھی۔ اس نے جو دو تین تھلے لیے تھے، وہ کب کے ہضم ہو چکے تھے اور اسے چکر آنے لگے تھے۔

خدا خدا کر کے سلمان کی آمد ہوئی تو ان جاہل اور گنوار عورتوں سے جان چھوٹی اور روبینہ نے شکر کی طویل سانس لی۔

☆☆☆

سلمان نے اپنے دفتر سے اور روبینہ نے اسکول سے ایک ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ وہ چھٹیاں ایک دو کا رشتے داروں کی دعوت اڑاتے یا سلمان کی ویسا پرسی ویو، مزار قائد اور اسی طرح کے سیرپاٹوں میں گزر گئیں۔

ایک بار پھر اس کی زندگی پہلے کی طرح مشینی انداز میں گزرنے لگی۔ سلمان نے اس سے کہا بھی تھا کہ تم ملازمت چھوڑ دو اور گھر بیٹھو۔

”نہیں سلمان!“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں مل کر کمائیں گے تو ہمیں خوشحالی نصیب ہوگی۔ اتنی مشکل سے تو یہ ملازمت ملی تھی، پھر مجھے کون سے مل چلا تا ہوتے ہیں۔“

سلمان نے اس کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیے۔

اسکول کی ملازمت تو وہی تھی لیکن روبینہ کے معمولات میں خوش گوار تبدیلی آگئی تھی۔ اب اسے بسوں کے دھکے نہیں کھانا پڑتے تھے۔ سلمان اسے اسکول چھوڑتا ہوا اپنے آفس چلا جاتا تھا۔ واپسی کا مسئلہ تھا۔ سلمان کی واپسی ساڑھے چار بجے تک ہوتی تھی۔ وہ بھی ایک سرکاری دفتر میں خاصی معقول پوسٹ پر ملازم تھا ورنہ ساڑھے چار بجے چھٹی کا کیا سوال؟ پرائیویٹ کمپنیاں تو سات بجے سے پہلے اپنے ملازمین کو نہیں چھوڑتیں۔

واپسی کا صلہ روبینہ نے یہ نکالا کہ وہیں آس پاس دو تین ٹیوشن پڑھانے لگی۔ یوں وقت بھی گزر جاتا اور اسے فاضل آمدنی بھی ہو جاتی۔ پھر وہ اطمینان سے سلمان کے

ویسا پرسی واپس آ جاتی اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ اسے بسوں کے دھکوں اور کوفت سے نجات ملی۔

اس کا لباس بھی اب پہلے کی نسبت صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اسے اپنی خوبصورتی کا احساس تو پہلے بھی تھا لیکن اب بننے اور بننے اور بناؤ سنگار کی وجہ سے اس کی شخصیت مزید رنگش ہوگئی تھی۔ اس کی رنگت سرخ و سفید ہوگئی تھی اور مزاج میں بھی خاصی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

وہ اپنی چھوٹی موٹی تلکھنوں کو نظر انداز کر کے ایک بھر پور زندگی جی رہی تھی۔

اس کی پرسکون زندگی میں محرومی کا زہر تو اس روز گھلا جب وہ سلمان کے دودھیالی رشتے دار کے گھر ایک تقریب میں شریک ہوئی۔ وہ لوگ ڈیفنس جیسے مہنگے علاقے میں رہتے تھے۔

فریڈہ آنٹی خاصی باوقار خاتون تھیں۔ وہ بہت سادہ لیکن قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھیں اور بہت خنداں پیشانی سے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔

روبینہ نے اتنا بڑا اور خوب صورت محل جیسا گھر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ لیکن نہیں پہلی دفعہ کہاں، میں تو اس گھر کو خوابوں میں دیکھتی رہی تھی۔ وہی خوب صورت لان، وہی مہکتے ہوئے پھول، وہی دبیز قالین اور بیش قیمت فرنیچر! آنٹی فریڈہ اور ان کے بچے تو کیا، گھر کے ملازم تک انتہائی مہذب تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے، بنگلے کی تزئین و آرائش اور مہمان خواتین کے قیمتی ملبوسات اور جھلملاتے زیورات سے وہ بری طرح مرعوب ہوگئی۔

جتنے جوش و خروش سے وہ پارٹی میں گئی تھی، واپسی پر اتنی ہی بے کل اور مضطرب تھی۔

سلمان نے اس کی خاموشی کو بھانپ لیا اور بولا۔ ”روہی! کیا بات ہے، کیا پارٹی میں مزہ نہیں آیا؟“

”نہیں سلمان..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بہت مزہ آیا۔“ پھر وہ موضوع بدل کر بولی۔ ”سلمان کتنی خاموشی ہے۔ کتنا سکون ہے اس علاقے میں اور بنگلے کتنے عالی شان بنے ہیں۔“

سلمان نے ہنس کر کہا۔ ”اس سے بھی زیادہ خاموشی اور سکون قبرستان میں ہوتا ہے۔“

روبینہ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ سلمان اس کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پرسکون علاقے کی خاموشی کو ویسا کی کرخت آواز مجروح کرتی ہوئی آگے بڑھ

رہی تھی۔

روبینہ سوچ رہی تھی، یہاں کے مکینوں نے تو زمین پر اپنے لیے جنت تعمیر کر لی ہے۔ انہیں موسموں کی شدت کی پروا تک نہیں ہے۔ گرمی میں اسے سی کی خنکی، سردیوں میں ہیش اور بارش کا لطف اٹھانے کے لیے وسیع و عریض لان اور چھتیں۔ بارش کے بعد ان کا علاقہ تو مزید نکھر جاتا ہوگا۔ ہمارے علاقے کی طرح نہیں کہ ایک ہی بارش میں سڑکیں جل تھل ہو جاتی ہیں، کنیرا بننے لگتے ہیں اور ہر جگہ کچھ نظر آتی ہے۔ زندگی کا نظام ہی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

روبینہ کی خاطر سلمان نے اسکول کا رخ آئس کریم کی اس دکان کی طرف موڑ لیا جہاں کی آئس کریم روبینہ کو بہت پسند تھی۔ پھر واپسی کا سفر بھی ہنستے بولتے طے ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دوران میں ہنسنے بولنے کا کام سلمان ہی نے انجام دیا۔

اپنے علاقے میں داخل ہوتے ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے نے ان کا استقبال کیا۔

ان دنوں لوگ لوڈ شیڈنگ جیسی ”نعمت“ سے محروم تھے۔ مہینے میں دو تین دفعہ لائٹ جاتی تھی۔ وہ بھی کسی فنی خرابی کے باعث۔

”شاید کوئی بڑی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔“ سلمان نے کہا۔ ”پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔“

روبینہ نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اسے تو اب یہ کوفت شرع ہوگئی تھی کہ اگر بجلی کی خرابی ابھی دور نہ ہوئی تو پوری رات جاگتے اور چمچروں سے لڑتے گزرے گی۔

عورتیں، بچے اور مرد سبھی گلی میں بیٹھے تھے۔ بچے حسب معمول اپنے کھیل میں مصروف تھے اور عورتیں ایک دوسرے کی غیبت یا اپنے بچوں اور شوہر کی تعریف کر رہی تھیں اور بچوٹے انداز میں ہنس رہی تھیں۔ ویسا کی روشن ہیڈ لائٹس میں وہ انہیں دیکھنے لگیں اور وہاں پھسکڑا مار کے بیٹھے ہوئے مرد اپنے سر سمیٹنے لگے۔

”کتنا فضول محلہ ہے؟“ روبینہ زیر لب بڑبڑائی۔ ”ذرا تمیز نہیں، بھلا یہ کیا تنگ ہوئی کہ لائٹ کیا گئی لوگوں نے گلی کو بیٹھک بنا ڈالا۔“

”اوکم آن روہی!“ سلمان خوش دلی سے بولا۔ ”کیوں اپنا جی جلاتی ہو جان، یہ سب کچھ نیا تو نہیں ہے۔ ہم بھی تو ان ہی گلیوں میں کھیل کر جوان ہوئے ہیں۔ پلیز، موڈ مت خراب کرو بلکہ اس اندھیرے کو اپنے رومانس

کا تھنہ سمجھو۔ تمہیں یاد ہے ہم ان ہی اندھیروں میں ایک دوسرے سے ملنے تھے اور اندھیرے کے شکر گزار ہوتے تھے۔“ سلمان نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے زمین پر اپنے جوتے سے مسلتے ہوئے کہا۔

روبینہ کو بھی سلمان کی بات پر وہ دن یاد آگئے جب وہ اپنے موقعوں پر سلمان سے ملتی تھی۔ وہ بے اختیار مسکراتے لگی۔

اس دن روبینہ اسکول جانے لگی تو اسے چکر سا آگیا۔ سلمان نے اسے اسکول سے چھٹی کرنے کو کہا اور اپنی ماں سے کہا کہ آپ روبینہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیے گا۔ آج آفس میں بہت اہم میٹنگ ہے ورنہ میں خود ہی لے جاتا۔

شام کو سلمان واپس آیا تو ایک خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ اس کی امی نے اسے بتایا کہ وہ دادی بننے والی ہیں۔

سلمان خوشی سے جھوم اٹھا اور اسی وقت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ روبینہ نیکی سے فیک لگائے نیم دراز تھی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”یار، اتنی بڑی خوش خبری..... اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“ اس نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

”مجھے تو خود آج ہی معلوم ہوا ہے تو میں کیا بتاتی؟“

روبینہ نے مسکرا کر کہا، پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ”شکر ہے جانو، یہ گڈ نیوز مل گئی ورنہ کچھ دن میں خالہ جان مجھے سروس اسٹیشن لے جاتیں۔“

”سروس اسٹیشن! کیا مطلب؟“ سلمان الجھ کر بولا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں خواتین کے سروس اسٹیشن میسٹری ہوم کی بات کر رہی ہوں۔“ روبینہ مسکرائی۔ ”جیسے گاڑیوں کی سروس کے لیے سروس اسٹیشن ہوتے ہیں اسی طرح خواتین کے لیے بھی گانا کالوجسٹ ہوتی ہیں۔ شادی ہوئے دو چار ماہ ہوئے نہیں کہ سائیں اپنی بہوؤں کو لے کر چیک اپ کے لیے گانا کالوجسٹ کے پاس دوڑتی ہیں کہ ان کی لائی ہوئی گاڑی..... میرا مطلب ہے کہ لڑکی میں کوئی نقص تو نہیں؟“

سلمان..... کھلکھلا کر ہنس پڑا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”یار تم بھی اچھی خاصی حس مزاج رہتی ہو۔ میرا خیال ہے، اب تم جاب چھوڑ دو۔ امی بتا رہی تھیں کہ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔“

”آرام کا نہیں، احتیاط کا۔“ روبینہ ہنس کر بولی۔ ”ڈاکٹر کے مشورے میں امی کے بہت سے مشورے

بھی شامل ہیں۔“

”نہیں روہی!“ سلمان نے کہا۔ ”میں واقعی اب یہ چاہتا ہوں کہ تم ملازمت چھوڑ دو۔ میری تنخواہ میں اضافہ خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب میری تنخواہ میں گزرا رہا ہوگا۔“

”بھلا کیسے ہوگا گزرا؟“ روہی نے کہا۔ ”اب اخراجات کم نہیں ہوں گے بلکہ مزید بڑھیں گے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ سلمان نے حسب معمول اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

سلمان کی امی کو البتہ اعتراض تھا کہ روبینہ ملازمت کرے لیکن وہ بہو اور بیٹے پر بھی اپنے فیصلے مسلط نہیں کرتی تھیں۔ بس ہر وقت روہی کی طرف سے فکر مند تھیں۔ پھر یوں ہی تفکرات اور احساسات کے گرد بچکولے کھاتے،

وقت کی رسی پر آٹھویں مہینے کی گرہ پڑتے ہی روبینہ کو اس گھر میں بہو بن کر لانے والی خود ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو گئی۔

سلمان کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ اس کے باپ کا تو برسوں پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اسے ماں ہی نے محنت کر کے پالا تھا۔ بڑھاپا لکھایا تھا۔ ماں کی جدائی کا صدمہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس موقع پر روبینہ اور اس کی امی نے سلمان کی بہت دل جوئی کی، اس کے دل پر محبت کا مرہم رکھا تو وہ خاصا سنبھل گیا۔ پھر اسے روبینہ اور آنے والے مہمان کی بھی فکر تھی۔ اس لیے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

زندگی پھر اسی ڈگر پہ چل پڑی۔ اب سلمان کو روبینہ کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ روبینہ نے اسکول سے چھٹی لے لی تھی لیکن گھر میں تو وہ تنہا ہی ہوتی تھی۔ امی کی ذات سلمان اور روبینہ دونوں کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ اب تحفظ دینے والا وہ سائبان ہی نہ رہا تھا۔

روبینہ کی امی ہی اس کی خبر گیری کو آجاتی تھیں۔ سیر نے اس گھر میں جنم لیا تو اداسی کے بادل چھٹ گئے اور ایک مرتبہ پھر روبینہ اور سلمان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ سلمان کو بس یہ افسوس تھا کہ اس کی ماں پوتے کی خوشی دیکھے بغیر دنیا سے چلی گئی۔ پھر ننھے سیر کی قلتقاریاں اس کی افسردگی کو خوشی میں بدل دیتیں۔

روبینہ بھی سیر کی آمد پر خوشی سے سرشار تھی۔ روبینہ کی چھٹی ختم ہوئی تو زندگی ایک مرتبہ پھر پرانی

رہنے لگی لیکن اس مرتبہ روبینہ کی ذمہ داری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ننھے سیر کی تیاری بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ صبح سیر کو اپنی امی کے حوالے کر کے خود سلمان کے ساتھ اسکول چلی جاتی۔

آفس جاتے ہوئے سلمان نے بتایا کہ پرسوں تائی ماں کی برسی ہے۔

”نا بھی؟“ روبینہ نے فوراً کہا۔ ”اب ہمارے پاس وقت کہاں ہے؟“

”جانا تو پڑے گا روہی!“ سلمان نے کہا۔ ”ورنہ فریڈ آئی کو بہت افسوس ہوگا۔“ سلمان نے کہا۔ ”تائی ماں آخر ان کی ساس تھیں۔ اور.....“

”وہ ڈیفنس والی فریڈ آئی؟“ روبینہ نے پوچھا۔

”ہاں بھی وہی فریڈ آئی؟“ سلمان نے جواب دیا۔ ”بس ہم وہاں زیادہ دیر بیٹھیں گے نہیں۔“

”سلمان! اگر جانا ہی ہے تو پھر جلدی اور دیر کا کیا ہے۔ میں اسکول کے بعد بچوں کو نہیں پڑھاؤں گی۔ اور آپ بھی دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لے لیں۔“

تین ماہ کی طویل چھٹی کے بعد روبینہ کلاس روم میں داخل ہوئی تو بچیاں خوشی سے کھڑی ہو گئیں اور پوری کلاس نے ہم آواز ہو کر کہا۔ ”السلام علیکم مس!“

”علیکم السلام!“ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے روبینہ نے کلاس روم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہی بچیاں، کچھ کی یونیفارم صاف، کچھ کی میلی اور گندی۔ کسی بچی نے شلوار اور دوپٹے میں اتنا نیل لگا لیا تھا کہ ان کا سفید رنگ، آسانی ہو رہا تھا۔

کئی کے بال تیل میں چڑھے ہوئے تھے اور کسی کے اتنے روکھے کہ گھونسلے کا گمان ہو رہا تھا۔ کسی کے بال کھلے ہوئے تھے اور کسی کی ادھ کھلی پونی ٹیل۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماؤں نے اپنا جان چھڑانے کو بس جلدی جلدی الٹا سیدھا تیار کر کے گھر سے نکال دیا ہو۔

روبینہ نے بیزاری سے ان بچیوں کو دیکھا جو اسے لڑتوں نظر دے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکیاں روبینہ کو اس لیے پسند کرتی تھیں کہ وہ انہیں سزا نہیں دیتی تھی، کبھی مارتی نہیں تھیں۔ سزا دینے یا پٹائی کرنے کی نوبت تو اس وقت آتی جب وہ ان بچیوں کو دل سے پڑھاتی۔ وہ تو مارے باندھے کلاس میں آتی تھی اور جلدی جلدی بڑھا کر گویا اپنے فرض سے بلکدوش ہو جاتی تھی۔ دوسری ٹیچرز تو اتنا بھی نہیں کرتی

تھیں۔ کبھی کوئی سخت مزاح اور با اصول ہیڈ مسٹریس آ جاتی تو ٹیچرز اسے کوتاہی ہوئی کلاسوں میں جاتیں اور اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہ معصوم بچیوں پر اتارتیں۔

روبینہ نے اس دن الٹا سیدھا پڑھایا اور چھٹی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے گھر کی فکر بھی ستا رہی تھی۔ ابھی تو بہت سے کام ادھورے تھے جو اسے گھر جاکے نمٹانا تھے۔

ساس کی کمی تو اسے پہلے بھی محسوس ہوتی تھی لیکن اس وقت اسے بہت شدت سے ان کے نہ ہونے کا احساس ہوا۔ گھر جاتے جاتے وہی شام ہو گئی لیکن وہ ملازمت چھوڑنے کو اب بھی تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

اس دن بھی لائٹ نہیں تھی۔ پڑوسی کے پرانے جزیئر کی گڑ گڑاہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سلمان کھٹکتے ہوئے ہونٹ اور چہرے کے تاثرات ہی اس کے الفاظ کے ترجمان تھے۔

روبینہ نے سیر کو دودھ پلا دیا تھا۔ اس کے کپڑے وغیرہ بدل کر اسے دوبارہ امی کے گھر چھوڑنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔ روبینہ نے اس دن خاص اہتمام کیا تھا۔ حیدری مارکیٹ سے سیل میں خریدا ہوا گل احمد کا شلوار سوٹ اس پہ خاصا فٹ رہا تھا۔

اچھی طرح تیار ہو کے اس نے آئینے میں اپنا سراپا ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ اس سوٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سلمان کی ویسا کراچی کی مختلف شاہراہوں سے ہوتی ہوئی ڈیفنس کی طرف جارہی تھی۔ ہر طرف ٹریفک کا ایک اژدھام تھا۔ بڑی بڑی کاروں اور دیو پھل بسوں کے درمیان ویسا کھلونا لگ رہی تھی۔ ٹریفک کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جب

ٹریفک کا رش چھٹا اور ویسا پرسکون علاقے میں داخل ہوئی تو روبینہ سمجھ گئی کہ وہ ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف خوبصورت اور وسیع و عریض بنکے تھے۔ بہت سے بنگلوں کے باہر سبز گارڈز بھی موجود تھے۔ کسی بنگلے کے آگے سے گزرتے ہوئے کتوں کی غراہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ روبینہ دل ہی دل میں سلمان کے اس دولت مند رشتے دار کو دعائیں دے رہی تھی جس کی وجہ سے..... ڈیفنس جیسے مہنگے ترین اور خوبصورت علاقے تک اس کی رسائی ہوئی تھی ورنہ تو اس نے صرف

ناظم آباد سے جہانگیر روڈ یا پھر حیدری کا شاہ پنگ سینٹر اور مزار قائد اور کبھی کبھار کلفٹن کا ایک مخصوص علاقہ ہی دیکھا تھا۔ اس کی سوچ کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب سلمان نے بریک لگایا۔ اس کی نظروں کے سامنے لکڑی کا وہی صدر دروازہ تھا۔ بنگلے کی چار دیواری کے ساتھ ہر ماڈل کی قیمتی اور چمکتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

”لگتا ہے تمام مہمان آچکے ہیں۔“ روبینہ نے ویسا سے اترتے ہوئے کہا۔

ان چمکتی دھمکتی گاڑیوں کے بیچ سلمان کی ویسا بہت ہی حقیر لگ رہی تھی۔ روبینہ دل مسوس کر رہ گئی۔ وہاں کا انتظام دیکھ کر وہ نروس ہوئی جارہی تھی۔ یا اللہ ابیرسی ہے تو اس گھر کی شادیوں کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔

سادہ لیکن قیمتی ملبوسات میں خواتین اور لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔ اس موقع پر بھی بیشتر خواتین نے میک اپ کر رکھا تھا۔ روبینہ بہت چاؤ سے اپنے خیال میں خاصا مہنگا سوٹ پہن کر گئی تھی لیکن ان خواتین کے قیمتی ملبوسات کے درمیان اسے نہ صرف اپنا سوٹ بلکہ اپنا وجود بھی کمتر اور حقیر لگ رہا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے محلے والیوں کی حسرت اور ستائش بھری نظروں نے اسے کافی مغرور کر دیا تھا اور اسی غرور کے سہارے ڈیفنس تک کا سفر آسانی سے گزر گیا تھا۔

وہ ایک بڑے سے ہال کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ گنتی کی چند خواتین قرآن خوانی میں مصروف تھیں، بقیہ دھیمی آواز میں اپنی جیولری، لباس کی تراش خراش اور اپنی مصروفیات کی باتیں کر رہی تھیں۔

”بھئی، میں تو اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اٹلی یا سویٹزر لینڈ جاؤں گی۔“ ایک آواز اس کے کان میں پڑی۔ روبینہ نے سر گھما کر اُدھر دیکھا۔ ایک طرح دار خاتون دوسری سے کہہ رہی تھی۔

”ارے وہاں کیا رکھا ہے۔“ دوسری بولی۔ ”میں تو وہی جاؤں گی۔ وہاں شاہ پنگ کی بھی آسانی ہے اور سفر بھی زیادہ دیر کا نہیں ہے۔“

روبینہ نے حسرت سے سوچا۔ یہ خواتین سویٹزر لینڈ، اٹلی اور وہی جانے کی بات یوں کر رہی ہیں جیسے ہم حیدری اور طارق روڈ جانے کی بات کرتے ہیں۔

اچانک روبینہ کی نظر اہل خانہ کے بچوں پر پڑی۔ بچے انتہائی مہذب اور شائستہ تھے۔ پہلی دفعہ روبینہ نے

انہیں اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مہذب انداز میں مہمانوں کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ کبھی اردو میں اور کبھی انتہائی شستہ انگلش میں۔

روبینہ تصور میں اپنے بیٹے کو بھی اسی وضع میں دیکھ رہی تھی۔ وہ خود ہی مسکرا اٹھی اور سوچا، ہاں کیوں نہیں، میں بھی اپنے بیٹے کو ایسا ہی بناؤں گی۔ اس خوش گوار احساس نے اس کے احساس کتری کو زائل کر دیا۔

وہاں سے واپسی پر روبینہ نے سلمان سے کہا۔ ”اب آپ بھی اس ویسا کا پیچھا چھوڑیں اور کوئی گاڑی لے لیں۔ مجھے تو اتنی قیمتی گاڑیوں کے درمیان آپ کی اس پرانی ویسا کو دیکھ کر بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔“

”روبینہ نیگم! اللہ کا شکر ادا کرو کہ ہمارے پاس چ سواری ہے ورنہ اس شہر کی اکثریت بسوں میں دھکے کھاتی ہے۔ انہیں یہ سواری بھی نصیب نہیں ہے۔“ سلمان نے ناگواری سے جواب دیا۔ ”تم انتہائی ناشکری ہو۔ ذرا اپنے سے کتر لوگوں پر نظر ڈالو۔ ہمارے محلے میں ہی کتنے ہیں جو پیٹ بھر روٹی کھاتے ہیں اور معقول لباس پہنتے ہیں؟“

”میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔“ روبینہ جلدی سے بولی۔ ”میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ اب سمیر کے بعد ہمیں گاڑی کی ضرورت ہے۔ اگر گاڑی ہوتی تو ہم اسے بھی اپنے ساتھ لا سکتے تھے۔ ویسا پر اتنے چھوٹے بچے کے ساتھ سفر کرنا مجھے تو اچھا نہیں لگے گا۔“

اس کی بات سن کر سلمان مسکرایا اور بولا۔ ”مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے۔ تم فکر مت کرو، میں بہت جلد گاڑی لے لوں گا۔“

جواب میں روبینہ بھی مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

زندگی کی گاڑی کو اسی ڈگر پہ گھسیٹتے تین برس پاک جھپکتے بیت گئے۔

اسی دوران میں روبینہ کو ایک اور وجود کی آمد کا احساس ہوا۔ یہ خبر سن کر سلمان خوشی سے نہال ہو گیا۔ اچانک روبینہ نے اس کے سامنے سمیر کا داخلہ فارم رکھ دیا اور بولی۔ ”یہ سمیر کا داخلہ فارم ہے اس پر سائن کر دیں۔“

”یہ کیا بچپنا ہے روبی؟“ سلمان نے کہا۔ ”سمیر ابھی بہت چھوٹا ہے اور.....“

”کوئی چھوٹا نہیں ہے۔“ روبینہ نے کہا۔ ”میں نے بڑے اسکولوں میں تو اس سے بھی چھوٹی عمر کے بچوں کو داخل

کرایا جاتا ہے۔ سمیر ابھی سے اسکول جائے گا تو اسے پڑھنے کی عادت پڑے گی نا!“

”اچھا تو کس اسکول میں سمیر کا داخلہ کرایا جا رہا ہے؟“ سلمان نے پوچھا۔

”ماڈرن ڈیفو ڈلز اسکول!“ روبینہ نے کہا۔ ”اچھا اسکول ہے، انگلش میڈیم ہے اور یہ کہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

”روبینہ، میں تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ عرصہ رہنے ہی دو۔ پھر اپنے ہی اسکول میں اس کا داخلہ کر ادینا۔ ساتھ لانے لے جانے.....“

”سلمان پلیز!“ روبینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آئندہ ایسی بات سوچنا بھی مت۔ میں سرکاری اسکولوں کا حال جانتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرے اور شروع ہی سے احساس محرومی کا شکار ہو جائے۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے روبی؟“ سلمان کے چہرے پر اب جھنجھلاہٹ کے تاثرات تھے۔ ”کیا برائی ہے سرکاری اسکولوں میں۔ کیا ہم نے وہاں تعلیم حاصل نہیں کی؟ کیا ہمیں ملازمت نہیں ملی۔ ان نام نہاد انگلش میڈیم کے بڑے ہوئے لڑکے میرے اسٹنٹ ہیں۔ یقین مانو انہیں کچھ بھی نہیں آتا۔“

”بہت اعلیٰ تعلیم ہے ان سرکاری اسکولوں کی!“ روبینہ نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”اردو میں بات شروع، اردو ہی پر ختم۔ برائے نام انگریزی۔ کچھ بھی ہو یہ اسکول انگلش میڈیم ہے۔ کم از کم ہمارا بچہ ابتدا ہی سے انگریزی پڑھے گا۔ ہماری طرح نہیں کہ چھٹی جماعت میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔“

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔“ سلمان نے کہا۔ ”یہ سب کچھ پڑھنے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، پھر تم خود بھی نیچر ہو۔ سمیر کو گھر میں شروع ہی سے انگریزی پڑھا سکتی ہو۔ میں نے بھی تو شوق میں پہلی کلاس ہی سے انگریزی پڑھنا شروع کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا ہے۔ سرکاری اسکول میں پڑھنے کے باوجود میں نے بورڈ کے ہر امتحان میں اول پوزیشن لی تو کیسے؟ میرے مقابلے پہ تو کراچی کے بہترین اسکولوں کے بچے تھے۔“ سلمان کا چہرہ اب غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”لیکن سلمان!“ روبینہ نے کہا۔ ”وہ دور اور تھا۔“

اس وقت پڑھانے والے بھی دل و جان سے پڑھاتے تھے۔ تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا لیکن اب.....“

”اب کیا ہے؟“ سلمان نے کہا۔ ”میں سو سال پرانی بات نہیں کر رہا ہوں۔ صرف دس بارہ سال پرانی بات ہے یہ لیکن تمہاری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ پہلے بچے کو نوڈلز، چپس، جوسز اور برگر کی عادت ڈالی اور اب یہ انگلش میڈیم اسکول کا شوشہ!“

”آپ تو بہت ہی دقیانوسی ہیں۔“ روبینہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ اونچے گھرانوں میں بچوں کو یہ ہی چیزیں کھلائی جاتی ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ زندگی کا چلن بھی بدلنا پڑتا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں، میں اس چھوٹے سے بچے کو دال چاول ٹھنڈا شروع کر دوں؟“

”ہاں، بھلا اس میں کیا برائی ہے روبینہ.....“

”پلیز سلمان!“ روبینہ نے پھر اس کی بات کاٹی۔

”اب یہ مت کہنے بیٹھ جائے گا کہ ہم بھی تو یہی چیزیں کھا کر پلے ہیں۔“

ایک طویل بحث کے بعد سلمان نے ایک مرتبہ پھر روبینہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

سمیر کو اسکول جاتے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اسکول میں ”کھڑوئے“ اور ”گیمز ڈئے“ شروع ہو گئے۔ کھڑوئے کے موقع پر بچے کو اسی رنگ کے کپڑے پہننا پڑتے ہیں، اسی رنگ کے جوس یا کھانے پینے کی چیزیں اور گیمز ڈئے کے موقع پر کھیلوں کا مخصوص لباس، مہنگے جوکرز اور دوسرے جو چلے! مہینے کے آخری دنوں میں یہ فضول کے اخراجات سلمان کو بہت گراں گزرے۔

دوسرے بیٹے کی پیدائش تک سمیر کے اسکول میں اس طرح کے کئی فضول پروگرام ہو چکے تھے۔ ان پروگراموں میں تعلیم کا کوئی دخل نہیں تھا، بس والدین کے پیسے کا زیاں تھا۔ ان چند ماہ میں سمیر نے تعلیم کے نام پر اسکول میں کچھ بھی نہیں سیکھا تھا۔ انگریزی کی شد بد تو دور کی بات ہے اسے تو انگریزی کے حروف ہی کی پہچان تک نہیں ہوئی تھی لیکن روبینہ خوش تھی کہ اس کا بیٹا انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ البتہ ان پروگراموں کی وجہ سے سمیر کے کپڑوں اور کھلونوں میں اضافہ ضرور ہوا تھا۔

ہر ماہ ہونے والی ”پیرٹس، نیچر میٹنگ میں روبینہ سلمان کے ساتھ یوں شریک ہوتی گویا دنیا کا اہم ترین کام

انجام دے رہی ہو۔ اسکول سے واپسی پر روبینہ بہت فخر سے کہتی۔ ”دیکھا سلمان! یہ ہوتا ہے انگلش میڈیم اسکولوں کا رکھ رکھاؤ۔ سرکاری اسکولوں کی طرح نہیں کہ والدین کی شکل صرف بچے کے داخلے کے موقع پر نظر آتی ہے، پھر بچہ میٹرک پاس کر کے چلا بھی جاتا ہے لیکن والدین میں سے کوئی بھولے سے بھی اسکول میں نہیں جھانکتا۔“

سلمان خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ اگر کچھ بولتا تو ایک نئی بحث کا آغاز ہو جاتا۔

زلزلے والے دن تو روبینہ کی تیاری عروج پر ہوتی۔ اس دن وہ خصوصی اہتمام کرتی اور سلمان کو بھی زبردستی سوٹ پہنا کر اپنے ساتھ اسکول لے جاتی۔ وہ اس فخر سے اسکول جاتی جیسے کسی اعزازی تقریب میں شرکت کر رہی ہو۔ دوسرے بچوں کے والدین سے گفتگو کرتے ہوئے خود کو بہت معتبر سمجھتی۔ وہ سب بھی روبینہ کی طرح احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ سلمان نے اس وقت تک گاڑی خرید لی تھی، جو گنتی کے چند لوگوں کے پاس تھی۔ وہ اسکول کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر اپنے اسکول سے اس کا موازنہ کرتی رہتی۔

سلمان اس کی باتوں پر کڑھتا رہتا۔ ایک دن اس کی باتیں سن کر سلمان پھٹ پڑا۔ ”کیا خاص بات ہے اس اسکول میں؟ اب بھی وقت ہے روبینہ بیگم، کمتری کے اس احساس سے نکل آؤ۔ انگلش میڈیم..... انگلش میڈیم کی تکرار سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ اتنے عرصے میں سمیر نے کیا سیکھا ہے؟“

”ابھی اسے اسکول جاتے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟“ روبینہ نے جواب دیا۔ ”صرف سات مہینے۔“

”اور ان سات مہینوں میں اے B اور D کا فرق معلوم نہیں ہوا۔“ سلمان نے کہا۔ ”اسکول کی ٹیچرز کو دیکھا ہے اس سے اچھی اور تعلیم یافتہ ٹیچرز تو سرکاری اسکولوں میں ہوتی ہیں جنہیں تم حقارت سے ”پیلا اسکول“ کہتی ہو۔“

”اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا سلمان!“ روبینہ نے کہا۔ ”کہ سمیر نے کیا سیکھا اور کتنا سیکھا۔“

سلمان جھنجھلا کر خاموش ہو گیا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش کے موقع پر سلمان خوش بھی تھا اور فکر مند بھی۔ اسے اخراجات کے مزید بڑھنے کا احساس تھا۔ اسی لیے اس نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی سے

پارٹ ٹائم ملازمت بھی شروع کر دی تھی۔

چھوٹے بیٹے رمیز کی پیدائش کے بعد روبینہ کی چوتھلی مزید بڑھ گئی۔ وہ اب ڈائریز استعمال کرنے لگی تھی۔ رمیز کو انتہائی مہنگا بے بی دودھ پلاتی تھی۔ اس کے لیے جدید قسم کا خاصا مہنگا... کیری بیگ اور پرام (بچوں کی گاڑی) خریدی تھی اور دودھ پلانے کے لیے وہ ایپریٹر فیڈر استعمال کرتی تھی۔ ان چیزوں کے حصول کے لیے سلمان کو مزید محنت کرنا پڑتی تھی۔

☆☆☆

وقت کا پھیا گوا تو سمیر کے ساتھ رمیز بھی اسی اسکول میں جانے لگا۔ اس مرتبہ سلمان نے کوئی احتجاج نہیں کیا، کوئی بحث نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ روبینہ اس کی ایک ٹھنسنے کی۔ اب تو وہ خاموش تماشا کی بن کر رہ گیا تھا۔

اس پورے عرصے میں سمیر انگریزی تو کیا سیکھتا، وہ تو اردو میں بھی بالکل کورا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے کسی اعلیٰ انگریزی اسکول کا کورس اپنے اسکول کے لیے منتخب کیا تھا۔ کورس کی کتابیں ہی اتنی مہنگی تھیں کہ انہیں خریدتے ہوئے سلمان کے ہوش اڑ جاتے تھے لیکن اس نصاب کو پڑھانے کے لیے جیسے تجربہ کار اور قابل اساتذہ کی ضرورت تھی، وہ اسکول میں موجود ہی نہیں تھے۔ اسکول والوں نے بڑے اور مشہور انگلش میڈیم اسکولوں کے کورس، مگر ڈے، گیمز ڈے اور نہ جانے کس کس ڈے کی نقل تو کر لی، بچوں کے یونیفارم بھی شہر کی ایک مخصوص دکان سے خریدے جاتے تھے لیکن ان سب باتوں سے معیار تعلیم کب بلند ہوتا ہے۔ اسکول والوں کی اعلیٰ تربیت یافتہ اساتذہ رکھنے کی استعداد نہیں تھی۔ انہوں نے کام چلانے کے لیے آس پاس کے علاقوں سے میٹرک اور انٹر پاس لڑکیاں بطور ٹیچر رکھ لی تھیں۔ وہ بیچاریاں تو خود بھی وہ بھاری بھر کم کورس سمجھنے کے قابل نہیں تھیں تو بچوں کو کیا پڑھاتیں؟

سلمان بھی سمیر اور رمیز کی ہوم ورک کا پیاں دیکھ لیتا تھا۔ انہیں دیکھ کر سلمان کو کوفت ہوتی تھی۔ ٹیچروں کی ہینڈ رائٹنگ ایسی ہوتی تھی جیسے چھٹی جماعت کے کسی بچے نے لکھا ہے۔ سلمان دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتا۔

متوسط اور محرومیوں کے مارے طبقے کے لیے یہ نام نہاد انگلش میڈیم اسکول ان کی ازلی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس وقت تک پاکستان میں سیل فون کی دبا شدہ

ہو چکی تھی۔ مگر سیل فون ابھی اتنا عام نہیں ہوا تھا لیکن بہر حال وہ زندگی کے اعلیٰ معیار کی علامت تھا، پھر روبینہ کیسے پیچھے رہتی۔ سیل فون تو اس وقت مہنگے تھے ہی، سم کارڈز بھی بہت مہنگے تھے۔ سم کارڈ جو اس وقت سو روپے اور اسی روپے میں مل جاتا ہے۔ اس وقت اس کی قیمت ساڑھے تین سے ساڑھے چار ہزار روپے تک تھی۔

روبینہ نے کمپنی ڈال کر اپنے لیے ایک سیل فون لے لیا۔ اس کی تو ضد تھی کہ سلمان بھی اپنے لیے ایک سیل فون لے لے لیکن سلمان نے اس فضول خرچی سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سیل فون کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دفتر میں ٹیلی فون ہے، گزشتہ برس میں نے گھر میں ٹیلی فون لگوا لیا ہے۔ میں اس فضول خرچی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”آپ ابھی تک چالیس کی دہائی میں سانس لے رہے ہیں۔ ذرا اپنے ارد گرد دیکھیں۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھ میں آپ کو سیل فون نظر آئے گا۔“

”مجھے ارد گرد دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ سلمان ہنس کر بولا۔ ”میری تو آنکھوں کے سامنے سیل فون رہتا ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”روبی جان! میں نے تو آج تک اس کی گھنٹی بجتے نہیں سنی۔ کوئی تمہیں کال نہیں کرتا؟ میں نے تمہیں بھی کال کرتے نہیں دیکھا۔“

”اس کی کال بہت مہنگی پڑتی ہے۔ ایک منٹ کی کال دس روپے کی ہوتی ہے۔“ روبینہ نے کہا۔

”اس وقت دس کا... نوٹ بھی واقعی دس روپے کا نوٹ ہوا کرتا تھا۔ دس روپے میں ایک مزدور دو روٹیاں اور دال لے کر خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیتا تھا۔“

پھر وہ منہ بنا کر بولی۔ ”اور تو اور..... جسے کال کی جائے اس کا بھی ایک روپہ کٹ جاتا ہے۔“

”آخر اتنے خرچے کا فائدہ بھی کیا ہوا؟“ سلمان نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ”بس دکھاؤ اور صرف دکھاؤ؟“

”اس دور میں عزت بھی اسی کی ہوتی ہے جس کے جسم پر بہترین لباس اور ہاتھ میں سیل فون ہو۔“ روبینہ نے جواب دیا۔

سلمان ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکا ہوتا رہتا تھا کہ کب روبینہ اپنے لیے یا بچوں کے لیے کوئی نئی فرمائش کرتی ہے۔ اس نے پارٹ ٹائم کا

وقت بھی اب بڑھا دیا تھا اور صبح سے رات گئے تک کولہو کے تیل کی طرح کام میں جتا رہتا تھا۔ اب وہ صبح روبینہ کو صرف اسکول تک چھوڑتا تھا۔ واپسی میں روبینہ خود ہی بس یا رکشا میں واپس آ جاتی تھی۔ روبینہ کی بھی ترقی ہو گئی تھی۔ اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا اور ٹیوشن بھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ جہانگیر روڈ کے ایک بنگلے میں بچوں کو اکٹھا کر کے ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ صاحب خانہ سعید صاحب خاصے بامروت اور وضع دار آدمی تھے۔ ان کی بیگم نے اپنے مکان کا ایک کمر چند گھنٹوں کے لیے روبینہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ سہ پہر سے شام تک ان کے گھر میں بچوں کا شور شرابا رہتا لیکن ان کے ماتھے پر حُسن تک نہ آتی۔ ان کے بھی دو بچے روبینہ سے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ روبینہ بہت اچھا پڑھاتی تھی۔ شاید اسی لیے مسز سعید اسے برداشت کر رہی تھیں، پھر ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بھی تھا۔ یوں روبینہ کو ٹیوشن سے بھی اتنی ہی آمدنی ہو جاتی تھی جتنی اسکول سے ہوتی تھی۔

سمیر ان دنوں پانچویں کلاس میں اور رمیز تیسری میں تھا۔ جسے روبی بہت فخر سے فقہ اسٹینڈرڈ اور تھرڈ اسٹینڈرڈ کہتی تھی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ جمعے کی نماز کے بعد سلمان مسجد سے آیا تو شدید گرمی کی وجہ سے اس کا موڈ خراب تھا۔ (ان دنوں جمعے کو سرکاری تعطیل ہوا کرتی تھی) سمیر نماز کے بعد اپنے ساتھ فالسے لے کر آیا تھا۔ اس نے روبینہ سے فالسے کا شربت بنانے کو کہا اور خود اخبار لے کر اپنے بیڈروم میں بیٹھ گیا۔

روبینہ شربت لے کر آئی تو سلمان نے پوچھا۔ ”رمیز اور سمیر کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہی ہیں۔“ روبینہ نے جواب دیا۔ ”پرسوں سے ان کے ایگزام شروع ہو رہے ہیں۔ اسی میں لگے ہوئے ہیں۔“

”اچھا!“ سلمان نے شربت کا خالی گلاس اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”ذرا ان دونوں کو یہاں بھیجو۔ میں بھی تو دیکھوں ان دونوں نے امتحانات کی کتنی تیاری کی ہے؟“

تھوڑی دیر بعد رمیز اور سمیر اس کے سامنے تھے۔ دونوں نے ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ سمیر کے بال ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ سلمان نے ناگواری سے کہا۔ ”سمیر تمہیں یاد ہے کہ تم نے آخری دفعہ بال کب کٹوائے تھے؟“

”شام کو میرے ساتھ چلنا، میں تمہاری کنگ کرادوں گا۔“ سلمان نے کہا۔ ”چلو اپنی کتابیں نکالو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تم نے امتحانات کی کیا تیاری کی ہے؟“ پھر اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”پرسوں کس مضمون کا پیپر ہے؟“

”پاپا پرسوں میتھس کا پیپر ہے۔“ سمیر اور رمیز دونوں نے جواب دیا۔

”چلو پھر میتھس ہی کی کاپی اور کتاب نکالو۔“

ان دونوں نے کتابیں نکال کر سلمان کے سامنے رکھ دیں۔ سلمان نے کتاب کا ایک باب کھولا اور سمیر سے کہا۔ ”چلو ذرا یہ سوال حل کر کے دکھاؤ۔“

سمیر نے ایک نظر کتاب پر ڈالی اور بولا۔ ”پاپا یہ چیپٹر تو مس نے پڑھایا ہی نہیں ہے۔ انہوں نے جتنا پڑھایا ہے اس میں سے ایگز ام میں آئے گا۔“

”اور مس نے تمہیں کتنا پڑھایا ہے؟“ سلمان نے پوچھا۔

سمیر نے اسے بتایا ”چیپٹر فور ٹین تک مس نے پڑھایا ہے۔“

”یعنی پورے سال میں تم نے صرف یہ چودہ چیپٹر پڑھے ہیں؟“ سلمان نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اسے آہستہ آہستہ غصہ آرہا تھا۔“ چلو پھر جو تم نے پڑھا ہے اسی کا ٹیسٹ لے لیتا ہوں۔“ اس نے کتاب کے ایک سوال کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”چلو یہ سوال حل کرو۔“

پھر وہ رمیز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ سمیر کے مقابلے میں رمیز زیادہ ذہین ہے۔ اس نے سلمان کے بتائے ہوئے سوال فوراً ہی حل کر دیے۔

سلمان پھر سمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کاپی کھولے اس کا دیا ہوا سوال حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر مزید گزری تو سلمان نے رمیز سے کہا۔ ”تم سے اب تک آسان سا ایک سوال بھی حل نہیں ہوا؟“

”کر رہا ہوں پاپا!“ سمیر نے جلدی سے کہا اور دوبارہ سوال حل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سلمان بہ غور اس کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کا موازنہ خود سے کر رہا تھا۔ پانچویں کلاس میں وہ اس سے کہیں زیادہ مشکل سوال چند منٹ میں حل کر لیا کرتا تھا۔ سمیر کبھی کاپی پر کچھ لکھتا پھر اسے کاٹ دیتا اور سر کھجانے میں مصروف

اس وقت تک رمیز کئی سوال حل کر چکا تھا۔

سمیر کو دیا ہوا سوال سیدھی ضرب اور تقسیم کا تھا۔

”سمیر، تمہیں ٹیبل کتنے یاد ہیں؟“

اس کے سوال پر سمیر بغلیں جھانکنے لگا۔

اس دن سلمان کو احساس ہوا کہ سمیر تعلیم میں بالکل

کور ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے اس کا اردو انگریزی معاشرتی علوم وغیرہ کا ٹیسٹ لیا لیکن سمیر ہر مضمون میں کور تھا۔

سلمان زندگی میں پہلی دفعہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور چیخ کر بولا۔ ”کیا پڑھتے ہو تم اسکول میں؟ میں دن رات محنت کر کر کے ہلکان ہو گیا، اس کا صلہ یہ ہے؟“

اس کی آواز سن کر روبینہ بھی کمرے میں آگئی اور درشت لہجے میں بولی۔ ”کیوں بچوں کو ڈانٹ رہے ہیں؟“

”بھئی تم نے ان کی تعلیم بلکہ انگلش میڈیم تعلیم کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے رو بی؟“ سلمان نے اسی طرح غصے میں کہا۔ ”تم خود بھی تو نیچر ہو۔ دوسروں کے بچوں کو بہت محنت سے پڑھاتی ہو۔ کبھی اپنے بچوں کی خبر بھی لی؟“

”میرے پاس اتنا وقت کب ہوتا ہے؟“ روبینہ نے کہا۔ ”صبح گھر سے نکلتی ہوں تو شام ڈھلے گھر میں داخل ہوتی ہوں۔ پھر چائے اور کھانے کی تیاری اور کھانا کھلانے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ مجھے اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ جب تک میں گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی ہوں، یہ دونوں سوچکے ہوتے ہیں۔ میں انہیں پڑھاؤں بھی تو کس وقت؟“ پھر وہ رمیز اور سمیر سے بولی۔ ”جاؤ بیٹا، تم لوگ جا کر اپنے ایگز امز کی تیاری کرو۔“ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچوں کے سامنے سلمان اسے برا بھلا کہے۔

”میں نے گزشتہ چند سالوں میں کتنی محنت کی ہے، تمہیں اس کا بھی احساس ہے؟“ سلمان نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اتنے پیسوں میں تو کہیں پلاٹ خرید کر میں دوسرا مکان بنا سکتا تھا یا اس مکان کو از سر نو تعمیر کرا سکتا تھا۔“ سلمان کے لہجے میں اب پچھتاوے تھے۔

”اس قسم کی باتیں بچوں کے سامنے نہ کیجیے گا۔“ روبینہ نے کہا۔

”شیخ صاحب کو جانتی ہو؟“ سلمان نے اچانک پوچھا۔

”ہاں انہیں تو میں بچپن سے جانتی ہوں۔“ روبینہ نے جواب دیا۔ وہ شروع سے اسی محلے میں رہتے ہیں۔“

”مارکیٹ میں ان کی چھوٹی سی پھلوں کی دکان تھی۔ اب ان کا کاروبار کتنا پھیل گیا ہے۔ ان کا گھر اس محلے کا سب سے بہترین گھر ہے۔ ان کے بچے، بہ قول تمہارے پیلے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بڑا بیٹا کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا ہے اور دونوں چھوٹے بیٹے کالج میں ہیں اور انتہائی مہذب بچے ہیں۔ پیلے اسکول میں پڑھنے کے باوجود ان میں اتنی ذہانت کہاں سے آگئی؟ ایم بی اے میں داخلہ صرف ان بچوں کو ملتا ہے جن کا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہو۔“

”یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“ روبینہ ترخ کر بولی۔

”میں تمہیں صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔ کیا تمہارے بیٹوں کو کسی اچھے کالج اور بعد میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل جائے گا؟“

”انشاء اللہ ضرور ملے گا۔ اور آپ یہ کیا جتا رہے ہیں کہ ان کی تعلیم پر اتنا خرچ ہو گیا۔ یہ سن کر بچے ابھی سے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔“

روبینہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کا فیصلہ غلط تھا اور اب بھی اس غلط فیصلے کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

سلمان نے بھی سوچ لیا تھا کہ کل اسکول جا کر رمیز اور سمیر کی کلاس ٹیچروں اور اسکول کی پرنسپل کو کھری کھری سنائے گا۔ کم بخت علم کی دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ چلو ایک لمحے کو مان بھی لیں کہ وہ تعلیم کو تجارت سمجھ رہے ہیں لیکن تجارت کا بھی پہلا اصول تو گا ہوں کو اچھا مال فروخت کرنا ہے۔ یہ اسکول والے تو دھڑا جرم کر رہے ہیں۔ علم کی تجارت سے پیسا بھی بنو رہے ہیں اور تعلیم بھی ٹھیک نہیں دے رہے۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے سلمان سمیر کے اسکول جا پہنچا۔ اسکول کی پرنسپل میڈم سعدیہ اسے اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے سلمان کا استقبال کیا۔ سلمان نے آتے وقت اسکول کا جائزہ لیا تھا۔ اسکول کی چار دیواری کے اندر طرح طرح کے کارٹون بنے ہوئے تھے۔ برآمدے کی دیوار کی ماؤس اور نام ایڈجیری کی تصاویر سے بھری ہوئی تھی۔ کسی کلاس میں بچوں کو چیخ چیخ کر انگریزی کی کوئی پویم یاد کرانی جا رہی تھی۔

”جی سلمان صاحب!“ میڈم سعدیہ نے

پوچھا۔ ”کیسے زحمت کی؟“

”میں رمیز اور سمیر کی پڑھائی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ پلیز ذرا ان کی کلاس ٹیچر کو بلوالیں۔“

”آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ وہ دونوں اس وقت کلاس لے رہی ہیں کلاس ختم ہوتے ہی انہیں بلوالوں کی۔“ پھر انہوں نے گھنٹی بجائے پھونک دیا اور اس سے کہا۔ ”چائے لاؤ۔ اور ہاں، مس نیسہ اور صائمہ کو بتا دینا کہ پیر میڈ ختم ہونے کے بعد میرے آفس میں آجائیں۔“

پھر وقت گزاری کے لیے حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتی رہیں۔ اس دوران میں فیس وصول کرنے والی لڑکی دو دفعہ آئی۔ ایک دفعہ بہت سے نوٹ لے کر اور دوسری مرتبہ کچھ بچوں کے بارے میں اطلاع دینے کہ ان کی اسکول فیس ابھی تک نہیں آئی ہے۔

”تم پانچ روپے روز کے حساب سے ان بچوں پر جرمانہ کرتی رہو اور فیس کے سلسلے میں بالکل رعایت مت کیا کرو۔“

اسکول کے برآمدے میں گھنٹی کی آواز گونجی تو سلمان سمجھ گیا کہ پیر میڈ ختم ہو چکا ہے۔ چہرہ اسی اس سے پہلے ہی چائے لا کر رکھ گیا تھا۔

وہ چائے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ نیسہ اور صائمہ دونوں آگے پیچھے داخل ہوئیں۔ ”لیس میڈم!“ نیسہ نے سر جھکا کر کہا۔

”فقہہ اسٹینڈر کی کلاس ٹیچر آپ ہیں۔“

”لیس میڈم!“ نیسہ نے کہا۔

”اور سیکنڈ اسٹینڈر کی کلاس ٹیچر آپ ہیں؟“ سلمان نے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی ہوں۔“ صائمہ نے جواب دیا۔

”آپ لوگ بچوں کو پڑھاتی ہیں یا مذاق کرتی ہیں؟“

”ہیں؟“ سلمان پھٹ پڑا تھا ”میرے بچے اتنے عرصے سے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ انہیں ایک لفظ نہیں آتا۔ کیا پڑھاتی ہیں آپ لوگ؟“

”دیکھیے سلمان صاحب! بچہ اگر نہ پڑھے تو اس میں ٹیچر کا کیا تصور؟“ پرنسپل نے کہا۔

”نہ پڑھے؟“ سلمان درشت لہجے میں بولا۔ ”بچوں کے ہوم ورک کی کاپیاں منگا کر دیکھیے۔ اس میں انہیں ہوم

ورک کیا کرایا گیا ہے؟ انگریز احقر میں صفائی کے نمبر الگ سے ہوتے ہیں لیکن یہاں تو ٹیچرز کی ہینڈ رائٹنگ اتنی گندی ہے کہ دیکھ کر شرم آئے۔ بچے نے جو کچھ غلط لکھا ہے اسے ان ٹیچرز نے صحیح سمجھا ہے اور اپنے جناتی دستخط بھی کیے ہیں۔ انگلش میڈیم اسکول ہے لیکن بچوں کو انگلش کی ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ چلیے میرے بچے تو نہیں پڑھتے۔ آپ کسی بھی بچے کو بلالیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں کیا کچھ سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے اور بچوں کو کتنی انگریزی آتی ہے؟“ سلمان گویا پھٹ پڑا۔

اس کے چار چاند انداز سے نہ صرف دونوں ٹیچرز بلکہ پرنسپل بھی کچھ سہم کر رہ گئی تھی۔

پرنسپل نے سنبھل کر کہا۔ ”مسٹر سلمان! اگر آپ یہاں سے مطمئن نہیں ہیں تو اپنے بچوں کو یہاں سے نکال لیں۔“

”وماٹ؟“ سلمان دھاڑ کر بولا۔ ”میں نے ان کی فیس پر جو لاکھوں روپے خرچ کیا ہے ان کا جو قیمتی وقت ضائع ہوا ہے، اس کا حساب کون دے گا؟“ سلمان نے رواں انگلش میں کہا۔ ”میں تو آپ لوگوں کو کورٹ میں گھسیٹوں گا۔ آپ لوگ تعلیم کو کاروبار سمجھ کر چلا رہے ہیں اور اس کاروبار کے چکر میں بچوں کے مستقبل سے کھیل رہے ہیں۔“

سلمان کی رواں انگلش سے پرنسپل مزید سہم گئی۔ جواب دینے کے لیے اس کے پاس انگریزی کے الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ بیچاری تو خود اردو میڈیم تھی۔

”لک مسٹر سلمان!“ اس نے ایک ایک کر کہا۔ ”آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کریں۔“ اس نے جواب دینے کے لیے اردو ہی کا سہارا لیا۔

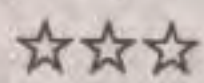
”میں آپ پر پچاس لاکھ ہرجانے کا دعویٰ کروں گا۔“ سلمان نے پھر انگلش میں کہا۔ ”شروع سے لے کر اب تک میرے پاس دونوں بچوں کی تمام کاپیاں اور ڈائریاں موجود ہیں۔ بہت سے الفاظ کی اسپیلنگ تو آپ کی ٹیچروں ہی نے غلط لکھی ہوئی ہے۔ ادھنہ انگلش میڈیم اسکول۔۔۔۔۔“ سلمان اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب ہماری ملاقات کورٹ میں ہوگی۔“

”مسٹر سلمان۔۔۔۔۔ سنیے تو سنی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ لیکن سلمان باہر نکل چکا تھا۔ اس نے دونوں بچوں کو بلایا اور انہیں اپنے اسکول بیک لے کر گھر جانے کو کہا۔ اس دن آفس میں بھی اس کا موڈ بہت خراب رہا۔

نعمان بن بشیر

صحابی بشیر بن سعد کے بیٹے، نام نعمان، کنیت ابو عبد اللہ قبیلہ خزرج، والدہ صحابی عبد اللہ بن رواحہ کی ہمشیرہ تھیں، ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے چھ ماہ بعد عبد اللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ ماں کو اتنی محبت تھی کہ باقی اولاد کو چھوڑ کر ساری جائداد ان کے نام کر دی۔ امیر معاویہ کی طرف سے حضرت علی کے خلاف جنگ کی۔ اس لیے امیر معاویہ نے انہیں پہلے دمشق کا قاضی اور پھر حاکم یمن بنایا۔ اپنے آخری ایام 59ھ میں معاویہ نے انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا۔ تقریباً نو ماہ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ یزید نے معزول کر دیا۔ وہاں سے شام چلے گئے۔ بعد ازاں یزید نے محض کا امیر مقرر کیا۔ وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ خلیفہ مروان کے عہد میں عبد اللہ بن زبیر کی طرفداری کے جرم میں قتل ہوئے۔ آپ کی زوجہ و دیگر اہل و عیال گرفتار ہوئے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، حیدر آباد



نعمت اللہ بت شکن

بنگال کے قدیم ترین صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں، نام شاہ نعمت اللہ، لیکن بت شکن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لقب کے پس منظر میں ایک کہانی ہے، کہا جاتا ہے کہ بوڑھی گنگا کے کنارے کل گاؤں تک ایک بڑی بستی تھی جو پیر پانڈو وندی کے کنارے تھی۔ جب منہ اندھرے وہاں کے ہندو اپنے بتوں کو بوڑھی گنگا میں دھونے کے لیے لے جاتے تو ان کو ان کی قیام گاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ آپ کے اشارے سے وہ بت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اسی وجہ سے آپ بت شکن مشہور ہوئے، آپ کے بارے میں تاریخ مزید کچھ بتانے سے قاصر ہے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مزار مبارک ڈھاکہ میں ”باغ دلکشا“ کے متصل احاطے میں دکنی صاحب کی مسجد کے جانب شمال میں ایک بلند چوترے پر واقع ہے۔ آپ کے دائیں بائیں آپ کے دو خلفاء کے مزارات ہیں۔

مرسلہ: سلطان شیخ، چنوٹ

اس کے ماتحت بھی حیران تھے کہ سلمان صاحب کو کیا ہوا ہے؟ سلمان نے اس دن پارٹ ٹائم سے بھی چھٹی کر لی اور گھر جانے کے بجائے یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا، اس نے ایک جگہ رک کر کھانا کھایا کیونکہ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔

وہ کھانا کھا کے فارغ ہوا ہی تھا کہ پشت سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلمان چونک کر پلٹا۔ اس کے بچپن کا دوست امجد کھڑا مسکراتا تھا۔

”ابے یار، اکیلے اکیلے ہی کھانا کھائے گا؟“ امجد کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے لیے بھی منگوا لیتا ہوں۔ بولو کیا کھاؤ گے؟“ سلمان نے ہنس کر کہا۔

”میں تو اس ریستورنٹ کے سامنے سے گزر رہا تھا، تمہیں دیکھ کر اندر آ گیا۔“ امجد نے کہا۔ ”اب آ گیا ہوں تو چائے ضرور پیوں گا۔“

”تم تو شاید کسی گورنمنٹ اسکول میں پڑھا رہے تھے؟“ سلمان نے کہا۔

”تھا نہیں، میں اب بھی پڑھا رہا ہوں۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”لیکن اب میں اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ شوقیہ ایک دو کلاسیں بھی لے لیتا ہوں۔“ پھر وہ بولا۔ ”ہاں یار، بھابی روبینہ بھی تو اسکول ہی میں ہیں۔ کیا وہ ابھی تک پڑھا رہی ہیں؟“

”ہاں، روبینہ بھی ابھی تک ملازمت کر رہی ہے۔“ سلمان نے جواب دیا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”یار امجد! میں اپنے بچوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“

”پریشان ہو؟“ امجد چونک کر بولا۔ ”کیوں بھی، ابھی وہ بہت چھوٹے ہوں گے۔“

”یار ان کی تعلیم کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ سلمان نے جواب دیا۔ ”روبینہ نے انہیں علاقے کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا تھا۔“ سلمان نے انگلش میڈیم کے الفاظ کو چبا چبا کر کہا۔ ”وہ دونوں ابھی تک بالکل کورے ہیں۔“

”یار تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ امجد نے کہا۔ ”انہیں اسکول سے اٹھا لو، اور گھر پہ تیاری کراؤ۔ پھر میرے پاس لے آنا۔ میں ان کا داخلہ ان کی عمر کے مطابق کلاس میں کر لوں گا۔ میں اسکول میں ان کی پڑھائی پر بھرپور

توجہ دوں گا؟ گھر پہ بھابی انہیں پڑھائیں گی۔ سال بھر یہ ان ہی بچوں کے بارے میں تم دوسروں کو فخریہ انداز میں بتاؤ گے کہ میرے بچوں نے اپنی کلاس میں ٹاپ کیا ہے۔ یار، تم بھی تو ہمیشہ کلاس میں ٹاپ کرتے تھے۔“

”ان میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ میرا باب نہیں تھا۔ ماں معمولی قسم کی محنت مشقت کرتی تھی۔ وہ سترہ گریڈ کے ایک افسر کے بچے ہیں۔ ان کی ماں بھی ایک باوقار اور معزز پیشے سے وابستہ ہے۔ انہیں ہر چیز کی سہولت ہے۔ انہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ سلمان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”او بھائی! ٹینشن مت لو۔“ امجد نے کہا۔ ”جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گلی گلی محلے والے ان نام نہاد انگلش میڈیم اسکولوں نے تو بچوں کی تعلیم تباہ کر کے رکھ دی ہے۔“

امجد دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ وہ امجد کی کہی ہوئی بات کا قائل تھا اور خود بھی سب کچھ جانتا تھا لیکن روبینہ کو سمجھانا ایک مسئلہ تھا۔ امجد نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور کہا کہ جب بھی بچوں کو لے کر آؤ، مجھے فون کر دینا۔

امجد سے باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ سلمان گھر پہنچا تو روبینہ منہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس نے سلمان سے پوچھا۔ ”آپ کو بچوں کے اسکول جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تم نہیں جانتیں کہ مجھے کیا ضرورت تھی؟“ سلمان نے تلخ لہجے میں کہا۔

”شام کو میڈم سعدیہ کا فون آیا تھا۔“ روبینہ نے کہا۔

”کون میڈم سعدیہ؟“ سلمان نے پوچھا۔

”اسکول کی پرنسپل ہیں کہہ رہی تھیں کہ سلمان صاحب نے ہمیں بہت برا بھلا کہا اور ٹیچرز کے سامنے میری توہین کی۔“ روبینہ نے ترش انداز میں کہا۔ ”آپ انہیں دھمکی دے کر آئے ہیں کہ ان کے خلاف عدالت میں جائیگا۔“

”میں دھمکی دے کر نہیں آیا ہوں۔“ سلمان نے جواب دیا۔ ”میں واقعی عدالت میں جاؤں گا۔ حد ہوتی ہے بددیانتی کی۔ وہ لوگ میرے بچوں کے مستقبل سے کھیلنے اور میں انہیں کھیلنے دوں؟“

”وہ بچوں کو اسکول سے نکال دیں گی۔“ روبینہ نے کہا۔

”وہ کیا نکالیں گی، میں خود ہی انہیں اسکول سے لے آیا تھا۔“

”اس معاملے میں آپ مت بولیں۔“ روبینہ نے کہا۔ ”بچوں کی پڑھائی جانے اور میں جانوں۔“ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

سلمان نے دیکھا، دونوں بچے بھی ان کی تکرار سن رہے تھے اس لیے وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا۔

رات کو جب بچے سو گئے تو سلمان نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”روبی! تم ذرا اٹھنڈے دل سے میری باتوں پر غور کرو۔ اگر بچوں کو واقعی انگلش میڈیم اسکول میں ہی پڑھانا ہے تو پھر ان کا داخلہ شہر کے کسی اعلیٰ اسکول میں کرانا ہوگا۔

کراچی گرامر، مانا پارسی اور اسی طرح کے دو چار اسکول اور بھی ہیں۔“

”ان اسکولوں میں پڑھائی کی اوقات ہے ہماری؟“ روبینہ نے ترخ کر کہا۔

”بس، میں تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان گلی محلے کے اسکولوں میں تو سوائے وقت اور پیسے کے زیاں کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“

پھر اس نے روبینہ کے سامنے امجد کی تجویز رکھی تو روبینہ ہمتے سے اکھڑ گئی اور بولی۔ ”آپ کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں پڑھانا اپنے بچوں کو ان پیلے اسکولوں میں۔ بس اب آپ خاموش رہیں۔ میڈم سعدیہ نے وعدہ کیا ہے کہ اب وہ فیس میں بھی رعایت کریں گی اور بچوں پر خصوصی توجہ دیں گی۔“

سلمان نے طویل سانس لی اور ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر ہتھیار ڈال دیے۔

دونوں بچے ایک مرتبہ پھر اسکول جانے لگے اور وہی شب دروز پھر شروع ہو گئے۔ سلمان بچوں سے بالکل لائق ہو گیا تھا، بس دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ پھر وقت کا پہیا اتنی تیزی سے گھوما کہ ماہ و سال گویا ہوا ہو گئے۔

گزرتے وقت نے سلمان اور روبینہ کے بالوں میں جگہ جگہ چاندی کے تار کھیر دیے تھے۔ ان دنوں سمیر میٹرک میں تھا اور رمیز آٹھویں کا امتحان دے رہا تھا۔ سلمان پہلے تو ان کے پاس ہونے پر حیران ہوتا تھا اب تو اس نے حیران ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دونوں بچے بھی اس سے دور ہو گئے تھے۔

ان ہی دنوں روبینہ کی امی کا انتقال ہو گیا۔ روبینہ کو

ماں کی موت کا شدید صدمہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب یہ فکر بھی تھی کہ اب میکے میں اس کا پُرساں حال کوئی نہیں ہوگا۔ بہن کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا میں تھی۔ بھائی کی بیوی سے اس کی بھی بیٹی نہیں تھی۔ ایک امی کی ذات بھی جن کی بدولت وہ میکے جانی تھی۔

انتقال کے دوسرے دن ڈیفنس والی فریڈہ آنٹی تعزیت کے لیے روبینہ کے گھر آئیں۔ ان کے بال بھی سفید ہو چکے تھے لیکن ان کی شخصیت مزید باوقار ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ خوبصورت سی ایک لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ لڑکے کو دیکھ کر روبینہ پہچان گئی کہ یہ فریڈہ آنٹی کا بیٹا ہے۔ اس نے کاشن کا سفید بے داغ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں انتہائی نفیس سیاہ رنگ کی چپل تھی۔ روبینہ نے ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور سلمان کو بازار کی

طرف دوڑا دیا۔ روبینہ اس دوران میں ان کے اور اپنے بچوں کا موازنہ کرتی رہی۔ وہ سوائے عید بقرعید کے بھی بچوں کو شلوار سوٹ نہیں پہناتی تھی۔ اس کے خیال میں شلوار سوٹ گنوار اور کمتر لوگوں کا پہناوا تھا لیکن آج فریڈہ آنٹی کے بیٹے وقاص کو دیکھ کر اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔

فریڈہ آنٹی نے سوائے چند گھونٹ کولڈ ڈرنک کے کچھ بھی نہیں لیا۔ دونوں بچوں نے اپنی پلیٹ سے ایک دو چپس، چند دانے نمکوکے اور ایک ایک بسکٹ لے لیا۔ فریڈہ آنٹی تعزیت کر کے واپس جا رہی تھیں تو روبینہ باہر تک انہیں خدا حافظ کہنے آئی اور ان کی لمبی چوڑی چیمائی ہوئی جدید ماڈل کی گاڑی دیکھ کر مرعوب ہو گئی۔ گاڑی فریڈہ آنٹی کا بیٹا ڈرائیو کر رہا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد روبینہ کھوئی کھوئی سی اندر آ گئی۔ میز پر سموے، پکڑے، پیڑے، چپس اور نمکوجوں کی توں رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ برتن اٹھاتی۔ رمیز اور سمیر گھر میں داخل ہوئے اور کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑے۔ روبینہ نے ناگواری سے ان دونوں دیکھا جو مریچکوں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان دونوں کے جسموں پر ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹس تھیں، بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ سمیر نے تو اپنے بالوں کو سمیٹ کر پونی بنا رکھی تھی۔ اس دن روبینہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سلمان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ محض نام کے انگلش میڈیم اسکولوں میں بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، نہ تربیت، فریڈہ آنٹی کا بیٹا کتنا

مہذب اور خوش اخلاق نظر آ رہا تھا۔ اس کی انگلیں تو اس نے برسوں پہلے اس وقت کی تھیں جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ ایک اس کے بچے تھے جو انگلیں کے صرف چند جملے رٹ سکتے تھے۔ پھر اس نے سوچا، ماحول کا بھی اس میں بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے بچے محلے کے اردو میڈیم بچوں کے ساتھ کھیلنے گئے تو کیا خاک انگریزی بولیں گے۔ اس دن کے بعد سے روبینہ کو ایک ہی دھن سوار ہو گئی کہ کسی نہ کسی طرح ڈیفنس یا کلفٹن میں مکان خریدا جائے۔

سلمان نے یہ سنا تو حیران رہ گیا اور بولا۔ ”تمہارا ذہنی توازن تو ٹھیک ہے روبینہ بیگم؟“

”کیوں میں نے کون سا آسمان سے چاند توڑ کر لانے کا مطالبہ کر دیا؟“ روبینہ منہ بنا کر بولی۔

”میرے لیے تو یہ ایسا ہی ہے۔“ سلمان نے کہا۔ ”تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ آج کل مکانوں کی قیمت کیا ہے؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ روبینہ نے کہا۔ ”مکانوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ ہمارا یہ مکان بھی تو زیادہ قیمت میں بکے گا۔“

سلمان نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب روبینہ کے خواب ہیں۔ نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

جس سال میر نے میٹرک پاس کیا، اسی سال سلمان ریٹائرڈ ہو گیا۔ سلمان کو اچھا خاصا پرائیویٹ فنڈ ملا کچھ رقم روبینہ نے پس انداز کر رکھی تھی۔ روبینہ ایک مرتبہ پھر سلمان کے سر ہو گئی کہ یہ مکان بیچو اور ڈیفنس کے علاقے میں کوئی مکان دیکھو۔

خاصی بحث و تکرار کے بعد سلمان راضی تو ہو گیا لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو کچھ کرنا ہے تم خود ہی کرو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سلمان کو ایک پرائیویٹ فرم میں خاصی معقول ملازمت مل گئی تھی۔

روبینہ نے اسی دن سے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اس کا ایک شاگرد ان دنوں پراپرٹی کا کام کر رہا تھا۔ اسی کی مدد سے روبینہ نے آخر کار ڈیفنس کے علاقے میں ایک فلیٹ پسند کر لیا۔ پھر مکان بیچ کر اس نے فوراً ہی وہ فلیٹ خرید لیا۔ فلیٹ چوتھی منزل پر تھا اور ڈیفنس کے کمرشل ایریا میں تھا۔

وہ بہت چاؤ سے سلمان کو فلیٹ دکھانے سے کچھ گریز کر رہا تھا۔ اس کے بچے دکان میں گئے۔ جن میں ایک جیولری شاپ، اس کے برابر میں ٹیلر شاپ، دکان سجائے بیٹھا تھا۔ فلیٹ کے سامنے والی تین دکانوں میں ایک ورکشاپ تھا۔ وہاں ڈیمنگ پینٹنگ کا کام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ پان سگریٹ والے بنگالی کا کینٹین تھا۔ اس علاقے میں پرائیویٹ کمپنیوں کے چھوٹے چھوٹے دفاتر بھی تھے۔ سامنے والی دکانوں میں چھوٹا سا ایک ریستورنٹ بھی تھا۔

سلمان نے شاکی نظروں سے روبینہ کو دیکھا تو وہ جھٹ بولی۔ ”سلمان جیسا بھی ہے، ہے تو ڈیفنس کا علاقہ۔ اب اتنی رقم میں تو اس کمرشل ایریا میں ہی فلیٹ مل سکتا تھا۔“ اس علاقے میں رہائش روبینہ کو مزید گراں گزری۔ اس کے دونوں بچوں کو انگریزی تو پہلے ہی نہیں آتی تھی۔ اردو بھی انہیں بولنے کی حد تک ہی آتی تھی لیکن یہاں آکر تو ان کی زبان بالکل ہی بگڑ گئی۔ ارد گرد کے علاقوں میں جاہل قسم کے دوستوں کے ساتھ رہ کر وہ دونوں بھائی بھی بازاری اور ہندی فلموں کی گھٹیا زبان بے دریغ گھر میں بھی استعمال کرنے لگے۔ انہیں دیکھ کر روبینہ کا دل خون ہوتا تھا۔ اس نے ان بچوں کے اعلیٰ مستقبل کے کیا کیا خواب دیکھے تھے اور وہ کیا بن گئے تھے؟ سلمان کی طنز بھری نظریں دیکھ کر وہ شرمندگی اور ندامت کے احساس تلے دب کر رہ جاتی تھی۔

روبینہ نے خاصی رقم خرچ کر کے سمیر کا داخلہ ایک پرائیویٹ کالج اور ریمز کو وہیں کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر لیا تھا لیکن یہ اسکول بھی پہلے والے اسکول سے مختلف نہیں تھا۔ بس یہاں فیس کچھ زیادہ تھی۔

ریمز اور سمیر آس پاس رہنے والے تھے اور آوارہ لڑکوں سے میل جول بڑھانے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں اسکول اور کالج میں پڑھائی تو کیا خاک کرتے۔ وہاں جا کر بھی وہ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ گھومتے رہتے تھے۔ پھر سمیر اس قسم کے آوارہ اور نکلے لڑکوں کے ایک میوزک بینڈ میں شریک ہو گیا۔ اب ریمز نے بھی جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ دیا تھا۔ سمیر نے اسے بھی اپنے بینڈ میں شامل کر لیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد ریمز نے وہ بینڈ چھوڑ دیا اور محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ لڑکانی وی ڈراموں میں ایکسٹرا کے طور پر رول کرتا تھا اور

امید میں تھا کہ کبھی تو اسے بھی کسی ڈرامے میں ہیرو کا پاس ملے گا۔ ریمز کو ہیرو بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ بھی دن رات اسٹوڈیو کے چکر کاٹنے لگا۔

”دونوں بیٹے رات گئے یا اکثر صبح کے وقت گھر پہنچے اور گھر میں گھستے ہی الٹا سیدھا کھا کر لمبی تان کر سو جاتے۔ وہ شام ڈھلے اٹھتے اور عجیب و غریب حلے بنا کر گھر سے نکل جاتے۔ ایک گانے کی پریکٹس کے لیے چلا جاتا اور دوسرا ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے۔“

اس علاقے میں آکر اخراجات میں بھی خاصا اضافہ ہوا تھا اس لیے سلمان کو بھی اب زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی اس کے باوجود اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو احسان ہے اس نئی حکومت کا جس نے کالج اور اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں میں دگنے سے زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ روبینہ کی تنخواہ بھی ایک دم بڑھ گئی تھی اس لیے ان کی پریشانی کچھ کم ہو گئی۔ دن رات کی محنت کے باعث سلمان کی صحت خاصی گر گئی تھی اور اب وہ اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔

انسان خود چاہے جیسے کٹھن اور نامساعد حالات سے گزرا ہو وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کی اولاد کا مستقبل شاندار ہو لیکن اولاد کا مستقبل تو اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ انسان اپنی اولاد کو ناکامیوں اور دشواریوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ سلمان نے بھی یہی کیا تھا لیکن ہر بار روبینہ آڑے آگئی تھی۔ مایوسی اور بے بسی نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اس نے اسے دل کا مریض بنادیا اور ایک رات اسے دل کا دورہ پڑ گیا۔

ہمیشہ کی طرح اس رات بھی دونوں بیٹے گھر پہ نہیں تھے۔ روبینہ کسی نہ کسی طرح تنہا ہی سلمان کو اسپتال لے کر پہنچی۔ پرانا محلہ ہوتا تو ہر فرد اس کی مدد کے لیے آ جاتا۔ سلمان کو فوری طور پر انتہائی نگہداشت کے شعبے (ICU) میں منتقل کر دیا گیا۔

اچانک روبینہ کی نظر وہیل چیئر پر بیٹھی باوقاری ایک خاتون پر پڑی۔ ایک نوجوان ان کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ غالباً ان کا بیٹا تھا۔ پھر خوب صورت سی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر خاتون کی پیشانی چومی اور بہت احتیاط سے انہیں گاڑی میں بٹھانے لگی۔

روبینہ بہت حسرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ”ایکسکوز می!“ ایک نرم آواز اس کے کانوں سے نکل کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سفید گاؤن میں ملبوس پُرکشش

چہرے اور روشن آنکھوں والی لڑکی اس سے مخاطب تھی۔ ”آپ مس روبینہ احمد ہیں؟“

”ہاں بیٹا، میں روبینہ ہوں۔ لیکن آپ..... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ روبینہ نے الجھ کر کہا۔

”مس! میں آپ کی شاگرد طاہرہ ہوں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے اسکول کا زمانہ لوٹ آیا ہو، یہاں کیسے آتا ہوا مس، خیریت تو ہے؟“

اب روبینہ بھی اسے پہچان گئی تھی۔ اس کے اسکول میں تیل سے چڑے بالوں اور نیل گے آسانی کپڑے پہنے والی ایک لڑکی آگئی اس نے کہا۔ ”میں..... اپنے شوہر کو یہاں لائی ہوں۔ انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے۔ وہ اس وقت آگئی یو میں ہے۔“

”ان کا نام بتائیے!“ طاہرہ نے کہا۔ ”میں جا کر دیکھتی ہوں، کون سے کارڈ یا لوجسٹ ان کا علاج کر رہے ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آرام سے ادھر صوفے پر بیٹھیں۔“ اس نے قریب سے گزرتے ایک وارڈ بوائے سے چائے لانے کو کہا۔

”نہن..... نہیں طاہرہ..... میرا مطلب ہے ڈاکٹر طاہرہ..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میرے شوہر.....“

”آپ فکر مت کریں مس!“ طاہرہ نے نرمی سے کہا۔ ”اور میں آپ کے لیے ڈاکٹر طاہرہ نہیں، صرف طاہرہ ہوں۔ آپ نے مجھے تعلیم دی..... استاد کا درجہ تو بہت بلند ہوتا ہے۔ بس میں ابھی پوری رپورٹ لے کر آتی ہوں۔“

روبینہ کو ماضی کی ایک اور تصویر نے بے بسی کے جنگل میں دھکیل دیا۔ وہ لڑکی جو سرکاری اسکول میں پڑھنے کے باوجود ڈاکٹر بن گئی۔ اس نے تو دل سے بھی بچوں کو بڑھایا ہی نہیں۔ وہ تو اسٹاف روم میں زیادہ وقت گزارتی تھی۔ اپنی ساتھی ٹیچروں سے خوش گپیاں کرتی رہتی تھی۔ اسے صرف اور صرف اس تنخواہ سے مطلب تھا جو ہر ماہ بغیر کسی محنت کے اسے مل جاتی تھی۔ پشیمانی اور ندامت کے احساس سے وہ پسینے پسینے ہو گئی۔

☆☆☆

دوراتوں اور دودن تک موت سے بچنے آزمائی کے بعد آخر موت، زندگی پر حاوی آگئی اور سلمان کو اپنے ساتھ لے گئی۔

روبینہ کے دل پہ تو قیامت گزر گئی۔ اسے زیادہ صدمہ اس بات کا تھا کہ اس کے دونوں بیٹوں کو باپ کی موت پہ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!

میں نے تو لکھاری ہوں اور نہ مجھے بہت زیادہ پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے۔ بس کبھی کبھی سرگزشت یا کوئی معلوماتی جریدہ پڑھ لیتی ہوں۔ سرگزشت اگر معلوماتی میگزین نہ ہوتا تو شاید یہ بھی مجھ سے دور رہتا۔ سرگزشت میں چھپنے والی آپ بیتیاں میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس بار سوچا کہ میں بھی کچھ لکھوں، کیونکہ میری زندگی بھی کسی افسانے سے کم نہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کر لیں۔

سونیا اسحاق
(اسلام آباد)



ہوئے کہا۔ شمینہ بی بی نے میرے سامنے ناشتا رکھا۔ میرا ناشتا ایک ایلے ہوئے انڈے، دو سادہ توس اور ایک گلاس اورنج جوس پر مشتمل ہوتا تھا۔ شمینہ بی بی نے تنبیہ کی۔ ”بے بی آپ نے کل بھی ناشتا ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ آج پورا کر کے

میں تیار ہو کر نیچے آئی تو ڈائننگ روم میں پاپا، جنید اور ثانیہ موجود تھے۔ پاپا نے میری طرف دیکھا۔ ”سونیا تم کل سے کہاں ہو؟“ میں نے کرسی پر بیٹھتے

اچانک ایک شوکیس میں روبینہ کی نظر روٹی نما ایک چیز پر پڑی، ہاں فوری طور پر۔ یہی لے لیتی ہوں۔ اس نے سوچا اور اپنے پرس سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دکان دار کے حوالے کر دیا۔ اس نے شاپر میں سامان دیتے ہوئے پچاس روپے کا نوٹ واپس کیا تو روبینہ بولی۔ ”بیٹا! آپ کے حساب میں کچھ غلطی ہو گئی ہے میں نے پانچ سو روپے کا نوٹ دیا تھا۔“

”غلطی کیسی آنٹی!“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”دودھ، چینی اور چائے کی قیمت اور ننانوے روپے کا یہ پیزا، آپ خود حساب کر لیں۔“

”ننانوے روپے کا پیزا؟“ اس نے حیرت سے دیکھا۔ ”تھیلی برابر پیزا نام کی چیز کو نے میں کئی پڑی تھی۔“

”یہ..... یہ پیزا ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”آئی! ننانوے روپے میں تو اس طرح کا دیسی پیزا ہی ملے گا۔ اصل پیزا تو پانچ سو ننانوے روپے کا ملتا ہے۔ وہ بھی کسی پیزا شاپ پر۔ اب دیسی پیزا تو ایسا ہی ہوگا آئی!“

روبینہ شاپر تھاے گھر آگئی اور گھر آ کر غور سے پیزا نامی اس چیز کو دیکھنے لگی۔

اس کے کانوں میں مختلف آوازوں کی بازگشت تھی۔ ”آئی! دیسی پیزا تو ایسا ہی ہوتا ہے، امی..... مجھے اپنے بینڈ کے ساتھ دینی جاتا ہے..... امی! میرے ڈرائے کی شوٹنگ ہے..... میرے گھر بیٹھنے سے ابو واپس تو نہیں آسکتے نا!“ تمام آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ پھر آوازوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ اس نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کی نظروں کے سامنے خالی گھر اور اپنی بے بسی تھی۔

”دیسی پیزا، ہاں، ہم جیسے لوگ دیسی پیزا ہی تو ہیں۔ ننانوے روپے والے..... پانچ سو ننانوے روپے والے اصل پیزا کی نقل!“

”میں بھی دیسی پیزا کو عمر بھر اصل پیزا سمجھتی رہی لیکن اصل، اصل ہے اور نقل، نقل!“

ہمارا طبقہ دیسی پیزا ہے اور ڈیفنس کے وسیع و عریض بنگلوں اور اعلیٰ اسکولوں میں پڑھنے والے اصلی پیزا ہیں۔

روبینہ ایک مرتبہ پھر سسک سسک کر رونے لگی، اپنی بے چارگی پر یا اپنے ان غلط فیصلوں پر!



ذرا برابر بھی صدمہ نہ تھا۔

سلمان کی تدفین کے ایک ہفتے بعد ہی سمیر اپنے میوزک بینڈ کے ساتھ دینی جانے کی تیاری کرنے لگا اور روبینہ کے رونے کے باوجود وہ چلا گیا۔ اس کے دودن بعد رمیز بھی شوٹنگ کے لیے اندرون سندھ جانے کو تیار ہو گیا۔ اسے بہت جتن کے بعد یہ رول ملا تھا اور وہ اسے گوانا نہیں چاہتا تھا۔

”بیٹا!“ روبینہ نے کہا ”ابھی..... تمہارے ابو کے انتقال کو دس دن بھی نہیں گزرے ہیں..... اور..... تم.....“

”اوہ امی!“ رمیز نے کہا۔ ”جانے والے چلے گئے۔ مجھے بہت مشکل سے یہ رول ملا ہے..... اب اگر میں گھر بیٹھ بھی جاؤں..... تو کیا ابو واپس آ جائیں گے؟ حقیقت پسند بنیں امی!“ اس نے روبینہ کو ٹکسا جواب دے دیا۔

”لیکن بیٹا..... میں عدت..... میں ہوں اور.....“

”امی پلیز! دقیا نوی باتیں مت کریں۔“ یہ کہہ کر رمیز بھی گھر سے نکل گیا۔

روبینہ بری طرح سسکنے لگی۔ یہ تھی وہ اولاد جس کی خاطر اس نے اتنی مشکلیں اٹھائیں، شوہر کی مخالفت مول لی۔ اسے امید نہیں تھی کہ دونوں بیٹے اس حد تک خود غرض ہوں گے۔

☆☆☆
دو دن روبینہ نے یادوں کے سہارے گزار دیے۔ پچھتاوؤں کے ناگ اسے ڈستے رہے۔ گھر میں جو کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں وہ دودن تک بے مشکل چلیں۔ تیسرے دن شدید بھوک نے اسے بے تاب کر دیا۔ بھوک کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ انسان اور جانور دونوں ہی بھوک کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا، گھر میں کچھ پکانے کے بجائے باہر سے کھانے پینے کے لیے کچھ لے آئی ہوں۔ پکانے میں تو بہت دیر لگتی۔ اسے بھوک کے مارے تھا ہت محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنا پرانا محلہ یاد آیا۔ محلے کے کسی بھی لڑکے سے کچھ منگا سکتی تھی۔ محلے کے کسی گھر سے کچھ کھانے ہی کو مانگ سکتی تھی۔

اس نے چادر جسم پر لپیٹی اور فلیٹ سے باہر نکل آئی۔ دودھ، پتی اور چینی لینے کے بعد اس نے دکان میں ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کیا چیزوں جو فوری طور پر بھوک سے نجات دلا سکے ہیں۔ سموے والا اب تک آیا نہیں تھا، وہ شام کے وقت میں اپنا کاروبار شروع کرتا تھا۔

جائیے گا۔“

”او کے بی بی۔“ میں نے جواب دیا۔ شمیمہ بی بی گزشتہ بیس سال سے یہاں ملازم تھی اور میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی اسے دیکھا تھا۔ اتنے عرصے میں وہ گھر کا ایک فرد بن گئی تھی۔ امی اس وقت پاپا سے الگ ہو گئی تھیں جب ثانیہ صرف دو سال کی تھی اور میں ثانیہ سے پانچ سال بڑی ہوں۔ جنید مجھ سے تین سال چھوٹا ہے۔ گویا جب امی اس گھر سے گئیں تو میں صرف سات سال کی تھی۔ اس کے بعد سے ہماری دیکھ بھال شمیمہ بی بی نے کی تھی۔ وہ پاپا کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ جب وہ ہمارے ہاں آئی تو صرف انیس برس کی تھی۔ پاپا نے اس کی شادی اپنے ڈرائیور نصر گل سے کر دی تھی۔ ورنہ امی کے جانے کے بعد اس کے گھر والے اسے یہاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ نصر گل بھی ہمارے علاقے کا رہنے والا ہے۔ ہمارے ہاں ذات اور برادری میں شادی کی جاتی ہے۔ یوں شمیمہ بی بی یہاں رہ گئی۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر شمیمہ بی بی کے بجائے کوئی عام ملازمہ ہوتی تو وہ ہرگز ہمارا اتنا خیال نہ رکھتی۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اس نے ماں بن کر خیال رکھا لیکن بہر حال اس کا رویہ ملازمہ والا نہیں تھا۔ خاص طور سے ثانیہ کی اس نے بہت محبت سے دیکھ بھال کی تھی۔ یہی وجہ تھی ہم شمیمہ بی بی کا احترام کرتے تھے۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سنتے تھے اور اس کا حکم بھی مانتے تھے۔

پاپا جنید احمد عباسی بیس گریڈ کے وفاقی بیوروکریٹ تھے۔ ان کا دفتر گھر میں ساتھ ہوتا تھا۔ میرے جواب پر پاپا کی بھوسیں تن گئی تھیں۔ ”تم کل رات ڈنر کے لیے کیوں نہیں آئیں؟“

”میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ میرے جواب پر وہ مجھے گھورتے رہے اور پھر نیکین سے منہ صاف کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھ سمیت جنید اور ثانیہ نے سکون کا سانس لیا۔ جب تک پاپا ہوتے ہم سب سنجیدہ اور باادب رہتے تھے۔ کوئی فالتو بات نہیں، کوئی ہنسی مذاق نہیں حتیٰ کہ مسکراتا بھی جیسے ممنوع تھا۔ پاپا گھر میں بھی بیوروکریٹ ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے اصول طے کیے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی تمام سرگرمیاں ایک دائرے میں رکھنا ہوتی تھیں۔ صبح سات بجے اٹھ جاتے تھے اور تیار ہو کر ناشتا کر کے اپنے اپنے تعلیمی اداروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس کے بعد ہمیں لازمی

چھٹی کے آدھے گھنٹے میں گھر پہنچنا ہوتا تھا۔ اگر دیر ہو جاتی تو شمیمہ اور پاپا کو کال کر کے بتانا ہوتا تھا کہ کیوں دیر ہوئی ہے۔ کسی سے ملنے جانا ہوتا تھا تب بھی لازمی سردیوں میں چار بجے اور گرمیوں میں پانچ بجے تک گھر آ جانا ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہم اکیلے کہیں نہیں جاسکتے تھے اور نہ کوئی ہم سے ملے آ سکتا تھا۔ رات آٹھ بجے ڈنر کے بعد لازمی سب کو دس بجے تک اپنے کمروں میں چلے جانا ہوتا تھا۔ اس کے بعد بلا ضرورت باہر آنے اور جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سونے سے پہلے پاپا سب کے کمروں میں گڈنائٹ کہنے اور چیک کرنے آتے تھے۔ میں یونیورسٹی سے ماسٹر کر رہی تھی۔ جنید انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا اور ثانیہ اولیول کر رہی تھی۔ پاپا کے جانے کے بعد جنید نے کہا۔ ”آج میرے کولیکز کی طرف سے پارٹی ہے میں دیر سے آؤں گا۔“

”یہ بات مجھے کیوں بتا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پلیز سو نیا پاپا پوچھیں تو تم بتا دینا۔“ اس نے منت کی۔ مجھے ترس آ گیا۔ ”او کے میں بتا دوں گی۔“

”بزدل! ثانیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تم کون سی بہادر ہو۔“ جنید تڑپ کر بولا۔ دونوں اوپر تلے کے تھے اس لیے دونوں میں جھتی جتی تھی اس سے زیادہ ان کی لڑائی ہوتی تھی۔ ”پاپا کے سامنے منمناتی رہتی ہو۔“

”پاپا سے تو سب ڈرتے ہیں۔“ ثانیہ بولی۔

دونوں کو چھوڑا اور یونیورسٹی پہنچی تو کلاس شروع ہو گئی تھی۔ میں نے آئی آر کا انتخاب کیا تھا۔ میرا ارادہ ماسٹر کے بعد سول سروس میں جانے کا تھا۔ ظاہر ہے میرا انتخاب فارن سروس ہوتی۔

☆☆☆

بہت سے دیکھنے اور جاننے والے شاید ہم پر رشک کرتے ہوں۔ ہم اسلام آباد کے ایک پوش علاقے میں اس بڑی سی سرکاری کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ لیکن ملازمت سے قطع نظر بھی ہم خاندانی دولت مند تھے۔ راول ڈیم سے اوپر کی طرف پاپا کی وسیع خاندانی زمین اور حویلی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد میں ملنے والے سرکاری پلاٹ پر کوٹھی بھی تعمیر کرائی تھی۔ فی الحال اسے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی میں موو کرتے تھے۔ بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھتے تھے اور ہر طرح سے لکڑی لائف اسٹائل کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر یہ تو ہم ہی جانتے تھے کہ ہماری زندگیوں میں کس چیز کی کمی تھی۔ بچپن میں ہمیں جس چیز سے محروم ہونا پڑا وہ ماں کی محبت تھی۔ میں نے بتایا میں صرف سات سال کی تھی جب امی پاپا سے طلاق لے کر ان سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئیں اور پھر ملک سے باہر چلی گئیں اس کے بعد ہم ان سے کبھی نہیں ملے تھے۔

جنید اور ثانیہ چھوٹے تھے لیکن مجھے کچھ ہوش تھا اور میں نے ماں باپ کو جب تک ساتھ دیکھا، وہ ایک تکلیف دہ یاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جب تک پاپا گھر میں۔۔۔۔۔ ہوتے تھے امی بیڈروم میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ بہت کم باہر آتی تھیں اور زیادہ وقت روتی رہتی تھیں۔ میں نے جب بھی دیکھا ان کی آنکھیں سوچی ہوتی تھیں۔ انہوں نے ثانیہ کو ڈیڑھ سال تک فیڈ کرائی تھی تب تک وہ امی کے ساتھ ہوتی تھی اور پھر انہوں نے اسے شمیمہ بی بی کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جس دن ثانیہ شمیمہ بی بی کے حوالے کی گئی اس دن امی اور پاپا میں بہت زوردار جھگڑا ہوا تھا۔ ان کی آوازیں بیڈروم سے باہر تک آرہی تھیں۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ لڑتے تھے تب بھی ان کی آوازیں بیڈروم سے باہر نہیں آتی تھیں۔ صرف میں جانتی تھی کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ پاپا غصے میں آکر بہت اونچی آواز میں بولتے تھے اور امی دبی دبی آواز میں بولتی تھیں۔ لیکن اس روز امی بھی زور زور سے بول رہی تھیں اور میں برآمد والے کمرے میں اپنے بیڈ پر دبی ہوئی ان کی آوازیں سن رہی تھی۔ جنید بے خبر سو رہا

تھا۔ پھر ان لوگوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ صبح مجھے پتا چلا کہ امی گھر سے چلی گئی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے چھ مہینے بعد پاپا سے طلاق لے لی۔

میں امی سے انج تھی تو نہیں تھی کیونکہ امی نے کبھی ہمیں خود سے زیادہ قریب نہیں کیا تھا مگر میں ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ میری کوشش ہوتی کہ ان کے آس پاس رہوں لیکن اکثر میری یہ کوشش ناکام ہوتی تھی۔ وہ بچوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتی تھیں بس کبھی موڈ ہوا تو پیار کر لیا۔ اس کے باوجود مجھے امی سے بہت محبت تھی۔ جب امی چلی گئیں تو میں تڑپ اٹھی تھی اور میں نے پہلی بار پاپا سے کہا۔ ”آپ نے میری امی کو نکالا ہے۔“

”سو نیا بیٹا میں نے نہیں نکالا وہ خود گئی ہے۔“ پاپا نے نرمی سے کہا۔ ”اے مجھ سے اور اپنے بچوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

”پاپا آپ امی کو لے آئیں میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ میں کہتے ہوئے رو دی تھی۔

”بیٹا اگر میرا اس پر زور ہوتا تو میں اسے جانے کیوں دیتا۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔“

پاپا شروع سے روکھے چپکے سے تھے۔ کم بولنے اور کم تاثرات دینے والے۔ وہ ہمیں پیار کرتے تھے مگر اس میں ایک عجیب سی اجنبیت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ امی پاپا سے الگ ہونا چاہتی ہیں، اس وقت مجھے طلاق کا مفہوم نہیں معلوم تھا۔ مگر مجھے لگا کہ اس لفظ نے ہمیشہ کے لیے میرے ماں باپ کو جدا کر دیا ہے۔ میں نے آخری بار امی کو اس وقت دیکھا جب وہ ہم سے ملنے آئی تھیں۔ میں خوش ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا وہ ہمیں لے جائیں گی مگر انہوں نے صرف ہمیں سار کیا اور روتی ہوئی چلی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ پاپا نے فیملی سے باہر شادی کی تھی۔ امی کا خاندان تقسیم کے وقت انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور آباد ہوا تھا پھر تانا سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ یہیں تانا اور پاپا کی ملاقات ہوئی جو گھریلو تعلقات میں بدل گئی۔ پاپا ان کے ہاں جانے لگے اور انہوں نے امی کو دیکھا تو پسند کر بیٹھے۔

پاپا کا رشتہ آیا تو امی کے گھر والے خوش ہو گئے۔ پاپا اس وقت سول سروس میں آئے تھے اور ان کا مستقبل روشن تھا پھر وہ ایک دولت مند جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ امی سے پوچھا تو وہ بھی مان گئیں مگر پاپا سے ان کی بیٹی

نہیں تھی۔ ایک بار پاپا نے بتایا کہ شادی کے تیسرے دن وہ ان سے جھگڑ کر اپنے گھر چلی گئی تھیں پھر تانا اور تانی ان کو منا کر چھوڑ کر گئے تھے۔ امی کی علیحدگی سے پہلے تانا نارناڑ ہو کر لاہور واپس چلے گئے۔ امی کے علاوہ ان کی دو بیٹیاں اور تھیں۔ مگر جب امی سے تعلق نہیں رہا تو ان سے کہاں سے ہوتا۔ مجھے تانا تانی اور اپنی خالائوں کی ہلکی سی یاد ہے۔ اب تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تانا اور تانی زندہ ہیں یا نہیں۔ اسی طرح دونوں خالائوں کا بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہوتی ہیں اور ان کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ میرا خیال تھا اسی طرح وہ ہم سے بے خبر ہوں گی۔ امی اور پاپا کی طلاق کے بعد ان لوگوں سے بالکل قطع تعلق کر لینا مجھے کھٹکتا تھا۔

کسی قدر ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے سوچا تو مجھے لگا کہ پاپا نے ہم تینوں بہن بھائیوں کو امی سے چھین لیا ہو گا۔ پاپا طاقتور بیوروکریٹ تھے اور وہ ہمیں زبردستی امی سے چھین سکتے تھے۔ دس گیارہ سال کی عمر تک مجھے امی کی یاد بہت آتی تھی۔ میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔ میں نے امی کی کچھ تصاویر اور چیزیں اپنے پاس رکھی تھیں میں ان کو دیکھ کر روتی اور امی کو یاد کرتی تھی۔ ایک بار اتفاق سے پاپا نے مجھے ان چیزوں کے ساتھ روتے دیکھ لیا تو وہ غصے میں آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”سو نیا تم اس عورت کو یاد کر کے رو رہی ہو جس نے تمہاری پروا نہیں کی۔“

”آپ نے ہمیں امی سے چھین لیا۔“

”یہ غلط ہے۔“ پاپا نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وہ عورت خود تمہیں چھوڑ کر گئی ہے۔ اس نے طلاق کے بدلے تمہیں میرے حوالے کیا ہے۔“

”تو آپ نے شرط رکھی ہوگی۔“

”اس نے خود پیشکش کی تھی۔“ پاپا نے کہا میں خاموش ہو گئی لیکن مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ عورت ہر چیز چھوڑ سکتی ہے اپنے بچے نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے یقین تھا کہ پاپا نے ہمیں امی سے چھین لیا ہو گا۔ اس کے بعد میری اس موضوع پر بھی پاپا سے بات نہیں ہوئی اور نہ ہی پاپا نے بھی کوئی بات کی۔ وقت گزرتا گیا۔ میں بڑی ہو گئی۔ امی کی یاد کا شعلہ کم نہیں ہوا تھا لیکن اب مجھے تکلیف کم ہوتی تھی۔ شعور آنے کے بعد میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اب ہمیں امی کے بغیر ہی رہنا تھا۔ اولیوں کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ گریجویشن کے بعد یونیورسٹی میں ماسٹر کرنے آئی۔ پاپا چاہتے تھے کہ

میں پولیٹیکل سائنسز میں لیکن میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز کا انتخاب کیا۔ میں نے قائد اعظم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اب میں تیسرے سمسٹر میں تھی۔ کلاسز ایک بے تکلف ہو جاتی تھیں لیکن میں ایک گھنٹا لائبریری میں گزارتی تھی۔ وہاں بکس دیکھتی اور نوٹس اتارتی۔ پھر دو بجے میں گھر کے لیے روانہ ہوتی اور ڈھائی بجے گھر میں ہوتی تھی۔ اس روز میں دو بجے یونیورسٹی سے نکلی تھی کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ اجنبی نمبر تھا اس لیے میں نے ایک بار کال ریسیو کی لیکن دوسری بار بیل بجی تو ریسیو کر لی۔

”ہیلو؟“

”سونیا...“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے کہا۔

”بات کر رہی ہوں۔“

”میں مرینا ہوں تمہاری امی...“ اس بار آواز ملو گئی تھی۔

امی کی آواز اور لہجہ سن کر مجھے ایسا جھٹکا لگا کہ ایک لمحے کو گاڑی لہرا گئی۔ میں نے بروقت اسے قابو کیا ورنہ وہ پاس سے گزرتی دین سے ٹکرا جاتی۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں بولی تو میری آواز کانپ رہی تھی۔ ”امی... یہ آپ ہیں؟“

”ہاں میری جان... میری بیٹی یہ میں ہوں تمہاری بد نصیب ماں۔“

مجھے لگا مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہوگی۔ اگر میں اسی طرح کار چلاتی رہی تو جلد کہیں مار دوں گی۔ میں نے گاڑی سڑک سے کچے میں اتار کر روک لی۔ ”امی مجھے یقین نہیں آ رہا... آپ نے پورے چودہ برس بعد مجھ سے رابطہ کیا ہے۔“

”میں مجبور تھی جان... اگر تم ملو تو میں تمہیں اپنی مجبوری کی داستان سناتی ہوں۔“

میں بے تاب ہو گئی۔ ”میں آپ سے کہاں مل سکتی ہوں؟“

امی نے اسلام آباد کے ایک اپارٹمنٹ کا نام لیا۔ ”تم نے یہ علاقہ دیکھا ہے؟“

”جی امی وہاں میری ایک یونیورسٹی فیلور رہتی ہے۔“

”یہاں آ جاؤ۔“ امی بولیں۔ ”میں آج کل یہیں ہوں۔“

”اس سے پہلے آپ کہاں تھیں؟“

”میں نے کہا تانیہ لمبی داستان ہے تمہیں وقت نکال کر آنا ہوگا اور ہاں تمہارے باپ کو ہرگز خبر نہ ہو۔“

”کیوں امی...؟“

”تم نہیں جانتی وہ اندر سے کیسا ہے؟“ امی کے لہجے

میں تھی آگئی۔ ”اگر اسے پتا چل گیا تو پھر تم مجھ سے نہیں مل سکتی۔“

”امی ابھی میں یونیورسٹی سے گھر جا رہی ہوں اگر مل ہوئی تو پاپا کو پتا چل جائے گا۔ وہ ہماری ایک ایک سرگرمی پر نظر رکھتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ وہ تصدیق بھی کرتے ہیں۔“

”اسی سے اندازہ لگا لو جس شخص کو اپنی اولاد پر اعتبار نہ ہو وہ بیوی کے ساتھ کیا کرتا ہوگا۔“

مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ امی کو پاپا سے الگ ہوئے کئی برس گزر گئے تھے اور اب انہیں پاپا کے بارے میں زیادہ جذباتی انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ بہر حال ان کے لیے نا محرم ہو گئے تھے۔ امی کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بیوی اپنے شوہر کی زیادتیوں کے بارے میں بولتی ہے۔ حالانکہ اب ان کا پاپا سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خاموش رہی پھر پوچھا۔ ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”بس مل گیا۔“ انہوں نے مبہم انداز میں کہا۔ ”تم کب آؤ گی؟“

”کل میں یونیورسٹی سے آ جاؤں گی۔ پہلی کلاس اینڈ کر لوں گی تو میری اینڈس لگ جائے گی اس کے بعد میں آؤں گی بھی تو پیرنٹس رپورٹ میں اینڈس لگے ہوگی۔ یہ آپ کا سیل نمبر ہے؟“

”ہاں سونیا، میں انتظار کروں گی میری جان۔“ امی نے کہا اور پیار کر کے کال کاٹ دی۔ جب کہ میں ان سے اور بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بے دلی سے گاڑی اشارت کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اتنے عرصے بعد امی کی آواز سن کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے امی سے بات کی ہے۔ امی نے مجھے منع کیا تھا کہ پاپا کو نہ بتاؤں مگر میں نے جنید اور ثانیہ کو بھی نہیں بتایا کہ میری امی سے بات ہوئی ہے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں ان کے منہ سے نکل جائے اور پاپا کو پتا چل جائے تو امی سے ملنے پر پابندی لگ جائے۔ اس لیے میں نے اپنا منہ بند رکھا تھا۔ مگر میری کیفیت بے چین تھی اور ان دونوں نے بھانپ لیا۔ لہجے کی میز پر ثانیہ نے کہا۔ ”آپنی کیا بات ہے آپ چپ چپ سی ہیں؟“

”ہاں سر میں درد ہے۔“ میں نے بہانہ کیا۔

”کوئی دوا لے لیں۔“ جنید نے مشورہ دیا۔

”ابھی لیتی ہوں۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ اپنی بے چین حالت چھپانے کے لیے میں اس دن

زیادہ تر کمرے میں رہی۔ صرف رات کو ڈنر کے لیے نکلتی تھی ورنہ پاپا چونک جاتے۔ ثانیہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ میرے سر میں درد ہے۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ دوا لے لی تھی اب ٹھیک ہے۔ پاپا مطمئن ہو گئے۔ ڈنر کے بعد میں اسٹڈی کا بہانہ کر کے کمرے میں آ گئی۔ اگلے دن ایک ٹیٹ تو تھا مگر میرا دھیان اس کی طرف کہاں تھا۔ میں تو امی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ اتنے دن کہاں رہیں؟ اور اب کیسے انہیں ہمارا خیال آیا تھا؟ واپسی تو ممکن نہیں تھی کیونکہ پاپا انہیں طلاق دے چکے تھے۔ پھر وہ ہم سے کیوں رابطہ کرنا چاہ رہی تھیں۔ پاپا نے ان کے ساتھ جو کیا تھا وہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ ان ہی خیالوں اور سوالوں میں مجھے رات مشکل سے نیند آئی اور صبح اٹھی تو سر سچ سچ درد کر رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ناشتے کی میز پر پاپا نے دیکھا تو بولے۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے آج مت جاؤ آرام کر لو۔“

”نہیں پاپا ایک ٹیٹ ہے اگر وہ نہیں دیا تو سمسٹر میں پانچ نمبرز کٹ جائیں گے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ پاپا نے بحث نہیں کی۔ یہ ان کی عادت تھی ہمارے معاملات کا فیصلہ وہ ہم پر چھوڑ دیتے تھے۔ مشورہ دیتے مگر اسے ہم پر ٹھونکتے نہیں تھے۔ ہاں ہمارے لیے جو قواعد و ضوابط بنا رکھے تھے ان پر سختی سے عمل کراتے تھے۔ ناشتے کے بعد میں یونیورسٹی روانہ ہوئی۔ ان دونوں کو چھوڑا۔ پہلی کلاس لی تاکہ اینڈس لگ جائے۔ اس کے بعد میں یونیورسٹی سے نکل آئی۔ میرا رخ ان اپارٹمنٹس کی طرف تھا جہاں امی موجود تھیں۔ یہ بہت پوش اور مہنگے اپارٹمنٹس تھے۔ امی جس فلیٹ میں تھیں وہ دوسرے فلور پر تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر انہیں کال کی تو انہوں نے فلیٹ کا نمبر اور لوکیشن بتائی پھر انٹرکام پر سیکورٹی گارڈز کو میرے بارے میں بتایا تب مجھے اندر جانے کی اجازت ملی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر پہنچی۔ کال بیل بجاتے ہوئے میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ دروازہ چند سیکنڈ بعد کھل گیا تھا مگر مجھے یہ چند سیکنڈ صدمہ کے برابر لگے تھے۔ دروازہ کھلا اور سامنے امی کھڑی تھیں۔ میں نے ان کی تصاویر اتنی بار دیکھی تھیں کہ وہ مجھے ازبہ ہو گئی تھیں۔ وہ تقریباً ویسی ہی تھیں۔ گردن پر چند معمولی سی جھریاں آئی تھیں جو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتی تھیں۔ بالوں کا رنگ قدرتی لائٹ براؤن تھا۔ ویسی ہی جسامت تھی۔

”سونیا میری جان۔“ امی نے جذباتی لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھ پھیلائے تو میں بے اختیار ان کی آغوش میں سا گئی۔ وہ دیوانہ وار مجھے پیار کر رہی تھیں اور چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اپنے بچوں سے نہیں مل سکوں گی۔ ان کو دیکھ اور پیار نہیں کر سکوں گی۔“

میں بھی رو رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”امی آپ ہم سے دور کیوں ہوئیں اور اگر ہوئیں تو ہم سے مل تو سکتی تھیں۔ ہمیں اپنے پاس تو رکھ سکتی تھیں۔“ امی مجھے اندر لے گئیں۔ انہوں نے صوفے پر پاس بٹھاتے ہوئے میرا ہاتھ چوم کر کہا۔ ”تو نہیں جانتی میری بچی اس شخص سے شادی کر کے میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی بلکہ میرے ماں باپ نے کی تھی، میں نے تو صرف ان کی خواہش پر سر جھکانے کی غلطی کی تھی۔“

آپنے میں خود کو دیکھ کر مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں بالکل امی جیسی ہوں لیکن اب انہیں سامنے سے دیکھ کر یقین ہو گیا تھا میرا رنگ و روپ قد و قامت، جسامت اور نقوش سب امی جیسے تھے۔ سات سال کی عمر میں امی سے آخری بار گلے ملی تھی ان کا لمس اور خوشبو بھی بھول گئی تھی۔ اب مجھے یہ لمس اور خوشبو ملی تو میں جیسے سرشار ہو گئی تھی۔ دیر تک امی سے لپٹا رہی۔ وہ بول رہی تھیں گھر میں نے سنا نہیں۔ اچانک انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا۔ ”سونیا کیا ہوا میں اتنی دیر سے بول رہی ہوں اور تو کوئی جواب ہی نہیں دے رہی ہے۔“

”سوری امی۔“ میں شرمندہ ہو گئی۔ ”اتنے دنوں بعد ملی ہیں نا آپ تو میں بے خود ہو گئی تھی۔ امی میں نے کل سے اب تک کا وقت کیسے گزارا ہے میں بتا نہیں سکتی۔“ ”تم نے کسی کو بتایا تو نہیں۔“ ابتدائی کیفیت کے بعد امی نے خود کو سنبھال لیا تھا اور نارمل انداز میں بول رہی تھیں۔ ”خاص طور سے حنیف کو؟“

”نہیں امی میں نے کسی کو نہیں بتایا۔“ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ”تم نے اچھا کیا تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کتنا خطرناک شخص ہے، اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں یہاں ہوں تو وہ مجھے اسلام آباد سے نکلوا دے گا۔“

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”امی پاپا ایسے نہیں ہیں۔“ ”میرے سامنے اس کی حمایت مت کرو۔“ امی بھڑکی تھیں پھر جلدی سے نرم لہجے میں بولیں۔ ”تم اسے نہیں

جانتیں، میری بچی، اس شخص کو بہت قریب سے میں نے دیکھا ہے۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جان سکتا ہے۔“ ”لیکن امی پاپا آپ کو یہاں سے کیسے نکال سکتے ہیں؟“

”وہ طاقتور بیوروکریٹ ہے، انتظامیہ اور پولیس اس کے ساتھ ہے۔ وہ چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔ مجھے طلاق دینے کا وقت بھی تو اس نے ہی کیا تھا۔“

میں نے ان کو یاد دلایا۔ ”لیکن امی طلاق تو آپ نے خود لی تھی۔“

”ہاں میں ساری عمر اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔“ ”پاپا کا کہنا ہے آپ نے طلاق کے عوض ہم سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔“

”جھوٹ کہتا ہے وہ۔“ امی سخت لہجے میں بولیں۔ ”اس کی شروع سے عادت رہی ہے دوسروں کے سامنے خود اچھا بننا ہے اور ہر جگہ مجھے پرانا کر ڈیل کراتا تھا۔ اس سے پوچھو اگر میں اتنی ہی بری تھی تو اس نے شادی کیسے کر لی۔“

”امی انہوں نے کبھی خود سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہاں جب میں نے بات کی تو انہوں نے بتایا تھا۔“ ”میری اس کے نزدیک شروع سے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ دوسری عورتوں کے....“

”امی پلیز....“ میں نے اس بار سنجیدہ لہجے میں انہیں ٹوک دیا۔ ”آپ کے پاپا سے اختلافات ہوں گے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ برا بھی کیا ہوگا لیکن آپ پاپا کے بارے میں یہ بات نہ کہیں.... میں اچھی طرح جانتی ہوں پاپا اس کردار کے آدمی نہیں ہیں۔“

امی ذرا خاموش ہوئیں پھر بدلے انداز میں بولیں۔ ”میرا بھی یہ مطلب نہیں ہے، میں کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے سامنے دوسری عورتوں کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ جیسے اس کے خاندان کی عورتیں، حد یہ کہ میری امی اور بہنوں کو بھی زیادہ اہمیت دیتا تھا۔“

”امی یہ تو اچھی بات ہے۔ پاپا آپ کی امی اور بہنوں کو بھی اہمیت دیتے تھے۔“ میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ”امی آپ اتنے عرصے کہاں رہیں اور ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ پاپا کتنی ہی پابندی لگاتے وہ ہمیں آپ سے ملنے سے روک نہیں سکتے تھے۔“

”وہ روک سکتا تھا میری بچی.... تم تینوں چھوٹے تھے،

اس کے قابو میں تھے۔ میں نے کتنی بار کال کی لیکن اس نے یا ملازموں نے ہر بار میری آواز سنتے ہی کال کاٹ دی۔ ایک بار میں تم لوگوں کی محبت سے مجبور ہو کر گھر تک چلی آئی مگر چونکدار نے اندر نہیں جانے دیا۔ کتنی دیر وہیں گیٹ پر کھڑی رہی کہ شاید تم میں سے کوئی نظر آجائے تو اپنی ممتا کی پیاس دیکھ کر ہی بجھالوں۔“ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ آنسو صاف کرنے لگیں۔ میں نے انہیں گلے لگا لیا۔

”اگر پاپا نے اس وقت روک دیا تھا تو اب نہیں روک سکتے اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔“

”اسی لیے تو ہمت کر کے یہاں تک چلی آئی ہوں۔“ امی ہماری بات کرتی رہیں اور ہر کچھ دیر بعد ان کی گفتگو کا رخ پاپا کی طرف مڑ جاتا اور وہ پاپا کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگتیں۔ ایسا لگتا تھا کہ پاپا کے خلاف ان کے اندر عناد بھرا ہوا تھا۔ میں بہ مشکل ان کا دھیان اس طرف سے ہٹاتی تھی اور پھر باتوں کے دوران میری توجہ گھڑی کی طرف گئی تو میں چونک گئی۔ دو بج کر دس منٹ ہو رہے تھے وقت کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”امی مجھے جانا ہوگا میں ہر روز ڈھانکی بجے تک گھر پہنچ جاتی ہوں۔“

وہ تڑپ کر بولیں۔ ”اس شخص نے پہلے مجھے قیدی بنا کر رکھا تھا، اب میری بیٹی کو قیدی بنایا ہوا ہے۔“

امی کی بات سن کر میں کچھ دیر کے لیے خاموش رہی تھی۔ ”ایسی بات نہیں ہے امی، ہم ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔ اگر دیر ہو جائے یا کہیں جانا ہو تو پاپا یا شمینہ کو بتا جاتے ہیں۔“

”شمینہ؟“ امی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”وہ اب تک اسی گھر میں ہے۔“ ”جی امی اس نے آپ کے جانے کے بعد ہمارا بہت خیال رکھا۔ شانیہ کو تو سمجھ لیں پالا امی اس نے ہے۔“

”بتاؤں گی اس کے بارے میں بھی تم کو۔“ امی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”اب تم جاؤ بیٹا کہیں اس ظالم شخص کو شک نہ ہو جائے اور یہ راستہ بھی بند نہ ہو جائے۔“

میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے نکل آئی۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ امی نے اپنے بارے میں تو بتایا نہیں کہ پاپا سے طلاق کے بعد انہوں نے کیا کیا اور اب تک کہاں تھیں؟ جب میں نے یہ سوال کیا تو انہوں نے بات پلٹ دی تھی۔ شاید وہ ابھی بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ پاپا کے بارے میں ان کی بعض باتوں سے مجھے اتفاق تھا لیکن بعض باتوں سے اختلاف تھا۔ وہ پاپا کی مخالفت میں حد سے بڑھ کر بول

رہی تھیں۔ ان میں جو بھی تھا وہ ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ انہوں نے چودہ سال پہلے اپنے اپنے راستے الگ کر لیے تھے اس لیے اب ان باتوں کو بھول جانا چاہیے تھا۔ آدمی اختلاف یا دشمنی اس سے رکھتا ہے جس سے کوئی تعلق ہو یا رکھنا مجبوری ہو یا بدلہ لینا ہو۔ جب کہ پاپا کے ساتھ امی کا ایسا کوئی تعلق یا بدلہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود امی کی باتوں سے لگ رہا تھا انہوں نے پاپا کو معاف نہیں کیا تھا۔ ان کے لیے اب تک امی کے دل میں غصہ تھا۔

میں گھر آئی، شانیہ اور جنید لنچ کی میز پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ پاپا نے ایک اصول یہ بھی بنایا تھا کہ تینوں وقت کا کھانا ہم گھر میں کھاتے تھے۔ باہر کھانے پینے پر پابندی نہیں تھی لیکن ناشتے، لنچ اور ڈنر میں شرکت ضروری تھی اور پتا کسی وجہ کے غیر حاضری پر باقاعدہ پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ خود پاپا اپنا لنچ گھر سے لے کر جاتے تھے۔ وہ باہر بہت کم اور صرف مجبوری میں کھاتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے باون سال کی عمر میں ان کی صحت بہت شاندار تھی۔ وہ ہفتے میں تین بار لمبی جاگنگ کرتے تھے اور رات کے کھانے کے بعد لازمی آدھا پون گھنٹا لان اور اگر موسم سرد ہو تو لاؤنج میں ٹہلتے تھے۔ ہر سٹڈے کو آفیسر کلب سوسنگ کرنے جاتے تھے۔ ان کے حکم پر ہم سب نے بھی کوئی نہ کوئی جسمانی ایکٹیوٹی اختیار کی ہوئی تھی۔ جیسے میں گھر میں سائیکلنگ کرتی تھی۔ جنید کو سوسنگ کا شوق تھا۔ البتہ شانیہ ذرا چور تھی جب تک پاپا سے ڈانٹ نہیں پڑتی وہ جاگنگ نہیں کرتی تھی۔ وہ صبح لان میں جاگنگ کرتی تھی کیونکہ پاپا کو لڑکیوں کا گھر سے باہر اس قسم کی سرگرمی کرنا پسند نہیں تھا۔ گھر میں بننے والے کھانے بھی زیادہ تر سادہ اور غذائیت والے ہوتے تھے۔ ہمیں چٹ پٹے کھانوں کا شوق نہیں تھا۔ رات سونے سے پہلے لازمی دودھ کا گلاس لینا ہوتا تھا۔

شانیہ نے پوچھا کہ میں لیٹ کیوں ہوئی تو میں نے بتایا کہ یونیورسٹی سے ڈرائیو نکلی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ امی تو ان دونوں کی بھی تھیں تو ان کا بھی حق تھا کہ امی سے ملیں۔ میں نے سوچا کہ اب جب امی سے ملوں گی تو پوچھوں گی۔ مجھے تو یہ پوچھنا بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ فلیٹ کس کا تھا جس میں امی تھیں۔ یہ خاصا بڑا اور پر عیش فلیٹ تھا۔ اس میں تین بیڈ رومز، ایک بڑا سا ڈرائنگ روم، کچن کے ساتھ ڈائننگ روم اور ایک لاؤنج بھی تھا۔ میری یونیورسٹی فیلو کا فلیٹ ایسا ہی تھا۔ امی نے مجھے لاؤنج میں بٹھایا تھا اور مجھے

باقی فلیٹ دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں نے امی کا نمبر موبائل میں محفوظ نہیں کیا تھا کیونکہ پاپا کبھی کبھی ہم سب بہن بھائیوں کے موبائل چیک کرتے تھے۔ اگر کوئی اجنبی نمبر دکھائی دیتا تو پوچھتے تھے۔ اگر ہم نمبر ڈیلیٹ بھی کر دیتے تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ سب کے موبائل نمبر پوسٹ پیڈ تھے اس لیے بل پاپا دیکھ سکتے تھے اور کالز کا ڈیٹا بھی لے سکتے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس میرے جنید اور ثانیہ کے تمام کونٹیکٹس نمبر تھے۔ اگر ان میں کوئی نیا نمبر آتا تو پاپا اس کی تحقیق کر سکتے تھے۔ اگلے روز میں نے امی کو یونیورسٹی سے کال کی۔

”امی اب آپ میرے موبائل پر کال مت کیجیے گا۔“ وہ پریشان ہو گئیں۔ ”کیوں میری جان؟“ میں نے انہیں بتایا کہ پاپا چیک کر سکتے ہیں اور وہ ان کے نمبر سے ان کے بارے میں جان سکتے ہیں تو امی کو غصہ آ گیا وہ پھر پاپا کو سنانے لگیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا کہ پاپا ایسا کسی شک کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک اصول کے تحت کرتے تھے کہ اولاد پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ آج کے دور میں یہ غلط نہیں بلکہ بہت ضروری ہے۔ امی نے مٹی سے کہا۔ ”یونہی کڑی نظر رکھ کر اس نے میری زندگی حرام کی ہوئی تھی اور اب تم لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کر رہا ہے۔“

”امی ہم لوگ عادی ہیں اور پھر پاپا کی نیت پر شک نہیں ہے۔“ ”سو نیا میں دیکھ رہی ہوں تم اپنے باپ کی زیادہ ہی سائیڈ لے رہی ہو۔“ امی نے کڑے لہجے میں کہا۔ میں نے رسائی سے کہا۔ ”امی میں آپ کی بھی ایسی ہی سائیڈ لیتی رہی ہوں۔ آپ میری امی ہیں اور وہ میرے پاپا ہیں دونوں میرے لیے ایک جیسے ہیں۔“ ”میں مظلوم ہوں اور وہ ظالم ہے۔“

”امی یہ آپ کا اور پاپا کا معاملہ ہے۔ میں نے آپ سے شکایت نہیں کی کہ آپ ہماری خاطر ان کے ساتھ رہ لیتیں۔ اسی طرح مجھے پاپا سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔“ میری بات پر وہ ذرا چپ ہوئیں اور پھر انہوں نے کہا۔ ”تم پھر کب ملنے آؤ گی۔“

”جلد آؤں گی۔۔۔ دراصل امی مجھے اس طرح یونیورسٹی سے چھٹی سے پہلے ٹکنا پسند نہیں ہے اور پھر میری کئی کلاسز بھی چھوٹ گئیں۔ میں اسٹڈی پر بہت توجہ دیتی

ہوں۔ اس لیے اب جلد ممکن نہیں ہے۔“ ”ٹھیک ہے لیکن مجھے تم اور ثانیہ و جنید بہت یاد آ رہے ہو۔ میں تم لوگوں کی خاطر تو یہاں آئی ہوں۔“ ”امی یہ آپ کا فلیٹ ہے؟“ اس سوال پر وہ ہچکچائیں۔ ”ایسا ہی سمجھو۔“ ”کیا مطلب؟“ ”ایک فرینڈ کا ہے اس نے مجھے رہائش کے لیے دیا ہوا ہے۔“

”اس سے پہلے آپ کہاں تھیں؟“ ”یو ایس اے۔“ وہ بولیں۔ ”ڈی ایورس کے فوراً بعد یہاں سے چلی گئی تھی۔ ابھی چند مہینے پہلے واپس آئی ہوں۔“ ”امی آپ نے دوسری شادی کی تھی؟“ میں نے وہ سوال کیا جو میں اصل میں کرنا چاہ رہی تھی۔ امی کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا۔ ”ہاں تمہارے نانا نے اپنے دور کے ایک سنجے سے میری شادی کی تھی وہ امریکا میں ہوتا ہے۔“ ”وہ ساتھ نہیں آئے؟“

”نہیں۔“ امی نے مختصر لکھا ایسا لگا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ”بیٹا میں ثانیہ اور جنید سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”اگر آپ کہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں لیکن اس کا خطرہ بھی ہے کہ کہیں بات کھل نہ جائے۔“ ”کبھی نہ کبھی تو کھلے گی لیکن اب میں تم لوگوں سے دور نہیں رہ سکتی اور پھر تم لوگ بالغ ہو چکے ہو۔ جنید تم پر اپنا رشتہ نہیں ٹھونس سکتا۔“

”امی ثانیہ ابھی سولہ سال کی ہے۔“ ”لیکن وہ بچی نہیں ہے۔“ ”تب بہتر ہے مجھے پاپا سے بات کرنے دیں۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ منع نہیں کریں گے۔“ ”اور اگر اس نے منع کر دیا تو تم لوگ مجھ سے نہیں ملو گے۔“

”نہیں امی پھر ہم پوچھیں گے کہ ہم آپ سے کیوں نہ ملیں۔ اگر پاپا ماضی کو دفن رکھنا چاہیں گے تو وہ ضرور اجازت دیں۔“

امی اس بات پر کچھ بے چین ہو گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں قائل کیا کہ وہ مجھے پاپا سے بات کرنے دیں۔ میں نے امی سے تو کہہ دیا تھا کہ میں پاپا سے بات

کروں گی۔ لیکن میں سوچ رہی تھی کہ یہ کام کیسے کروں۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رات ڈنر کی میز پر جب سب کھانا ختم کر چکے تھے پاپا نے منہ صاف کر کے اچانک کہا۔ ”سو نیا تم کل مرینا سے ملی ہو؟“ میں ایک لمحے کو ششدر رہ گئی کہ پاپا کو کیسے پتا چلا۔ پھر میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”آپ۔۔۔ آپ میری جاسوسی کراتے ہیں۔“

”تم بھول رہی ہو تمہاری گاڑی میں ٹریک رکھا ہے اور میں جب چاہوں اپنے لیپ ٹاپ پر دیکھ سکتا ہوں تم کہاں ہو۔ جب تم ان فلیٹوں تک نہیں تب ہی میں چونک گیا تھا اور پھر معلوم کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا کہ تم کہاں اور کس سے ملنے لگی تھیں۔“

اس وقت مجھے پاپا پر غصہ آیا تھا اور میں بول گئی۔ ”امی ٹھیک کہہ رہی تھیں آپ نے ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہوگا۔ آپ کسی پر اعتبار نہیں کرتے ہیں۔“ ”تم جذباتی ہو رہی ہو۔“ خلاف توقع پاپا کا لہجہ نرم رہا۔ ”مجھے پہلے ہی خطرہ تھا کہ مرینا نے تمہارے ذہن میں زہر بھرنے کی کوشش کی ہوگی۔“

”انہوں نے سچ کہا ہے۔“ میں کھڑی ہو گئی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ پیچھے سے پاپا آوازیں دیتے رہ گئے تھے مگر میں نے ان سے کئی کر دی۔ میں اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ بیڈ براؤنڈ سے منہ کر کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ میں سمجھی کہ پاپا ہوں گے مگر ان کے بجائے ثانیہ کی آواز آئی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھی۔

”آپنی کیا سچ آپ امی سے ملی ہیں؟“ میں اٹھ بیٹھی اور چہرہ صاف کیا۔ ”ہاں کل میں ان سے ملی تھی۔ وہ حال ہی میں یو ایس اے سے آئی ہیں۔“ ”آپنی کیسی ہیں امی؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”مجھے تو یاد ہی نہیں ہیں۔“

میں نے اسے کئی قدر تفصیل سے بتایا کہ امی سے کیسے ملی اور وہ اب کیسی ہیں۔ ”میں نے پاپا سے بات کرنی تھی لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے بات چھیڑ دی۔“ ”یہ تو اچھا ہوا ورنہ آپ ہمت کرتی رہ جاتیں اور پھر پاپا نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا نا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، مجھے معلوم تھا کہ پاپا نے ہماری گاڑیوں میں ٹریک لگوا دیا تھا اور انہیں معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ یہ اصل میں ہماری حفاظت کے لیے

تھے۔ جب سے ملک کے حالات خراب ہوئے تھے پاپا ہم بہن بھائیوں کی طرف سے بہت فکر مند رہتے تھے۔ مگر میں امی سے مل کر آئی تھی اور شاید ان کی باتیں میرے ذہن میں تھیں اس لیے میں پاپا سے ایسا بول گئی۔ میں نے ندامت سے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو پاپا نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ میں ان سے سوری کر لیتی ہوں۔“ میں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی ان سے بات کرنی ہے امی تم سے اور جنید سے بھی ملنا چاہتی ہیں۔“

”سچ! ثانیہ جوش سے بولی۔ ”میرا بھی امی سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”تب میرے ساتھ آؤ پاپا سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ جنید لاؤنچ میں تھا اور امی کا سن کروہ بھی بے قرار تھا۔ مگر وہ پاپا سے ڈرتا تھا اس لیے ان کے پاس جانے کے لیے ذرا مشعل سے تیار ہوا تھا۔ پاپا اپنے کمرے میں تھے اور کسی قدر فکر مند انداز میں ٹہل رہے تھے۔ میں سمجھ رہی تھی ان کی فکر مندی کا تعلق امی سے تھا۔ انہوں نے دستک کے جواب میں اندر آنے کی اجازت دی تو ہم تینوں اندر آئے۔ پاپا نے میری طرف دیکھا تو میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”سوری پاپا آپ سے بات کرتے ہوئے میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔“

”اٹس اوکے سو نیا۔۔۔ مجھے فکر تم لوگوں کی ہے۔ اس عورت کو برسوں بعد تم لوگوں کی یاد آئی ہے۔“ ”پاپا وہ ماں ہیں۔“ میں نے سچی لہجے میں کہا۔ ”اپنی ممتا سے مجبور ہو کر آئی ہیں۔ ہم سے ملنا چاہتی ہیں۔“ ”یہ ممتا اس وقت کہاں تھی جب وہ تم تینوں کو اس عمر میں چھوڑ کر چلی گئی جب تمہیں ماں کی کہیں زیادہ ضرورت تھی؟“ پاپا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”پاپا آپ ہمیں جو امی کے بارے میں بتاتے ہیں وہ ہم سنتے ہیں۔ اسی طرح امی نے جو بتایا وہ بھی ہم نے سن لیا۔ یہ آپ کا اور ان کا معاملہ ہے ہمیں اس میں نہ گھسیٹیں، میری اور ان دونوں کی خواہش ہے ہم امی سے ملیں۔“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اگر وہ تم سے اس لیے ملتی ہے کہ اسے تم سے محبت ہے۔ لیکن مجھے شک ہے وہ اصل میں تم لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے تم سے مل رہی ہے۔“

”پاپا ہم اب بچے نہیں ہیں سمجھا رہیں ہمیں کوئی نہیں

”بیٹا تم بھول رہی ہو وہ کوئی نہیں تمہاری ماں ہے اور ماں سے انسان ویسے ہی متاثر ہوتا ہے، وہ دنیا میں واحد ہستی ہے جس کے جھوٹ پر سب سے زیادہ آسانی سے اعتبار کیا جاسکتا ہے۔“

”پاپا پلیز۔“ میں نے التجا کی۔

”میرے بچو۔۔۔ میں نے شاید تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا ہو۔“ پاپا نے کسی قدر تھکے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں نے تم لوگوں کی پرورش میں کوئی کوتاہی یا کمی نہیں کی ہے۔“

”پاپا میں جانتی ہوں۔“

”مجھے خوف ہے کہیں مرینا تم لوگوں کو بگاڑ نہ دے۔“

ثانیہ اور جنید بالکل خاموش تھے لیکن ان کی خواہش ان کے چہروں پر لکھی تھی۔ وہ اپنی ماں سے ملنا چاہتے تھے۔ پاپا نے بھی یہ خواہش پڑھ لی تھی۔ اس لیے وہ مان گئے۔ ”ٹھیک ہے تم لوگ اپنی ماں سے ملو جا کر لیکن۔“ وہ بولتے ہوئے رکے اور پھر کہا۔ ”میری شرط ہے تم تینوں ایک ساتھ جاؤ گے اس سے الگ الگ نہیں ملو گے دوسرے تم اس کے پاس رکو گے نہیں بس ملو گے اور واپس آ جاؤ گے۔ بے شک کئی گھنٹے اس کے پاس رہو مگر وہاں ٹھہرو گے نہیں۔“ ہم تینوں خوش ہو گئے تھے۔ ”مجھے منظور ہے پاپا۔“ میں نے کہا۔

”اور تم دونوں کو؟“ پاپا نے جنید اور ثانیہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے بھی جلدی سے سر ہلایا۔

”سو نہ تم انہیں لے کر جاؤ گی اور اپنے ساتھ لاؤ گی۔ میں تم لوگوں پر جبر نہیں کرنا چاہتا ورنہ اس سے ملنا تم تینوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے اسی رات امی کو کال کر کے بتایا کہ کل ہم تینوں ان سے ملنے آئیں گے۔ امی بھی خوش ہو گئی تھیں۔ طے پایا کہ کل میں یونیورسٹی سے جلدی نکلوں گی اور ان دونوں کو لے کر امی کے پاس جاؤں گی۔ ہم وہاں دو سے تین گھنٹے رکیں گے اور پھر واپس آ جائیں گے۔ میں نے پاپا کو بتایا تو وہ مان گئے مگر ان کی فکر مندی کم نہیں ہوئی تھی۔ اگلے روز جب ہم ناشتا کر کے نکلے تو تینوں ہی بہت پُر جوش تھے۔ جنید نے پہلی بار کہا۔ ”اگر پاپا منع کرتے تب بھی میں امی سے ملتا۔“

میں نے اسے گھورا۔ ”پاپا کے سامنے تمہاری بولی بگڑ جاتی ہے۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ پاپا مان جائیں گے۔“

”میں ڈر رہا تھا پاپا انکار کر دیں گے۔“

”پاپا سخت ہیں مگر صرف اصولوں کے معاملے میں ورنہ وہ ہم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے ہیں۔“

”میں امی سے پوچھوں گی، وہ ہمیں کیوں چھوڑ کر گئیں۔“ ثانیہ بولی۔ ”مجھے بھی چھوڑ دیا جب کہ میں اتنی سی تھی، مجھے تو ان کی زیادہ ضرورت تھی۔“

”میں نے امی سے پوچھا تھا مگر ان کا کہنا ہے پاپا نے ان سے ہمیں چھین لیا تھا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، امی کورٹ گئی تھیں اور کوئی کورٹ بچوں سے ماں نہیں چھینتی ہے۔“ جنید بولا۔

”کوئی سیٹل منٹ ہوئی تھی لیکن یہ ماضی کی بات ہے بہتر ہے اسے بھول جاؤ ہم امی سے ملیں گے اور واپس آ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ انہیں ان کے اسکول اور یونیورسٹی تک چھوڑا۔ میں یونیورسٹی سے ایک بجے نکل آئی تھی ان دونوں کو لیا اور امی کے پاس پہنچی۔ وہ بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے جس طرح ثانیہ اور جنید کو اپنی آغوش میں لیا، پیار کیا، اس سے کوئی متاثر ہوئے بغیر رہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت رورہی تھیں اور بار بار انہیں پیار کر رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی رو رہے تھے۔ میں کیونکہ اس مرحلے سے گزر چکی تھی اس لیے انہیں چپ کر رہی تھی۔

”امی نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں بتا نہیں سکتی کہ چودہ سال تم لوگوں کے لیے کیسے کیسے تڑپی ہوں۔“

”امی ہم بھی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔“ ثانیہ بولی۔

اس بار امی نے پاپا کے خلاف کھل کر تو کچھ نہیں کہا لیکن ہر کچھ دیر بعد وہ کچھ نہ کچھ ایسا بول جاتی تھیں جس سے لگتا تھا وہ ہم سے جدائی میں پاپا کو قصور وار سمجھ رہی ہیں۔ ہم تین کے بجائے چار گھنٹے وہاں رکے تھے۔ سردی کے دن تھے پانچ بجے سورج ڈوب گیا اور اندھیرا ہوا تو میں نے جنید اور ثانیہ سے چلنے کو کہا۔ وہ راضی نہیں تھے، امی بھی بار بار کہہ رہی تھیں کہ کچھ دیر اور رک جاؤ۔ مگر مجھے پاپا کی وارننگ یاد تھی کہ ہمیں جلد آنا تھا۔ میں نے امی سے کہا۔ ”ہمیں تاریکی سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

”تم لوگ اپنی ماں کے پاس ہو۔“ وہ ناگواری سے بولیں۔ ”اب تمہارے باپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”امی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پاپا نے جلدی آنے کو کہا تھا اگر ہم دیر سے گئے تو شاید پھر اجازت ملنے سے ملے۔“

”مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ جنید نے سرکش لہجے میں کہا۔ ”مجھے امی سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”جنید وہ پاپا ہیں۔“ میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ”اور ہمیں ان کے پاس رہنا ہے۔“

اس وقت جنید چپ ہو گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کا اور امی دونوں کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ واپسی کے سفر میں ثانیہ بھی چپ تھی۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہاں پاپا کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ میں فکر مند ہو گئی۔ پاپا لاؤنج میں مل گئے۔ لیکن شکر ہے انہوں نے تاخیر سے آنے پر کچھ کہا نہیں، ہم سے سلام دعا لے کر انہوں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔ ”مل آئے اپنی ماں سے؟“

”جی پاپا۔۔۔ آج پہلی بار گئے تھے اس لیے دیر ہو گئی۔“ میں نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

”پاپا کیا ضروری ہے ہم سب ساتھ جائیں۔“ خلاف توقع جنید بولا۔

پاپا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم نے یہ سوال کیوں کیا؟“

”میں امی سے اکیلے بھی ملنے کے لیے جانا چاہتا ہوں جب میرا دل چاہے۔“

پاپا نے ثانیہ کی طرف دیکھا۔ ”آپ بھی اپنی امی سے اکیلے میں ملنا چاہتے ہو؟“

”جی پاپا۔“ وہ دبے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ اپنی خواہش کے مطابق اپنی ماں سے ملیں لیکن میں بتا دوں یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔“ پاپا کہتے ہوئے اٹھ گئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جنید نے کہا۔

”کیا پاپا ہم پر پابندی لگا دیں گے؟“

”پابندی لگانا ہوتی تو ابھی اجازت کیوں دیتے؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”پاپا نے تو ساتھ ملنے کی پابندی بھی ختم کر دی ہے۔ پاپا کی بات کا مطلب کچھ اور ہے۔“

”میں۔۔۔ میں کل ہی جا کر امی سے ملوں گا۔“ جنید نے جذباتی انداز میں کہا۔ ثانیہ بھی تیار تھی تو میں نے کہا۔

”تب ٹھیک ہے ہم سب ہی چلتے ہیں۔“

”یہ تو پھر وہی کچھڑی پک جائے گی۔“ ثانیہ نے اعتراض کیا۔

”تو پاپا نے الگ الگ ملنے کی اجازت دی ہے ساتھ ملنے پر پابندی تو نہیں لگائی ہے۔“ میں نے کہا۔ جو بات میں نے پہلی ملاقات میں محسوس نہیں کی تھی وہ دوسری بار میں محسوس کی۔ کیونکہ اس بار ہم چار گھنٹے سے زیادہ امی کے پاس رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں کھانے یا پینے کا نہیں پوچھا تھا۔ حالانکہ دوسری بار ہم بھوکے بھی تھے کسی نے لچ نہیں کیا تھا۔ مگر امی نے ہم سب کو کولڈ ڈرنک ٹن فریج سے نکال کر تھما دیے تھے۔ کھانے کا انہوں نے کہا ہی نہیں۔ اس لیے جب ہم گھر آئے تو بھوک سے سب کا برا حال تھا۔ ڈنر سے پہلے ثمنینہ بی بی سے کچھ بنوا کر اپنی سلی کی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کیونکہ ماں عملی پیار کا اظہار اولاد کو کھلا پلا کر کرتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے اس سے اگلے دن میں نہیں جاسکی۔

اچانک ہی یونیورسٹی میں ایک غیر ملکی سفیر کی آمد ہوئی تھی اور میں اس کا پتھر سننے کے لیے رک گئی۔ جنید اور ثانیہ چلے گئے تھے۔ پاپا نے ان کے لیے آفس سے نصر گل کو گاڑی دے کر بھیج دیا تھا جو انہیں امی کے پاس لے گیا۔ پھر امی نے انہیں پانچ بجے تک واپس گھر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے بھی کچھ دیر بعد واپس آئی تھی۔ میں جانیں سکی تھی لیکن ان سے اس ملاقات کا احوال لینے کے لیے بے تاب تھی۔ ثانیہ اور جنید لاؤنج میں سر جوڑے بیٹھے آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر یک دم چپ ہو گئے۔

”کیا ہو رہا ہے کیسا رہاؤنٹ؟“ میں صوفے پر گر کر بولی۔

”آپ کیوں نہیں آئیں؟“ ثانیہ نے پوچھا۔

”امی کو کال کر کے بتایا تو تھا کہ یونیورسٹی میں ایک سفیر آیا تھا اس کا پتھر سننے کے لیے رک گئی تھی۔“

”تو ہمیں تو نہیں معلوم تھا۔“ جنید بولا۔

”ڈونٹ بی سلی۔۔۔ تم لوگ امی کے پاس تھے اور میں نے امی کو بتا دیا تھا، کیا اب تم دونوں کو الگ سے بتانی۔“

”امی کو بتانے کا خیال نہیں رہا ہو گا۔“ ثانیہ نے کہا۔ ”آپ کو خیال رکھنا چاہیے تھا۔“

وہ دونوں ہی احمقانہ بات کر رہے تھے۔ میں نے بحث کے بجائے اپنا سوال دہرایا۔ ”کیسا رہا آج کا وزٹ؟“

”امی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پاپا نے جلدی آنے کو کہا تھا اگر ہم دیر سے گئے تو شاید پھر اجازت ملنے سے ملے۔“

”مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ جنید نے سرکش لہجے میں کہا۔ ”مجھے امی سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”جنید وہ پاپا ہیں۔“ میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ”اور ہمیں ان کے پاس رہنا ہے۔“

اس وقت جنید چپ ہو گیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کا اور امی دونوں کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ واپسی کے سفر میں ثانیہ بھی چپ تھی۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہاں پاپا کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ میں فکر مند ہو گئی۔ پاپا لاؤنج میں مل گئے۔ لیکن شکر ہے انہوں نے تاخیر سے آنے پر کچھ کہا نہیں، ہم سے سلام دعا لے کر انہوں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔ ”مل آئے اپنی ماں سے؟“

”جی پاپا۔۔۔ آج پہلی بار گئے تھے اس لیے دیر ہو گئی۔“ میں نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

”پاپا کیا ضروری ہے ہم سب ساتھ جائیں۔“ خلاف توقع جنید بولا۔

پاپا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم نے یہ سوال کیوں کیا؟“

”میں امی سے اکیلے بھی ملنے کے لیے جانا چاہتا ہوں جب میرا دل چاہے۔“

پاپا نے ثانیہ کی طرف دیکھا۔ ”آپ بھی اپنی امی سے اکیلے میں ملنا چاہتے ہو؟“

”جی پاپا۔“ وہ دبے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ اپنی خواہش کے مطابق اپنی ماں سے ملیں لیکن میں بتا دوں یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔“ پاپا کہتے ہوئے اٹھ گئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جنید نے کہا۔

”کیا پاپا ہم پر پابندی لگا دیں گے؟“

”پابندی لگانا ہوتی تو ابھی اجازت کیوں دیتے؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”پاپا نے تو ساتھ ملنے کی پابندی بھی ختم کر دی ہے۔ پاپا کی بات کا مطلب کچھ اور ہے۔“

”میں۔۔۔ میں کل ہی جا کر امی سے ملوں گا۔“ جنید نے جذباتی انداز میں کہا۔ ثانیہ بھی تیار تھی تو میں نے کہا۔

”بہت مزہ آیا۔“ ثانیہ چپک کر بولی اور پھر حسرت سے کہا۔ ”کاش کہ امی ہمارے ساتھ رہتیں۔“

”دل میں تو میرے بھی یہی آتا ہے۔“ میں نے سر د آہ بھری۔ ”کاش امی ابو سے ڈائیورس نہ لیتیں۔“

”امی نے نہیں لی... ان کو ابو نے ڈائیورس دی۔“ جنید تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ ابو کا قصور ہے انہوں نے ہمیں ماں سے محروم کیا۔“

”جنید احمقانہ باتیں مت کرو، میاں بیوی کی لڑائی میں قصور ایک کا نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے اسے جھڑکا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ثانیہ نے اس کی حمایت کی۔ ”تم دونوں بھول رہے ہو، امی کورٹ گئی تھیں اور ڈائیورس کورٹ کے ذریعے ہوئی تھی۔ کورٹ نے ہی ہمیں پاپا کی تحویل میں دیا تھا۔“

”بات کورٹ تک گئی تب بھی پاپا قصور وار تھے۔“ جنید کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا، لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی جنید تھا جو منمناتا کر بات کرتا تھا۔ آج اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔

”کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو اس طرح کیوں بات کر رہے ہو، جب تمہیں سمجھایا تھا کہ ہمیں صرف امی سے ملنا ہے ماضی کو بھول جانا ہے اور تم لوگ بلا وجہ ماضی کی بات کر رہے ہو اس کا اب کیا فائدہ؟“

”ماضی کبھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔“ جنید نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ جو ماضی میں کرتا ہے اسے بھگتنا پڑتا ہے۔“

جنید اپنی بات مکمل کرتے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ ثانیہ چپ بیٹھی تھی مگر اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جنید سے متفق ہے۔ میں حیران تھی کہ ایک دن میں ان دونوں کو کیا ہو گیا تھا؟ اتنا تو میں بھی جانتی تھی کہ امی نے پاپا کے خلاف بات کی ہوگی لیکن یہ بات ان دونوں پر اس قدر اثر کرے گی یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے ثانیہ کو کریدا کہ امی نے ان سے کیا کہا مگر اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ ایک بار پوچھنے پر اس نے تنک کر کہا۔ ”اگر امی نے کچھ کہا تو کیا غلط کہا ہے؟“

میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ امی غلط یا ٹھیک کہہ رہی ہیں، میں کہہ رہی ہوں ہمیں امی پاپا کے اختلاف میں نہیں پڑنا چاہیے۔“

”کیوں نہیں پڑنا چاہیے... ان کی وجہ سے آج ہم ایک ٹوٹے گھر میں رہ رہے ہیں۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں، دونوں قصور وار

ہیں۔ ہمیں کسی ایک کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور نہ کسی کو قصور وار قرار دینا چاہیے۔“

”آپ ہی آپ ہمیشہ سے پاپا کی گڈ گول رہی ہو۔“ ثانیہ تقریباً جنید کے لہجے میں کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ میں نے سر پکڑ لیا تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہم کوئی بہت مثالی ماحول والے گھر میں نہیں تھے لیکن ہم بہن بھائیوں میں محبت تھی۔ سکون تھا اور آرام تھا۔ مگر ان دونوں کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ جلد ہمارے درمیان سے محبت اور سکون ختم ہونے والے تھے۔ امی نے ایک ہی دن میں نہ جانے ان دونوں سے کیا کہا تھا کہ وہ پاپا سے انتہائی فرٹ لگ رہے تھے۔ میں لاؤنج میں تھی کہ پاپا آ گئے۔ وہ میری صورت سے بھانپ گئے۔ ”کیا ہوا سونیا؟“

میں نے سوچا اور پھر پاپا کو سب بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور جب میں نے اپنی بات مکمل کی تو گہری سانس لے کر بولے۔ ”مجھے پہلے ہی خدشہ تھا... میں مرنا کی فطرت اچھی طرح جانتا ہوں... وہ ان عورتوں میں سے ہے جو نہ خود سکون سے رہتی ہیں اور نہ دوسروں کو سکون سے رہنے دیتی ہیں۔“

میں کسی حد تک پاپا سے متفق تھی کہ امی سے ملے ہوئے ہمیں صرف دو دن ہوئے تھے اور گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ خاص طور سے جنید اور ثانیہ کے تیور بدل گئے تھے۔ مگر میرے ذہن میں وہی بات تھی کہ اس سارے معاملے میں صرف امی قصور وار نہیں تھیں۔ پاپا بھی برابر کے شریک تھے تب ہی نوبت طلاق تک پہنچی تھی۔ میں نے پاپا کی طرف دیکھا۔ ”پاپا اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس طلاق کا پس منظر بتا دیں... میں جانتا چاہتی ہوں کہ آپ دونوں میں کس وجہ سے علیحدگی ہوئی۔“

پاپا سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے کہا۔ ”بیٹا میں نے سوچا تھا جو میرے اور تمہاری ماں کے درمیان تھا اسے خود تک محدود رکھوں گا۔ کبھی اپنے بچوں سے شیکر نہیں کروں گا کہ ان کا دل ان کی ماں کی طرف سے خراب نہ ہو لیکن یہ عورت آج پھر ہماری زندگیوں میں آ گئی ہے۔ وہ میرے بچوں کا ذہن خراب کر رہی ہے صرف اپنی اتنا کی تسکین کے لیے... یہ سوچے بغیر کہ تم لوگ ابھی عمر کے اس حصے میں ہو جہاں انسان اپنا کیریئر بناتا ہے اور ساری توجہ اس پر دیتا ہے۔ اس لیے اب مجھے تم سے وہ سب باتیں شیکر کرنا پڑیں گی۔ سونیا تم ڈنر کے بعد میرے کمرے میں آنا۔“

دوپال کے کسی بھی گوشے میں لادریک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

”بابا بالکل ٹھیک ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن انہوں نے تو خود ہم سے درخواست کی تھی کہ تم لوگوں سے نہ ملیں ورنہ تو ہم کتنا ترپتے تھے۔ امی ابو تو آخری وقت تک تم لوگوں کو یاد کرتے رہے۔“

”نانا ابو اور نانی جان۔“ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”ابو نے مجھے ان کے بارے میں بھی بتایا تھا۔“

”میری بچی ہم تیرا، ثانیہ اور جنید کا سوچ کر رہ جاتے تھے۔“ زرینہ خالہ بولیں۔ وہ مجھ سے میرے، ثانیہ اور جنید کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ میں نے انہیں اپنے آپ کی فون پر ان دونوں کی تصویریں بھی دکھائیں۔ پھر خالہ جو تک کر بولیں۔ ”لو میں نے چائے پانی تو پوچھا نہیں میری بیٹی پہلی بار میرے گھر آئی ہے۔“

میں نے انہیں منع کیا لیکن وہ مجھے لاؤنج کے ساتھ اوپن کچن میں لے آئیں۔ انہوں نے چائے کا پانی چڑھایا اور چیزیں نکالنے لگیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے بچوں کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ ان کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑے اسحاق بھائی تھے جو انجینئرنگ کر کے جاب کر رہے تھے۔ ان سے چھوٹی مونا باجی تھیں جن کی شادی ہو گئی تھی اور وہ کوہاٹ میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ تیسرے نمبر پر الیاس بھائی تھے وہ ایم بی بی ایس مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہے تھے اور سب سے چھوٹی ندا کالج میں تھی، وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ آج اس کی کسی فرینڈ کی سالگرہ تھی تو وہ کالج سے اس کے گھر چلی گئی تھی۔ خالو شاہد احمد سرکاری ملازم تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے پاس تھے۔ زرینہ خالہ امی سے دو سال بڑی تھیں۔ چائے اور دوسرے لوازمات لے کر ہم میز پر آگئے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”خالہ....“

میں نے ایک خاص وجہ سے آئی ہوں۔“

انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں میری بچی.... جب سے مرینا کے آنے کا سنا ہے تب سے مجھے لگ رہا تھا کوئی طوفان آنے والا ہے۔ اگر شاہد نے منع کیا ہوتا تو اب تک میں اس کے پاس جا چکی ہوتی۔ اسے کوئی حق نہیں ہے اپنے بچوں کی زندگی میں دخل اندازی کا۔“

”آپ کو کب پتا چلا کہ امی یہاں ہیں؟“

”دو مہینے پہلے.... اس کی ایک کلاس فیلو سے میرا اب بھی رابطہ ہے، اس نے بتایا.... مرینا پرانی دوستوں سے ملتی پھر رہی ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”خالہ، ابو نے مجھے سب دیا ہے انہوں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ میں ان کے کہے ایک ایک لفظ کی آپ سے تصدیق کر سکتی ہوں۔ وہ بتا رہے تھے کہ سیتا خالہ بھی سب جانتی ہیں لیکن وہ لاہور میں ہوتی ہیں۔“

”ہاں اور وہ بیمار بھی ہے۔“ خالہ بولیں۔ ”ابھی سردی کے آغاز میں آئی تھی یہاں چیک اپ کے لیے، اسے ہارٹ پر اہلیم ہے۔“

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ میں پریشان ہو گئی۔

”اس کے ایک وال میں کچھ مسئلہ آ رہا ہے۔“ زرینہ خالہ نے بتایا۔ ”مگر زیادہ نہیں ہے ابھی ڈاکٹر دواؤں سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر خدا نہ خواست اس سے مسئلہ حل نہ ہوا تو پھر آپریشن کریں گے۔“

”ان کا نمبر دیجیے گا میں ان سے بات کروں گی۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”لیکن ابھی میں آپ سے امی کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔“

”اگر تم تصدیق کرنے آئی ہو تو اس کی ضرورت نہیں ہے میں یقین سے کہتی ہوں، حنید بھائی نے تمہیں جو بتایا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولیں۔ ”ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے لیکن حنید بھائی ہمیں ہمیشہ سکے بھائی کی طرح لگے۔“

”خالہ یہ آپ کی محبت ہے لیکن میں پھر بھی جانا چاہتی ہوں۔ اس وقت کیا ہوا تھا جب امی اور بابا کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ بات بالآخر ڈاکٹر تک جا پہنچی۔“

”میں بتاؤں گی میری بچی.... میرے ذہن میں ایک بات ہے۔ یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ کاش کے حنید بھائی اسی وقت ہمت کر لیتے تو آج تم مجھ سے ملنا بار نہ ملتی ہوتیں۔ امی ابو اور ہم اتنے سالوں تم بچوں کے لیے نہ ترپتے۔“

”بابا نے ایسا کیوں کیا، انہوں نے مجھے بتایا تھا میں سمجھتی ہوں اس وقت ان کی سوچ درست تھی۔ اگر آپ سے ملنے تو حقیقت ہمارے علم میں آتی اور ہمارے چھوٹے ذہن انتشار کا شکار ہو جاتے۔ اب ہم سمجھ رہے ہیں۔ اب ہم حقیقت کا سامنا کر سکتے ہیں۔“

زرینہ خالہ نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ پھر بات طویل ہوتی چلی گئی۔ ماضی کی اس داستان میں دو گھنٹے

میں نے زیادہ ہو گئے۔ جب بات ختم ہوئی تو خالہ اور میں دونوں اس تھے۔ بابا کے کہے ایک ایک لفظ کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں نے خالہ کو ثانیہ اور جنید کے بارے میں جان کر صدمہ بھی ہوا ہے لیکن اب ہم آپ سے اور سیتا خالہ سے مل سکیں گے یہ خوشی بھی کم نہیں ہے۔“

خالہ نے سر ہلایا۔ ”اللہ تمہاری ماں کو عقل و ہدایت دے، اس لڑکی نے اپنی من مانی کر کے نہ صرف تم لوگوں کو بلکہ ہمیں بھی بہت صدمے دیئے ہیں۔ بابا تو اس کے بعد سنبھل ہی نہیں سکے.... ایک بار بستر سے لگے تو پھر ان کا جنازہ ہی اٹھا تھا۔ ہمیں ڈسنے والا سانپ کوئی اور نہیں ہمارا ہی رشتے کا کزن تھا۔“ خالہ رونے لگی تھیں، میں نے انہیں چپ کرایا۔ پھر انہوں نے کھانا گرم کیا۔ اصرار کر کے مجھے کھلایا اور پھر میں دل پر جبر کر کے ان کے گھر سے نکل آئی مگر رابطہ تو ہو گیا تھا۔ اب آنا جانا لگا رہتا.... فی الحال تو مجھے امی سے بات کرنی تھی۔

☆☆☆

میں نے کال نیل بجائی تو اندر سے چند لمحے بعد ایک مردانہ آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”سونا.... میں امی سے ملنے آئی ہوں۔“

اس بار خاصی دیر لگی اور پھر امی نے دروازہ کھولا۔ ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ مجھ سے آنکھیں چڑھ رہی تھیں۔ ”سونا تم.... بتائے بغیر چلی آئیں۔“

”جی امی یہ پاکستان ہے یہاں بچوں کو ماں باپ سے ملنے کے لیے اپائنٹ منٹ نہیں لینا پڑتا ہے۔“ میں نے اس قدر طنز یہ انداز میں کہا۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اندر آ جاؤں۔“

”ہاں.... ہاں کیوں نہیں۔“ انہوں نے ہٹ کر راستہ دیا۔ انہوں نے گاؤں پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے لاؤنج میں لے گیا۔ مجھے کہیں وہ شخص نظر نہیں آیا جس نے کال نیل کے جواب میں پوچھا تھا۔ امی ابھی تک نروس تھیں۔ انہوں نے ان کی کوشش کی۔ ”وہ میرے ایک جاننے

والے ہیں وہ ملنے آئے ہیں۔“

مرد مجھے نشست گاہ میں بھی نظر نہیں آیا تھا، تو کیا وہ کسی بیڈ روم میں تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں اس کے بارے میں بات کرنے نہیں آئی ہوں اور نہ مجھے پتا تھا کہ یہاں آپ کا کوئی واقف کار بھی موجود ہے۔“

میرے لہجے سے وہ کھٹک گئیں۔ اس لیے جب اس بار بولیں تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”پھر کس لیے آئی ہو۔“

”آپ سے ماضی کے بارے میں بات کرنے۔“

”لیکن تمہیں تو ماضی کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں ہے تم نے ثانیہ اور جنید کو بھی منع کیا تھا؟“ وہ تھکے انداز میں بولیں۔

”ہاں پسند تو نہیں ہے لیکن آپ نے مجبور کر دیا۔ بابا نے پہلے ہی خبردار کیا تھا مگر میں اس وقت نہیں سمجھتی تھی۔“

”تو کیا اب سمجھ آ گئی ہے؟“

”جی امی.... میں نے بابا سے پوچھا اور انہوں نے مجھے پوری داستان سنا دی ہے کہ آپ اور ان کے درمیان علیحدگی کیسے ہوئی اور اس کی وجہ کیا تھی؟“

ان کا رنگ ایک لمحے کو بدلا تھا۔ ”اس نے جھوٹ بولا ہوگا۔“

”انہوں نے مجھے جو بتایا اس کے ایک ایک لفظ کی میں نے تصدیق کر لی ہے۔“

”کیا بتایا اس نے تمہیں؟“

”امی آپ کی ابو سے شادی نانا ابو اور نانی جان کی مرضی سے ہوئی تھی اس میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی۔“

”انہوں نے پوچھا کب تھا۔“ امی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”بس فیصلہ سنا دیا تھا۔“

”گویا آپ اس رشتے پر شروع سے آمادہ نہیں تھیں۔“ میں نے ان کی بات پکڑی تو وہ گڑبڑا گئیں۔ پھر جلدی سے کہا۔

”ہاں مجھے غصہ تھا کہ امی ابو نے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں؟“

”تو آپ کو نانا نانی سے غصہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے ابو سے طلاق کا مطالبہ کیوں کیا؟“

امی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ”اس شخص نے کبھی میری کوئی بات نہیں مانی.... ہمیشہ مجھے تنگ کیا۔“

”آپ کی کون سی بات نہیں مانی امی.... آپ کھل کر بابا کے بارے میں بتائیں جیسے انہوں نے بتایا ہے۔“

ماہنامہ سرگزشت

219

مارچ 2014ء

والے ہیں وہ ملنے آئے ہیں۔“

مرد مجھے نشست گاہ میں بھی نظر نہیں آیا تھا، تو کیا وہ کسی بیڈ روم میں تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں اس کے بارے میں بات کرنے نہیں آئی ہوں اور نہ مجھے پتا تھا کہ یہاں آپ کا کوئی واقف کار بھی موجود ہے۔“

میرے لہجے سے وہ کھٹک گئیں۔ اس لیے جب اس بار بولیں تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”پھر کس لیے آئی ہو۔“

”آپ سے ماضی کے بارے میں بات کرنے۔“

”لیکن تمہیں تو ماضی کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں ہے تم نے ثانیہ اور جنید کو بھی منع کیا تھا؟“ وہ تھکے انداز میں بولیں۔

”ہاں پسند تو نہیں ہے لیکن آپ نے مجبور کر دیا۔ بابا نے پہلے ہی خبردار کیا تھا مگر میں اس وقت نہیں سمجھتی تھی۔“

”تو کیا اب سمجھ آ گئی ہے؟“

”جی امی.... میں نے بابا سے پوچھا اور انہوں نے مجھے پوری داستان سنا دی ہے کہ آپ اور ان کے درمیان علیحدگی کیسے ہوئی اور اس کی وجہ کیا تھی؟“

ان کا رنگ ایک لمحے کو بدلا تھا۔ ”اس نے جھوٹ بولا ہوگا۔“

”انہوں نے مجھے جو بتایا اس کے ایک ایک لفظ کی میں نے تصدیق کر لی ہے۔“

”کیا بتایا اس نے تمہیں؟“

”امی آپ کی ابو سے شادی نانا ابو اور نانی جان کی مرضی سے ہوئی تھی اس میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی۔“

”انہوں نے پوچھا کب تھا۔“ امی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”بس فیصلہ سنا دیا تھا۔“

”گویا آپ اس رشتے پر شروع سے آمادہ نہیں تھیں۔“ میں نے ان کی بات پکڑی تو وہ گڑبڑا گئیں۔ پھر جلدی سے کہا۔

”ہاں مجھے غصہ تھا کہ امی ابو نے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں؟“

”تو آپ کو نانا نانی سے غصہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے ابو سے طلاق کا مطالبہ کیوں کیا؟“

امی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ”اس شخص نے کبھی میری کوئی بات نہیں مانی.... ہمیشہ مجھے تنگ کیا۔“

”آپ کی کون سی بات نہیں مانی امی.... آپ کھل کر بابا کے بارے میں بتائیں جیسے انہوں نے بتایا ہے۔“

ماہنامہ سرگزشت

218

مارچ 2014ء

”وہ مجھے آنے جانے سے روکتا تھا۔ ملنے جلنے سے روکتا تھا۔“ امی جیسے پھٹ پڑیں۔ ”میں تنگ آگئی تھی اس کی پابندیوں سے.... میری اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔“

”وہ آپ کو نانائانی کے ہاں جانے سے روکتے تھے؟“

”نہیں تو لیکن....“

”آپ کو خالاؤں سے ملنے سے روکتے تھے؟“

”نہیں۔“ اس بار بھی انہوں نے وہی جواب دیا۔

”لیکن دوسروں سے ملنے سے تو روکتا تھا۔“

”یہ دوسرا کون تھا امی.... ماجد علی....؟“

”اس نے ہمیں یہ بھی بتا دیا۔“ امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کریں، وہ پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں۔

”تو کیا غلط کیا انہوں نے.... اگر آپ ماجد کو پسند کرتی تھیں تو یہ شادی سے پہلے کی حد تک ٹھیک تھا لیکن آپ شادی کے بعد بھی اس سے ملنا چاہتی تھیں تو ایسا بے غیرت کوئی شوہر نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں پایا کا قصور کہاں سے ہوا؟ آپ نے ثانیہ اور جنید کے ذہن میں کیا بھرا ہے؟“

”میں نے کیا بھرا ہے؟“ وہ بھڑک کر بولیں۔ ”سچ تو بولا ہے۔“

”صرف پایا کے بارے میں؟“ میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔ ”کیا آپ نے انہیں ماجد علی کے بارے میں بتایا جس سے شادی کے چکر میں آپ نے پایا سے طلاق لی۔ اس سے شادی کر کے امریکا چلی گئیں۔ اس اوباش شخص نے آپ کو وہاں چھوڑ دیا اور خود عیش و عشرت میں غرق ہو گیا۔ آپ نے ان دونوں کو یہ سب بتایا۔“

”وہ چھوٹے ہیں میں ان سے یہ بات کیسے کہہ سکتی تھی۔“ امی کا انداز مذاقتی ہو گیا۔

”آپ ان کو یہ بتا سکتی ہیں کہ ثمنینہ بی بی اور پایا کے درمیان غلط رشتہ تھا۔ اس وقت آپ کو ان کی عمروں کا خیال نہیں آیا۔ آپ کو تو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ثمنینہ بی بی ہمارے لیے کیا ہیں۔ ثانیہ کو اس نے ماں کی طرح پالا ہے۔ ہمارا اس سے زیادہ خیال رکھا جتنا آپ رکھتی تھیں۔ اس معصوم اور سادہ دل عورت کے دل پر کیا گزیرے گی اگر اسے آپ کے جھوٹے الزام کے بارے میں معلوم ہو۔“

”تو کیا غلط کہا میں نے....“

میں نے ان کی بات کاٹی۔ ”آپ نے نہ صرف غلط

کہا ہے بلکہ اپنے پاؤں پر خود کھلاڑی ماری ہے۔ آپ نے پایا کے بارے میں جو کہا ثانیہ اور جنید نے اس پر یقین کر لیا مگر ثمنینہ بی بی کے بارے میں وہ بھی ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔“

اتنی دیر میں پہلی بار امی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”انہوں نے یقین کیا تھا کیونکہ میں نے ان سے کہا تھا۔ وہ دونوں میرے بچے ہیں تمہاری طرح باپ کے بچے نہیں ہیں۔“

”اگر میں پایا کی چچی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آخر آپ بھی تو اس شخص سے دوبارہ شادی کرنے کی فکر میں تھیں جس کی اتنی برائی کر رہی ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ اچھل کر بولیں۔

”یہ سچ ہے آپ نے واپس آکر پہلے پایا سے رابطہ کیا اور کوشش کی کہ وہ آپ سے پھر شادی کر لیں۔ آپ نے انہیں بچوں کا حوالہ دیا۔ مگر پایا نے انکار کیا.... پہلے وہ مجبور تھے آپ ان کی بیوی تھیں، ان کے بچوں کی ماں تھیں اس لیے انہوں نے ممکنہ حد تک آپ کا ساتھ نبھایا مگر آپ نے غلطی توڑنے پر مجبور کیا تو انہیں طلاق دینا پڑی۔ آپ عدالت تک چلی گئیں۔ مگر وہاں جب آپ کے پول کھلے تو آپ نے اولاد سے دست برداری کے عوض پایا سے طلاق لے لی۔ پایا اور ہم ایک بار اس تکلیف سے گزر گئے۔ آپ دوبارہ ہماری زندگی میں دخل چاہتی تھیں مگر پایا نے آپ کو اپنانے سے انکار کر دیا۔“

”یہ بھی تمہیں اسی نے بتایا ہے؟“

”صرف بتایا نہیں ہے پایا نے ثبوت بھی دکھائے ہیں وہ اسٹامپ پیپر جس پر آپ ہم سے دست بردار ہوئی تھیں۔ پایا کے آفس میں ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ جس میں آپ نے ان سے پھر شادی کرنے کو کہا اور جب پایا نے انکار کیا تو آپ نے دھمکیاں دیں کہ آپ ان کی اولاد کو ان کے خلاف کر دیں گی۔“

امی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”اس ذلیل شخص نے ریکارڈنگ کر لی تھی؟“

”جی آپ کا جھوٹ مزید واضح ہوا۔ امی شادی سے پہلے آپ نے اس ماجد کی خاطر نانائانی اور ثانیہ کو جس طرح پریشان کیا، ان کی عزت کو اچھالا وہ سب مجھے ذہن نشین رہنے بتایا۔ آپ کی وجہ سے ہم اپنے خیمیاں سے محروم رہے۔“

کہ ہم ان سے ملنے تو لازمی ہمیں آپ کے بارے میں پتا چلا اور ہمارے معصوم ذہن خراب ہوتے۔ پایا نے نانائانی اور خالاؤں سے درخواست کی کہ وہ ابھی ہم سے نہ ملیں۔ خود پایا ان سے رابطے میں رہتے تھے، ان کو ہمارے بارے میں بتاتے تھے۔ وہ ان کا خیال بھی رکھتے تھے۔ امی سب پایا کے گواہ ہیں۔ آپ وہ جھوٹ بولتی رہیں جس کا کوئی پاؤں نہیں ہے اور کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔“

”تم نہ کرو.... اور کوئی نہ کرے لیکن ثانیہ اور جنید کریں گے۔“ انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

”سوری ٹو سے امی آپ سمجھنے کی حد سے گزر گئی ہیں، آپ کی عقل اور سوچ پر مہر لگ گئی ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ سچائی ان کے سامنے نہیں آئے گی۔ اس وقت وہ دونوں زرینہ خالہ کے ساتھ نیچے گاڑی میں ہیں۔ میرے اور جنید کے موبائل کی کال ملی ہوئی ہے اور وہ ہماری گفتگو براہ راست سن رہے ہیں۔ امی آپ کی حقیقت ان دونوں کے سامنے آچکی ہے۔“ میں کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”امید ہے اب آپ اپنا یہ ڈھونگ ختم کر دیں گی۔ اللہ آپ کو سمجھ اور ہدایت دے۔“

اسی لمحے ایک ادھیڑ عمر اور سوہر نظر آنے والا شخص لاؤنج میں آیا اور اس نے امی سے کہا۔ ”سب سے پہلے تو میں خدا کا شکر ادا کروں گا کہ اس نے مجھے تم جیسی عورت سے بچا لیا۔ جو اپنے بچوں کی نہ ہو سکی وہ میرے بچوں کو کیا پیار دے گی۔“ اس نے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”تمہارا شکریہ بیٹے تم نے میری آنکھیں بھی کھول دی ہیں۔“

”وقاص....! امی نے کہنا چاہا تو اس نے جھڑک دیا۔ ”میرا نام مت لو.... آج کے بعد ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ بہتر ہوگا جلد از جلد اس فلیٹ سے چلی جاؤ۔“ اس نے کہا اور فلیٹ سے نکل گیا۔ اس کی بات سے لگ رہا تھا کہ یہ فلیٹ اسی کا تھا۔ امی کی کیفیت ایسی تھی کہ اگر انہیں کاٹ دیا جاتا تو ان کے جسم سے خون بھی نہ نکلتا۔ میں جانے لگی تو انہوں نے پیچھے سے کہا۔

”سو نیارک جاؤ....“

میں رکی۔ ”جی امی....؟“

وہ روہانے لہجے میں بولیں۔ ”بیٹا میں تم سے، ثانیہ اور جنید سے محبت کرتی ہوں۔“

”امی آپ کی یہ واحد بات ہے جس پر میں یقین کر سکتی ہوں کیونکہ آپ ہماری ماں بھی ہیں۔“ میں نے کہا اور باہر نکل آئی۔ میں نیچے آئی تو وہ تینوں میرا انتظار کر رہے تھے۔ ثانیہ اور جنید کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے دکھ ہوا خود میں بھی رو رہی تھی لیکن آج رو لینا اس خرابی سے بہتر تھا جس کے بیچ ہماری ماں ہماری زندگی میں... بونے آئی تھیں۔ زرینہ خالہ نے ہمیں سنبھال لیا۔ پھر سینا خالہ بھی بیماری کے باوجود لاہور سے آگئیں۔ ان سے ہمیں بہت ڈھارس ہوئی تھی۔ دو دن ہم زرینہ خالہ کے ہاں رہے، اپنے کزنز سے ملے جن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سینا خالہ کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ ان کی چھوٹی بیٹی الیاس بھائی کی منگیتر تھی۔ پھر پایا اور خالاؤں میں میٹنگ ہوئی اور اس کا مرکزی نقطہ امی تھیں۔ یہ تو طے تھا کہ پایا اب انہیں اپنانے کے لیے تیار نہیں تھے مگر وہ ہماری ماں تھیں اور خالاؤں سے بھی ان کا رشتہ بنتا تھا وہ انہیں ایسے ہی نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے طے ہوا کہ امی سے مل کر انہیں راضی کیا جائے گا کہ وہ کسی ایک خالہ کے ساتھ رہ لیں۔ تاکہ ہم سے بھی ان کی ملاقات ہوتی رہے مگر جب زرینہ اور سینا خالہ ان کے فلیٹ پر پہنچیں تو وہ خالی پڑا تھا۔ اس کا مالک وہی شخص تھا جسے امی نے دھوکے میں رکھا تھا۔ اس کی امی سے امریکا میں ملاقات ہوئی تھی اور امی نے اسے بھی شادی کا جھانسا دیا تھا۔

پایا نے معلوم کر لیا تو پتا چلا کہ اسی شام ایک فلائٹ سے امی نیویارک کے لیے روانہ ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد ہمیں امی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئیں اور اب کہاں ہیں؟ مگر ہمیں ہمارا انتہیال مل گیا تھا۔ میں نے آئی آر مکمل کیا اور سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ اس دوران میں زرینہ خالہ نے مجھے اسحاق کے لیے مانگ لیا تھا۔ پایا خوشی سے مان گئے اور مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ویسے بھی اسحاق جتنے خوش شکل ہیں اس سے کہیں زیادہ اخلاق کے اچھے ہیں۔ طے ہوا کہ اگر میں سروس کے امتحان میں کامیاب رہی تو ٹریننگ اور پوسٹنگ کے بعد ہماری شادی کر دی جائے گی۔ اب میں بہت خوش ہوں بس کبھی کبھی امی کی یاد آتی ہے تو دل میں کسک سی اٹھتی ہے کچھ بھی سہی وہ ہیں تو میری ماں۔



باچی عذرا رسول صاحبہ
تسلیم!

آپ کے رسالے میں شوق سے پڑھا کرتی ہوں۔ ایک نہیں کئی بار سوچا کہ مجھے جو روگ چمٹ گیا ہے اس کے بارے میں بھی کچھ لکھوں لیکن ہمت نہ ہوئی، پہلی بار لکھا ہے اس لیے لکھاریوں جیسی بات اس تحریر میں نہیں ہوگی۔ کسی رائٹر سے اسے درست کرالیں۔

نازنین
(فیصل آباد)



میں بچپن سے ہی بہت چوڑی واقع ہوئی ہوں۔ میری نظر کبھی کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہوں۔ امی میری اس عادت سے بہت پریشان تھیں اور وہ ہمیشہ میرے ساتھ بازار جانے سے کتراتیں۔ اسکول اور کالج کے زمانہ میں بھی میں نے دوست بنانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا۔ میں ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہو جاتی تھی بلکہ صرف اس لڑکی کو دوست بناتی جو خوش شکل، خوش مزاج اور خوش گفتار ہو۔ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آتا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری ہم مزاج ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب خوبیاں کسی ایک لڑکی میں نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے میری سہیلیوں کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی لیکن زندگی کا اہم فیصلہ کرتے وقت مجھ سے چوک ہو گئی اور تمام تر احتیاط کے باوجود میرا انتخاب غلط نکلا اور اس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔

میرا نام نازنین ہے لیکن بچپن سے ہی سب لوگ مجھے ننی کہہ کر پکارتے تھے پھر اسکول، کالج ہر جگہ یہی نام میری شناخت بن گیا۔ میری سب سہیلیاں اور رشتے دار بھی مجھے اسی نام سے بلاتے تھے۔ میرے کان اس نام کو سننے کے لیے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ کبھی کبھی مجھے اپنا اصلی نام اجنبی لگتا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن شاہین تھیں اسے سب لوگ شانی کے نام سے پکارتے تھے۔ میرے ابو گزرا خان مردان کے رہنے والے تھے لیکن میٹرک کرنے کے بعد وہ اپنے چچا کے پاس کراچی آ گئے اور یہیں انٹرنیشنل میں داخلہ لے لیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی پڑھائی میں تیز تھے۔ انہوں نے انٹر کا امتحان اے ون گریڈ میں پاس کیا اور انہیں باسانی انجینئرنگ

زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ ابو نے ذاتی مکان کے علاوہ شہر کے تجارتی مرکز میں ایک چار منزلہ بلڈنگ بھی بنائی تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں اور بالائی منزلوں پر دفاتر تھے جن کا معقول کرایہ آتا تھا۔ ابو نے کاروبار کے ساتھ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ علم ہی انسان کی اصل دولت ہے۔ چور، ڈاکو، لٹیرے تم سے سب کچھ چھین سکتے ہیں لیکن علم کی دولت کوئی نہیں لے سکتا۔ اس لیے علم حاصل کرو تا کہ دولت مند کہلائی جاؤ اور لڑکیوں کو خاص طور پر تعلیم حاصل کرنا چاہیے کیونکہ اچھے برے وقت میں یہی ان کے کام آتی ہے۔ ابو کو یہی قلق تھا کہ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا رواج نہیں ہے بلکہ لڑکے بھی چار پانچ جماعتیں پڑھ کر اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھنے لگتے ہیں۔ دادا بھی ابو سے یہی کہا کرتے تھے کہ جب تم نے کاروبار ہی کرنا تھا تو پڑھائی میں وقت کیوں ضائع کیا۔ انہیں اس پر بھی شدید اعتراض تھا کہ ابو نے اپنی بیٹیوں کو اسکول کیوں

ہی ٹاتا اور ثانی یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لے دے کے ایک ماموں تھے۔ وہ بھی امریکا چلے گئے اور انہوں نے وہیں اپنی دنیا بسالی۔ رسم دنیا بھانے کے لیے وہ دو تین مہینے میں امی کو ایک فون کر لیتے اور بس۔ امی کو بیٹے کی بڑی آرزو تھی اور وہ ہر نماز کے بعد اولاد دینے کے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں اس خواہش کا اظہار انہوں نے کئی مرتبہ ابو کے سامنے بھی کیا۔ وہ ہمیشہ امی کو یہی سمجھاتے کہ بیٹا یا بیٹی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو پیاری پیاری بیٹیاں دی ہیں ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں، ویسے بھی آج کل کے لڑکے کون سا سکھ دیتے ہیں۔ ادھر شادی ہوئی ادھر بیٹا بہو الگ ہو گئے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ابو کا کاروبار دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر رہا تھا۔ پھر دادا کی زمینوں اور جائیداد کی آمدنی سے بھی انہیں حصہ ملتا تھا۔ اس لیے ہماری

بھیجا۔ ابو ان کے سامنے گستاخی تو نہیں کر سکتے تھے بس سر جھکا کر خاموش ہو جاتے۔

ہمارے والدین تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ ان کی راہنمائی اور تربیت کی بدولت ہم دونوں بینس کامیابی سے تعلیمی مدارج طے کرتے رہیں۔ امی اور ابو نے کبھی ہم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی اور نہ کبھی یہ کہا کہ ہمیں کیا پڑھنا ہے اور مستقبل میں کون سا شعبہ اختیار کرنا چاہیے۔ شانی باجی پیکچر ار بننا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے انٹر سائنس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جبکہ میں نے ڈاکٹر بننے کا خواب آنکھوں میں سجایا ہوا تھا۔

شانی باجی کو ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک مقامی کالج میں عارضی طور پر پیکچر ار کی جاب مل گئی۔ ان کا ارادہ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں بیٹھنے کا تھا۔ اس وقت میں میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی۔ میڈیکل کی پڑھائی تو ویسے ہی بہت سخت ہوتی ہے لیکن میں نے اسے کچھ زیادہ ہی اپنے اوپر طاری کر لیا تھا۔ بچپن سے ہی یہ میری عادت تھی کہ ہمیشہ نمبروں رہنا چاہتی تھی۔ مجھ سے یہ برداشت ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مجھ سے آگے نکل جائے۔ اسکول کی حد تک تو معاملہ ٹھیک رہا۔ میں ہر ٹیسٹ اور امتحان میں اول آتی رہی لیکن میڈیکل کالج کا معاملہ مختلف تھا۔ یہاں پورے شہر کے ذہین ترین طالب علم جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے مجھے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں تمام کلاسیں اینڈ کرتیں۔ اگر کوئی پیریڈ فارغ ہوتا تو لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتی اور گھر آنے کے بعد بھی رات گئے کتابوں میں سر دیے رہتی۔

پہلے تین سال تو میں اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لیتی رہی لیکن چوتھے سال میں میرا سابقہ ایک حریف سے پڑ گیا۔ وہ سلیم درانی تھا جس نے مڈ ٹرم ٹیسٹ میں مجھ سے زیادہ نمبر لے کر میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ اس سے پہلے میں نے اپنی کلاس کے کسی لڑکے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن سلیم کو نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ بظاہر وہ ایک لابیالی سال کا نظر آتا تھا۔ کلاس میں بہت کم آیا کرتا اور زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ کر گزار دیتا۔ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک شاندار قیمتی گاڑی اس کے استعمال میں تھی جس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اس کے بارے میں جاننے یا سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن

جب پہلی بار اس نے مڈ ٹرم ٹیسٹ میں مجھ سے زیادہ نمبر حاصل کیے تو میرا چونکنا فطری امر تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کلاس میں کوئی مجھ سے آگے نکل گیا ہو۔ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو سلیم نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ یہ گویا میری اتنا پر حملہ تھا۔ میں نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا اور تن من دھن سے اگلے ٹیسٹ کی تیاری میں لگ گئی اور اس کا نتیجہ میرے حق میں رہا۔ میری پہلی اور اس کی دوسری پوزیشن آئی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان ایک دوڑی شروع ہو گئی۔ کبھی وہ آگے نکل جاتا اور کبھی میں اسے پیچھے چھوڑ دیتی۔ میں پڑھائی میں اتنی مگن تھی کہ کسی اور جانب دیکھنے کا خیال ہی نہ رہا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے اور کون کس حال میں ہے۔

انہی دنوں ابو کو پہلی بار ہارٹ ایکٹ ہوا۔ وہ عموماً رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر دیکھتے اور ہم لوگوں سے کہیں لگایا کرتے تھے۔ اس روز بھی وہ لاؤنچ میں بیٹھے بی بی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ایک طرف لڑھک گئے۔ میں سامنے والے صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی میری نظر ان پر پڑی میں گھبرا کر ان کی جانب لپکی۔ ان کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور تقریباً نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ان کا بلڈ پریشر چیک کیا جو معمول سے بہت زیادہ تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی نکالی اور انہیں لے کر اسپتال پہنچ گئی۔ امی اور شانی بھی ہمراہ تھیں۔ فوری طبی امداد ملنے سے ابو کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ ڈاکٹروں نے انہیں دو گھنٹے نگرانی میں رکھنے کے بعد گھر واپس بھیج دیا۔ دوسرے دن انہیں ایک طبی ماہر کو دکھایا گیا۔ وہ شہر کے نامور ماہر امراض قلب تھے۔ انہوں نے کچھ ٹیسٹ کروانے کے بعد دوا میں تجویز کیں اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”انہیں اپنا طرز زندگی بدلنا ہوگا۔ دواؤں کے ساتھ ساتھ پرہیز اور احتیاط بھی ضروری ہے اور سب سے بڑھ کر یہ انہیں ذہنی دباؤ سے دور رہنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ یہ اپنی ذمے داریاں دوسروں کو سونپ دیں اور خود زیادہ سے زیادہ آرام کریں۔ صرف اسی صورت میں یہ ایک بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔“

ہم نے ڈاکٹر کا مشورہ سنا اور گھر آ گئے۔ علاج اور پرہیز کی حد تک تو اس پر عمل کیا جاسکتا تھا لیکن ابو کے لیے آرام کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنے کاروبار سے زیادہ عرصہ

لا تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ ہمارا کوئی بھائی تو تھا نہیں جسے وہ اپنی ذمے داریاں سونپ دیتے۔ لہذا انہوں نے ایک ہفتہ بعد ہی دفتر جانا شروع کر دیا۔ امی چاہتی تھیں کہ وہ اپنا کاروبار بند کر کے سرمایہ کسی ایسی جگہ لگا دیں جہاں سے انہیں ہر ماہ گھر بیٹھے منافع ملتا رہے۔ ویسے بھی ابو کے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ تھا کہ بقیہ زندگی گھر بیٹھ کر آرام سے گزار سکتے تھے لیکن ابو نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کام کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتے پھر یہ کہ جو منصوبے انہوں نے شروع کر رکھے تھے انہیں مکمل کیے بغیر کاروبار کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال ہم لوگوں کے بہت زیادہ زور دینے پر وہ اس حد تک تیار ہو گئے کہ فی الحال کوئی نیا معاہدہ یا منصوبہ شروع نہیں کریں گے۔

انہی دنوں امی کے خالہ زاد بھائی عارف سکھر سے کراچی آئے۔ وہ سپلائی کا کام کرتے تھے اور کاروبار کے سلسلے میں ان کا اکثر کراچی آنا ہوتا تھا۔ اس بار وہ اپنے بیٹے ساجد کے ہمراہ آئے تھے۔ ساجد نے ایم بی اے کر لیا تھا اور انہیں کسی کمپنی میں انٹرویو دینا تھا۔ امی نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ساجد بھائی بھی بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ ہم دونوں بہنوں سے جلد گھل مل گئے۔ ساجد بھائی کا شعری ذوق بہت اچھا تھا اور وہ بات بات پر شعر سناتے تھے۔ شانی باجی کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ ان سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئیں۔

وہ لوگ دو دن بعد سکھر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ساجد بھائی کی نوکری کا کیا بنا۔ ابو باقاعدگی سے دفتر جا رہے تھے لیکن پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ وہ دو تین گھنٹے میں ضروری کام نمٹا کر گھر واپس آ جاتے۔ ایک دن رات کے کھانے پر انہیں اچانک ہی ساجد بھائی کا خیال آ گیا اور انہوں نے امی سے پوچھا۔ ”ساجد کی ملازمت کا کیا بنا؟“

”پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کامیابی نہیں ہوئی ورنہ وہ ہمیں بتانے ضرور آتا۔“

”فون کر کے معلوم کرو۔ اگر وہ فارغ ہے تو یہاں آ جائے اور جب تک اسے مرضی کی ملازمت نہیں ملتی۔ وہ میرے دفتر میں کام کرے۔ اچھا ہے، اسے کچھ تجربہ ہو جائے گا اور مجھے بھی مدد ملے گی۔“

”فون تو میں کر لوں گی لیکن اس سے آپ کو کیا مدد ملے گی۔ وہ ایم بی اے ہے جبکہ آپ کو تو ایک سول انجینئر کی

ضرورت ہے۔“ امی نے کہا۔

”سائٹ کا کام دیکھنے کے لیے دو انجینئر ہیں۔ دراصل مجھے دفتر کے معاملات کے لیے ایک کوالی فائڈ منسٹر کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ساجد اس کام کے لیے بے حد موزوں رہے گا۔“

امی نے ماموں سے بات کی تو وہ فوراً مان گئے اور ایک ہفتہ بعد ہی ساجد بھائی ہمارے گھر آ گئے۔ امی نے ان کے لیے اوپر کی منزل پر ایک کمر اتیار کر دیا تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہمیں چند ہی روز میں اندازہ ہو گیا کہ ساجد بھائی بے حد تھیں اور رکھ رکھاؤ والے انسان ہیں۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتے اور موقع محل کی مناسبت سے گفتگو کیا کرتے۔ وقت کے اتنے پابند کہ صبح ٹھیک سات بجے ناشتے کی میز پر ہوتے۔ ناشتے کے دوران وہ اخبار پڑھتے اور ہم لوگوں سے ہلکی پھلکی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ دفتر کے لیے روانہ ہو جاتے۔

ساجد بھائی کے آ جانے سے ابو کو بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ انہوں نے بہت جلدی سارا کام سنبھال لیا تھا۔ ابو صرف نگرانی کرتے یا انہیں کام کے بارے میں ہدایات دیتے لیکن ابو جانتے تھے کہ یہ ایک عارضی انتظام ہے اور جیسے ہی ساجد بھائی کو کوئی اچھی جاب ملی وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا۔ وہ امی اور ہم دونوں کے لیے محفوظ سرمایہ کاری کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بینک میں رکھا ہوا پیسا آہستہ آہستہ اپنی قدر رکھتا رہتا ہے جبکہ جائیداد کی قیمت مسلسل بڑھتی رہتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی سال بہ سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ساجد بھائی چھ ماہ تک ہمارے ساتھ رہے پھر انہیں ایک کمپنی میں اچھی جاب مل گئی۔ معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ کمپنی کی جانب سے رہائش، گاڑی اور علاج معالجہ کی سہولت بھی مل رہی تھی چنانچہ ساجد بھائی نے خوشی خوشی یہ پیشکش قبول کر لی اور ملازمت شروع کرنے کے ایک ماہ بعد ہی وہ اپنی نئی رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے حالانکہ امی کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں لیکن ساجد بھائی نے معذرت کر لی کیونکہ ان کا ارادہ تھا کہ وہ گھر والوں کو بھی کراچی بلا لیں گے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کو اس ماحول سے نکالنا چاہ رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سکھر میں رہ کر ہمیشہ کنوئیں کے مینڈک بنے رہیں گے۔

ساجد بھائی کے جانے کے بعد ابو کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ انہوں نے جیسے تیسے تمام منصوبے مکمل کیے۔ سارا پیسا اکٹھا کیا اور اسے مختلف اسکیموں میں لگا دیا۔ اب ابو کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پاس اتنا پیسا تھا کہ وہ بقیہ زندگی گھر بیٹھ کر کھا سکتے تھے۔ سرمایہ کاری سے ہونے والے منافع کے ساتھ ساتھ انہیں دونوں بلڈنگوں سے بھاری کرایہ ملتا تھا۔ دادا کی زمینوں اور اس سے ہونے والی آمدنی اس کے علاوہ تھی لیکن ابو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے والوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے دفتر بند کر کے پراپرٹی کا کام شروع کر دیا۔ وہ سستے داموں پلاٹ خریدتے اور چند مہینے اپنے پاس رکھ کر معقول منافع کے ساتھ بیچ دیتے۔ اس کام میں نہ تو کوئی ٹھکن تھی اور نہ ہی دباؤ، اپنی مدد کے لیے ایک لڑکا رکھ لیا تھا جو سارے آؤٹ ڈور کام نمٹاتا۔

ابو کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد امی کو ہم دونوں بہنوں کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ انہیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ ان کے میکے اور سسرال میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ان کی لڑکیاں بیاہ کر چلی جائیں۔ امی کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ایک بھائی امریکا میں جا کر بس گئے تھے۔ ہمارے لیے ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ البتہ ہماری دوھیال بہت بڑی تھی۔ دونوں تایاؤں اور پھوپھی کے بیٹوں کی تعداد نصف درجن تھی لیکن جو لوگ ہم سے ملنا گوارا نہیں کرتے تھے، ان سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی تھی کہ وہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آئیں گے۔

ساجد بھائی کا ہمارے گھر رہنا رنگ لایا اور مارچ کی ایک سہانی شام عارف ماموں مع اپنی بیگم ہمارے گھر آئے اور ساجد بھائی کے لیے باجی کو مانگ لیا۔ امی اور ابو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ساجد بھائی جیسا داماد تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ خوش شکل، خوش مزاج، سلیقہ مند، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسر روزگار۔ ساجد بھائی میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں اور بظاہر ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ امی اور ابو اتنے زیادہ خوش تھے کہ انہوں نے روایت کے مطابق سوچنے کے لیے وقت بھی نہ مانگا اور فوراً ہی ہاں کر دی لیکن نہ جانے مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ساجد بھائی کا ظاہر باطن ایک جیسا نہیں ہے اور انہوں نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے نفاست اور خوش مزاجی کا ملح چڑھا رکھا ہے۔ وہ دوہری شخصیت کے

مالک ہیں یعنی باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ سب سے بڑا کر مجھے ان کا خاندانی پس منظر بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ لوگ صرف مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ سماجی طور پر بھی ہم سے کم تر تھے۔ گھر بھر میں صرف وہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی دونوں بہنوں نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھتیں۔ فلمی رسالے پڑھتیں اور نئے فیشن کے کپڑے پہنتیں جبکہ چھوٹا بھائی انور بمشکل انٹر پاس کر سکا تھا۔ اس کے نمبر بہت کم آئے تھے۔ اس لیے کسی اچھے کالج میں داخلہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجبوراً عارف ماموں نے اسے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا۔ وہ دن بھر پرانی کھٹارا سوز دو کی میں بھر کر دکانوں پر مال سپلائی کرتا اور شام کو دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل جاتا پھر اس کی واپسی رات گئے ہوتی۔

مجھے ایسا لگا کہ یہ رشتہ باجی کے معیار کا نہیں، وہ تو بڑی باذوق، نفیس اور شاعرانہ مزاج رکھتی تھیں۔ انہیں پھولوں، کتابوں، موسیقی اور قدرتی مناظر سے عشق تھا۔ برسات میں بھینٹا، گرمی کی طویل دوپہروں میں شاعروں کا کلام پڑھنا اور چاندنی راتوں میں آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کا نظارہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میرے خیال میں ساجد بھائی کے خاندان سے ان کا کوئی جوڑ نہیں تھا اور وہ ان لوگوں میں مس فٹ تھیں۔ میں نے اس رشتے کی مخالفت کرنا چاہی لیکن جب شانی باجی کے چہرے پر خوشی کے رنگ نکھرتے دیکھے تو خاموش ہو گئی۔

شانی باجی اور ساجد بھائی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس موقع پر دونوں طرف سے دل کے ارمان نکالے گئے۔ ابو نے دل کھول کر پانی کی طرح پیسا بھایا۔ شانی باجی کا جہیز دیکھ کر لوگ اش اش کراٹھے۔ مہندی، مایوں اور شادی کی تقریب بھی بڑے عالی شان پیمانے پر منعقد ہوئی۔ شانی باجی کی تو اپنی کوئی پسند نہیں۔ میں نے ہی ان کی ساری تیاری کروائی۔ ممانی نے بھی بہت اچھی بری بنائی تھی۔ انہوں نے عقل مندی یہ کی کہ شادی سے ایک مہینہ پہلے کراچی آکر شانی باجی کو اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے گئیں اور ان کی پسند کے مطابق کپڑوں اور زیور کی خریداری کی۔

اس موقع پر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ابو کے بہن بھائیوں اور سوتیلی بہنیتوں نے بھی اس شادی میں شرکت کی لیکن انہوں نے ہمارے گھر میں ٹھہرنے کے بجائے اپنی

رہائش کا بندوبست الگ کیا۔ بڑے تایا کے کسی دوست کا مکان خالی تھا، ان لوگوں نے وہیں قیام کرنے کو ترجیح دی۔ البتہ تمام رسومات اور تقریبات میں وہ لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے اور انہوں نے ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے رویہ سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ صرف ابو کے رشتے دار ہیں۔ امی اور ہم دونوں بہنوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود ہم نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ میرا خیال تھا کہ کزنز کے آجانے سے گھر میں کچھ رونق ہوگی۔ بلکہ گلا ہوگا اور ہم سب مل کر شادی بیاہ کے گیت گائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سب آپس میں ہنسی مذاق کرتے لیکن مجھے دیکھتے ہی ان کی ہنسی کو بریک لگ جاتا اور وہ مجھے کسی دوسری دنیا کی مخلوق سمجھ کر ادھر ادھر ہو جاتے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری ڈاکٹری سے مرعوب ہو گئے تھے اور اسی لیے مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کہیں ان کی قابلیت کی پول نہ کھل جائے۔

ویسے کے دوسرے روز ان کی روائی ہوئی۔ جانے سے پہلے ایک اور عجیب بات ہوئی۔ گاڑیوں کا قافلہ تیار کھڑا تھا کہ بڑے تایا میرے پاس آئے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور بڑا رکا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولے۔ ”تم مجھے اچھی لگی ہو۔ پہلے میں لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا لیکن تمہیں دیکھ کر میری رائے بدل گئی ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اگر لیڈی ڈاکٹر نہ ہوتو ہماری عورتوں کا علاج کون کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے علم سے خلق خدا کو فائدہ پہنچاؤ گی خاص کر غریبوں کو جو دوسروں کے مقابلے میں تمہاری توجہ اور ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں۔“

بڑے تایا کی یہ نصیحت میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لی اور آج تک اس پر عمل پیرا ہوں۔

شانی باجی سے فارغ ہونے کے بعد امی کو میری فکر لاحق ہو گئی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی ذکر کرنے لگیں۔ ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد میرے فرض سے سبکدوش ہو جائیں جبکہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ میرا ہاؤس جاب ختم ہونے والا تھا اور اس کے بعد میں اسپیشلائز کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ صرف ایم بی بی ایس کی ڈگری اس شعبے میں آگے بڑھنے کے لیے ناکافی تھی۔ امی نے میرے اس ارادے کی شدید مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پانچ چھ سال کے لیے میری شادی نہیں روک سکتیں لیکن مجھے ابو کی مکمل تائید حاصل تھی۔ اس لیے میں نے امی کی مخالفت کی پروا نہیں کی اور

پارٹ ون کی تیاری کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کچھ تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک پرائیویٹ اسپتال میں نوکری بھی کر لی۔

ہاؤس جاب کے دوران میری سلیم سے کافی بے تکلفی ہو گئی۔ ہم دونوں ایک ہی گروپ میں تھے۔ پڑھائی کے دوران میں اسے اپنا حریف سمجھتی تھی اور ہمیشہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش کیا کرتی لیکن اب ہمارے درمیان کوئی مقابلہ نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ سے مجھے کافی سہولت ہو گئی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ایمر جنسی وارڈ میں مریضوں کے رش کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور میں وارڈ میں حواس باختہ ادھر سے ادھر دوڑتی رہتی تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی مریض کے ساتھ آنے والوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی کہ پہلے ان کے مریض کو دیکھا جائے۔ ایسے میں سلیم ہی میری مدد کے لیے آتا۔ رفتہ رفتہ میں اس کی گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ ٹائٹ شفٹ ہوتی تو وہ میرے آس پاس ہی رہتا تا کہ کسی غیر معمولی صورت حال میں میری مدد کر سکے۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ میرے ساتھ پارکنگ تک آتا۔ جب تک میری کار آگے نہ بڑھ جاتی وہ وہیں کھڑا رہتا۔ آہستہ آہستہ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ میں اسے اپنا مسیحا اور مخلص دوست سمجھتی تھی اور اس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ دوسرے لڑکوں سے بہت مختلف ہے۔ ڈیوٹی کے دوران ہم کئی کھٹے ساتھ گزارتے لیکن اس نے بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے میں اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرتی۔

ہاؤس جاب ختم ہونے میں چند روز ہی رہ گئے تھے۔ ایک دن ہم دونوں کیشین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے اس سے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا ”شاید میں یہ پروفیشن جاری نہ رکھ سکوں۔“

”کیا؟“ میں حیرت سے بولی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہی جو تم نے سنا۔ دیکھو نا کیا رکھا ہے اس پروفیشن میں۔ سرکاری اسپتال میں تو نوکری ملنے سے رہی اور پرائیویٹ والے اتنی کم تنخواہ دیتے ہیں کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آئے۔“

”تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو اس پوزیشن میں ہو کہ باہر جا کر بھی مزید تعلیم حاصل کر سکتے ہو۔“

”یہ ایک لمبا اور محنت طلب کام ہے اور میں اس کے لیے اپنی زندگی کے مزید دس سال ضائع نہیں کر سکتا۔ سچ پوچھو تو مجھے اس پروفیشن سے کوئی دلچسپی نہیں، امی مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کی خواہش کے احترام میں یہ ڈگری حاصل کرنی ورنہ میرا مستقبل تو اپنے خاندانی کاروبار سے وابستہ ہے۔ دونوں بڑے بھائی پہلے ہی ابو کا ہاتھ بٹا رہے ہیں اور اب میرے لیے بھی ان کے دفتر میں ایک کمر اتیار کیا جا رہا ہے۔“

”سچ پوچھو تو مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔ تم ایک ذہین طالب علم رہے ہو۔ اگر اسپیشلائز کر لو تو ایک اچھے ڈاکٹر بن سکتے ہو۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں مشکل راستوں پر چلنے کا عادی نہیں ہوں۔“

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اچانک ہی وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا اور اس نے آہستہ سے کہا ”ہاؤس جاب ختم ہونے کے بعد ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے پھر تم سے ملنے کی کیا صورت ہوگی؟“

”تم جب چاہو مجھ سے ملنے گھر آ سکتے ہو۔ مجھے ٹیلی فون کر سکتے ہو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ کاروباری مصروفیات میں گھر جانے کے بعد تمہیں میرا خیال آئے گا۔“

”یہ تو خیر وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہی آفر تمہیں بھی کر رہا ہوں۔ جب کبھی میری ضرورت محسوس ہو بلا تکلف فون کر سکتی ہو۔ ہوٹل کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔“

اس طرح ہم دو اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں پوری تندی سے اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ دوپہر کو ڈیوٹی سے گھر آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی اور پھر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ رات بارہ ایک بجے تک پڑھائی چلتی رہتی۔ امی میرے اس معمول سے بہت نالاں تھیں اور مسلسل مجھے شادی کے لیے مجبور کر رہی تھیں۔ باجی بھی ان کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھیں جبکہ ابو اور ساجد بھائی میری حمایت کر رہے تھے۔ انہی دنوں میری زندگی میں وہ حادثہ رونما ہوا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس روز میں اپنی ڈیوٹی سے واپس آئی تو باہر کا گیٹ کھلا دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار تھی اور گھر کے اندر کافی

لوگ جمع تھے۔ میں اس بھیڑ میں سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھی تو داخلی دروازے پر ساجد بھائی نظر آئے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور آہستہ سے بولے۔ ”نہی، کافی دیر سے فون کر رہا ہوں لیکن تمہارے اسپتال کا نمبر مسلسل انجینج جا رہا تھا۔ پھر میں تمہیں لینے اسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ تم گھر کے لیے نکل چکی ہو۔“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ میں حیرت اور تعجب کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی پھر تقریباً چلا تے ہوئے بولی۔ ”ساجد بھائی، یہ سب کیا ہے۔ اتنے سارے لوگ کیوں جمع ہیں؟“

انہوں نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولے۔ ”انکل ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“

”نہیں۔“ انہیں نے ایک دل دوز چیخ ماری اور اندر کی جانب لپکی۔ لاؤنج کے وسط میں ایک چارپائی پر ابوبکی لاش رکھی ہوئی تھی اور اس کے سر ہانے امی کم صدمہ بھی ہوئی تھیں۔ میں چکر اکر گرنے ہی والی تھی کہ باجی نے مجھے تھام لیا۔ وہ مجھے سہارا دے کر امی کے پاس لے گئیں پھر ہم تینوں ماں بیٹیاں مل کر خوب روئیں لیکن ہماری کوئی چیخ کوئی آنسو ابو کو واپس نہیں لاسکتا تھا۔

ابو کے انتقال کے بعد ہمارے گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال دیے۔ امی بالکل تنہا ہو گئی تھیں حالانکہ میں اسپتال سے واپس آنے کے بعد زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتی۔ شام کو باجی اور ساجد بھائی بھی آ جاتے اور تین چار گھنٹے امی کے پاس رہتے۔ آہستہ آہستہ ان کا غم ہلکا ہوتا گیا۔ لیکن انہیں ہر وقت میری فکر رہتی تھی۔ وہ ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔ ان کے پاس اپنے موقف کے حق میں مضبوط دلائل تھے۔ میری مزاحمت کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی پھر میں نے ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ صرف اس شخص سے شادی کروں گی جو میرے پروفیشن کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے۔ میں ہر قیمت پر اپنا پوسٹ گریجویٹیشن مکمل کرنا چاہ رہی تھی۔

امی میری رضامندی جان کر خوش ہو گئیں اور انہوں نے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا اور اپنی ہر ملنے والی سے میرے لیے لڑکا دیکھنے کی بات کرنے لگیں۔ میں اس بات پر ان سے الجھنے لگی کیونکہ مجھے تماشا بننا پسند نہیں تھا۔

اس وقت میری عمر صرف چوبیس سال تھی لیکن ان کی پریشانی دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے میری شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس دوران میرے لیے تین چار رشتے آئے۔ ان سب کو ڈاکٹر ہی کی تلاش تھی لیکن جب امی نے ان کے سامنے میری شرط رکھی تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگے کسی نے انکار تو نہیں کیا لیکن کھل کر رضامندی بھی ظاہر نہیں کی اور گول مول باتیں کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے سے کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔ اس کا فیصلہ تو شادی کے بعد فریقین ہی کر سکتے ہیں۔ اگر حالات اجازت دیں تو یہ اپنا پروفیشن جاری رکھ سکتی ہیں۔ میرے لیے یہ ادھورا جواب قابل قبول نہ تھا۔ میں ایسی کئی ڈاکٹرز کو جانتی تھی جو شادی کے بعد گھرداری کے جھیلوں میں ایسی الجھیں کہ ان کے لیے اپنی جاب جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ اسی لیے میں واضح یقین دہانی چاہ رہی تھی۔

امی اپنی کوشش میں لگی ہوئی تھیں لیکن اس میں انہیں کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ میرے لیے خاندان میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ باہر سے جو رشتے آتے ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی وجہ سے قابل قبول نہ تھے۔ کسی کا خاندان اچھا نہیں تھا تو کوئی کم پڑھا لکھا۔ کسی کی جاب معمولی تھی تو کوئی ہمارے پیسوں پر باہر جانے کا خواہش مند تھا۔ اس کے باوجود امی مایوس نہیں تھیں اور انہیں یقین تھا کہ وہ میرے لیے مناسب رشتہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور ابو کے انتقال کے ایک سال بعد وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میں حسب معمول اسپتال جانے کے لیے سوکر اٹھی تو مجھے گھر میں غیر معمولی خاموشی اور سنائے کا احساس ہوا۔ میں نے لاؤنج اور کچن میں جا کر دیکھا تو امی مجھے وہاں نظر نہیں آئیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ورنہ وہ تو فجر کی اذان کے ساتھ ہی بستر چھوڑ دیتی تھیں پھر نماز اور تلاوت کے بعد میرے لیے ناشتا بنا تیں۔ میں نے ان کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ دو تین آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے قریب جا کر ان کا کندھا ہلایا تب مجھے احساس ہوا کہ ان کا جسم بے جان ہے۔ ان کی نبض اور دل کی دھڑکن چپک کی اور اپنے حلق سے نکلتی ہوئی چیخوں کو دباتے ہوئے ان کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

امی کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہو گئی۔ سوم کے

بعد سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ صرف شانی باجی اور ساجد بھائی میری دل جوئی کے لیے موجود تھے لیکن وہ بھی اپنا گھر چھوڑ کر کب تک میرے پاس رہ سکتے تھے۔ دسویں کے بعد ساجد بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ رہوں کیونکہ وہ مجھے اس گھر میں تنہا چھوڑنے پر تیار نہ تھے لیکن میں نے ان سے کہا وہ ہمارے گھر شفٹ ہو جائیں کیونکہ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے وہ انہیں کمپنی کی طرف سے ملا ہوا تھا اور اسے چھوڑنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد انہوں نے میری بات مان لی اور ہمارے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

میں نے پارٹ دن کلینر کر لیا تو مجھے ہسپتال کی جاب چھوڑنا پڑی کیونکہ پارٹ ٹو کے لیے مجھے ٹینگ اسپتال میں شفٹ ڈیوٹی کرنا تھی۔ ان ڈیوٹیوں کا بھی کوئی حساب نہیں تھا۔ کبھی کبھی چھتیس گھنٹے مسلسل کام کرنا پڑتا جس کی وجہ سے باجی بہت پریشان ہوتی تھیں۔ اب انہوں نے امی کی جگہ لے لی تھی اور مسلسل میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ شادی کر لوں۔ میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا کہ شادی سے انکار نہیں لیکن شرط یہی ہے کہ کما ام سے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ ساجد بھائی نے مجھے سمجھایا کہ اس شرط سے دستبردار ہو جاؤں کیونکہ مرد فطری طور پر اپنا پرست ہوتا ہے۔ وہ شادی کے بعد تو جاب کرنے کی اجازت دے سکتا ہے لیکن شادی سے پہلے کوئی شرط قبول نہیں کرے گا۔

پھر ایک دن سلیم سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں شاپنگ کے لیے طارق روڈ گئی تو وہیں ایک ریسٹوران میں سلیم سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے دیکھا تو اپنی ٹرے لے کر میری میز پر آ گیا اور بولا۔ ”اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں“ میں نے چونک کر دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ”اوہ سلیم! یہ تم ہو، بیٹھو اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ شکر یہ ادا کر کے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم تو ہاؤس جاب کے بعد اچانک ہی غائب ہو گئیں۔ نہ کوئی خط نہ ٹیلی فون۔ ایسی بھی کیا بے مروتی۔“

”اگر یہی سوال میں تم سے کروں۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری شکایت بجا لیکن میری کچھ مجبوریات تھیں جس کی وجہ سے تم سے رابطہ نہ کر سکا۔ پہلی تو یہ کہ میں اپنے کیریئر کے حوالے سے کافی ڈسٹرب رہا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس پروفیشن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیکن ہاؤس

جواب کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر میں نے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہ کیا تو یہ اس عہد کی خلاف ورزی ہوگی جو ہم نے میڈیکل کالج میں داخلہ کے وقت کیا تھا چنانچہ میں نے بھی آگے پڑھنے کا ارادہ کر لیا لیکن جب اس فیصلے کی اطلاع گھر والوں کو ہوئی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب اور دونوں بڑے بھائیوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ وہ اب تک میری پڑھائی کی وجہ سے خاموش تھے لیکن اب وہ مجھے مزید وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ والد صاحب کا حکم تھا کہ میں مزید پڑھائی کا خیال دل سے نکال دوں اور ان کے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دوں۔ مجھے مجبوراً ان کا حکم ماننا پڑا۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ کچھ عرصہ بعد موقع محل دیکھ کر ملک سے باہر چلا جاؤں گا اور امریکا یا انگلینڈ سے اسپیشلائز کرنے کے بعد ہی واپس آؤں گا۔ فی الحال تو ابو کے دفتر میں بیٹھ رہا ہوں۔ لیکن میرا وہاں دل نہیں لگتا۔ ابو اور دونوں بھائی کے سرمایہ دار ہیں۔ ان کی سوچ پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہوتی ہے۔ میرا وہاں دم گھٹنے لگتا ہے اور اس دفتر میں اپنے آپ کو ایک قیدی سمجھتا ہوں جس کی آزادی سلب کر لی گئی ہو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں آزاد فضاؤں میں اڑنے والا تھی ہوں لیکن ان لوگوں نے میرے پرکاش کر ایک پنجرے میں بند کر دیا ہے۔

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر بولا۔ ”میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ تم اپنی سناؤ، کس حال میں ہو۔ کیا کر رہی ہو؟“

جب میں نے اسے اپنے حالات کے بارے میں بتایا تو وہ افسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے امی ابو کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اب تمہارے لیے تنہا رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ معاشرہ اگلی عورت کو جینے نہیں دیتا۔ تم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ تمہیں بہن اور بہنوئی کا تحفظ حاصل ہے لیکن یہ عارضی سہارا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی لیکن فی الحال اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لیے میں نے گفتگو کا رخ دوسری جانب موڑ دیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب ہم رخصت ہونے لگے تو اس نے جیب سے کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”اس پر میرے گھر اور دفتر دونوں کے فون نمبر درج ہیں۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فون کر سکتی ہو۔ مجھے تمہاری مدد کر کے

خوشی ہوگی۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا پرس اٹھا کر چلے گی تب وہ بولا۔ ”اگر مانیڈ نہ کرو تو اپنا نمبر بھی دے دو تاکہ بوقت ضرورت سے بات کر سکوں۔“

”سوری! اسپتال کا نمبر مسلسل الجھجھکتا رہتا ہے اور یہ بھی میں بہت مصروف ہوتی ہوں۔ وارڈ چھوڑ کر فون سننے نہیں آسکتی۔ گھر کا نمبر دے سکتی ہوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں وہاں صرف سونے کے لیے ہی جاتی ہوں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“

کچھ دن خیریت سے گزر گئے۔ اس روز میری چھٹی تھی۔ ساجد بھائی کے دفتر جانے کے بعد باجی میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں ”نینی! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بینک چلنا ہے۔“

”خیریت تو ہے۔ میرے ساتھ بینک جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”یہ میں تمہیں راستے میں بتاؤں گی۔ بس تم چلنے کی تیاری کرو اور ہاں اپنا شناختی کارڈ بھی رکھ لیتا۔“

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور باجی کے ساتھ بینک کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں باجی نے مجھے بتایا۔ ”نینی! مجھے ساجد کی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ انہیں ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ کے بارے میں تو علم ہے لیکن وہ ابو کے مکان اور دوسرے اثاثوں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کسی بات کے لیے مجبور کریں۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے اثاثے الگ کر لیں تاکہ کم از کم تمہارا حصہ محفوظ ہو جائے۔“

”میں تو ساجد بھائی کو ایسا نہیں سمجھتی۔“

”بظاہر وہ ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ باجی نے تنبیہ سے کہا۔ ”لیکن میں ان کی بیوی ہوں اور ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو گئی ہوں۔“

بینک پہنچ کر میں نے باجی کی ہدایت کے مطابق اپنا اکاؤنٹ کھولا اور باجی نے مشترکہ اکاؤنٹ میں سے آدھی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ اس کے بعد وہ مجھے لے کر وکیل صاحب کے دفتر گئیں اور ان سے درخواست کی کہ ابو کے تمام اثاثے ہم دونوں بہنوں کے نام منتقل کر دیے جائیں۔ ہم دونوں نے باہمی رضامندی سے =

طے کیا کہ چار منزلہ بلڈنگ باجی اور کمرشل پلازہ میرے نام کر دیا جائے جبکہ مکان ہم دونوں بہنوں کی مشترکہ ملکیت رہے گا۔ وکیل صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد یہ کام کروادیں گے۔

ساجد بھائی کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ کافی ناراض ہوئے۔ انہیں پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ ان کے علم میں لائے بغیر یہ کارروائی کی گئی اور دوسرا سوال انہوں نے یہ اٹھایا کہ اس ہزار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس موقع پر باجی نے بڑی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کارروائی ننی کے مطالبہ پر کی گئی کیونکہ وہ اپنا حصہ الگ کرنا چاہ رہی تھی اور کیونکہ یہ بہنوں کا آپس کا معاملہ تھا۔ اس لیے ان سے مشورہ کرنے یا انہیں کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس واقعہ کے بعد ساجد بھائی مجھ سے کھینچے کھینچے رہنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں نے ان کا کوئی بڑا نقصان کر دیا ہو۔

ساجد بھائی کے رویہ نے مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں اپنے آپ کو اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ مرد کے بغیر عورت کے لیے زندگی کا سفر طے کرنا کتنا مشکل ہے چنانچہ میں نے اپنی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ باجی اپنے طور پر میرے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی معقول رشتہ آگیا تو انکار نہیں کروں گی۔

شادی کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا ذہن سلیم کی جانب چلا گیا۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھ چکی تھی لیکن شاید وہ پہلی ملاقات میں اس کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ لہذا میں نے اسے ٹولنے کی خاطر اس کے دفتر کا فون ملایا۔ میری آواز سننے ہی وہ خوشی سے چپکنے لگا۔

”زہ نصیب! آج میری یاد کیسے آگئی؟“

”بس یونہی۔ میں نے سوچا کہ تمہاری خیریت ہی معلوم کر لوں۔“

”اچھا کیا۔ میں بھی اس وقت کافی بور ہو رہا تھا۔ کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ کریں۔“

اس نے یہ بات ایسے انداز میں کہی کہ میں انکار نہ کر سکی۔ شاید لاشعوری طور پر میں بھی اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہی تھی چنانچہ میں نے رضامندی کا اظہار

کر کے اسے اسپتال کے گیٹ پر پہنچنے کے لیے کہہ دیا۔ دس منٹ بعد وہ آگیا۔ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر میں نزدیک واقع ایک ریسٹوران میں گئی۔ اس روز ہم دونوں نے جی بھر کر باتیں کیں۔ اس نے اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس کی تین بہنیں اور دو بھائی شادی شدہ تھے۔ سلیم نے مجھے بتایا کہ اس کے والدین شادی کے لیے زور دے رہے ہیں لیکن اسے ابھی تک اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ اب تک اس کی والدہ نے جتنی لڑکیاں دیکھیں وہ سب بہت زیادہ فیشن ایبل، ماڈرن اور آزاد خیال تھیں جبکہ وہ کسی مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا لیکن میں نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح پرکھنا چاہتی تھی۔ پہلی ملاقات خاصی طویل رہی۔ اس کے بعد ہم باقاعدگی سے ملنے لگے۔ آہستہ آہستہ میں اس سے اپنے ذاتی مسائل بھی شیئر کرنے لگی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک سچا اور مخلص دوست تھا لیکن ابھی تک اس نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ عارف ماموں اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر کراچی آتے رہتے تھے لیکن ان کا قیام دو چار روز سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس بار وہ اپنی فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے ان لوگوں کی آمد کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اپنے معمولات میں لگی رہی البتہ باجی اپنے سسرال والوں کی خوب خاطر مدارات کر رہی تھیں۔ ماموں تو دو دن بعد واپس چلے گئے لیکن بقیہ لوگ یہیں رک گئے۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ کراچی کی سیر کرنے آئے ہیں۔ میری ان لوگوں سے ملاقات صرف رات کے کھانے پر ہوتی تھی۔ ممانی کی دونوں بیٹیاں میری عملی قابلیت سے بہت مرعوب تھیں۔ اس لیے مجھ سے بڑے ادب سے پیش آئیں البتہ ان کا بیٹا انور مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ بے حد چمچھورا اور شوباز ٹائپ لڑکا تھا جسے اپنی مردانگی پر بہت ناز ہو۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور گفتگو سے خود کو ایک کامیاب بزنس مین ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تین چار دنوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ یہ سب کچھ مجھے متاثر کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کے بعد میں مزید محتاط ہو گئی اور میں نے اپنے چہرے پر نولفٹ کا ماسک چڑھالیا۔

اتوار کے دن ساحل سمندر پر جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ ساجد بھائی نے اپنی کمپنی کا ہٹ بک کروالیا تھا۔ باجی نے دو دن پہلے ہی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا لیکن میں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر پکنک پر جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن میں جانتی تھی کہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی۔ ساجد بھائی کو جب معلوم ہوا تو وہ خود میرے پاس آئے اور بولے۔ ”اگر تم نہیں جاؤ گی تو کوئی بھی نہیں جائے گا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ پکنک منانے چلا جاؤں۔“

ساجد بھائی نے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کہی کہ مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑ گیا۔ باجی نے پکنک کے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ ساجد بھائی نے ایک کوسٹر کا انتظام کر لیا تھا۔ سب لوگ جانے کے لیے تیار تھے لیکن انور کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ کمرے سے برآمد ہوا تو اس کا حلیہ دیکھ کر میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں سرخ ٹائی جھول رہی تھی۔ بیروں میں سیاہ چمچاتے ہوئے جوتے، سر پر ہیٹ، آنکھوں پر سپاہ کا گلز اور کندھے پر کیمرا لٹکا ہوا تھا۔ دونوں بہنیں اور ممانی اسے تعریفی انداز سے دیکھ رہی تھیں لیکن میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ جی چاہا کہ اس کارٹون کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں لیکن پھر ساجد بھائی کا خیال آ گیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے کوئی بد مزگی ہو۔ ان کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات تھے لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولے۔ شاید وہ اپنے گھر والوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

پکنک کا آغاز بڑے خوشگوار انداز میں ہوا۔ سب لوگ بڑی حیرت اور دلچسپی سے ساحل کا نظارہ کر رہے تھے۔ انور نے کیمرا نکالا اور دھڑا دھڑا تصویریں لینے لگا۔ اس نے میری تصویر بھی کھینچنا چاہی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ سب لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں میں مگن تھے۔ کوئی اونٹ کی سواری کر رہا تھا، کوئی پانی میں جا کر بھیگنے کا شوق پورا کر رہا تھا۔ لیکن میں بہت بور ہو رہی تھی۔ میں نے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور اسے پڑھنے بیٹھ گئی۔ کافی وقت گزر گیا۔ میں اپنی دنیا میں مگن تھی کہ اچانک مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں انور کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور ایک کرسی تھیں کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ مجھے

اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگی لہذا اسے نظر انداز کر کے دوبارہ کتاب پڑھنے لگی۔ وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے آہستہ سے کھنکھارایا پھر کہنے لگا۔ ”اتنا پڑھ کر کیا کریں گی۔ آپ یہاں پکنک منانے آئی ہیں یا امتحان کی تیاری کرنے۔“

”کتابیں ہی میری بہترین دوست ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی کمپنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ آپ کو ابھی تک کوئی اچھا دوست نہیں ملایا آپ نے کسی کو دوست بنانے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ زندہ انسانوں کو چھوڑ کر ان بے جان کتابوں سے دل نہ لگاتیں۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”میں اپنے دل کی مالک ہوں چاہے انسانوں سے لگاؤں یا پتھروں سے، آپ کیوں فکر مند ہو رہے ہیں۔“

”اس لیے کہ میں آپ جیسی خوبصورت اور پُرکشش لڑکی کو ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ رومینگ ہوتے ہوئے بولا۔ ”جوانی صرف ایک بار آتی ہے۔ اس سے پوری طرح انجوائے کریں۔“

میرا ضبط جواب دے گیا اور میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ چاہتے کیا ہیں۔ آپ کے ساتھ ساحل پر دوڑ لگاؤں۔ شلوار کے پانچے چڑھا کر پانی میں چلی جاؤں اور آپ میرا بھیگا ہوا جسم دیکھ کر محفوظ ہوتے رہیں۔ آپ کے ساتھ اونٹ پر سواری کروں یا آپ کے گلے لگ کر گانا گاؤں اگر اس کے علاوہ جوانی سے انجوائے کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو وہ بھی بتادیں۔“

میرا جواب سن کر وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ غالباً اسے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے شیشٹاتے ہوئے کہا۔ ”مم، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ غلط سمجھی ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ.....“

”بس“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔“

اس کا منہ لنگ گیا اور وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ مجھ سے دور رہے گا لیکن انہماکی ڈھیٹ ثابت ہوا گو کہ اس نے بعد میں مجھ سے بات

کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن پورے وقت میرے ارد گرد ہی مڈلاتا رہا۔ غالباً اسے یہ زعم تھا کہ اپنی کسی ادا سے مجھے متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور یہی دعا کرتی رہی کہ دن خیریت سے گزر جائے اور پکنک کے دوران کوئی بد مزگی نہ ہو۔

گھر آنے کے بعد دو تین دن سکون سے گزر گئے۔ اس دوران تفریح کے کئی پروگرام بنے لیکن میں نے کسی میں شرکت نہیں کی اور باجی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کریں۔ اس روز گرمی کچھ زیادہ تھی۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر آ گئی۔ کچھ دیر کھلی فضا میں بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ رات کے وقت لان میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی تو میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر جانے لگی۔ وہ لوگ پہلی منزل پر بٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے ممانی جان کے کمرے میں روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں پھر جب ساجد بھائی کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی میری سماعت سے ٹکرائی تو میرا تجسس بڑھ گیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ رات کے اس پہر دونوں ماں بیٹے کس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ میرے قدم بے اختیار اس کمرے کی جانب اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں بیرونی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اندر ہونے والی گفتگو بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ ساجد بھائی کہہ رہے تھے۔

”آپ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ انور اور ممانی کا کوئی جوڑ نہیں۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”کیوں انور میں کیا کمی ہے اور ممانی میں کون سے مریض کے پر لگے ہیں۔“

”باقی باتیں چھوڑیں۔ صرف تعلیم کا فرق ہی دیکھ لیں۔ انور صرف ایف اے پاس ہے جبکہ ممانی ڈاکٹر ہے اور چند ماہ بعد اسپیشلسٹ بن جائے گی۔ آپ ہی بتائیں کہ کیا ان دونوں کا جوڑ بنتا ہے؟“

”لڑکی چاہے ڈاکٹر ہو یا انجینئر، شادی کے بعد اسے روٹیاں ہی تھوپنا ہوتی ہیں اور مرد کی تعلیم نہیں، کمائی دیکھی جاتی ہے اور میرا انور ماشاء اللہ ہزاروں کمارہا ہے۔ تم بات تو کر کے دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ شانی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”میں ایسی فضول بات زبان پر نہیں لاسکتا اور نہ ہی آپ کو شانی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔“ ساجد بھائی

سنجیدگی سے بولے۔

”تم تو ہمیشہ سے ہی جو رو کے غلام ہو لیکن میں اپنے بچے کا ترپنا نہیں دیکھ سکتی اگر اس کی شادی ممانی سے نہ ہوئی تو وہ کچھ کر بیٹھے گا اور میں اپنے انور کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

”میرے یا شانی کے ماننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ ممانی کو کرنا ہے۔ اسے ہم مجبور نہیں کر سکتے۔“

”اسے میں سمجھا لوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرا کہنا نہیں ٹالے گی۔“ ممانی نے بڑے اعتماد سے کہا اس سے زیادہ سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ میں دبے قدموں وہاں سے چلی آئی اور اپنے بستر پر لیٹ کر اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس وقت تو ساجد بھائی میرے حق میں بول رہے تھے لیکن ممانی نے جو جذباتی انداز اختیار کیا تھا، وہ اس کی لپیٹ میں آ سکتے تھے اور اگر وہ بھی اپنی ماں اور بھائی کے ہم خیال ہو جاتے تو ہم دونوں بہنوں کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ مجھے جلد از جلد اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنا تھا۔

اس سے پہلے کہ ممانی بات آگے بڑھائیں، انہیں اچانک ہی واپس کھینچ کر لایا گیا۔ ماموں کی دکان میں چوری ہوئی تھی اور ان کا کافی مالی نقصان ہوا تھا۔ اس پریشانی میں ممانی کو کسی بات کا ہوش نہ رہا اور وہ یہ اطلاع ملتے ہی اپنے بچوں سمیت واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے پر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ وقتی طور پر طوفان ٹل گیا تھا لیکن کسی وقت بھی یہ مسئلہ دوبارہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مجھے اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔ ایسے میں اچانک مجھے سلیم کا خیال آیا۔ میں نے اسے فون کیا اور کہا کہ فوراً اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے لہجے سے پریشانی کا اندازہ لگالیا اور بولا۔ ”خیریت تو ہے، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“

”ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھے کب اور کہاں مل رہے ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ تم ایک بچے اسپتال کے گیٹ پر آ جاؤ۔ میں تمہیں وہیں سے پک کر لوں گا۔“

میں نے باجی کو کچھ نہیں بتایا اور ناشتا کر کے معمول کے مطابق ڈیوٹی کے لیے روانہ ہو گئی۔ مقررہ وقت پر سلیم مجھے لینے آ گیا اور ہم دونوں اسی ریسٹوران میں چلے گئے جہاں اکثر ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ جب میرا کھانا رکھ

لڑ چلا گیا تو سلیم نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“
میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ وہ خاموشی سے
کھانا کھاتا رہا اور درمیان میں اس نے کوئی مداخلت نہیں
کی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے چائے کا آرڈر دیا اور
بولاً۔ ”میں پوری بات سمجھ گیا۔ مسئلہ خاصا کمبھیر ہے۔“
”اب تمہی بتاؤ کہ اس کا حل کیا ہے؟“ میں نے
تقریباً روہانی آواز میں کہا۔

”جنگ میں کامیابی کا پہلا اصول یہ ہے کہ دشمن کے
متوقع حملہ سے پہلے اپنے دفاع کا بندوبست کر لینا
چاہیے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری ممانی اتنی جلدی واپس نہیں
آئیں گی کیونکہ ان کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس سے
سنجنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اس سے پہلے تم شادی کر لو۔“
”کیا تم مجھے کسی ایسی دکان کا پتا بتا سکتے ہو جہاں دولہا
برائے فروخت کا بورڈ لگا ہو۔“

”مشکل یہ ہے کہ تمہیں قریب کی چیزیں نظر نہیں
آئیں۔ ورنہ تمہیں دکان کا پتا پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ
ہوتی۔“

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہی اپنی جگہ سے اچھلی اور
بولی۔ ”کیا؟ کیا کہا تم نے؟“

”اگر تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو تو مجھے اجازت دو کہ کل
کر اپنا مدعا بیان کر سکوں۔“ تھوڑا سا جھجک گئی تھی اس لیے
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میرا دل زور زور سے
دھڑک رہا تھا۔

”جی بات تو یہ ہے کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم
سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار
یہ بات کہنا چاہی لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ڈرتا تھا کہ اگر تم
ناراض ہو گئیں تو میں ایک اچھی دوست سے محروم ہو جاؤں
گا۔“

میرے پورے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور
میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو فوراً اپنے
والدین کو ہمارے یہاں بھیج دو۔ اس کام میں دیر نہیں ہوتی
چاہیے۔“

”بالکل نہیں ہوگی۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے
بولاً۔ ”میں اسی اتوار کو اپنے والدین کے ساتھ تمہارے گھر
آ رہا ہوں۔“

ماہنامہ سرگزشت

میں نے گھر آ کر باجی کو سلیم کے بارے میں سب
بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس اتوار کو وہ لوگ رشتے کی بات
کرنے آرہے ہیں۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر ساجد
بھائی کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ شاید ان کے دل میں بھائی کی
محبت جاگ گئی تھی اور وہ مجھے اس کی بیوی کے روپ میں
دیکھنا چاہ رہے تھے۔

سلیم کے گھر والے پروگرام کے مطابق اتوار کو رشتے
کی بات کرنے آ گئے۔ رسی باتوں کے بعد سلیم کی والدہ نے
مطلب کی بات چھیڑ دی اور جاتے جاتے باجی اور ساجد
بھائی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئیں۔ اس طرح کی
دو تین رسی ملاقاتوں کے بعد یہ رشتہ طے پا گیا۔ باجی نے
اپنے طور پر تمام معلومات کر لی تھیں اور مطمئن تھیں۔ باجی
نے ان لوگوں پر واضح کر دیا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی
اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی۔ سلیم اور اس کی والدہ نے یہ
شرط مان لی۔ یہ یقین دہانی ملنے کے بعد باجی سکون سے
شادی کی تیاری میں لگ گئیں۔

اس موقع پر باجی نے مجھے امی کی کمی کا احساس نہیں
ہونے دیا اور میرے جھیزنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک
اچھی چیز خریدی گوکہ میں چاہ رہی تھی کہ شادی سادگی سے ہو
لیکن باجی نے میری ایک نہ سنی اور دل کھول کر اپنے ارمان
نکالے۔ دو ماہ بعد میں سلیم کی دلہن بن کر اس کی گھنٹی میں
آ گئی۔ میری شادی میں ساجد بھائی کے گھر والوں نے رسما
شرکت کی۔ صرف ماموں اور ممانی ایک دن کے لیے آئے
اور رخصتی کے بعد واپس چلے گئے۔ انہوں نے ولیمہ میں بھی
شرکت نہیں کی۔ ان کے اس رویہ پر باجی بہت حیران تھیں
لیکن صرف میں ہی ان کی ناراضی کا سبب جانتی تھی۔

سلیم کے گھر میں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ سلیم بھی
میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ مجھے ہنی مون کے لیے سوئٹزر لینڈ
لے جانا چاہ رہا تھا لیکن میں اس فضول خرچی کی قائل نہیں
تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اسپتال سے بھی زیادہ چھٹی نہیں مل
سکتی تھی۔ اس لیے ہم پندرہ دن کے لیے شمالی علاقوں کی سیر
پر چلے گئے اس کے بعد زندگی معمول پر آ گئی۔ میں صبح
سورے ڈیوٹی پر چلی جاتی، سلیم اس وقت سو رہے ہوتے
تھے۔ شام کو چار بجے تھکی ہاری آتی اور کھانا کھا کر کچھ دیر
آرام کرتی۔ پھر مغرب کی نماز کے بعد پڑھنے بیٹھ جاتی۔
ابھی میرا کورس مکمل ہونے میں ایک سال باقی تھا اور میں
گر دوپیش سے بے خبر اپنی پڑھائی میں منہمک تھی۔ آہستہ

بہت سی حقیقتیں مجھ پر کھلتی چلی گئیں۔ میں نے محسوس
کیا کہ ساس اور سرکارو تیرے ساتھ تو ٹھیک تھا لیکن سلیم
سے وہ بڑی بے رخی اور رکھائی سے پیش آتے۔ دونوں بھائی
بھی ان سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے اور آئے دن ان کے
درمیان کسی نہ کسی بات پر تلخ کلامی ہوتی رہتی لیکن میرے
پس ان باتوں پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

ایک سال بعد مجھے دو خوشیاں ایک ساتھ ملیں۔ میں
نے اپنا کورس کامیابی سے مکمل کر لیا۔ اب میں اسپیشلسٹ
بن چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں ایک خوبصورت سے
بیٹے کی ماں بن گئی۔ سلیم کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔
اب وہ پہلے سے زیادہ میرا اور بچے کا خیال رکھنے لگے تھے۔
میں نے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی آیا رکھ لی
تھی۔ کیونکہ میری مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ صبح اسپتال جاتی۔
وہاں سے دو بجے واپسی ہوتی پھر شام کو کلینک چلی جاتی۔
میں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ پریکٹس بھی
شروع کر دی تھی۔ حالانکہ سلیم اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان
کا خیال تھا کہ اتنی زیادہ محنت نہیں کرنا چاہیے لیکن میں نے
اتنی محنت صرف گریڈ اٹھارہ کی سرکاری ملازمت کے لیے
نہیں کی تھی بلکہ میں اپنی تعلیم اور تجربہ سے خلق خدا کو فائدہ
پہنچانا چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنی فیس بھی دوسرے
ڈاکٹروں کے مقابلے میں کم رکھی تاکہ زیادہ سے زیادہ
لوگوں کی خدمت کر سکوں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن میں محسوس
کر رہی تھی کہ سسرال والوں کا رویہ سلیم کے ساتھ ٹھیک نہیں
ہے۔ سسر کو کئی دن سلیم سے بات نہیں کرتے تھے۔ ساس
کا منہ بھی پھولا رہتا۔ دونوں بھائیوں سے بھی آئے دن
جھڑپ ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن گھر میں بہت زور کا جھگڑا
ہوا۔ میں کلینک سے واپس آئی تو سسر کے کمرے سے
آوازیں سنائی دیں۔ وہ بہت غصے کے عالم میں بول رہے
تھے، تھوڑی دیر بعد سلیم بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلے اور اپنے
کمرے میں آ کر سفری بیگ تیار کرنے لگے۔ میں نے پوچھا
تو بولے ”میں چند دنوں کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ اپنا
خیال رکھنا۔“

میں سمجھی کہ کسی کام کے سلسلے میں جا رہے ہوں گے۔
اس لیے میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن
دوسرے دن حقیقت جان کر میرے پیروں تلے سے زمین
نکل گئی۔ معلوم ہوا کہ سلیم کسی کام سے نہیں بلکہ گھر والوں

سے ناراض ہو کر لاہور گئے ہیں۔ میں نے ناراضی کی وجہ
جاننا چاہی تو میری ساس نے بتایا۔ ”یہ لڑکا شروع سے ہی
لاابالی، بے پروا اور غیر ذمے دار واقع ہوا ہے۔ نہ جانے
اس نے اپنی تعلیم کیسے مکمل کر لی۔ جوان اولاد ماں باپ کے
بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے لیکن اسے اپنی ذمے داریوں کا
بالکل احساس نہیں ہے۔ باپ کا اتنا بڑا کاروبار ہے۔
دونوں بڑے بھائی صبح سے شام تک کام میں جتے رہتے
ہیں۔ اس کا کمر ابھی الگ ہے لیکن یہ دفتر جاتا ہی نہیں اور
اگر بھی باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر چلا جائے تو ڈیڑھ دو گھنٹے
سے زیادہ نہیں بیٹھتا۔ اس کی غیر ذمے داری کی وجہ سے
بعض اوقات بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ کل بھی یہی ہوا۔
ایک پارٹی سے میٹنگ تھی لیکن یہ گھر میں پڑا سوتا رہا۔ اس کی
وجہ سے ایک بہت اچھا کنٹریکٹ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔
زیادہ کچھ ہو تو الگ ہونے اور گھر چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے
ہمارا خیال تھا کہ شادی کے بعد سدھر جائے گا لیکن اس میں
کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم تو سمجھا سمجھا کر تھک گئے اب تم
کوشش کر کے دیکھو۔ شاید تمہاری بات اس کی سمجھ میں
آجائے۔“

ساس کی زبانی یہ کہانی سن کر میں سنائے میں آ گئی۔
سلیم کی شخصیت کا ایک اور پہلو میرے سامنے آیا جس کا میں
نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بے شک سلیم میں بے شمار خوبیاں
تھیں لیکن اگر مرد کام نہ کرے تو اس کی تمام خوبیاں پس
منظر میں چلی جاتی ہیں اور معاشرہ اسے ایک ٹکے، ٹکھڑا اور
ناکارہ شخص کے روپ میں دیکھتا ہے۔ میرے کلینک میں
ایسی کئی عورتیں آتی تھیں جن کے مرد سارا دن گھر میں پڑے
چار پائی توڑتے اور وہ خود محنت مزدوری کر کے اپنا گھر چلاتی
تھیں بلکہ اکثر مرد تو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے
مار پیٹ کر کے ان سے پیسے اینٹھ لیا کرتے تھے۔ خدا کا شکر
ہے کہ سلیم میں ایسی کوئی خرابی نہ تھی۔ پیسے مانگنا تو دور کی
بات، انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ میں کتنا کماتی ہوں اور
کہاں خرچ کرتی ہوں۔ حالانکہ میری آمدنی ہزاروں میں
تھی۔ اس کے علاوہ بینک میں لاکھوں روپے پڑے ہوئے
تھے جن کا اچھا خاصا منافع آتا تھا۔ اس لیے میں سلیم کی کمائی
کی محتاج نہیں تھی لیکن یہ جان کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ وہ
دفتر میں بیٹھنے کے بجائے سارا وقت گھومنے پھرنے یا سونے
میں گزار دیتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد سلیم کی واپسی ہوئی تو میں نے انہیں



دو پھول

محترم ایڈیٹر سرگزشت کراچی

السلام علیکم!

یہ میری سرگزشت نہیں ہے۔ یہ الگ الگ کرداروں کی کہانی ہے۔ اسے آپ میرا تجربہ کہہ لیں۔ امید ہے اس بار بھی میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

ارشاد حسین
(میرپور آزاد کشمیر)

کہ ہر طرف سبز ہی سبز۔ جیسے کسی بے مثال مصور نے خوبصورت سی پینٹنگ بنا دی ہو۔ شاداب مگر نام تھا اس کا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بالکل مناسب رکھا تھا۔ اس خوبصورت وادی کا نام شاداب مگر ہی ہو سکتا تھا۔ نیچے ایک

چاروں طرف ایسے پہاڑ جن پر صنوبر کے درخت تھے اور درختوں کے درمیان جیسے بہا کرتے۔ ہر وقت ایک رومانوی دھند چھائی رہتی۔ ایسا حسین ماحول کہ ذہن و دل پر جادو سا چھا جائے۔ اس حسن کو وسعت بخشتا تھا وہ حسین منظر

مارچ 2014ء

237

ماہنامہ سرگزشت

کر سکیں لیکن وہ ایسا نہیں چاہتے۔

یہ گفتگو بے نتیجہ رہی۔ میرے سمجھانے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ باقاعدگی سے دفتر جانے لگے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ ایک بار پھر وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ آئے۔ میں نے بھی دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اس دوران میرے دو بچے اور ہوئے۔ اب میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ سر کا انتقال ہو چکا ہے۔ سلیم بھی دفتر چلے جاتے ہیں۔ کبھی بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر مڑ بیٹھ جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ اپنا کام شروع کر چکے ہیں لیکن ہمیشہ نقصان ہوا۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ مجھ سے بے ایمانی نہیں ہوتی۔ انہیں شدید قسم کا احساس کمتری ہے اور وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے میرا کیریئر تباہ کر دیا۔ ورنہ میں بھی آج ایک نامور ڈاکٹر ہوتا۔ انہیں گھر کے اخراجات کی کوئی فکر نہیں کیونکہ بڑے بھائی ہر مہینے اس مد میں ایک بڑی رقم کا چیک ماں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سلیم بھی اپنی ضروریات کے لیے دفتر سے پیسے لیتے رہتے ہیں۔ انہیں بچوں سے بہت پیار ہے۔ ان کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ انہیں گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت اچھا ہے، انہوں نے بھی میرے معاملے میں دخل اندازی نہیں کی۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے پاس بہت پیسا ہے۔ میری ماہانہ آمدنی کا کوئی شمار نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے آج تک ایک پیسا نہیں مانگا بلکہ اکثر میرے لیے کپڑے یا چھوٹے موٹے تحفے لاتے رہتے ہیں لیکن ان کے کام نہ کرنے کی عادت میرے لیے ایک روگ بن گئی ہے۔ ایک احساس محرومی نے میری زندگی کو گھن لگا دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنے بھائیوں کے ٹکڑوں پر پلنے کے بجائے باقاعدگی سے دفتر میں بیٹھ کر کام کریں۔ انہیں بھی ہر مہینے تنخواہ ملے اور وہ اس کمائی میں سے چند روپے جیب خرچ کے نام پر مجھے بھی دیا کریں۔ لیکن وہ ہر احساس سے عاری ہو چکے ہیں اور ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ مجھے اپنی مرضی سے کام نہیں کرتے دیں گے میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ مجھے یا میرے بچوں کو ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں لیکن میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی میرے شوہر کو کھٹو کہے۔ کاش وہ بھی اس حقیقت کو سمجھ سکتے کہ مرد کا کمایا ہوا ایک روپیہ بھی عورت کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

مارچ 2014ء

آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ خاموشی سے میری تقریر سنتے رہے اور جب میں نے اپنی بات ختم کر لی تو بولے۔ ”مجھے اس حال کو پہنچانے میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میری خواہشوں کو پامال کیا اور اپنی مرضی مجھ پر مسلط کی، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ صرف ایم بی بی ایس کی ڈگری سے کچھ نہیں ہوتا لیکن جب میں نے مزید پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو ابا کا نا در شاہی حکم صادر ہوا۔ ہمیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہت پڑھ لیا۔ اب کاروبار میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ، یہ سن کر میرا دل ٹوٹ گیا لیکن میرے پاس ان کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن میں نے اتنا ضرور کہا کہ اگر دفتر میں بیٹھنا تھا تو میڈیکل میں داخلہ کیوں دلویا تھا۔ جواب ملا کہ تم جاہل نہ رہ جاؤ۔ آج کے دور میں ڈگری کی بہت اہمیت ہے، خواہ وہ کوئی سی بھی ہو۔“

میں نے بادل ناخواستہ دفتر جانا شروع کر دیا لیکن وہاں میرا دل نہیں لگا۔ سب کچھ ابو اور بھائیوں کے کنٹرول میں ہے۔ کہنے کو تو میں مالک کا بیٹا ہوں لیکن مجھ سے ٹکڑوں والے کام لیے جاتے ہیں۔ یہاں چلے جاؤ، وہاں چلے جاؤ۔ فلاں میٹنگ اٹینڈ کر لو۔ حساب کتاب دیکھا کرو۔ دفتر کے ملازمین پر نظر رکھو، پھر ان کا سارا کاروبار ناجائز ہے۔ یہ لوگ رشوت دے کر ٹھیکے حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنا منافع پورا کرنے کے لیے کام میں بے ایمانی کرتے ہیں۔ جس میٹنگ میں نہ جانے پر مجھے ڈانٹ پڑی، وہاں بھی یہی ہوتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ متعلقہ افسران کو ایک معقول کمیشن کی پیشکش کروں تاکہ وہ کام ہمیں مل جائے۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا اور میں نے وہ میٹنگ ہی گول کر دی۔ تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کام کر سکتا ہوں۔“

”اگر یہ بات ہے تو تم اپنا کاروبار الگ کیوں نہیں کر لیتے؟“ میں نے تجویز پیش کی۔

”دس بار کہہ چکا ہوں لیکن ہمیشہ یہی جواب ملتا ہے کہ پہلے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کچھ تجربہ حاصل کرو پھر اپنے کام کے بارے میں سوچنا۔“

”اگر پیسوں کا مسئلہ ہے تو مجھ سے لے لو۔ یہ پیسا بھی تو تمہارا ہی ہے۔“

”اگر یہ کام کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ کیا ابو کے کاروبار میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ اصولاً تو انہیں ہم تینوں بھائیوں کو الگ کر دینا چاہیے تاکہ ہم اپنی مرضی سے کام

236

ماہنامہ سرگزشت

تالاب تھا۔ اس تالاب کے کنارے چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔

ان کی چھتیں سرخ کچریلوں کی تھیں۔ یہاں کے رہنے والے قریبی شہر سے جا کر کچریلیں لایا کرتے تھے۔ بلندی سے دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے سبزیوں کے درمیان بے شمار بیربھوٹیاں بیٹھی ہوں۔

بہت ہی رومان پرور اور خوبصورت وادی تھی۔ صنوبر اور چمڑے کے درختوں کے ساتھ شمال کی طرف ایک ریٹ ہاؤس بنایا گیا تھا۔ کبھی کبھی اس ریٹ ہاؤس میں شہر کے لوگ آکر قیام کرتے تو ریٹ ہاؤس میں رونق ہو جاتی۔ ورنہ عام طور پر یہ ویران ہی ہوتا۔

اس علاقے میں گرمیاں بہت کم ہوا کرتیں۔ اور وہ بھی کچھ دنوں کے لیے۔ ورنہ عام طور پر ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتیں اور سردیوں میں برف باری ہوا کرتی۔

برف کے ذرات پوری وادی کو سفید چادر اوڑھادیے۔ درختوں کے پتے سفید ہو جاتے... اور گزرگا ہیں سفید ہو جاتیں۔

اس وادی میں بہت سے گھرانے آباد تھے۔ ان کا روزگار بھیڑ بکریاں پالنا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پہاڑوں کے دامن میں کاشت کاری کیا کرتے۔ چونکہ اس علاقے کی مٹی بہت ذرخیز تھی، اسی لیے فصلیں لہلہاتی رہتیں اور وادی کے حسن میں ان کی وجہ سے اور اضافہ ہو جاتا۔

اس وادی میں اسکول وغیرہ نہیں تھے۔ البتہ اس وادی کے کچھ بوڑھوں نے اپنے زمانے میں شہروں میں جا کر تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہ وادی کے بچوں اور بچیوں کو لے کر بیٹھ جایا کرتے اور تھوڑا بہت لکھنا پڑھا سکھا دیتے۔

پہاڑوں کے ساتھ ساتھ جنگلات میں بے ضرر قسم کی جنگلی حیاتیات بھی بہت پائی جاتی تھیں۔ خاص طور پر ہرن، اور سانبر وغیرہ۔

اس وادی میں انسانوں نے بلا وجہ خون بہانا نہیں سیکھا تھا۔ اسی لیے یہ جانور بڑی آزادی کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے رہا کرتے اور وادی کے مکانوں کی طرف بھی آجایا کرتے۔

ریٹ ہاؤس کی مخالف سمت میں لکڑی کا ایک کیمپ تھا جس میں بابا کو، ملی رہا کرتا۔ بابا کسی زمانے میں فوج میں رہ چکا تھا اور کسی جنگ کے دوران اس کی ایک ٹانگ

معدور ہو گئی تھی۔ بابا کو ہلی کورٹارڈ کر دیا گیا تھا۔ اس کیمپ میں رہنے لگا تھا۔

یہ بابا اکیلا تھا۔ سنا گیا تھا کہ اس کی بیوی اور بچے شہر میں رہتے ہیں لیکن انہوں نے بابا کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے بابا شہر سے مایوس اور بددل ہو کر اپنے آبائی علاقے میں آکر آباد ہو گیا تھا۔

علاقے والے بابا کا بہت خیال رکھا کرتے۔ کیونکہ وہ ان کو علم اور دانش کی باتیں بتایا کرتا۔ وہ جڑی بوٹیوں کا علم بھی جانتا تھا۔ اس لیے وادی میں جب کوئی بیمار ہوتا تو بابا ہی کے پاس مشورے کے لیے آیا کرتا۔

اس گاؤں کی زندگی دھیمی سُرور میں بہتے ہوئے دریا کی طرح خاموش اور پرسکون تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ شہر سے کوئی قافلہ گاڑیوں میں اس طرف آ نکلتا تھا تو ایک پھیل سی بچ جاتی۔

اس وقت وہ ریٹ ہاؤس آباد ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا چوکیدار نور و پورے گاؤں میں اترایا پھرتا۔ سب کو آنے والوں کی کہانیاں سناتا۔

کیسے لوگ ہیں۔ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ شہر سے کیا کیا لے کر آئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی کہانیاں ہوا کرتیں اس کے پاس۔

ریٹ ہاؤس کی خاموش فضا زندگی سے بھر جاتی۔ سیاحوں کے قہقہے گونجا کرتے۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام چوکیدار نور و ہی کیا کرتا۔

وہ گاؤں کی ایک عورت کو پیسے دے آتا جو مہمانوں کے لیے کھانے تیار کر کے بھیج دیا کرتی۔ اس طرح اس عورت کا بھی بھلا ہو جاتا تھا۔

یہ سیاح کچھ ہی دنوں کے لیے آیا کرتے۔

کبھی کبھی رانی اپنے کوارٹر سے نکل کر ان کے پاس آ جاتی۔ رانی چوکیدار کی بیٹی تھی۔ پورا شاداب گھر اسے رانی کہا کرتا۔

وہ تھی بھی کسی رانی کی طرح خوبصورت۔ شہر سے آنے والوں کی سانسیں اسے دیکھ کر رک جایا کرتیں۔ اس کی معصومیت اور خوبصورتی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی۔

وہ سب سوچا کرتے کہ جنگل میں کھلنے والا یہ پھول اگر شہر میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کتنے لوگ اس کے دیوانے ہو جاتے۔

رانی کو خود بھی کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ

معمورت ہے۔ شاداب گھر کے آسمان پر منڈلاتے بادل در رنگ برنگے پرندے اسے اس کی خوبصورتی کا احساس دلا کر کرتے۔

پہاڑوں کی کوکھ سے نکلتے ہوئے جھرنے اسے بتاتے کہ وہ بہت پیاری ہے۔ گاؤں کی عورتیں اس کی بلانیں لے کر اس کے صدقے اتارا کرتیں۔

سیاح بس کچھ دنوں کے لیے آتے۔ اگر ان کے ساتھ عورتیں ہوتیں تو رانی ان سے مل کر ادھر ادھر کی باتیں کر لیا کرتی۔ اسے یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ سیاحوں سے دور ہی رہا کرے۔

اس کا زیادہ تر وقت ریٹ ہاؤس کے پیچھے کے جنگل میں گزرتا۔ اس جنگل کا سلسلہ پہاڑیوں تک چلا گیا تھا۔ جنگل کے شروع ہی میں ایک قبر بنی ہوئی تھی جس پر ایک کتبہ بھی تھا۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے بتایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں یہ قبر بنائی گئی تھی۔ ”قبر کسی انگریز لڑکی کی تھی جس کا نام میری تھا۔

میری کا انتقال اسی گاؤں میں ہوا تھا۔ اسی لیے اس کی قبر یہیں بنادی گئی تھی اور شہر سے کتبہ لکھوا کر لایا گیا اور اس کی قبر پر لگا دیا گیا تھا۔

اس قبر کے آس پاس ایک چبوترہ سا تھا۔ کسی قیمتی پتھر کا بنا ہوا۔ رانی کو اس چبوترے پر بیٹھنا اور لیٹ کر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔

وہ اکثر سوچا کرتی کہ جس کی یہ قبر ہے وہ کیسی ہوگی۔ بابا نے بتایا تھا کہ اس کا نام میری تھا اور وہ صرف چوبیس برس کی عمر میں مر گئی تھی۔

رانی سوچا کرتی کہ یہ میری کتنی دور سے آئی ہوگی۔ اس کے ماں باپ کہاں ہوں گے۔ اور انسان مرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے۔ کیا اس دنیا میں پھرنے والوں سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔

رانی کی جان پہچان یوں تو پوری ہستی سے تھی۔ لیکن اس کا کوئی دوست نہیں تھا جس سے وہ اپنی باتیں کہہ سکتی۔ اس کی باتیں سن سکتی۔

جب ریٹ ہاؤس میں سیاح آ کر رکا کرتے تو وہ ان نوجوان لڑکے، لڑکیوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی جو ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔ ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے اور جب پکڑ لیتے تو ایک دوسرے سے لپٹ بھی جاتے تھے۔

رانی یہ سب درختوں کے پیچھے سے چھپ کر دیکھا کرتی۔ اسے بہت عجیب سا لگتا۔ ایک انجان سی کیفیت جو اس کو بھی اپنے بس میں کر لیتی۔

اس کی رگوں میں اس وقت خون کی روانی تیز ہو جاتی۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ پھر اس کے ایسے دوست کیوں نہیں تھے۔

یہاں جوڑے کے تھے وہ تو اس کو دیکھ کر راستہ بدل دیتے یا اس سے بات بھی کرتے تو بس ادھر ادھر کی۔ ان لڑکوں میں زندگی کا کوئی جوش کوئی ولولہ نہیں تھا۔ وہ سب ہی اس گاؤں کے بہتے ہوئے دریا کی طرح خود بھی پرسکون تھے۔

☆☆☆

یہ کہانی بہت پرانی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب انگریزوں کی حکومت تھی۔ وہ ایک شان کے ساتھ جس طرف سے گزرا کرتے مقامی لوگوں کی گردنیں جھک جاتیں۔

میری ہندوستان دیکھنے کے شوق میں اپنے باپ کرل رابرٹ کے ساتھ ہندوستان آئی تھی۔ اس نے ہندوستان کے بارے میں بہت سی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ قصے سنے تھے کہ وہ سربستہ رازوں کی سرزمین ہے۔ وہاں قدم قدم پر ان دیکھے اور ان جانے سے مجید ملتے ہیں۔

کرل رابرٹ میری سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اسی لیے وہ میری کی فرمائش رو نہیں کر سکا اور اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا۔

کرل رابرٹ کی تعیناتی راولپنڈی کی چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ یہاں سے وہ ارد گرد کے علاقوں کو کنٹرول کر سکتا تھا۔

چھاؤنی کے احاطے میں ہی اعلیٰ فوجی افسران کے لیے کوارٹرز بنادیے گئے تھے۔ جبکہ عام فوجی بیرکس میں رہا کرتے۔

ان انگریز فوجیوں کو ہر قسم کی سہولیات حاصل تھیں۔ انگریزوں میں بھی شاید اتنی آسانیاں حاصل نہ ہوں جتنی یہاں تھیں۔

صاحب بہادر کہلائے جاتے تھے۔ بہت سوں نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں۔ اس کے باپ کرل رابرٹ نے بتایا تھا کہ آس پاس بہت خوبصورت علاقے ہیں جہاں کا قدرتی حسن دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے۔

میری کرنل سے ان علاقوں کی سیر کے لیے ضد کیا کرتی۔ کرنل خود بھی اپنی بیٹی کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن پراہم یہ آگئی تھی کہ وہ ان دنوں چھاؤنی کے کسی انتظامی معاملے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔

اس نے اپنے ملازم کرم داد سے مشورہ کیا۔ کرم داد رگروٹ تھا۔ اس کی خدمات کرنل رابرٹ کو دے دی گئی تھیں۔ رابرٹ کسی حد تک کرم داد کو پسند کرنے لگا تھا۔ وہ ایک محنتی، فرض شناس اور ایماندار آدمی تھا۔ کرم داد کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہر وقت کسی جن کی طرح مشورہ دینے اور مدد دینے کے لیے تیار رہتا۔ ”کرم داد“ میرے دانت میں درد ہے۔

”کوئی بات نہیں صاحب، لوگ دبا لیں۔“
”کرم داد کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔“
”کوئی بات نہیں صاحب، ابھی دھل کر آجائیں گے۔“

پھر جب کرنل رابرٹ نے بتایا۔ ”کرم داد، بے بی میری جنگلات کی سیر کی ضد کر رہی ہے۔“ کرم داد نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں صاحب، صاحب زمان بے بی کو سیر کرا دے گا۔“

”کون ہے یہ صاحب زمان؟“ کرنل نے پوچھا۔
”میرا چچا زاد بھائی“ کرم داد نے بتایا۔ ”پڑھا لکھا اور بے انتہا شریف نوجوان ہے صاحب۔ آپ اس سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ وہ ان علاقوں کے ایک ایک درخت سے واقف ہے۔ وہ ایک ایک راستے کو پہچانتا ہے۔“

”لیکن بے بی میری اس کے ساتھ اکیلی کیسے جاسکتی ہے۔“

”اکیلی نہیں صاحب، آپ دو تین سپاہی ساتھ کر دیں۔“ کرم داد نے مشورہ دیا۔

کرنل رابرٹ کو یہ مشورہ بھی پسند آیا۔ اس طرح وہ اپنے کاموں کو بھی نمٹاتا رہتا اور میری کی سیر بھی ہو جاتی۔

خود کرم داد کو کرنل رابرٹ بہت پسند تھا۔ وہ دوسرے انگریز فوجیوں کی طرح سخت اور بددماغ نہیں تھا بلکہ انسان کو انسان سمجھنے کا عادی تھا۔

کرم داد اکثر اپنے احباب سے یہی کہا کرتا ”دیکھ لو ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ رابرٹ بھی ایسا ہی ہے۔“

پھر جب کرنل رابرٹ کی بیٹی میری کرم داد سے مل کر کرم داد کو احساس ہوا کہ باپ کی خوبیاں بیٹی میں بھی ہیں۔ وہ بھی بہت مہربان اور نرم دل تھی۔ ہمیشہ نرمی سے بات کیا کرتی اور کرم داد کی مدد کرنے کی کوشش کرتی۔

وہ بھی اپنے باپ کی طرح یہی کہا کرتی تھی۔ ”کرم داد، انسان صرف انسان ہوتا ہے۔ کالے یا گورے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں انسان کو اس کے اندر جمنا کر دیکھنا چاہیے۔“

کرنل رابرٹ نے کرم داد کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے چچا زاد صاحب زمان کو لے کر آجائے۔ جب صاحب زمان ان کے سامنے آیا تو دونوں ہی اس سے متاثر ہو گئے۔

وہ واقعی ایک مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔

شاداب نگر کا بابا کوہلی بھی بہت عجب انسان تھا۔ رانی کبھی کبھی اس کے کیمین کی طرف چلی جایا کرتی جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں آ کر آباد ہو گیا تھا۔

اس کو مہینے میں صرف ایک بار اپنی پیشن لینے کے لیے قریبی شہر کے ڈاک خانے جانا پڑتا۔ پیشن کے پیسے لے کر وہ مہینے بھر کاراشن خرید کر اپنے کیمین واپس آ جاتا۔ وہ خود ہی کھانے بنایا کرتا تھا۔ واپسی میں وہ گاؤں کے بچوں اور لڑکیوں کے لیے چاکلیٹ وغیرہ بھی لے آتا جسے بچوں میں تقسیم کر دیتا۔

اس علاقے کے سارے بچے اور بچیاں اس سے مانوس تھے۔

بابا کوہلی کو بے شمار کہانیاں بھی یاد تھیں۔ پرندوں کی کہانیاں، سمندروں کی کہانیاں اور سمندر پار بسنے والوں کی کہانیاں۔

اس کی کہانیوں میں بھید ہوتے۔ جن کو سن کر کچھ اور جان لینے کی خواہش ہوا کرتی۔ رومان۔۔۔ اور ایڈ ونچرز سے بھری ہوئی کہانیاں۔

جادو گروں اور ان نازک شہزادیوں کی کہانیاں جو ان جادو گروں کی قید میں ہوا کرتیں۔ بابا کوہلی کو اس علاقے کی بچی، رانی بھی بہت پسند تھی۔

رانی اکثر اس کے پاس آ جایا کرتی۔ جب آتی اپنے ہاتھوں سے بابا کے لیے کچھ پکا کر لاتی۔ اور بابا اسے کھا کر

بھر کر رانی کو دعا مانگ دیا کرتا۔ کبھی کبھی شہر سے وہ رانی کے لیے سلعے سلائے بڑے بھی لے آتا تھا جنہیں پہن کر رانی پورے گاؤں میں رانی پھرتی۔

اس دن رانی جب بابا کوہلی سے ملنے آئی تو اس کے پاس ایک شخص کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی بابا کوہلی کے پاس آیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ نوجوان رانی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رانی کو دیکھے جارہا تھا کہ رانی کو اس سے وحشت ہونے لگی تھی۔

رانی اٹھ پاؤں واپس جانا چاہتی تھی لیکن بابا کوہلی نے۔۔۔ آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”ارے رانی کہاں جا رہی ہے۔ اس سے مل، یہ میرا بیٹا ہے گلزار۔“

”تمہارا بیٹا؟“ رانی حیران ہو کر رک گئی تھی۔

”ہاں، میں نے بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے شہر میں ہیں۔“ بابا نے کہا۔ ”گلزار شہر سے میرے پاس آیا ہے۔“

”کمال ہے“ بہت جلدی بابا کا خیال آ گیا۔ ”ارے ہم تو بابا سے کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آ کر رہو۔“ بابا کے بیٹے نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”لیکن بابا ہماری بات ہی نہیں سنتے۔ یہاں گاؤں میں آ کر اکیلے رہتے ہیں۔“

”اب یہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہے۔“ بابا نے بتایا۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے۔“ رانی نے پوچھا۔ ”تمہاری وجہ سے تو ہم گاؤں والوں کو بہت ڈھارس دیتی ہے۔“

بابا زربل مسکرا کر رہ گیا۔

”بابا۔ یہ لڑکی کون ہے۔“ گلزار نے بابا سے رانی کے بارے میں پوچھا۔

”یہ ہمارے چوکیدار کی بیٹی ہے رانی۔“ بابا نے بتایا۔ ”اور ہے بھی کسی رانی کی طرح۔“

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“ بابا کے بیٹے نے یہ جملہ دبی زبان سے ادا کیا تھا۔

”بتاؤ نا بابا، پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے۔“ رانی نے پوچھا۔

”بیٹا، ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔“ بابا نے

بتایا۔ ”ڈرا گاؤں والوں سے مشورے کر لوں۔“ ”ہاں ہاں، واپس جانے کی کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔“ گلزار نے ایک نظر رانی پر ڈالی۔ ”کچھ دن یہاں رہ کر جاؤں گا۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔“

رانی نے اس کی بدنگاہی کی تمازت اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ وہ کچھ دیر اور بابا کے پاس رہ کر واپس آ گئی۔ اس رات اس نے اپنے باپ نورو سے بابا کے بیٹے کا ذکر کر دیا۔ نورو یہ سن کر بہت حیران ہوا تھا۔ ”وہ اب بابا سے کیا لینے آیا ہے۔ اس نے تو ساری زندگی بابا کو نہیں پوچھا۔“

”بابا بھی اس کے ساتھ جانے کی سوچ رہا ہے۔“ رانی نے بتایا۔

”اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں بیٹا۔ دونوں باپ بیٹے ہیں۔ ان کے آپس کا معاملہ ہے۔ ہم گاؤں والے تو کچھ نہیں بول سکتے نا۔“

”بابا ایک بات کہوں۔“ رانی نے کچھ سوچ کر اپنے باپ کو مخاطب کیا۔

”ہاں بیٹا۔“

”وہ جو بابا کا بیٹا ہے نا، وہ۔۔۔ رانی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بتائے۔“

”ہاں، بات پوری کرنا، بابا کا بیٹا کیا ہے۔“ نورو نے پوچھا۔

”وہ کچھ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا بابا۔“ رانی نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی تھی۔

نورو پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے رانی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے بیٹا، وہ جب تک ہے تو بابا کے پاس مت جایا کر۔“

یہ فیصلہ تو خود رانی کا بھی تھا۔ اس نے بھی یہی سوچا ہوا تھا کہ وہ بابا کوہلی کے پاس نہیں جایا کرے گی۔

☆☆☆

لکڑی کا ایک کیمین تھا، بہت بڑا۔ اس کیمین میں تیل سے جلنے والے لمپ کی روشنی کر دی گئی تھی اور کیمین سے باہر میری کے ساتھ آنے والے ملازم سب کے لیے کھانے بنانے میں مصروف تھے۔

جنگل سے انہیں لکڑیاں مل گئی تھیں۔ اس لیے انہیں ایندھن کی کمی کا سامنا نہیں تھا۔ میری کے منع کرنے کے باوجود اس کے باپ کرنل رابرٹ نے تین عدد فوجی جوانوں کے علاوہ چار پانچ ملازمین بھی اس کے ساتھ کر دیے تھے۔

اس قافلے کو یہاں تک لانے والا صاحب زمان ان کے علاوہ تھا۔ میری راستے بھر حیران ہو کر مناظر دیکھتی آئی تھی۔ یہ قافلہ کئی موٹروں میں مری سے آگے تک پہنچا تھا۔ اس کے بعد ان کا سفر گھوڑوں پر ہو رہا تھا۔ صاحب زمان اسے پہاڑیوں، جھرنوں، صنوبر اور شاہ بلوط کے درختوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔

میری کو یہ نوجوان بہت اچھا لگا تھا۔

وہ بہت مہذب تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی پوری روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ میری کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا تھا۔ ”مس، ہمارے نبی نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ اگر دشمن کے شر سے بچنا ہو تو اس کی زبان سیکھ لو۔ اسی لیے میں نے آپ لوگوں کی زبان سیکھی ہے۔“

”کیا میں تمہیں دشمن دکھائی دے رہی ہوں۔“ میری نے پوچھا۔

”نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم کسی فرد یا قوم سے انفرادی طور پر اپنی حیثیت میں تو دوستی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ حیثیت قوم ایک قوم کی دوسری قوم سے دوستی نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن کیوں؟ تم ہمیں اپنا دشمن کیوں سمجھتے ہو۔ انگریزوں نے تمہیں کیا نہیں دیا۔ سڑکیں، بناؤں، ریلوے کا نظام دیا۔ جدید ایجادات سے فائدے اٹھانے کے طریقے بتائے اس کے باوجود ہم دشمن کیوں ہیں۔“

”مس اگر کسی قیدی پرندے کو زبان مل جائے تو وہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس کے لیے آزادی بہتر تھی یا یہ بھیرہ جس کی سلاخیں سونے کی ہیں۔“

میری خاموش ہو کر رہ گئی۔ اسے اس جیسے نوجوان کی تکیے باتیں بھی اچھی لگتی تھیں۔ کیونکہ وہ اوروں کی طرح منافق نہیں تھا۔ وہ اپنی محبت یا نفرت کو جھوٹی مسکراہٹوں میں چھپانے کا فن نہیں جانتا تھا۔

میری نے دیکھا تھا کہ اس ملک کے راجا مہاراجا اور نواب وغیرہ جب اس کے باپ کرل رابرٹ سے ملا کرتے تھے تو ان کے انداز کتنے خوشامدانہ ہوتے۔ وہ صاحب بہادری شان میں قصیدے پڑھا کرتے۔ وہ ہندوستانیوں کو جاہل اور وحشی قرار دیتے اور اس وقت وہ یہ بھول جاتے کہ وہ بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ میری یہ تماشے دیکھ کر افسوس کیا کرتی۔

وہ ایک حساس دل کی لڑکی تھی۔ اس کی سوچ بہت

مختلف تھی۔ وہ یہ سوچا کرتی کہ جس قوم کے افراد سے ان کی انا چھین لی جائے وہ قوم ہمیشہ غلام ہی رہتی ہے۔ لیکن ان سب لوگوں کے برعکس صاحب زمان ہم کے اس نوجوان نے اسے اسی لیے متاثر کیا تھا کہ یہ اپنے دل میں تڑپ رکھتا تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں کوئی چنگاری ضرور روشن تھی۔

ایک دن میری نے صاحب زمان سے پوچھا۔ ”بتاؤ، تمہیں ان درختوں اور ان پودوں کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے آگئیں۔“

”اس لیے کہ میں اپنی فطرت میں ان کے بہت قریب ہوں۔“ صاحب زمان نے بتایا۔ ”یہ میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کی آغوش میں پرورش پائی ہے، ان کو دیکھ دیکھ کر جوان اور باشعور ہوا ہوں۔“

”تم باتیں بھی بہت اچھی کر لیتے ہو۔“ میری نے کہا۔

”وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ یہ جھرنے، یہ پہاڑیاں، یہ اونچے درخت یہ سب ہر وقت کچھ نہ کچھ سکھانا چاہتے ہیں، اگر آپ ان کی خاموشی کی زبان سمجھ سکیں۔ یہ بہت بڑے استاد ہوتے ہیں۔ انہوں نے نہ جانے کتنے زمانے بدلے اور گزرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں ان علاقوں میں گھوم پھر کر ان کی باتیں جمع کرتا رہا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، کیا تمہارے ان علاقوں میں عشق اور محبت کی داستانیں بھی ہوا کرتی ہیں۔“ میری نے شوخ انداز میں پوچھا۔

”کیوں نہیں جی۔“ صاحب زمان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ”لیکن ایک فرق ہے۔ اس قسم کے جذبے تو انسان کی فطرت میں شامل ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ سامنے والے پہاڑ کو دیکھ رہی ہیں۔ اب کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے سینے میں کتنے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب اس پہاڑ کو اندر سے دیکھا جائے۔ اسی طرح یہاں کے رہنے والے پہاڑوں کی طرح اپنے جذبات کو اپنے سینوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اندر سے دیکھا جائے تو اس وقت پتا چلے گا کہ عشق و محبت کے کیسے خزانے ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔“

اس وقت میری نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا کہ اب بھی اس پہاڑ کو اندر سے دیکھنے کی ضرورت کو محسوس کرے گی۔

☆☆☆

بابا کوہلی کا بیٹا بظاہر کسی شکار کی تلاش میں ریٹ ہاؤس کے عقبی جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ لیکن اس کا اصل مقصد رانی سے ملنا اور اس کو دیکھنا تھا۔ وہ اس دن کے بعد دوبارہ بابا کوہلی کے پاس نہیں آئی تھی۔ گلزار کو شہر واپس جاتا تھا لیکن وہ بابا سے بہانہ کر کے رک گیا تھا۔

گلزار کو وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ وہ شہر کی بہت سی لڑکیوں سے واقف تھا۔ لیکن جو بات جنگل کی اس ہرنی میں تھی، وہ کسی میں نظر نہیں آئی تھی۔ بابا نے بتایا تھا کہ رانی ریٹ ہاؤس کے چوکیدار کی بیٹی ہے۔ وہ ریٹ ہاؤس دیکھ آیا تھا۔ اس کے پیچھے درختوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

وہ براہ راست ریٹ ہاؤس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لڑکی ریٹ ہاؤس سے باہر ہی کہیں مل جائے۔ اسی لیے وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ وہ بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا جہاں ایک قبر بنی ہوئی تھی۔

گلزار اس جنگل میں ایک قبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اونچے ٹکیوں کی قبر۔ پتھر کی چٹنی سلوں سے بنی ہوئی جس کے سر ہانے ایک کتبہ بھی تھا۔ اس قبر کے پاس ایک چبوترہ بھی تھا۔ وہ بھی کسی قیمتی پتھر کا بنا ہوا تھا اور اس چبوترے پر کوئی لڑکی یا عورت لیٹی ہوئی تھی۔

کون ہو سکتی تھی جو اس ویرانے میں ایک قبر کے چبوترے پر آکر لیٹ گئی تھی۔ گلزار آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا رہا۔ لیٹنے والی کے خدو خال واضح ہوتے گئے۔ جب وہ چبوترے کے پاس پہنچا تو لیٹنے والی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

گلزار نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھی، رانی جس کی تلاش میں وہ یہاں تک آیا تھا۔

رانی حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کا دوپٹا ایک طرف تھا۔ اس نے جلدی سے دوپٹا اوڑھ لیا اور چبوترے سے نیچے اتر آئی۔ ”بابو، تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

”تم وہی ہونا جو بابا کے پاس آئی تھیں۔“

”ہاں، میں وہی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو۔“

”کیوں؟ کیا اس جنگل پر صرف تمہارا حق ہے۔ کبھی

کوئی اور یہاں نہیں آ سکتا۔“ گلزار نے کہا۔ ”میں شکار کھیلنے آیا تھا۔“ اس نے اپنی بندوق کی طرف اشارہ کیا۔

”لیکن اس جنگل میں تو شکار نہیں ملتا۔“

”کس نے کہا کہ نہیں ملتا۔ مجھے تو مل گیا ہے۔“ گلزار نے اپنی نگاہیں رانی کے بدن میں اتار دیں۔

رانی کوئی جواب دیے بغیر چبوترے سے اتر کر جانے لگی تو گلزار نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ارے، کہاں جا رہی ہے۔ میں تو تیرے لیے بھٹکتا پھر رہا ہوں اور تو ہاتھ چھڑا رہی ہے۔“

”چھوڑ مجھے۔“ رانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دوں۔ تیرے لیے تو یہاں رہ گیا ہوں۔ بات مان لے میری۔ بہت پیسے دوں گا۔“

”چھوڑ۔۔۔ رانی نے اپنے دانت اس کی کلائی میں اتار دیے۔

گلزار نے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ رانی چکرائی ہوئی چبوترے پر جا گری۔ گلزار کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اپنی بندوق اس کے سینے پر رکھ دی۔ ”حرام زادی اگر اب ہنگامہ کیا تو گولیاں تیرے سینے میں اتار دوں گا۔“

اسی وقت درختوں کے عقب سے کوئی نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ بابا کوہلی تھا۔ گلزار اسے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

رانی اپنے آپ کو سنبھال کر دوڑتی ہوئی بابا کوہلی سے لپٹ گئی۔ ”بابا، بچاؤ مجھے۔ یہ مجھے بے عزت کرنے لگا تھا۔ بچاؤ اس سے۔“

اپنے شکار کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر گلزار بھڑک اٹھا تھا۔ ”بابا، اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے بابا کوہلی سے کہا۔ ”اس کی فکر مت کرو، اپنی اولاد کو دیکھو۔“

”میں اپنی کم بخت اولاد ہی کا پیچھا کرتا ہوں یہاں تک آیا ہوں۔“ بابا کوہلی نے کہا۔ ”جس وقت تو شکار کا کہہ کر بندوق لے کر نکلا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تیرے دل میں اس وقت کوئی شیطان گھس آیا ہے۔ تیری آنکھیں بتا رہی تھیں کہ تو کسی ناپاک ارادے سے کسی طرف جا رہا ہے۔ پھر میں تیرا پیچھا کرتا ہوں یہاں تک آ گیا ہوں۔ اب میں تیرا یہاں رہنا برداشت نہیں کر سکتا۔ تو اسی وقت واپس چلا جا۔“

”بابا، یہ تو سوچو کہ تم ایک غیر لڑکی کے لیے اپنے بیٹے

کو ذلیل کر رہے ہو۔“
”یہ غیر لڑکی تجھ جیسی بے غیرت اولاد سے بہتر ہے۔“ بابا کوہلی نے کہا۔ ”اب دفع ہو جا یہاں سے۔“
”یہ تم زیادتی کر رہے ہو بابا۔“
”میں نے کہا نافع ہو جا۔“

گلزار نے اپنی بندوق اٹھالی جو اس ہنگامے میں ایک طرف جا گری تھی۔ وہ بندوق اٹھا کر دو قدم آگے گیا۔ پھر اچانک پلٹ پڑا۔ اس کی بندوق کا رخ بابا کوہلی کی طرف تھا۔ ”بس بابا، اب بہت ہو گیا۔ اب میری برداشت سے باہر ہے۔“

”تو... بابا کوہلی کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھٹی رہ گئی تھیں۔“ تو اپنے باپ پر بندوق اٹھائے گا۔ گولی مارے گا پنے باپ کو۔“
”ہاں۔ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اب میرا تم سے رشتہ ہی کیا ہے۔ تم تو یہاں آکر آباد ہو گئے ہو۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو تمہیں اپنے ساتھ لینے آ گیا تھا۔ لیکن اب بہت ہو چکا۔“

رانی اس دوران کھسکتی ہوئی کچھ فاصلے تک آچکی تھی۔ گلزار کا دھیان بابا کوہلی کی طرف تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ پایا تھا کہ رانی ایک بڑا سا پتھر اٹھا چکی ہے۔ وہ پتھر بندوق سے نکلی ہوئی کسی گولی کی طرح گلزار کے سینے پر لگا۔ ایک کر بناک چیخ کے ساتھ گلزار ایک طرف جا گرا تھا۔ بندوق بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ رانی نے جلدی سے بندوق اٹھا کر بابا کی طرف اچھال دی۔ پھر اس ویرانے میں دو گولیاں چلیں۔ پرندے درختوں سے پرواز کرنے لگے اور گلزار کا خون آلود جسم پھڑکنے لگا۔

☆☆☆

بہت خوبصورت صبح تھی۔ میری نے اب تک جتنی بھی صبحیں دیکھی تھیں، یہ شاید ان سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ان کے خیمے ایک بلند ٹیلے پر نصب کیے گئے تھے۔

اس ٹیلے سے دور دور تک کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ دور پہاڑیوں پر نیلی نیلی دھند چھائی ہوئی تھی اور روٹی کے گالوں کی طرح اڑتے ہوئے بادلوں نے درختوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

اس کے قدموں میں دور تک گھاس بچھی ہوئی تھی جس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ ایسی

وادی تھی جہاں پوری زندگی سکون کے ساتھ گزاری جاسکتی تھی۔

وہاں کے لوگ ان لوگوں کو دیکھ کر ادب سے سر جھکا کر ادھر ادھر سمٹ جاتے۔ ان کی لڑکیاں اور عورتیں بہت خوبصورت ہوا کرتیں۔ ان کی رنگت صاف ہوتی اور ان کے گالوں پر آگ جیسی لگی رہتی۔ ان کے ہونٹ یا قوت کی طرح سرخ ہوا کرتے۔

صاحب زمان اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میری نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کتنی خوبصورت وادی ہے۔ ہے۔“

”لیس مس۔ لیکن آپ اس کی اداسی بھی تو دیکھیں۔ اس کے درختوں اور چشموں کی زبانیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ انہیں اپنے غلام ہونے کا دکھ ہے۔“

”میں نے اس علاقے کے لوگوں میں یہی برائی دیکھی ہے کہ گھما پھرا کر مذہب یا وطن کا رونا رونے لگتے ہیں۔“ میری نے چڑ کر کہا۔

”وہ اس لیے مس کہ ہم ان کے سلسلے میں بہت جذباتی ہیں۔“ صاحب زمان نے کہا۔ ”ہم خواب دیکھے جارہے ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر کب ملے گی۔“

”کیسے خواب!“
”وہی آزادی کے خواب۔“
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے بہت دور تک چلے آئے تھے۔ سورج اب پوری طرح نکل چکا تھا اور اس کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر نیچے گر رہی تھیں۔ پرندے پرواز کرتے پھر رہے تھے۔

”یہ دیکھو۔“ میری نے ایک شاخ پر بیٹھے کانیں کانیں کرتے کوئے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں کے کوئے بھی کتنے مختلف ہیں۔ سائز میں بڑے۔ مکمل کالے اور آواز بھی کتنی بھاری ہے۔“

”لیس مس۔ پہاڑی کوئے شہری کوؤں سے مختلف ہی ہوتے ہیں۔“

میری ایک جگہ آکر رک گئی۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جس کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔

”صاحب زمان اس علاقے کا نام کیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”اس کو شاداب نگر کہتے ہیں مس۔“ صاحب زمان

نے بتایا۔ ”شاداب نگر۔“
”واقعی اپنے نام ہی کی طرح شاداب ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔“

”یہاں زمین پر۔“
”تو کیا ہوا۔ زمین سے انسان کا تعلق قائم رہنا چاہیے۔“ میری زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

صاحب زمان بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت ہوا بہت دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور درختوں کے پتوں کے درمیان ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کرتی گزر رہی تھی۔

وہ جگہ جنگلی پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔
”یہ تو ایسی جگہ ہے... صاحب زمان کہہ دل چاہتا ہے قیامت تک کے لیے یہیں پڑاؤ ڈال لیا جائے۔ تمہارے اس شاداب نگر نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہیں۔“

”مس، تم واقعی دوسروں سے بہت الگ ہو۔“ صاحب زمان نے کہا۔ ”تمہارے سینے میں واقعی ایک حساس دل ہے۔“

میری اس کی بات سن کر مسکرا دی۔
درختوں کے عقب سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس طرف آرہے ہوں۔ وہ میری کے محافظ ہی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ میری کو صاحب زمان کے ساتھ نکلے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

لیکن جب وہ لوگ سامنے آئے تو دونوں ہی بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ چہروں پر ڈھانے باندھے ہوئے سات آٹھ آدمی تھے۔ جن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

☆☆☆

پورا شاداب نگر بابا کوہلی کے کہن کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

مرنے والے شخص کی تدفین کر دی گئی تھی۔ بابا کوہلی ایک طرف سر جھکائے بیٹھا رو رہا تھا۔ سب کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ بابا کوہلی نے رانی کی عزت بچانے کے لیے اپنے بیٹے کو گولی مار دی تھی۔

ہرزبان پر اس کے چہرے تھے۔

سب کے سب بابا کو عزت اور دکھ کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ پہلے ہی بابا کی عزت کیا کرتے۔ اب ان کا احترام اور زیادہ ہو گیا تھا۔ بابا نے ایک مثال قائم کر دی

تدفین تک وہ کسی چٹان کی طرح خاموش رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں خلا میں گردش کرتی رہی تھیں۔ لیکن بیٹے کی تدفین کے بعد وہ ٹڈھال ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

رانی اس وقت خود کو چورس محسوس کر رہی تھی۔ جو کچھ ہوا شاید اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ کاش، وہ اس قبر کی طرف نہیں جاتی۔ کاش وہ وہاں چبوترے پر نہ آرام کرتی۔ کاش! بہت کچھ تھا اس کاش میں۔ لیکن ایک حادثے کو نہیں آتا تھا وہ آگیا۔ بابا نے اپنے ہاتھوں اپنے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس وقت وہ اکیلا بیٹھا سر جھکائے روئے جا رہا تھا۔

رانی نے اس کے پاس پہنچ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بابا، مجھے بہت افسوس ہوا۔ جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا۔“

”نہیں بیٹا۔“ بابا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اس بد نصیب کی قسمت میں ایسی موت لکھی تھی۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ ورنہ اس کو مارنے کے بعد میں خود کو بھی گولی مار لیتا۔“

رانی بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔
پورے ماحول پر سو گواریت تھی۔ سب کو بابا کوہلی کی فکر تھی کہ وہ کس طرح اس صدمے کو برداشت کر پائے گا لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد گاؤں والے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے۔ رانی بابا کوہلی کے لیے اپنے گھر سے کچھ پکا کر لے آئی تھی۔ اس نے بہت زبردستی کر کے بابا کو کھلایا تھا۔

رانی کے لیے دوسرا دن بہت اداس کرنے والا تھا۔ وہ صبح کو بابا کوہلی کو دیکھ آئی تھی۔ اس کے لیے چائے بنادی تھی۔ پھر اپنی اسی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ یعنی قبر کے اس چبوترے پر۔ جہاں ایک دن پہلے ایک قیامت برپا ہو چکی تھی۔

وہ سوچتی رہی کہ یہ سب کیا ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس نے اپنے بابا سے سنا تھا کہ تقدیر کا لکھا ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔ تو جو کچھ ہوا کیا اسے تقدیر کا لکھا کہا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو تقدیر نے ایسا کیوں لکھا؟ زندگی کسی کو امتحان میں کیوں ڈالتی ہے۔

وہ سوچتی رہی۔

اور ایک بار درختوں کے عقب سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح چوکنا ہو گئی۔ کل بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ کوئی ان درختوں کے عقب سے نکل کر بلائے ناگہانی کی طرح اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن اس بار درختوں کے عقب سے نکل کر آنے والی ہستی کوئی مرد نہیں بلکہ ایک لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت۔ جس کی زلفیں سنہری تھیں اور جس کے جسم پر ایسا لباس تھا جس کے بارے میں اس کے بابا نے بتایا تھا کہ انگریز لڑکیاں اسی قسم کے لباس پہنتی ہیں۔

رانی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لڑکی اس کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے۔

”تم، ک، کون ہو تم؟“ رانی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔
”میں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”میرا نام میری ہے۔“ اس نے بتایا۔ پھر قبر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ میری قبر ہے۔“
میری لاش اس میں دفن ہے۔“

☆☆☆

درختوں کے درمیان سے آنے والے نقاب پوشوں نے میری اور صاحب زمان کو زبردستی اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ میری بہت بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ صاحب زمان نے تسلی دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”صاحب زمان کون ہیں یہ لوگ؟ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔“ میری نے کئی سوال کر ڈالے۔ ”یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔“

”مجھے بھی کچھ نہیں معلوم مس۔“ صاحب زمان نے جواب دیا۔ ”لیکن تم پریشان نہ ہو۔ یہ ہمیں جہاں لے جا رہے ہیں وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا۔“

”ان سے معلوم تو کرو۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ لیکن یہ کوئی جواب نہیں دے رہے۔“
میری کے لیے یہ بہت ہولناک اور بھیانک تجربہ تھا۔ وہ تو ان پہاڑوں کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے آئی تھی۔ وہ تو یہاں کے خوبصورت نظاروں میں کھوئی تھی۔ وہ تو صاحب زمان سے باتیں کر رہی تھی کہ یہ لوگ نہ جانے کہاں سے آچکے تھے۔

ویسے ابھی تک ان کے انداز مہذب ہی تھے۔ انہوں نے میری کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی اور نہ ہی انہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ صاحب زمان نے اس کا ہاتھ کیوں تھام رکھا ہے۔

پھر بھی ایک انجانہ سا خوف، ایک انجانہ سا اندیشہ اسے گھیر رہا تھا۔ شاید ان جنگلوں سے نکلتا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

نہ جانے ان لوگوں کا کیا ہوا ہوگا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں شاید خبر بھی نہ ہو کہ میری اور صاحب زمان پر کیا گزر رہی ہے۔

اس کے باپ کو جب اندازہ ہوگا کہ اس کی بیٹی ان جنگلوں میں کہیں غائب ہو گئی ہے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اسے تو میری سے بہت محبت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے صاحب زمان کی حرکت سمجھے اور کرم داد کی شامت آجائے کیونکہ کرم داد ہی اسے لے کر آیا تھا۔

میری کے ذہن میں بہت تیزی سے سوالات آرہے تھے۔ یا تو جو کچھ ہو رہا تھا، ایک خواب تھا۔ بھیا نک خواب۔ اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھل جانے والی تھی۔ یا پھر ایک حقیقت تھی۔ انتہائی بھیانک اور تلخ حقیقت۔ ان کا سفر درختوں کے درمیان جاری تھا۔

ہر طرف جنگلی پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور پرندوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میری کو یاد آیا کہ صاحب زمان نے یہ کہا تھا کہ کسی پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید کر کے اس سے پوچھیں کہ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کیا چیز تھی؟

کچھ دیر پہلے تک وہ آزاد تھی اور اب اسے قیدی بنا کر کسی انجانی منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ وہاں سورج کی کرنیں بہت چمک رہی ہو کر گر رہی تھیں۔ اس کے باوجود ایک خنک سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس اجالے میں ایک طرف چلے جا رہے تھے۔

پھر بہت دیر کے بعد وہ سب رک گئے۔ یہ بھی جنگل ہی کا حصہ تھا لیکن ایک چھوٹے سے میدان کی صورت میں۔ اس میدان کے ارد گرد صنوبر کے درخت تھے اور میدان میں خیمے لگے ہوئے تھے۔ خیموں سے باہر کچھ لوگ تھے لیکن انہوں نے نقابیں نہیں باندھ رکھی تھیں۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی ان دونوں کے پاس آیا۔ اس نے صاحب زمان سے کہا۔ ”تم تو ویسی معلوم ہوتے ہو؟“ ”ہاں، لیکن یہ سب کیا ہے۔ تم ہمیں کیوں لائے ہو؟“

”ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا سکتے ہو۔ لیکن یہ لڑکی ہمیں رہے گی ہمارے پاس۔“

”کیوں، اس نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔“
”یہ ہمارے دشمنوں کی لڑکی ہے۔ ان لوگوں نے ہماری زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہماری آزادی چھین لی ہے۔“

”تو کیا اس لڑکی کو قید رکھنے سے تم انگریزوں سے بدلہ لے لو گے۔“

”ہاں اس کے باپ کو کچھ تو احساس ہوگا جو سات سمندر پار سے ہمیں غلام بنانے کے لیے یہاں آیا ہے۔“
”دیکھو، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب کوئی قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تم کسی بے گناہ کو اس کے ناکردہ گناہ کی سزا دو۔ اور ہمارے مذہب میں تو ویسے ہی عورت کا احترام کیا جاتا ہے۔“

”ہمیں تمہاری تقریر نہیں سننی۔ ہم نے اس پر قابو پایا ہے۔ ہمارے لیے اتنا بہت ہے۔ اس کو قید رکھ کر ہم کچھ تو نقصان پہنچا دیں گے۔“

”یہ ایک بچکانہ حرکت ہوگی۔“ صاحب زمان نے کہا۔ ”اور ویسے بھی یہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ ہمدرد ہے بے چاری۔ اس کے سوچنے کا انداز بہت مختلف ہے۔ یہ ہماری پریشانیوں کو سمجھتی ہے۔ لیکن اپنی قوم کے سامنے بے بس ہے۔“

”واہ، واہ، کیا بات ہے۔ کتنی حمایت کر رہا ہے اس کی کہیں اس سے عشق تو نہیں کرنے لگا۔“
”ہاں۔ میں اس لیے اس سے عشق کرنے لگا ہوں کہ اس لڑکی کے اندر کا انسان زندہ ہے۔“

”بس۔ اب زیادہ باتیں نہیں۔ ہم تم کو جانے کی اجازت دے رہے ہیں تمہارے لیے اتنا بہت ہے۔ ورنہ تمہارے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ لیکن میں اس کو اپنے ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

اس آدمی نے غصے میں اپنی بندوق کی نال صاحب زمان کے سینے پر رکھ دی۔ ”بس۔ اب اپنی زبان بند کر۔“

انگریزوں کے لئے۔ تم جیسوں نے سچ دیا ہے اس کو۔“

پاس کھڑی ہوئی میری نے اچانک بندوق کی نال پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے صاحب زمان اور اس آدمی کے درمیان ہونے والی گفتگو تو سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ صاحب زمان اس آدمی سے میری کے لیے بحث کر رہا ہے اور اب اس آدمی نے صاحب زمان کے سینے پر بندوق کی نال رکھ دی ہے۔ وہ اسے مارنا چاہتا ہے۔

اسی لیے اس نے بے تاب ہو کر بندوق کی نال پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ بدلنے یا اسے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس آدمی نے گولی چلا دی۔

ایک زوردار دھماکا جنگل میں گونج کر رہ گیا۔ یہ سب پانچ سیکنڈ میں ہوا تھا۔ صرف پانچ سیکنڈ۔ زندگی اور موت کے پانچ سیکنڈ۔ صرف پانچ سیکنڈ پہلے تک صاحب زمان زندہ تھا۔ لیکن اب اس کی لاش پڑی ہوئی تھی اور گرم گرم سرخ خون نے اس کے پورے جسم کو رنگین کر دیا تھا۔

میری سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، پھر چکر اکر ایک طرف گر پڑی۔

☆☆☆

رانی جیسے بے ہوش ہونے والی تھی۔ جس انگریز لڑکی کی قبر تھی۔ وہ لڑکی اچانک زندہ ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی ہوئی میری اس کی حالت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”ڈرو نہیں، میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“
میری نے کہا۔ ”میں تو خود صدیوں سے ان ہی جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ میں تو ایک غریب آوارہ روح ہوں۔ میں بے چاری کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔“

اس دوران درختوں کے درمیان سے ایک آدمی نکل کر ان کے پاس آ گیا۔ اس نے میری کو مخاطب کیا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ وہاں شاٹ تیار ہے۔ ڈائریکٹر نے شور کر کے پورا جنگل سر پر اٹھالیا ہے۔“

”دانش یہ بے چاری مجھے میری کی روح سمجھ رہی ہے۔“ اس لڑکی نے رانی کی طرف اشارہ کیا۔

اس آدمی نے ستائشی نگاہوں سے رانی کی طرف دیکھا۔ ”تم یہیں رہتی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

وارث شاہ

قادر یہ سید کے مشائخ سید قطب شاہ کے بیٹے اور "ہیرا راجھا" کے مصنف۔ 1135ء یا 1140ء میں ضلع شیخوپورہ کے جنڈیا نوالہ شہر خان میں پیدا ہوئے۔ ذرا بڑے ہوئے تو تحصیل علم کی خاطر قصور گئے اور مسجد کوٹ قصور میں مولانا غلام محی الدین سے فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد حضرت بھٹے شاہ کے ساتھ مولانا غلام مرتضیٰ قصوری کے شاگرد ہوئے۔ یہاں سے نکلے اور پاک پتن شریف پہنچے اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دی بعد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں وارث شاہ اور بھاگ بھری کی متنازعہ داستانیں لکھیں۔ پھر پاک پتن کے قریبی گاؤں ملکہ ہانس چلے گئے، قصہ ہیرا راجھا بھی یہیں کی تحریر ہے کچھ دنوں کے بعد یہاں سے لاہور اور قصور ہوتے ہوئے واپس جنڈیا نوالہ شہر خان چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔ آپ کی قبر ایک چار پانچ فٹ اونچے احاطے میں گاؤں کے باہر ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے والد اور بھائی کے مقابر بھی ہیں۔ انہیں پنجابی کے بلند پایہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، ہیرا راجھا نامی نظم نما کہانی نے انہیں لازوال شہرت دی ہے جو کلاسیکی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔

واجب

ایک عربی اصطلاح، فقہ میں وہ کام جس کا کرنا ضروری ہو، یہ فرض اور نفل کی درمیانی شکل ہے۔ نفل کے برعکس اس کے نہ کرنے پر گناہ ہوتا ہے مگر فرض کاموں سے کم، نماز و تراویح واجب ہے۔ عید الاضحیٰ پر قربانی بھی واجب ہے۔ فرض سے انکار کفر و الحاد ہوتا ہے لیکن واجب سے انکار میں ایسا درجہ نہیں۔ "واجب" مختلف دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً واجب الوجود یعنی "وجود مطلق" یعنی "خدا" واجب الادا یعنی وہ چیز جو ادا کرنی ہو مثلاً قرضہ وغیرہ واجب الاطبار وہ جس کی تقلید کی جائے یعنی "نبی"۔

مرسلہ: سلیم خاتونی، کراچی

شاہدہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور شاہدہ کچھ بولتی جا رہی تھی۔ فرحان نے بتایا کہ اس آدمی کے ہاتھ میں مانگ ہے۔ اور شاہدہ کی آواز ریکارڈ ہو رہی ہے۔ رانی بہت دیر تک دیکھتی رہی تھی۔ سین ختم ہونے کے بعد شاہدہ ان دونوں کے پاس آگئی۔ "ہاں بھئی رانی، کیسا لگا۔"

"بہت اچھا۔" رانی نے بتایا۔ "لیکن آپ کیا کیا بول رہی تھیں۔"

"وہ لمبے چوڑے ڈائلاگس تھے۔"

"آپ لوگ یہاں کب تک ہیں جی۔" رانی نے پوچھا۔

"کم از کم ایک ہفتہ، ہمارا آؤٹ ڈور ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر ان ڈور کام ہوگا۔"

"ٹھیک ہے جی، میں پھر آؤں گی۔" رانی نے کہا۔

"بابا پریشان ہو رہا ہوگا، میں پھر آؤں گی۔"

"ضرور آتا۔" فرحان نے کہا تھا۔

رانی اس کو دیکھتی ہوئی ریٹ ہاؤس کی طرف چلی گئی۔

"باجھی لڑکی ہے۔" فرحان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں، اچھی ہے لیکن تم اس بے چاری سے دور رہی رہتا۔" شاہدہ چڑ کر بولی۔ "جنگل کے پھول کو جنگل میں ہی رہنے دینا۔"

☆☆☆

اسے صرف اتنا یاد تھا کہ صاحب زمان کو جب گولی ماری گئی تو وہ چکر اکر گر پڑی تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید وہ بے چارہ اسی کی وجہ سے مارا گیا تھا۔

یہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے خواہ مخواہ اس کی جان لے لی تھی۔

میری کو ہوش تو آ گیا تھا لیکن اس کے اعصاب کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کا ذہن سن ہو گیا تھا۔ یہ کیسا بھیانک سفر تھا۔ اس نے کیوں اپنے باپ سے سیر کی خواہش کی تھی۔

اب کیا ہونے والا تھا؟ اس کا کیا بنے گا۔ یہ بہت بے رحم لوگ معلوم ہوتے تھے۔

وہ رونا چاہتی تھی، چیخنا چاہتی تھی لیکن کچھ نہیں کر پارہی تھی۔ ایک بے کفی سی تھی۔ احساس بے چارگی نے اسے سن کر کے رکھ دیا تھا۔

نے بتایا۔ "رانی نام ہے اس کا۔"

"چلو اپنا کام شروع کرو۔"

میک اپ آرٹسٹ نے شاہدہ کا میک اپ درست کرنا شروع کر دیا۔ یونٹ کے دوسرے افراد نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ رانی کے لیے یہ سب بالکل نیا تھا۔ وہ پہلی بار یہ سب دیکھ رہی تھی۔

جو آدمی اسے اور شاہدہ کو لے کر آیا تھا۔ وہ بہت قبول صورت نو جوان تھا۔ وہ رانی کو بتا رہا تھا۔ "میں اس ڈرامے کا ہیرو ہوں۔ میری کی کہانی میں ایک کردار تھا صاحب زمان کا۔ میں وہ کردار ادا کر رہا ہوں۔"

"اور آپ کا اصل نام کیا ہے جی۔"

"فرحان۔" اس نے بتایا۔ "تم نے شاید میرے ڈرامے دیکھے ہوں۔"

"ہاں جی، کچھ یاد تو پڑتا ہے۔" رانی نے گردن ہلائی پھر پوچھا۔ "اور جی۔ یہ مریم کون تھی۔"

"یہ ایک انگریز کرنل رابرٹ کی بیٹی تھی۔" فرحان نے بتایا۔ "جو ایک مقامی شخص صاحب زمان سے محبت کرنے لگی تھی۔ پھر کچھ حریت پسندوں نے اسے مار دیا۔ انہوں نے صاحب زمان کو بھی مار دیا تھا۔ میری کی قبر تو اسی جگہ بنا دی گئی اور صاحب زمان کی قبر کا پتا نہیں چلا ہے۔"

فرحان نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ منتخب کر کے ہونٹوں سے لگایا۔ ماچس نکالی۔ ایک تیلی جلا کر اسے پھونک مار کر بجھا کر دوسری تیلی جلا کر اس سے سگریٹ سلگائی۔

رانی بہت حیرت اور دلچسپی سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ "یہ کیا صاحب، تم نے ایک تیلی جلا کر کیوں بجھا دی۔"

فرحان مسکرا دیا۔ "شگون کے لیے۔ یہ میری عادت ہے۔ میں کبھی پہلی تیلی سے سگریٹ نہیں جلاتا ہوں۔"

"اور یہ شگون کیا ہوتا ہے جی۔"

"شگون یہ ہوتا ہے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ مجھے ملے گا یا نہیں۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"چھوڑو میری بات کو۔ وہ دیکھو، ریکارڈنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس سین میں شاہدہ یعنی میری کو اپنے آپ سے باتیں کرنی ہیں۔ ہم اسے مونو لاگ کہتے ہیں۔"

رانی نے دیکھا کہ ایک شخص ایک ڈنڈا سا اٹھائے

"ہاں۔ لیکن یہ سب کیا ہے۔ تم لوگ کون ہو۔"

"ہم یہاں ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے آئے ہیں۔"

اس آدمی نے بتایا۔ پھر اس آدمی نے میری کی قبر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں جو لڑکی دفن ہے نام میری، اس کی زندگی پر ڈراما بن رہا ہے اور یہ شاہدہ اس ڈرامے میں میری کا رول کر رہی ہے۔ اب سمجھ گئیں۔"

رانی نے ریٹ ہاؤس میں لگے ہوئے ٹی وی میں ڈرامے دیکھ رکھے تھے۔ اس لیے اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے شکوہ بھرے انداز میں میری کا رول ادا کرنے والی شاہدہ کی طرف دیکھا۔ "آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا جی۔ میں یہ بھی تھی کہ واقعی مرنے والی اپنی قبر سے باہر نکل آئی ہے۔"

"تم بہت بھولی ہو۔" شاہدہ ہنس پڑی۔ "رہتی کہاں ہو۔"

"میں یہاں کے ریٹ ہاؤس کے چوکیدار کی بیٹی ہوں۔" رانی نے بتایا۔ "لیکن آپ لوگوں کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہم لوگوں نے ریٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر اپنے کیمپ لگا رکھے ہیں۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"رانی۔"

"واقعی کسی رانی کی طرح ہو۔ اگر شوٹ میں آ جاؤ تو تمہلکے بچاؤ۔ ڈرامے کی ریکارڈنگ دیکھنی ہو تو ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

"ہاں جی، کیوں نہیں۔ مجھے تو بہت شوق ہے۔ میں نے بہت سنا ہے۔"

"تو پھر آؤ۔"

اس ٹیم نے ریٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر اپنے کیمپ لگا رکھے تھے۔ پورایونٹ آؤٹ ڈور ریکارڈنگ کے لیے آیا ہوا تھا۔

ادھیڑ عمر ڈائریکٹر جھلایا ہوا گھوم رہا تھا۔ شاہدہ کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ "سمال کی لڑکی ہو۔ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔"

"میں اپنی قبر کی طرف چلی گئی تھی۔" شاہدہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"اور کس کو ساتھ لے آئی ہو۔" ڈائریکٹر نے رانی کی طرف دیکھا۔

"یہ ریٹ ہاؤس کے چوکیدار کی بیٹی ہے۔" شاہدہ

شاید رات ہوگئی تھی۔ جنگل میں تو شام کے وقت بھی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ یہ تو پھر بھی رات تھی۔ اسی لیے ایک لیمپ روشن کر دیا گیا تھا۔ جس کی روشنی اس کیمین کو نہ تو پوری طرح روشن کر پار ہی تھی اور نہ ہی وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ دونوں کے درمیان کی کیفیت تھی۔

خوفزدہ کر دینے والا ماحول تھا۔ لکڑی کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ میری جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے گم شدہ اوسان جیسے اچانک واپس آ گئے تھے۔

آنے والی ایک عورت ہی تھی۔ مقامی عورت۔ جس نے اپنے ہاتھ میں ایک تھالی لے رکھی تھی۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں اور گلاس میں پانی تھا۔ اس نے میری کو بیٹھے دیکھ کر کچھ کہا۔ لیکن اس کی زبان میری کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس عورت نے وہ ٹرے لاکر میری کے سامنے رکھ دی۔ اس نے اشارے سے کہا کہ وہ کچھ کھالے۔

”کون ہو تم لوگ۔ یہاں کیوں مجھے رکھا ہوا ہے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“ میری ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ جس طرح اس کی باتیں میری کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھیں اسی طرح میری کی باتیں وہ بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ وہ ایک جوان عورت بھی لیکن اس کے چہرے پر کھردرا پن تھا۔ اس کی پیشانی پر کچھ لکیریں سی بنی ہوئی تھیں۔

اس عورت نے پھر اشارہ کیا کہ میری کچھ کھالے۔ ”خدا کے لیے کسی کو بلا کر لاؤ جو میری زبان سمجھ سکے۔“ میری نے کہا۔

وہ عورت اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اب میری نے وہ تھالی اٹھا کر ایک طرف پھینک دی۔ یہ اشارہ شاید اس عورت کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے کیمین سے باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہی آدمی داخل ہوا جس کی بندوق سے صاحب زمان کی موت ہوئی تھی۔ وہ پہلے بھی میری سے باتیں کر چکا تھا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی تھی۔

”کیا کہا تم نے۔ کیوں مار دیا اس کو۔“ میری نے پہلا سوال صاحب زمان کے حوالے سے کیا تھا۔

”مس، اس کی موت کا ہمیں بھی افسوس ہے۔“ اس

نے کہا۔ ”لیکن آپ مجھ پر الزام نہ دیں۔ آپ نے اس انداز سے بندوق پر ہاتھ ڈالا تھا کہ ٹریگر دب گیا اور اس بے چارے کی موت ہوگئی ویسے بھی راہ حق میں اس قسم کی شہادتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔“

”تو پھر اس کو مارنے کے بعد مجھے کیوں نہیں جانے دے رہے۔“ میری نے پوچھا۔ ”مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے۔“ ”تم تو ہمارے لیے بہت قیمتی ہو۔“ اس نے کہا۔ ”تم کرنل رابرٹ کی بیٹی ہو۔ جو اس پورے علاقے کی فوج کا نگران ہے۔ تمہیں قید میں رکھنے سے تمہارے باپ پر دباؤ پڑے گا۔“

”اور تم لوگ اپنی آزادی کی جنگ جیت جاؤ گے۔ کیوں۔“ میری کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

”نہیں۔ صرف ایک واقعہ سے یہ جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ لیکن یہ واقعہ بارش کا پہلا قطرہ تو ہو سکتا ہے نا۔“ اس نے کہا۔ ”کم از کم ہم تمہارے باپ اور اس جیسے دوسروں کو یہ احساس تو دلا سکیں گے کہ ہم ان کو اپنی سر زمین پر برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ یہاں سے چلے جائیں۔“

”یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔“ میری نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے باپ کی اکلونی اولاد ہوں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے فرد واحد کی نہیں پوری قوم کی اہمیت ہوگی۔ وہ عظیم برطانیہ کا بیٹا ہے۔ اور صرف میرا باپ ہی نہیں بلکہ اس جیسے سیکڑوں دوسروں کا بھی یہی خیال ہوگا۔ اس لیے ختم کرو اس کہانی کو۔“

”تمہارے غائب ہونے کے بعد تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ نے فوجی دستے تمہاری تلاش میں ان جنگلوں کی طرف روانہ کر دیے ہیں۔“

”اوہ۔“ میری کا دل دھڑک اٹھا۔ ”ظاہر ہے، وہ باپ ہے میرا۔ اسے میری فکر تو ہوگی۔ لیکن تم لوگ کیا کرو گے؟“

”یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب وہ دستے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”فی الحال تم آرام کرو۔“

”اچھا کہا تم نے۔ اگر اس حالت کو تم آرام کرنا کہتے ہو تو میں واقعی بہت آرام سے ہوں۔“

وہ آدمی گہری نگاہوں سے میری کو دیکھتا رہا۔ پھر کیمین سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میری نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

اب تک وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی کمزور ہو چکی ہے۔

یہ رات اس کی زندگی کی سب سے بھیا تک رات تھی۔ اس نے ایسی رات کبھی نہیں گزاری ہوگی۔ انجانے لوگوں کے درمیان۔ جن کے لیے وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ جو اس کی ذرا سی حرکت پر اسے گولی مار سکتے تھے۔

اسے اپنا باپ یاد آ رہا تھا۔ اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ جس کا انتقال چار پانچ برس پہلے ہو گیا تھا۔ لندن میں اپنا وہ گھر یاد آ رہا تھا جہاں اس نے زندگی گزاری تھی۔

موسم سرما کی راتیں یاد آ رہی تھیں۔ جب آتش دان میں آگ جلتی رہتی۔ اور وہ اس کے سامنے بیٹھ کر کتاب پڑھتی رہتی۔

ان دنوں زندگی کتنی پرسکون ہوا کرتی تھی لیکن اب سب خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ اب زندگی اس کے سامنے ایک بھیا تک اور بے رحم تعبیر کی طرح تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہ جنونی لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے سر پر آنے والے انجانے لمحات کی تلوار لگی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔

نیند کا ایسا شدید غلبہ اس پر پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیا ہو گیا تھا اسے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے اس وقت اس کے منہ میں کوئی دوا ڈکادی ہو جب وہ بے ہوش تھی۔ تاکہ ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ غافل ہو جائے۔ خداوند میری مدد کر۔ اس نے دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ کنواری مریم کے صدقے میرے اعصاب کو میرے قابو میں رکھ۔

لیکن اس کے اعصاب اس کے قابو میں نہیں رہ سکے۔ اس کی پلکیں بوجھل ہوتی چلی گئیں، ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

رانی کو یہ نیا کھیل مل گیا تھا۔ اب وہ اس انگریز لڑکی میری کی قبر پر نہیں جاتی تھی بلکہ میری کی ریکارڈنگ دیکھا کرتی۔ اس دوران وہ نوجوان فرحان اس کے پاس ہی ہوا کرتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے بہت کھل مل گئے تھے۔

جب فرحان کی ریکارڈنگ نہیں ہوتی تو اس وقت وہ رانی کو لے کر جنگلوں کی طرف نکل جاتا۔ اس نے رانی کو

بتایا تھا کہ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ شادی اسی وقت کرے گا جب اس کے معیار اور پسند کی لڑکی اسے مل جائے گی۔

”فرحان صاحب، یہ شاید بھی تو بہت اچھی ہے۔“ ”ہاں بہت اچھی ہے لیکن شوبز کی لڑکیوں کے ساتھ دوستی تو ہو سکتی ہے لیکن شادی نہیں ہو سکتی۔“ ”وہ کیوں۔“

”یہ بات شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن اتنا جان لو کہ وہ تمہاری طرح معصوم اور مخلص نہیں ہوا کرتیں۔ تم ایک خوبصورت پھول کی طرح ہو اور وہ سب اس پھول کی طرح ہیں جنہیں صرف گلدانوں میں سجایا جاتا ہے۔“

رانی کو اس کی باتیں بہت اچھی لگتیں۔ ایسی باتیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنیں۔ کسی نے نہیں کہیں اور شہر کا یہ خوبصورت نوجوان سگریٹ سلگانے کے دوران اس سے اسی قسم کی باتیں کیا کرتا۔

ماجس کی پہلی تیلی بجھا کر پھر دوسری تیلی سے سگریٹ جلاتے ہوئے وہ رانی کو بہت کچھ بتا دیتا۔ رانی اس کی باتوں کے سحر میں گم ہو جاتی۔

فرحان کو باتیں کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ اس نے شوبز کی دنیا میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ بے شمار لڑکیاں اس کے آگے پیچھے ہوا کرتیں لیکن رانی ان سبھوں سے مختلف تھی۔ بہت معصوم بہت خوبصورت۔ بہت تازہ۔

ایسے پھول کی طرح جس پر شبنم کے قطرے جھلملا رہے ہوں۔ ایک دن فرحان نے اس سے کہا۔ ”رانی، میں تمہارے بابا سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیسی بات۔“ ”ان سے اجازت لینی ہے تمہیں ساتھ لے جانے کی۔“ ”کیسی بات کرتے ہو بابو صاحب، کون باپ اس طرح اپنی بیٹی کو کسی کے ساتھ جانے کی اجازت دے گا۔“

”تم نہیں سمجھیں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“ ”کیا مطلب۔“

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ فرحان نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ چند لمحوں تک تو رانی کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ فرحان

میرا والا کیس

جناب معراج رسول
السلام علیکم!

پُر مزاح انداز میں، میں نے اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ اس کیس میں
میں کتنا کامیاب رہا اس کا نتیجہ تو تب سامنے آئے گا جب یہ
اصغر شاہ
کہانی چھپے گی۔
(شیخوپورہ)



نہیں گھورتیں۔ تھوڑا بہت لحاظ کر لیتی ہیں لیکن اس کے پاس
لحاظ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

میری رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔ دل
پھڑپھڑانے لگا اور نہ جانے کیا کیا ہونے لگا۔ پہلی دفعہ کوئی
لڑکی مجھے اتنے غور سے دیکھے جارہی تھی۔

پھر نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں
نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے مسلسل دیکھنے

شہادہ مجھے اچانک ملی تھی۔
عام طور پر لڑکیاں اچانک ہی ملتی ہیں۔ کسی دکان میں
کھڑی ہوتی۔ کسی پارک میں، کسی مارکیٹ میں۔ ادھر ادھر
کی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر پریم کہانی شروع ہو جاتی ہے۔

میں اس وقت بس اسٹاپ پر تھا۔ جب میں نے شہادہ
کو دیکھا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھے جارہی تھی... بلکہ
باقاعدہ گھور رہی تھی۔ لڑکیاں عام طور پر اتنی بے باکی سے

”تم کو یاد ہے بیٹا کہ یہ پودا میں ریٹ ہاؤس کے
لیے کہاں سے لایا تھا۔“
”ہاں بابا، یاد ہے مجھے۔ تم ایک بار شہر کے چھوٹے
وہاں سے لے کر آئے تھے۔“

”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے اس کی کتنی دیکھ بھال کی تھی۔“
”ہاں بابا، یاد ہے۔ لیکن یہ پودا مر جھاتا چلا گیا تھا۔“
”کیوں۔“

”اس لیے کہ اس کو یہاں کی آب و ہوا اس نہیں آئی
تھی۔“ رانی نے بتایا۔ ”جو پھول جہاں کا ہوتا ہے اس کو
وہیں رہنا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے بیٹا کہ تم نے میری بات سمجھ لی
ہوگی۔“ نورو نے کہا۔

رانی کی سمجھ میں اپنے بابا کی بات بہت اچھی طرح آگئی
تھی۔ اس کے بابا نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ جہاں کا پھول ہے
اس کو وہیں رہنا چاہیے۔ اپنے ہی ماحول میں۔ اپنے ہی لوگوں
کے آس پاس۔ ورنہ زندگی مر جھاکر رکھ دیتی ہے۔

☆☆☆
برسوں گزر گئے۔ اب میری کی قبر کے پاس ایک اور
قبر بھی تھی۔ وہ تھی رانی کی قبر۔ میری کو تو حریت پسندوں نے
اس جرم میں مار دیا تھا کہ اس نے رات کے وقت کیمن سے
فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

اور رانی اس لیے مر گئی تھی کہ فرحان سے محبت کے بعد
پورے علاقے میں اس کی بدنامی ہو گئی تھی۔ بستی کا کوئی بھی
نوجوان اسے اپنانے کے لیے راضی نہیں تھا۔

اس دکھ نے پہلے تو اس کے باپ نورو کی جان لے لی۔
پھر رانی نے بستی کے کنوئیں میں گر کر اپنی جان دے دی۔

بستی والوں نے اس کی لاش کنوئیں سے نکال کر میری
کی قبر کے برابر دفن کر دی تھی۔

فرحان کچھ دنوں تک پریشان اور الجھا ہوا رہا تھا۔ اس
کے بعد زندگی کی مصروفیات نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

جس وقت رانی کی قبر بنائی جا رہی تھی۔ اس وقت وہ
کسی ڈرامے کی ریکارڈنگ میں مصروف تھا۔

اب اس علاقے میں ریٹ ہاؤس سے ذرا آگے
صنوبر کے اونچے درختوں کے درمیان دو قبریں ہیں، ایک
بہت پرانی اور ایک بیس سال پہلے کی۔

دو پھول ایک ساتھ ہیں۔ دو کہانیاں ایک ساتھ ہیں۔

اس سے کیا کہہ گیا ہے۔ پھر جب فرحان کی بات سمجھ میں آئی
تو وہ شرما کر دھڑکی ہوئی۔

”بتاؤ رانی، کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟“
فرحان نے پوچھا۔

”بابو صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رانی نے
کہا۔ ”میرے اور آپ میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں
گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادی بغیر پڑھی لکھی لڑکی۔ جس
کی پوری دنیا اس گاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ خود
سوچیں۔ جبکہ بابو صاحب تم انجان نگر سے آئے ہوئے ہو۔
تمہارے پاس گاڑی ہے۔ بنگلا ہے، پڑھے لکھے ہو۔ تمہاری
اپنی زندگی ہے۔“

فرحان نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”بس
رانی... میں فلموں میں کام کے دوران اس قسم کی بہت
باتیں سن چکا ہوں۔ لیکن سچائی وہی ہے جو میں نے ابھی تم
سے بیان کی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کہاں کی ہو
اور میں کہاں کا ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے اور تمہاری کیا
حیثیت ہے۔ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ اصل بات
صرف اتنی ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں اور تم سے
شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن اس کے لیے تمہیں بابا سے ملنا ہوگا۔ اس سے
بات کرنی ہوگی۔“

”کیوں نہیں۔ میں تو خود بھی چاہتا ہوں۔“
رانی کے لیے بہت خوشی کی بات تھی۔ کوئی اس کے
قریب بہت قریب ہو گیا تھا۔ اسے اپنانے کی خواہش کر رہا
تھا۔ زندگی بھر ساتھ بھاننے کی باتیں کی تھیں۔

اس نے یہ خبر اپنے بابا کو سنا دی۔ اس کا خیال تھا کہ
اس کا باپ یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا۔ اس کی بیٹی شہر
جانے والی تھی۔ کوئی اس کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔
لیکن نورو خاموش خلا میں دیکھتا رہا تھا جیسے کچھ تلاش
کر رہا ہو۔

”بابا فرحان بہت اچھا ہے۔“ رانی نے کہا۔ ”وہ میرا
بہت خیال رکھے گا۔ وہ خود تم سے ملنا چاہتا ہے۔“
”بیٹا...“ کچھ دیر بعد نورو نے کہا۔ ”وہ دیکھ رہی ہو بیٹا،
وہ کیا ہے۔“

نورو نے جس طرف اشارہ کیا تھا، وہ پھولوں کا ایک
گملا تھا۔ جس میں کسی پھول کا پودا تھا جو مر جھاکر ایک طرف
لٹک گیا تھا۔

کے انداز نے مجھ میں بجلی سی بھردی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”محترمہ، کیا آپ مجھے جانتی ہیں۔“ میں نے بہت شائستگی سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ وہ بدستور مجھے دیکھ رہی تھی۔

”تو پھر آپ اس طرح مجھے کیوں گھور رہی ہیں۔“

”ہائے اللہ! میں تو کیورتوں کو دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”کیورتوں کو؟ کیا میں آپ کو کیورت دکھائی دے رہا ہوں۔“

”دیکھیں نا، کتنے کیورت ایک ساتھ اڑ رہے ہیں۔“

اس نے سگریٹ کے ایک کھوکھے کی طرف اشارہ کر دیا جس کے عقب میں بہت سارے کیورت نظر آرہے تھے۔

اور اس وقت پتا چلا کہ محترمہ بھینگی ہیں۔ یعنی ان کی

آنکھوں کے زاویے بہت مختلف ہیں۔ اگر وہ مشرق کی

طرف دیکھ رہی ہوں تو سمجھ لیں کہ وہ مغرب کو دیکھ رہی

ہیں۔ وہ کیورتوں کو دیکھ رہی تھیں اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان

کی نظریں میری طرف ہیں۔

”معاف کیجیے گا۔“ میں ایک شرمندہ سی مسکراہٹ

سے بولا۔ ”مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی دونوں آنکھیں

ایک دوسرے کی مخالفت کرتی ہیں۔“

”یہی تو براہم ہے۔“ اس نے کسی اور کی طرف

دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ جبکہ میں یہ جانتا تھا کہ وہ

مجھ ہی کو دیکھ رہی ہوگی۔ ”لوگ مجھے بھینگی سمجھتے ہیں۔ اب

آپ ہی بتائیں کیا میں بھینگی ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ کون کم بخت آپ کو بھینگی کہتا ہے۔ آپ

کی تو دونوں آنکھیں صراطِ مستقیم میں سفر کرتی ہیں۔ اور زاویہ

قائمہ بناتی ہوئی واپس آ جاتی ہیں۔“

”ہائے اللہ! آپ کتنے اچھے ہیں۔ میری ایسی

تعریف کسی نے نہیں کی ہوگی۔“

”اچھا۔ آپ ایک کام کریں۔ اپنی دونوں آنکھیں

بند کر لیں۔“

”کیوں؟ کیا آنکھ مچولی کھیلیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں تب مجھے

اندازہ ہوا کہ وہ اگر اپنی آنکھیں اسی طرح بند رکھے تو پھر

اچھی خاصی لڑکی ہے۔

لانا قد، بڑے بڑے بال، خوبصورت چہرہ، گورا

رنگ، بس بے چاری اپنی آنکھوں سے مار کھا گئی تھی۔ ورنہ

بہت سوں سے اچھی تھی۔

”اب کھول دوں آنکھیں؟“ اس نے مصیبت سے پوچھا۔

”ہاں کھول دیں۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پان کے کھوکھے کی

طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا دیکھا آپ نے؟“

آنکھیں کیوں بند کروانی تھیں۔“

”محترمہ، آپ برانہ مانیں تو میں یہ کہہ دوں کہ آپ

ایک خوبصورت لڑکی ہیں۔“

”ارے“ تو اس میں برامانے والی کیا بات ہے۔ وہ

جلدی سے بولی۔ ”آپ تو دل کے اتنے صاف معلوم

ہورہے ہیں۔ میں نے فرشتوں کی تعریف سنی ہے۔ شاید

آپ کی بھی وہی کیلگری ہے۔“

”ارے نہیں محترمہ، میں تو ایک گناہگار انسان

ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کون کون سے گناہ کیے ہوں گے آپ نے؟“

”یہ بہت لمبی لسٹ ہے۔ اب یہاں کھڑے کھڑے تو

نہیں بتا سکتا۔“

”تو چلیں، چل کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ اس نے

کہا۔ ”میرے پاس ابھی بہت وقت ہے۔ اب آپ کا

نہیں معلوم۔“

”میرے پاس بھی وقت ہے۔“ میں جلدی سے

بولا۔ ”چلیں، سامنے دل کشا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

دل کشا ہمارے سامنے ہی یعنی بس اسٹاپ کے

سامنے ایک مشہور ریسٹوران تھا۔ وہاں صرف چائے ملتی

تھی۔ اور وہ بھی تھرڈ کلاس۔ لیکن اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ

محبت کے مارے ہوئے اسی ریسٹوران میں آکر بیٹھا کرتے

تھے۔ چھوٹے چھوٹے کیمبن بنے ہوئے تھے جن پر پردے

کھینچ دیئے جاتے اور سڑی ہوئی چائے مہنگے داموں بیچ دی

جاتی تھی۔

”ہائے اللہ! میں نے تو سنا ہے کہ دل کشا میں

جوڑے جایا کرتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”جہاں دوٹل گئے وہاں جوڑا تو ہو ہی جاتا ہے۔

ویسے آپ کو اعتراض ہو تو رہنے دیں۔“

”نہیں نہیں، مجھے کیا اعتراض؟ میں تو یوں ہی کہہ

رہی تھی۔ ویسے میں بہت شرم و حیا والی لڑکی ہوں۔“

”آپ پان کے کھوکھے سے نظریں ہٹا کر میری

طرف دیکھیں نا۔“

”میں تو آپ ہی کو دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے

بتایا۔ ”اگر میں پان کے کھوکھے سے نظریں ہٹا کر آپ کو

دیکھوں تو پھر کیورت ہی دکھائی دیں گے۔“

”تو پھر رہنے دیں اس بحث کو آئیں چلتے ہیں۔“

اس طرح میں اسے دل کشا میں لے آیا۔ وہ

ریستوران جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں ٹھنڈی

سانس لیا کرتا تھا۔ یہ خواہش ہوتی تھی کہ کاش میرا بھی کوئی

ہوتا جسے میں پردے والی کیمبن میں لے جاسکتا۔

آج میں اسی ریسٹوران میں ایک ایسی لڑکی کو لے کر

جا رہا تھا جس کی آنکھیں دو طرفہ وار کیا کرتیں۔ دائیں طرف

کھڑا ہوا بھی گھائل ہو رہا ہے اور بائیں طرف والا بھی۔

ایک کیمبن خالی تھا۔ میں نے اندر بیٹھ کر پردہ برابر

کر دیا۔ وہ ازراہ تکلف میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی

تھی۔ ابھی میں اس سے کچھ پوچھنے بھی نہیں پایا تھا کہ کیمبن کی

دیوار پر ہلکی سی دستک کے ساتھ پیرے نے پردہ ہٹاتے

ہوئے پوچھا۔ ”جی صاحب، آرڈر دیں۔“

”ارے بھائی، تمہارے یہاں سوائے چائے کے

اور ہوتا ہی کیا ہے۔ جاؤ چائے لے آؤ۔“

”اچھا صاحب۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے اس لڑکی کی طرف

دیکھا۔ ”ہاں۔ اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے۔“

اس نے ابھی بتانا چاہا تھا کہ وہی میرا پھر نازل

ہو گیا۔ ”صاحب، چائے پھینکی جا رہے یا میٹھی۔“

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ ”جاؤ بھائی میٹھی

چائے لے آؤ۔“

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے

دوبارہ پوچھا۔ ”ہاں بھئی، تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

وہ کم بخت میرا پھر نازل ہو گیا۔ ”صاحب، آپ

لوگ چائے پیالیوں میں پیتے ہیں یا گلوں میں۔“

اب تو اس کم بخت کا گلا گھونٹنے کو دل چاہ رہا

تھا۔ ”خدا کے لیے کسی میں بھی لے آؤ۔“ میں دانت پیستے

ہوئے بولا۔

اس کے جانے کے بعد اس لڑکی نے اپنا نام

بتایا۔ ”شاہدہ۔ کیسا نام ہے؟“

”بہت خوبصورت۔“

”اب میں ایک بات کہوں۔ یہ براہم چائے لے

کر آئے تو اس کے ہاتھ میں دس کانوٹ رکھ دیجئے گا۔“ اس

نے بتایا۔

”وہ کیوں؟“

”پھر یہ بار بار آکر جھگ نہیں کرے گا۔“ اس نے

کہا۔ ”یہاں کا یہی دستور ہے۔“

”مہمیں کیسے معلوم۔“ میں نے شک بھری نگاہوں

سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری ایک سہیلی یہاں آتی رہتی ہے اس نے مجھے

یہ قصہ بتایا ہے۔“

میرا جب چائے لے کر آیا تو میں نے اس کے ہاتھ پر

دس کانوٹ رکھ دیا۔ وہ سلام کر کے دانت نکالتا ہوا چلا گیا تھا

اور اس کے اس انداز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ اب واقعی

بہت دیر تک اس طرف نہیں آئے گا۔

”چلیں، میں نے تو اپنا نام بتا دیا۔ اب آپ اپنا نام

بتائیں۔“ اس نے پوچھا۔

”میں عاجز ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”عاجز! یہ کیا نام ہے؟“

”یہ نام نہیں تخلص ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ میں

شاعر بھی ہوں۔“

”ہائے اللہ! تم شاعر ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ بھیک

بھی مانگتے ہو گے۔“

”بھیک؟“ میں اس بے تکی بات پر جڑبڑ ہو کر رہ

گیا۔ ”کیوں؟ میں بھیک کیوں مانگوں گا؟“

”میری اماں کہتی ہیں کہ یہ جو شاعر لوگ ہوتے ہیں

یہ بھیک مانگتے ہیں۔“

کیا میں تمہیں بھیک مانگنے والا لگ رہا ہوں۔“

”لگ تو نہیں رہے لیکن کیا بھروسہ! کب اٹھ کر مانگنا

شروع کر دو۔“

”بے وقوف، میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔“ میں

نے بتایا۔ ”اچھی تنخواہ ہے میری۔ شاعری تو میرا شوق ہے۔“

”ایک بات بتاؤں۔ میں نے بھی اماں سے چھپ

چھپ کر بہت شعر یاد کیے ہوئے ہیں۔ میری دوست کہتی ہے

کہ شاہدہ شاعری کے معاملے میں تیرا ذوق بہت اچھا ہے۔“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی۔ ”یہ تو بہت اچھی بات

ہے۔ چلو اپنی پسند کا کوئی شعر سناؤ۔“

”یہ جو دیوانہ پچھلی گلی میں کھڑا ہے وہ مجھے بہت اچھا

لگا ہے۔“ اس نے شعر سنا دیا۔

”کیا تھا یہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”شعر تھا۔ اور کیا تھا۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”میری اماں نے بتایا ہے کہ یہ شعر ہے۔“

”اگر تمہاری اماں نے بتایا ہے تو پھر شعر ہی ہوگا۔“

”اچھا عاجز صاحب‘ یہ سب باتیں چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ۔ بینک میں تمہارا اچھا کیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”اسٹنٹ ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”نہج ہونے والا تھا لیکن ایک دو آدی راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔“

”اچھا، کیسی رکاوٹ۔“

”رہنے دو‘ یہ سب دفتری معاملات ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم کچھ اور اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”نام تو بتائی چکی ہوں‘ شاہدہ۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔“

”اور تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے۔“

”میٹرک تک۔ اماں کہتی ہیں کہ لڑکیوں کے لیے اتنی ہی تعلیم بہت ہے۔“

”ایک بات بتاؤ‘ یہ سب باتیں تمہاری اماں ہی کیوں کہتی ہیں‘ ابا کیوں نہیں کہتے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ابا بھی وہی کہتے ہیں جو اماں کہتی ہیں۔“

”اور تمہارے ابا کرتے کیا ہیں۔“

”ان کا اپنا کاروبار ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر جھلا کر بولی۔ ”یہ تم کہاں اماں اور ابا کا چکر لے کر بیٹھ گئے۔ اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ۔“

”میرا اصل نام شہزاد ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”عاجز حقیقت ہے۔ والدین کی اور شہر میں ہیں اور میں یہاں اپنی قسمت بنانے کے لیے آیا ہوا ہوں۔“

”اور شادی۔ شادی تو ضرور ہوگئی ہوگی۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ شادی ضرور ہوگئی ہوگی۔“

”یہ لو‘ اس میں کون سی مشکل ہے۔ تم تو دیکھتے ہی میں تین چار بچوں کے باپ لگ رہے ہو۔“

”میں اس بات پر بھٹا کر رہ گیا تھا۔“ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔“ میں نے بتایا۔ ”نہج بننے کا انتظار کر رہا ہوں۔ نہج بننے ہی شادی کر لوں گا۔“

”اچھا۔ چلو‘ اب مجھے جانے دو۔ مجھے بہت دیر ہوگئی ہے۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”شاہدہ پھر کب ملوگی۔“

”کیا ملنا ضروری ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں بہت ضروری ہے۔ اس کے باوجود کہ تمہاری

آنکھیں مشرق اور مغرب کو ایک ساتھ گھیر لیتی ہیں۔ تم سے میرا ملتے رہنا اس لیے ضروری ہے کہ میری زندگی میں سب کچھ ہے سوائے کسی کی خوبصورتی اور نرم مسکراہٹ کے۔ کوئی تو ایسا ہو جو میرے لیے بے قرار ہو جایا کرے۔ جس کو سامنے بٹھا کر میں اپنے دل کی باتیں کہہ سکوں۔ کوئی تو ہو۔“

”سمجھ گئی۔“ وہ مسکرا دی۔ ”ویسے تم نے بہت جلدی ایسی بات کر دی۔ شاعر ہونا۔ اماں تو یہ بھی کہتی ہیں کہ یہ شاعر بہت بے شرم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”تمہاری اماں تو اس دور کی ارسطو معلوم ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ان سے ملاقات کرنی پڑے گی۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”وہ کیوں۔“

”اگر اماں کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں تم سے ملتی رہی ہوں تو میری کھال ادھڑ کر رکھ دیں گی۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت ہی سخت مزاج کی ہیں۔ پورا خاندان ان سے ڈرتا ہے۔“

”تو پھر ہم ایک دوسرے سے کیسے مل سکیں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں اس کے لیے کوئی راستہ نکال لوں گی۔ تم مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے کہ تمہارے پاس موبائل فون ہے۔“

”ہاں اماں نے دلویا تھا۔“ اس نے اپنے بیگ سے ایک قیمتی سامو بائل سیٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

”واہ! یہ تو بہت خوبصورت سیٹ ہے۔“

”ہاں‘ اماں نے میری سال گرہ پر دلایا تھا۔“

”کون سی والی سال گرہ۔“

”اماں کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو اپنی اصل عمر نہیں معلوم ہونا چاہیے۔“ شاہدہ نے کہا۔ ”اس طرح وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔“

”تو تمہیں اپنی اصل عمر نہیں معلوم۔“

”نہیں‘ اماں نے بھی ہوا ہی نہیں گلے دی۔“ اس نے کہا۔

”واقعی تمہاری اماں دنیا کی سب سے گریٹ اماں ہیں۔ چلو جب ملنے کی خواہش ہو تو خود فون کر لیتا۔“

”تو یہ بھی شاہدہ سے میری پہلی ملاقات۔“

”اس قسم کی حماقت بھری صحبتیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔ اچانک اسی پلاننگ کے بغیر۔ تو یہ محبت بھی اسی طرح شروع ہوئی تھی۔“

شاہدہ کی آنکھیں جا رہے کچھ بھی کہتی ہوں لیکن اس کا دل میرے لیے ہی دھڑکا کرتا تھا۔ اس کا تجربہ کئی بار ہو چکا تھا۔ میں نے اتنی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھنے والے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس وقت میرا موڈ کیا ہے۔ میں خوش ہوں یا پریشان ہوں، میری پسند اور ناپسند کیا ہے۔

دو چار ہفتوں کے بعد ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ شاہدہ میرے لیے ناگزیر ہو چکی ہے۔ میں شاید اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔

ایک شام ہم پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں پھولوں کے ایک پودے پر مرکوز تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ”شاہدہ ذرا میری طرف دیکھو۔“

”میں آپ ہی کو تو دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”تب خیال آیا۔ اوہو اس کے ساتھ کیا پر اہلم ہے۔ اس وقت کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا تھا۔“

”ہاں اب بتائیں کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”تم نے اتنے دنوں میں مجھے کیا پایا۔“

”بہت اچھا۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ جس سے آپ کی شادی ہوگی وہ زندگی بھر خوش رہے گی۔“

”تو یہ خوشی تم کیوں نہیں حاصل کر لیتیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ اچانک اداس ہوگئی۔ ”کاش! ایسا ہو سکتا۔“

”کیوں‘ کیوں نہیں ہو سکتا۔“

”اماں اپنی بہن کے لڑکے سے میرا رشتہ کرانے کا سوچ رہی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”نہیں شاہدہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میری محبت کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“

”تو پھر اس کے لیے آپ کو اماں کو منانا ہوگا۔ ان سے ملاقات کرنی ہوگی۔ اگر انہوں نے ہاں کر دی تو سمجھیں پھر میں آپ کی ہوگئی۔“

”تم تو یہ کہتی ہو کہ تمہاری اماں بہت سخت مزاج کی ہیں۔ میں ان سے نہیں مل سکوں گا۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”پھر کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پر جوش ہوگئی تھی۔ ”ہاں ایک راستہ ہے اماں کو موم کرنے کا۔ اماں بالکل پھل جالمیں گی۔“

”جلدی بتاؤ‘ کیا راستہ ہے۔“

”تم صراحی والے بابا کے پاس چلے جاؤ۔“ اس نے بتایا۔

”صراحی والے بابا‘ یہ کون صاحب ہیں۔“

”بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔“ شاہدہ نے کہا۔ ”صرف دو بار ان کی خدمت میں حاضری کی ضرورت ہوتی ہے۔ تیسری بار میں کام ہو جاتا ہے۔“

”لیکن وہ صراحی والے بابا کیوں ہیں۔“

”اس لیے کہ وہ ہر وقت صراحی سے پانی پیتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کو صراحی والے بابا کہا جاتا ہے۔“

”تم کیوں ان چکروں میں رہتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب بے کاری کی باتیں ہیں۔“

”بے کاری کی باتیں نہیں ہیں‘ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں خود اس بات کی گواہ ہوں کہ انہوں نے میرے کئی جاننے والوں کے ایسے کام کر دیے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

پھر اس نے کاموں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور اس ملاقات کے اختتام تک میں اس بات پر یقین لا چکا تھا کہ اس ملک میں اگر کوئی بزرگ ہیں تو وہ صراحی والے بابا ہی ہیں۔

شاہدہ نے مجھے ان کا پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم ان سے مل کر صرف یہ خواہش کرنا کہ میری اماں راضی ہو جائیں۔ تم ایک بار ان سے ملاقات کر لو۔ اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔“

صراحی والے بابا کا آستانہ ایک بہت ہی نامعقول مقام پر تھا۔

آستانہ دو عدد کمر در پر مشتمل پر تھا جس کے سامنے ایک بڑا سا نالہ بہہ رہا تھا اور اس نالے میں پانی کی بجائے کچرے کے ڈھیر تھے۔

آستانے کے آگے کسی مویشی والے کے مویشی بھی بندھے ہوئے تھے۔

میں جس وقت صراحی والے بابا کے آستانے کے اندر پہنچا۔ اس وقت بھی ان کے پاس دو چار کلائٹ موجود تھے اور وہ خود صراحی سے پانی ڈھال کر پی رہے تھے۔

میں بھی ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ صراحی والے بابا پچاس پچپن کی عمر کے ایک صحت مند شخص تھے۔ انہوں نے صراحی اٹھا کر فضا میں کسی کو مخاطب کیا۔ ”ارسا نوس، صراحی خالی ہوگئی ہے۔ شام تک پانی لے آنا۔“

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک آدی نے جھومنا شروع کر دیا۔ بابا اس وقت کسی کلائٹ کی طرف متوجہ تھے۔

میں نے اس جھوٹے والے سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”بھائی“
یہ بابا نے کس سے پانی منگوا یا ہے۔“
اس آدمی نے مجھ پر ایک حقارت بھری نگاہ ڈالی جیسے میری
جہالت پر ناراض ہو رہا ہو۔ پھر دھیرے سے بتایا۔ ”اپنے موکل
سے۔ وہ روزانہ ان کے لیے صراحی بھر کر لاتا ہے۔“
”کہاں سے لاتا ہے۔“
”زم زم کا پانی ہے بے وقوف۔“
”سمجھ گیا۔ جس طرح بہت سے دولت مند وغیرہ منزل
واثر پیا کرتے ہیں اسی طرح بابا زم زم کا پانی پیتے ہیں۔“
”ہاں۔ ان کے لیے روزانہ صراحی آتی ہے۔“
مجھ پر بابا کا رعب جسے لگا تھا۔ اس کلائٹ سے فارغ
ہو کر بابا نے میری طرف توجہ کی۔ ”شاید تم پہلی بار میرے
پاس آئے ہو۔“
”جی سرکار۔“ میں نے کہا۔ ”ایک غرض سے حاضر
ہوا ہوں۔“
”یہاں غرض کے بندے ہی آتے ہیں۔“ بابا نے
ارشاد فرمایا۔ ”نام کیا ہے تمہارا۔“
”عاجز۔“ میں نے اپنا تخلص بتا دیا۔
”ہوں۔“ بابا نے ایک گہری سانس لی۔ ”عاجز ہی
معلوم ہوتے ہو۔ اب کچھ مت بتانا۔ میں اپنے موکل سے
معلوم کر لیتا ہوں۔“
بابا نے پھر خلا میں کسی کو مخاطب کیا۔ لیکن اس بار
اشاروں میں مخاطب کیا تھا۔ ادھر سے بھی اشاروں میں ہی
جواب ملا ہوگا۔ بابا نے پھر کچھ اشارے کیے۔ پھر شاید کوئی
جواب ملا۔ پھر بابا نے میری طرف دیکھا۔ اس بار ان کے
ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ تھی۔ ”دل کا معاملہ سمجھ کر لایا
ہے نا۔“
”جی۔ جی بابا۔“ میں اب ان کا قائل ہو چلا تھا۔
”بہت ہی بے رحم۔ بہت ہی سخت مزاج کی ہے۔“
بابا نے فرمایا۔ ”تم یہی چاہتے ہو نا کہ اس کی ماں مہربان
ہو جائے اور وہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دے تاکہ
تم اس لڑکی کو حاصل کر سکو۔“
”جی ہاں بابا۔“ میں تو اب پوری طرح ان کا قائل
ہو گیا تھا۔
”بہت ہی سخت مزاج کی عورت معلوم ہوتی ہے۔“
بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور جیسے اپنے آپ سے
بول رہے تھے۔ پھر آنکھیں کھول کر میری طرف

دیکھا۔ ”جاؤ“ جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی سے
آجاؤ۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“
”بابا! یہ جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی کہاں سے
لاؤں؟“
”کہیں سے بھی لاؤ۔ یہ تمہارا معاملہ ہے۔“ بابا نے
کہا۔ ”میں نے تو علاج بتا دیا ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں
میرے پاس آجائیں گی تو عمل کروں گا۔“
میں نے نذرانے کے طور پر جب کچھ دینے کو کہا تو بابا
نے سختی سے منع کر دیا۔ ”نہیں“ ہرگز نہیں۔ میں کسی سے ایک
پیسہ نہیں لیتا۔ خدمت خلق کے لیے بیٹھا ہوں۔ اب تم
جاؤ یہاں سے۔“
میں دل ہی دل میں ان کا قائل ہوتا ہوا اس کو ٹھوڑی
سے باہر آ گیا۔ جہاں ایک درخت کے سائے میں ایک آدمی
بیٹھا ہوا بہت غور سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے
اشارے سے مجھے اپنی طرف آنے کے لیے کہا۔ میں جب
اس کے پاس پہنچا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بابا سے
مل کر آ رہے ہونا۔“
”ہاں بھائی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔
”واقعی بہت کمال کے آدمی ہیں۔“ اس نے
کہا۔ ”میں نے تو ایسے ایسے کام ہوتے ہوئے دیکھے ہیں کہ
حیران ہو جاتا ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے
کہ بہت عجیب و غریب چیزیں لانے کے لیے کہہ دیتے ہیں۔“
”تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔“ میں نے اس کی تائید
کی۔ ”مجھ کو بھی انہوں نے جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی
لانے کو کہا ہے۔“
”بس یہ سمجھ لو کہ اگر تم نے یہ دونوں چیزیں لا کر دے
دیں تو تمہارا کام بن گیا۔“
”لیکن لاؤں کہاں سے۔“
”تم اس کی فکر مت کرو۔ میں یہاں کس لیے بیٹھا
ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم جیسے ضرورت مندوں کی مدد
کرنے کے لیے اس قسم کے مال سپلائی کرنے کا بہت پرانا
تجربہ ہے میرے پاس۔“
”واقعی۔“
”ہاں“ اگر کہو تو خود بابا سے پوچھو اودوں۔“ اس نے
کہا۔ ”بابا اچھی طرح جانتے ہیں مجھے۔“
”ہاں“ میرا یہ کام کر دو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“
”لیکن میں صرف مہربانی اور ثواب کے لیے یہ نہیں

کرتا ہوں۔“ وہ روکھا سامنے بنا کر بولا۔ ”بلکہ اس میں محنت
لگتی ہے۔ وقت برباد ہوتا ہے۔ اور مال بھی ایک نمبر دینا
ہوتا ہے۔“
”ایک نمبر مال سے کیا مراد ہے؟“
”یعنی ایسا چوہا اور ایسا گیدڑ جو بھی بیمار نہ پڑا ہو۔“
اس نے بتایا۔
”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ بیمار پڑا ہے یا نہیں۔“
”یہی تو فن ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”پچھلے پندرہ برسوں
سے یہی کام کر رہا ہوں۔ اب اتنا بھی تجربہ نہ ہو تو لعنت ہے
مجھ پر۔“
میں نے اسی دوران اس شخص کو دیکھا جو بابا کے پاس
بیٹھا ہوا جھوم رہا تھا۔ اس آدمی نے جھومنے والے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ بابا کا خاص بندہ ہے“ اگر تم
کہو تو میں اس سے اپنے بارے میں پوچھو اودوں۔“
”نہیں بھائی“ مجھے تم پر یقین ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس
پر خرچہ کتنا ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔
”صرف تین ہزار۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہارے لیے
رعایت کر رہا ہوں کہ تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن
ضرورت مند بھی ہو۔“
”یہ بات تو ہے ضرورت مند تو ہوں۔“
”تو پھر نکالو تین ہزار۔“
”یہ اتفاق ہے کہ میں تین ہزار ہی لے کر آیا تھا۔ وہ
میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔“
”اب تم دونوں کے بعد آ جانا۔“ اس نے پیسے
جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔
میں نے واپس آ کر شاہدہ کو فون پر ساری کہانی
سنائی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ”اچھا ہوا تم میری
بات مان کر بابا کے پاس چلے گئے اب خود دیکھ لینا اماں کیسے
تم پر مہربان ہوتی ہیں۔“
”اگر ایسا ہو گیا نا تو میں صراحی والے بابا کا چیلہ بن
جاؤں گا۔“
”خیر“ اب اتنا زیادہ مت پھیلو۔ اپنا کام نکلواؤ۔“
اس دوران شاہدہ سے میری ملاقات بھی نہیں ہو سکی
اور میں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں تو صراحی والے
بابا کے عمل کا رزلٹ دیکھنا چاہتا تھا۔
اس دوران میں ایک بار پھر بابا کے آستانے کی
طرف چلا گیا۔ وہ آدمی اس درخت کے نیچے موجود تھا۔ مجھے

دیکھ کر وہ ہرجوش ہو کر بولا۔ ”ارے بھائی کہاں چلے گئے
تھے۔ میں تو کل سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“
”خیریت؟“
”ہاں ہاں تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“ اس
نے کہا۔ ”تمہارا مال تیار ہے۔“ اس نے ایک طرف رکھا ہوا
ایک پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو“ اس میں چوہے کی
کھال اور گیدڑ کی چربی ہے۔“
وہ پیکٹ پوری طرح پیک تھا۔
اب اس کو جا کر بابا کو دے آؤ۔ اور بابا کو یہ مت بتانا
کہ یہ سب کچھ تم نے مجھ سے لیا ہے۔ بلکہ ان سے کہنا کہ
یہ تم نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔“
”اگر بابا نے تفصیل پوچھ لی تو۔“
”وہ کچھ نہیں پوچھیں گے۔ ویسے بھی اس بڑھے کو آم
سے مطلب ہے“ وہ ہنسنے لگا۔
میں اس کا شکریہ ادا کر کے بابا کے آستانے میں داخل
ہو گیا۔ بابا کے پاس اس وقت بھی ایک کلائٹ موجود تھا اور
بابا صراحی سے پانی ڈھال کر پی رہے تھے۔
میں نے وہ پیکٹ بڑے ادب کے ساتھ ان کے
سامنے رکھ دیا۔ ”بابا۔ اس میں چوہے کی کھال اور گیدڑ کی
چربی ہے۔“
”ٹھیک ہے“ اب تم جاؤ۔ آج رات سے میں اپنا عمل
شروع کروں گا۔ اور چاروںوں میں اس کا رزلٹ دیکھ لینا۔“
بابا نے ان دونوں چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں
پوچھا تھا۔ میں ان کے آستانے سے باہر آ گیا۔
اور ٹھیک تیسرے دن سے بابا کے عمل نے اپنا کام
دکھانا شروع کر دیا۔ میں اپنے محلے کی ایک دکان سے باہر
نکل رہا تھا کہ شاہدہ سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔
اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔
ہم اس طرح سامنے آئے تھے کہ کترا کر نکل بھی نہیں
سکتے تھے۔
”ارے عاجز صاحب آپ۔“ شاہدہ حیرت سے
بولی۔ پھر اس نے اس عورت سے کہا۔ ”اماں! یہ عاجز
صاحب ہیں۔ میں نے کل آپ کو بتایا تھا نا۔“
میرا خیال تھا کہ وہ خراشت عورت پھٹ پڑے گی۔
مجھے پچاس باتیں سنا کر رکھ دے گی۔ لیکن اس کا رویہ حیرت
انگیز تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ”اچھا اچھا“ عاجز میاں۔ شاہدہ
تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔“

”وہ مارا۔“ میں نے اپنے دل میں نعرہ لگایا۔ بابا کے عمل نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔
شہادہ کے ہونٹوں پر بھی ایک معنی خیزی مسکراہٹ تھی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ دور کھڑی گاڑیوں کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن دراصل وہ مجھ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے زاویے ہمیشہ دھوکا دیتے تھے۔
”بیٹا، کبھی ہمارے گھر بھی تو آؤ۔“ شہادہ کی ماں نے کہا۔

”جی جی ہاں۔“ میں واقعی اس کامیابی پر بوکھلا سا گیا تھا۔ ”کبھی شہادہ لے کر چلیں تو ضرور حاضر ہوں گا۔“
”جیتے رہو۔ تم واقعی پیارے بچے ہو۔“ اس عورت نے مانتا بھرے انداز میں کہا۔

میں باغ باغ ہو کر رہ گیا۔ قائل ہو جانا پڑا کہ جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے۔ صراحی والے بابا زندہ باد۔
شہادہ اور اس کی ماں آگے بڑھ گئیں۔

اس شام جب شہادہ کا فون آیا تو وہ بھی بہت پرجوش اور خوش تھی۔ ”عاجز، کمال ہو گیا۔ اماں تو اب ہر وقت تمہارا ہی ذکر کرتی رہتی ہیں۔“
”کیا کہتی ہیں۔“

”یہی کہ بہت پیارا لڑکا ہے۔ صورت سے اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ اب تو وہ منور کا نام بھی نہیں لیتیں۔“
”کون منورا؟“

”وہی میرا خالہ زاد۔ اماں کی بہن کا لڑکا۔ اب جو کچھ ہو وہ تم ہی ہو۔“

”اس کے لیے ہمیں بابا صراحی والے کا شکریہ ادا کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نذرانہ لے کر جاؤں گا ان کے پاس۔“
”نہیں نہیں اب مت جانا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بابا کے اصول کے خلاف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عمل کو لوٹا دیں۔“
”وہ کیوں۔“

”وہ پسند نہیں کرتے کہ کام ہو جانے کے بعد کوئی ان کی طرف لوٹ کر آئے۔ وہ شکریہ وغیرہ ادا کرنے کو برا سمجھتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں اس کو۔“

”یہ تو ان کی عظمت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ اگر میں کسی اور کو بھی بھیجوں تو اس کا کام ہو جائے گا۔“
”کیوں نہیں۔ ان کا آستانہ تو ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے۔ لیکن کس کو بھیجوں گے۔“

”میرے بینک میں ہی ہے ایک۔“ میں نے بتایا۔ ”بے چارہ کسی سے عشق کر رہا ہے لیکن لڑکی کے گھر والے تیار نہیں ہیں۔“
”ضرور بھیجو۔“ شہادہ نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس کا بھی کام بن جائے۔ جس طرح تمہارا بھتیجا جا رہا ہے۔“
دوسرے دن میں نے اپنے بینک کے ساتھی ساجد سے پوچھا۔ ”ہاں بھائی، تمہارا عشق کس مرحلے میں ہے۔“
”یار، کچھ مت پوچھو۔ عشق تو کامیاب ہے لیکن اس کی ماں راستے کی دیوار بنی ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”بہت ہی خونخوار قسم کی عورت ہے۔“
”بالکل میرا والا کیس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب اس کی ماں بالکل راستے پر آگئی ہے۔“
”وہ کس طرح بھائی، یہ طریقہ مجھے بھی بتا دو۔“

”صراحی والے بابا۔“ میں نے بتایا۔ ”ان کی خدمات حاصل کرلو۔ سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔“
”کہاں ہیں یہ صراحی والے بابا۔“

”میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔“ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔“
”تو میں چلا جاؤں ان کے پاس۔“

”ہاں چلے جاؤ۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“
دو دن کے بعد ساجد نے بتایا۔ ”یار، یہ سمجھو میرا کام بن گیا۔ صرف تین ہزار خرچ ہوئے۔“
”وہ کس طرح۔“

صراحی والے بابا نے جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی لانے کے لیے کہا تھا۔ پھر وہیں آستانے کے باہر بیٹھے ہوئے ایک بندے نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔“

”بالکل میرا والا کیس۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا شاید صراحی والے بابا محبوباؤں کی ماؤں کو رام کرنے کے لیے جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی کا استعمال کرتے ہیں۔“
”ہو سکتا ہے یار، لیکن اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔“

ساجد نے بتایا۔
”وہ کس طرح۔“

”اس کی ماں مہربان ہونا شروع ہو گئی ہے۔ میں ایک دکان سے غلامان خرید رہا تھا کہ دونوں ماں بیٹی اتفاق سے مل گئیں۔“
”بالکل میرا والا کیس۔ پھر کیا ہوا؟“
”ہونا کیا ہے۔ اس کی ماں بہت محبت سے ملی اور

گھر آنے کی دعوت دی ہے۔“
اب میں تھوڑا سا کھٹک گیا تھا۔ ”ایک بات بتاؤ، نام کیا ہے اس لڑکی کا؟“ میں نے پوچھا۔
”شہادہ۔“

میرا سر گھوم کر رہ گیا۔ بالکل میرا والا کیس تھا۔ میں جس دورخی آنکھوں والی لڑکی کے لیے پاگل ہو رہا تھا، اس کا بھی نام شہادہ تھا۔

مزید کنفرم کرنے کے لیے میں نے اس سے پھر پوچھا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ اس لڑکی کی آنکھیں کیسی ہیں۔“
”اس کی آنکھوں میں ہی تو خصوصیت ہے۔ وہ بے چاری مشرق کی طرف دیکھے تو لگتا ہے مغرب میں دیکھ رہی ہے۔“

بالکل میرا والا کیس۔ اور ساجد کی محبوبہ بھی وہی تھی جو میری تھی۔ یعنی وہ لڑکی ہم دونوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ میں نے ساجد سے تو کچھ نہیں کہا لیکن شہادہ کو فون کیا۔ ”ہاں شہادہ کیسی ہو تم؟“
”بالکل ٹھیک۔“

”اور اماں کا کیا حال ہے۔“
”بس وہ دن رات تمہارے ہی گن گاتی رہتی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”سنو کیا تم کچھ دیر کے لیے میرے پاس آ سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس کچھ پیسے آگئے ہیں میں تمہاری اماں کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ خریدنا چاہتا ہوں تم آ کر پسند کرلو۔“

”ارے واہ! یہ تو بہت زبردست بات ہوگی۔ کہاں آ جاؤں۔“
”اسی ریسٹوران میں جہاں ہم ملا کرتے ہیں پہلے کچھ کھائیں گے اس کے بعد مارکیٹ چلے جائیں گے۔“
”ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔“

وہ اسی ریسٹوران میں آگئی جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ کیمین والے پارہہ ریسٹوران میں جہاں شریف لڑکیاں شریف لڑکوں کے ساتھ آکر بیٹھا کرتی ہیں۔ ہم بھی ایک کیمین میں آکر بیٹھ گئے۔

اس نے بیٹھتے ہی اپنی اماں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”وہ اب بہت مہربان ہو گئی ہیں۔ ان کے مزاج کی سختی نہ جانے کہاں چلی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔“
”ویسے تمہاری اماں آج کل ساجد پر بھی بہت مہربان ہو رہی ہیں۔“ میں نے اچانک بم پھینک دیا تھا۔

”ساجد، کون سا جادو؟“ وہ چونک گئی تھی۔
”وہی، جو میرے ساتھ بینک میں کام کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اس جیسے نہ جانے کتنے ساجد ہوں گے۔ جنہیں تم نے گھیر کر صراحی والے بابا کے پاس بھیجا ہوگا۔“
اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔
”بتاؤ، کیوں کرتی ہو ایسا۔“ میں نے پوچھا۔ ”صراحی والے بابا سے تم دونوں ماں بیٹی کتنی کیشن لیتی ہو۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
”کیوں؟ ان کے لیے اتنی محنت کرتی ہو اور ان سے کچھ وصول نہیں کرتیں۔“

”صراحی والے بابا میرے ابا ہیں۔“ اس نے بتایا۔ سارا کھیل سمجھ میں آ گیا۔ شہادہ فراڈ تھی، اس کی ماں فراڈ تھی، اور وہ آدی فراڈ تھا جو جو ہے کی کھال اور گیدڑ کی چربی دیا کرتا تھا۔

اس طرح یہ سب مل کر دن بھر میں نہ جانے کتنا کمالیتے ہوں گے۔
شہادہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی تھی۔

”دیکھو میری طرف۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ کیا تمہارے اماں اور ابا مجھ سے تمہاری شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“
”شادی؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔ ”تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”ہاں۔“
”یہ جان لینے کے بعد بھی کہ ہم فراڈ ہیں۔“
”ہاں، اس کے بعد بھی کیونکہ اس ملازمت میں کچھ نہیں رکھا۔“ میں نے کہا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم آج جو کام اپنے باپ کے لیے کر رہی ہو شادی کے بعد اپنے شوہر کے لیے نہیں کر سکتیں۔“
”عاجز۔ تم۔۔۔۔۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔“

”ہاں یار، میں تمہارے ابا کا داماد بن کر ان سے یہ ہنر سیکھ کر اپنا آستانہ بنالوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم میرا ساتھ دوگی۔“
”کیوں نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔



مہربانی

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!

انسان خوش فہمی میں بہت سے منصوبے خود گھڑ لیتا ہے۔ میں نے بھی خوش فہمی میں کچھ خواب دیکھ لیے تھے اور آنکھ کھلی تو..... میری آپ بیتی کو ضرور شائع کریں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

عافیہ
(کراچی)



شادی ہو گئی ہے۔ میں آج کل میں ٹیوٹر کے لیے اخبار میں Add دینے والا تھا۔ تم آگئی ہو تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔
”ضرور پڑھاؤں گی سر۔“
”گڈ، پانچ ہزار روپے لیں گے۔“ اس نے بتایا۔
میرے لیے یہ ایک اچھی خبر تھی۔ میں تو جاب کی تلاش میں آئی تھی جس میں سارا دن مصروف رہنا پڑتا ہے اور یہاں صرف ایک دو گھنٹوں کے پانچ ہزار مل رہے تھے اور مجھے اس کا تجربہ بھی تھا۔

”بتاؤ، کیا سوچ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”جناب، میں تیار ہوں لیکن مجھے کہاں اور کس وقت آنا ہوگا۔“
”میں تمہیں ایڈریس لکھ کر دے دیتا ہوں۔ تم آسانی سے پہنچ سکتی ہو۔ میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔“
اس نے مجھے ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ میں نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر لیا۔ گھر پہنچی تو امی گھر پر نہیں تھیں۔ بازار گئی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور چکن میں آکر چائے بنانے لگی۔

میری بھی کیا زندگی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی اپنی اپنی جگہ بالکل تنہا ہو کر رہ گئے تھے۔ زندگی تو پہلے بھی دشوار تھی لیکن ابو کی موت نے اسے اور بھی دشوار بنا دیا تھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اسی لیے بہت پیار سے رکھا گیا تھا۔ خدا نے مجھے خوبصورتی بھی دے دی تھی، نہ جانے کیوں۔ میرا خیال ہے کہ غریبوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ غلط قسم کی نگاہیں ان کی زندگی دشوار کر دیتی ہیں۔

خوبصورتی، حُسن، اچھے کپڑے، قیمتی زیورات، میک

پہلی ہی ملاقات میں نے اسے پسند کر لیا تھا۔ وہ ایک ذہین اور خود اعتماد آدمی تھا۔ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں گفتگو کرنے والا۔ حالانکہ اس کی عمر مجھ سے کہیں زیادہ تھی اس کے باوجود میں نے اس کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں اس کے دفتر میں اپنی جاب کے سلسلے میں گئی تھی۔
میں نے اپنی سی وی اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ ”یہ میری C.V ہے سر۔“ میں نے بتایا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔
”کیونکہ میرے دفتر میں فی الحال کوئی گنجائش نہیں ہے۔“
”میں تو بہت امیدوں سے آپ کے پاس آئی تھی۔“
”دیکھو موس عافیہ“ میں ان میں سے نہیں ہوں جو خواجواہ تمہیں آسے دے کر دوڑاتا رہوں اور تم یہاں آتے جاتے پریشان ہو جاؤ۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تمہیں صاف صاف کیوں نہ بتا دوں۔“

”آپ کی یہ بات اچھی لگی سر۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہر حال اب آپ کو زحمت نہیں دوں گی۔ جانے لگی تھی کہ اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔“ عافیہ
”میں ایک بات سنیں۔“
”یس سر۔“ میں رک گئی تھی۔

تم یہ بتاؤ کیا تمہیں ٹیوشن پڑھانے کا تجربہ ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں سر، میں اب تک ٹیوشن ہی پڑھاتی رہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کیا تم میرے گھر آکر میرے بچے کو پڑھا سکتی ہو۔“ اس نے پوچھا، پھر بتایا۔ ”اس کی جو نیچر تھیں ان کی

کے گھر جا کر پڑھانا پڑے گا۔“
امی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ پھر کچھ دیر بعد کہا۔ ”بیٹا، خدا جانے وہ کیسے لوگ ہیں۔“

”امی، بظاہر تو اچھا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن اب زندگی گزارنے کے لیے اتنا رسک تو لینا ہی ہوگا۔ گھر بیٹھے ہوئے کون دے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہی تو وہ مجھے اپنی فرم میں بھی رکھ لے۔“

امی کو میں نے راضی کر ہی لیا تھا۔
دوسری شام کو میں اس ایڈریس پر پہنچ گئی۔ بہت بڑا اور خوبصورت مکان تھا اس شخص کا۔ عام فہم نام تھا اس کا۔ اس وقت وہ گھر پر ہی موجود تھا۔ اس کے ملازم نے شاندار ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔

میں نے اپنی زندگی میں آسائش کی اتنی چیزیں نہیں دیکھی ہوں گی جتنی اس ایک ڈرائنگ روم میں دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد عام ایک خوبصورت پیارے سے بچے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ ”عافیہ، یہ ہے

اپ، گاڑیاں، جہنازیم وغیرہ۔ یہ سارے چوچلے امیروں کے ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کیا ہوتا ہے سوائے چھوٹے سے گھر اور چوہے کے۔“

میرے پاس باہر آنے جانے کے قابل صرف دو ہی جوڑے تھے۔ ان ہی کو پہن کر انٹرویو وغیرہ کے لیے جایا کرتی اور واپس آکر بہت احتیاط سے اتار کر رکھ دیا کرتی۔

لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ میں چاہے جس رنگ کا لباس پہنوں، چاند کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ میری امی بھی ایسی ہی ہیں۔ میری ہی طرح خوبصورت اور دل کش۔ وہ میری ماں معلوم ہی نہیں ہوتیں بلکہ دیکھنے والے ہم دونوں کو ہمیشہ سمجھا کرتے ہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی اور امی بازار سے سودا وغیرہ لے کر واپس آ گئیں۔ میں نے اتنی دیر میں چائے بنالی تھی۔ ایک پیالی ان کے سامنے رکھ کر میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”امی، جاب تو نہیں مل سکی لیکن خدا نے ایک وسیلہ اور پیدا کر دیا ہے۔“

”وہ کیا ہے۔“
”میں جہاں جاب کے لیے گئی تھی، اس فرم کے باس کے بیٹے کی ٹیوشن مل گئی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس

تمہارا اسٹوڈنٹ۔“ عامر نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اب اس کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“

”بیٹے نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے بچے سے پوچھا۔ ”آصف۔“ بچے نے مہذب انداز میں جواب دیا۔

اس دوران میں ملازم چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگیا تھا۔ ”عامر صاحب! آپ نے اتنی زحمت کیوں کی۔“

”میں نے نہیں، کریم خان نے کی ہے۔“ عامر نے ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ویسے بھی تمہارا پہلا دن ہے۔ کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔“

میں نے بچے سے دو چار باتیں کیں تو اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت ذہین اور مہذب بچہ ہے۔ میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس بچے کی ماں کہاں ہے۔ کیا اس کا انتقال ہو گیا ہے یا عامر اور اس کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے یا کوئی اور بات تھی۔

بہر حال پہلے دن یہ سب باتیں معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس دن ہم صرف باتیں کرتے رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ موسم، سیاست، فلمیں، اور نہ جانے کیا کیا۔ شاید عامر یہ چاہتا تھا کہ میں اس گھر کے ماحول سے مانوس ہو جاؤں۔

اس دن میں تقریباً ایک گھنٹے بیٹھ کر واپس آگئی تھی۔ میں نے امی کو پوری رپورٹ دے دی تھی۔ انہیں بھی شاید اطمینان ہو گیا ہوگا کہ میں صحیح جگہ جا رہی ہوں۔

میں نے آصف کو پڑھانا شروع کر دیا۔ مجھے چونکہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ اسی لیے بالکل وقت پر پہنچ جایا کرتی۔ ایک بار عامر نے مجھ سے کہا۔ ”عافیہ“ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میں آگے بڑھنے کے امکانات ہیں۔ کیونکہ تم وقت کی پابند لڑکی ہو۔“

”شکریہ سر۔“

آصف پوری طرح میرے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ اسے پڑھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دن اس گھر میں کسی لڑکی کی آواز سنی۔ وہ کسی ملازم پر ناراض ہو رہی تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اس گھر میں عامر، آصف اور کریم کے علاوہ کسی اور کی موجودگی محسوس کی تھی۔

وہ کون ہو سکتی تھی۔ شاید آصف کی امی لیکن آصف کی امی ہوتی تو وہ ضرور سامنے آتیں۔ عام طور پر مائیں ہی اپنے بچوں کی ٹیوٹرز وغیرہ کو ہدایات دیا کرتی ہیں۔ تو پھر یہ

کون ہو سکتی تھی۔ بہر حال جو بھی ہو میرا اس سے کیا واسطہ تھا

لیکن ایک کریدی ضرور لگ گئی تھی۔ ایک شام وہی لڑکی اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں میں آصف کو پڑھایا کرتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ خوبصورت اور اشککش۔

اس نے آصف کے بارے میں ایک دو سوالات کیے پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی پتہ نہ تھا۔ میں نے جب آصف سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی پھوپھی تھی۔ یعنی عامر کی بہن۔ حالانکہ عامر سے میرا ایسا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ایسا لگا جیسے سینے سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں خود کو ہلکی ہلکی محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک شام ایسا ہوا کہ جب میں آصف کو پڑھانے کے لیے گئی تو عامر پہلے سے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”محترمہ، آج آصف میاں کی چھٹی ہے کیونکہ ہم آؤنگ پر جا رہے ہیں۔ یہ بہت دنوں سے ضد کر رہا تھا۔“

”ٹھیک ہے سر، تو پھر میں چلتی ہوں۔“

”ارے تم کہاں جا رہی ہو۔ تم کو بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے۔“

”میں! میں حیران ہو گئی تھی۔“ میں کہاں جاؤں گی سر۔“

”جہاں ہم جا رہے ہیں۔“ عامر نے کہا۔ ”بس، اب تمہارے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“

اس شام میں نے پہلی بار اپنی امی کو یہ بتایا کہ میں نے کتنے خوبصورت لمحے گزارے ہیں۔ میں یہ بات ان سے چھپا گئی تھی۔ وہ لمحے واقعی خوبصورت تھے۔ ہم ساحل کی طرف گئے تھے۔ عامر کی بہن عالیہ ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ اسے اپنی کسی دوست کے ساتھ جانا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس نے جان بوجھ کر مجھے اور عامر کو جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ عامر نے اس شام مجھ سے بہت باتیں کی تھیں۔ وہ مجھے اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس نے احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک بہت بڑی فرم کا مالک ہے یا بہت پیسے ہیں اس کے پاس۔

اس شام پہلی بار مجھے زندگی اتنی خوبصورت محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے کیا تھا سوائے مایوسیوں اور ناکامیوں کے۔

میں آصف کو پڑھانے کے لیے جاتی رہی۔ اس

دوران عامر کی بہن عالیہ سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بھی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس کی مگنی ہو چکی تھی اور ایک سال بعد شادی ہونے والی تھی۔

میں شام کی چائے اکثر ان کے ساتھ ہی پینے لگی تھی۔ عالیہ ہی سے معلوم ہوا تھا کہ عامر کی بیوی یعنی آصف کی امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ دکھ ہوا تھا یہ سن کر۔ آصف جیسا پیارا بچہ بغیر ماں کے زندگی گزار رہا تھا۔ پھر ایک دن عالیہ نے مجھ سے کہا۔ ”عافیہ“ میں اگر تم سے کچھ کہوں تو تم برا تو نہیں مانو گی۔“

”نہیں تو، میں برا کیوں ماننے لگی۔“

”میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے آنے کے بعد عامر بھائی کی زندگی کے معاملات میں دل چسپی لینے لگے ہیں۔ ورنہ بھائی کی موت کے بعد وہ صرف دفتر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اب تم نے انہیں بدل کر رکھ دیا ہے۔“

”میں اب اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم کو مجھ سے یہی بات کرنی تھی۔“

”نہیں، بات یہ ہے کہ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اب اسی گھر میں آ جاؤ۔“

میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ عالیہ نے اچانک یہ کیا کہہ دیا تھا۔ شاید اس نے میرے دل کی آواز سن لی تھی۔ میں خود بھی تو یہی چاہتی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں خود سے اس بات کا اظہار کرتی۔

”کیا میری یہ بات ناگوار گزری ہے۔“ عالیہ نے پوچھا۔

”نہیں“ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دوں۔“ میں نے کہا۔

”تم یہ بتاؤ، تمہیں اعتراض تو نہیں ہے۔“

”نہیں، اعتراض تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن میں اپنی امی سے پوچھنے بغیر اتنا بڑا فیصلہ تو نہیں کر سکتی۔“

”بالکل درست۔ بلکہ ایسا کیوں نہیں کرتی ہو کہ اپنی امی سے عامر بھائی کو ملوادو۔“ عالیہ نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہاری امی کو بھی عامر بھائی پسند آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں کل ہی امی کو بھیج دوں۔“

میں نے یہ وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب دعا مانگ رہی تھی کہ خدا کرے امی عامر سے ملنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میرے بارے میں کچھ

اور سوچ رکھا ہو۔ میں تو عامر کے یہاں بچے کو پڑھانے کے لیے آئی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ یہ موڑ بھی آ جائے گا۔ بہر حال ہزار اندیشوں کے ساتھ میں نے دبے الفاظ میں امی کو سب کچھ بتا دیا۔

میرے اندیشوں کے برعکس امی یہ سب سن کر خاموش رہی تھیں۔ انہوں نے فوری طور پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر دیر سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری قسمت میں یہی ہے کہ تم ایک شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ سے شادی کرو تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔“

اس رات میں نے امی کو عامر کے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔ میں خود وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسری شام امی تیار ہو کر عامر کی طرف چلی گئیں اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا۔

نہ جانے وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ ان دونوں کے درمیان کیسی باتیں ہو رہی ہوں گی۔ عامر امی کو کیسا لگا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ ہر طرح کے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ پھر امی واپس آ گئیں۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ خوش اور مطمئن ہو کر واپس آئی ہیں۔ شرم کے مارے میں نے ان سے خود کچھ نہیں پوچھا۔ انہوں نے خود ہی کہا۔ ”عافیہ، عامر بہت اچھے ہیں۔ وہ مجھے پسند آئے۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔“

”کیا..... آپ نے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں بھئی، اس میں کیا دیر کرنا لیکن.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

”لیکن کیا امی۔“

”بیٹا، بات یہ ہے کہ یہ تاریخ تمہاری شادی کی نہیں بلکہ میری شادی کی تاریخ ہے۔ میں عامر سے شادی کر رہی ہوں۔“

”کیا؟“ مجھ پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ کیسی خبر سننے کو مل رہی تھی۔ امی اپنی شادی کی تاریخ طے کر آئی تھیں اور وہ بھی اس شخص کے ساتھ جس کو میں نے پسند کیا تھا۔

”امی! میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ یہ بتائیں، کیا عامر اس شادی کے لیے راضی ہیں۔“

”ظاہر ہے۔ میں زبردستی تو شادی نہیں کر سکتی۔“ امی

ماہنامہ سرگزشت

265

مارچ 2014ء

نے کہا۔ ”بیٹا بات یہ ہے کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ تم ابھی لڑکی ہو۔ عامر چالیس پینتالیس سال کے ہو چکے ہیں۔ ایک اولاد بھی ہے۔ اس لیے عامر سے تمہارا رشتہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔ عامر نے تو مجھے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے میری ہی عمر کی عورت کی ضرورت تھی۔“

”اور اس کی بہن عالیہ۔ اس نے کیا کہا۔“

”اسے کیا کہنا تھا۔ وہ بھی بہت خوش ہے۔“

اس کے بعد میں نے امی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ویسے دل کا جو حال تھا وہ خدا ہی جانتا تھا۔ دھچکا سا لگا تھا مجھے۔ کہاں تو میں عامر کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی اور اب کہاں وہ میری ماں کا شوہر بننے جا رہا تھا۔

میں اسے اپنا باپ تو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ بے شمار باتیں میرے ذہن میں آرہی تھیں۔ میں اس کے سامنے کس طرح جا سکتی تھی۔ کیا کہتی اس کو۔ کس نام سے پکارتی۔

ہم دونوں ایک ہی گھر میں کیسے رہ سکتے تھے؟ بہت الجھی ہوئی صورتحال تھی۔ امی نے یہ کیا کر دیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں اپنی بیٹی کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟

میں نے ٹیوٹن کے لیے عامر کے یہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔ میرے وہاں جانے کا اب کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ امی نے بھی اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید انہیں احساس تھا کہ میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ امی نے اپنی شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے یہ بتایا کہ عامر نے پیسے دیے ہیں۔ تاکہ وہ کچھ کپڑے وغیرہ بنوالیں۔

آخر ایک دن امی نے بتایا کہ اگلے ہفتے ان کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے معلوم تو ہو ہی چکا تھا۔ اس کے باوجود شادی کی تاریخ کا سن کر ایک شاک سا ہوا تھا۔

اور اس وقت میں نے امی کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”امی، آپ کی شادی کے بعد میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔“

”وہ کیوں۔“

”یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں ہے امی۔ میں نے کہا۔ میں ایک چھت کے نیچے اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

امی سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر دھیرے سے بولیں۔ ”بیٹا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے غلط قدم اٹھالیا ہو۔“

”نہیں، آپ نے مناسب قدم اٹھایا ہے۔“ میں

نے کہا۔ ”آخر آپ کی بھی زندگی ہے۔ آپ میں کس چیز کی کمی ہے۔ آپ دیکھنے میں میری بہن لگتی ہیں۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت اور اسماٹ ہیں۔ خدا آپ کو طویل زندگی دے۔ میرا کیا ہے۔ مجھے تو کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا۔ پھر آپ کیا کرتیں۔ اچھا ہوا کہ آپ کو ایک ایسا آدمی مل گیا جو آپ کی قدر کرے گا۔ آپ کو آرام سے رکھے گا۔ اس لیے میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ امی نے ایک گہری سانس لی۔ ”لیکن تم کہاں رہو گی۔“

”کہیں بھی۔ میری ایک سہیلی ہے غزالہ۔ آپ تو جانتی ہیں اس کو، وہ اکیلے فلیٹ میں رہتی ہے۔ میں اس کے ساتھ شیئر کر لوں گی۔ اور کہیں نہ کہیں چاب بھی مل جائے گی۔ آپ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

امی کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سخت الجھن اور کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر ایک ہی ملاقات میں دونوں کے درمیان ایسا کیا ہوا تھا کہ شادی کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔

ایسا کون سا جادو ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد انتہائی سادگی کے ساتھ امی اور عامر کی شادی ہو گئی۔ اس دوران میں نے یہ کوشش کی تھی کہ میرا عامر سے سامنا نہ ہو۔ میں اس کوشش میں کامیاب رہی۔۔۔ اور امی کی رخصتی ہوگی۔ میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھی بلکہ اپنے ہی گھر میں رہ گئی تھی۔

امی کے جانے کے بعد ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ میں بستر پر گر کر نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔ کتنی تنہا ہو گئی تھی میں۔

اب کوئی بھی نہیں تھا میرے ساتھ۔ میں یہ سوچتی رہی تھی کہ کیا امی کو میرا خیال نہیں آ رہا ہوگا۔ کیا انہیں میری تنہائی کا احساس نہیں ہو رہا ہوگا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں اسی طرح روتی رہی۔ پھر نیند آ گئی تھی۔ دوسری صبح ایک نیا تماشا میرے انتظار میں تھا۔ یہ محلے کی عورتیں تھیں جو باقاعدہ ایک طرح سے پرسہ دینے میرے پاس آئی تھیں۔ ”ہائے ہائے کیسی ماں ہے۔ جوان بیٹی کا تو خیال نہیں کیا اور خود اپنی شادی رچا کر بیٹھ گئی۔“

”خدا سمجھے ایسی ماں سے۔ بیٹی کو اکیلی چھوڑ کر چلی گئی۔“

اور بھی طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اب میں کس کس سے جھگڑا کرتی۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ امی نے ایسا ہی تو کیا تھا میرے ساتھ۔

دوسری صبح موبائل پر امی نے رابطہ کیا۔ ”بیٹا، کیسی ہو تم۔“

”میں ٹھیک ہوں امی، آپ میری فکر نہ کریں۔“

”عافیہ، رات کو میں نے عامر سے بات کر لی ہے۔ تم یہیں آ جاؤ ہمارے ساتھ۔“

”نہیں امی پلیز، مجھے یہیں رہنے دیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں کل غزالہ کے یہاں شفٹ ہو رہی ہوں۔ میں نے اس سے بات کر لی ہے۔“

”بیٹا، گھر کا کیا ہوگا۔ تمہارے باپ کی نشانی ہے۔“

”آپ جو کہیں وہی ہوگا۔“

”تم اسے بچ دو۔“ امی نے کہا۔ ”اور اس کے پیسے اپنے بینک اکاؤنٹ میں رکھو لیتا۔ تمہارے وقت پر کام آئیں گے۔“

”جی ہاں، میں ایسا ہی کروں گی۔ کیونکہ اب ویسے بھی میں اس محلے میں تو نہیں رہ سکتی۔ محلے کی عورتوں نے آپ کے حوالے سے باتیں کر کر کے میری زندگی عذاب کر دی ہے۔“

امی خاموش ہو گئیں۔ وہ سمجھ گئی ہوں گی کہ محلے کی عورتیں کس قسم کی باتیں کر رہی ہوں گی۔

اس محلے میں ایک نوجوان تھا۔ پڑھا لکھا، معقول اور حالات کا تجربہ کرنے والا۔ میری اس سے رسمی سلام دعا تھی۔ وہ میرا بہت احترام کیا کرتا تھا۔

میں نے محلے کے ایک بچے کو بھیج کر سرفراز کو بلایا۔ پہلی بار میں نے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔

”جی عافی۔“ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں۔“

”سرفراز، آپ کو پتا تو چل ہی گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں، مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور دہرانے کی ضرورت نہیں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا ہے یہ کوئی ان نیچرل بات نہیں

ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ آپ کی امی نے جو کچھ کیا اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

سرفراز کی باتیں سن کر میرے دل کو ڈھارس ہوئی تھی۔ ”سرفراز، تم پہلے آدمی ہو جس نے ایسی باتیں کی ہیں۔ ورنہ محلے کی عورتیں تو نہ جانے کیا کیا بول رہی تھیں۔“

”وہ سب جاہلوں کی باتیں ہیں۔ تم ان کا اثر مت لو۔ تم یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”سرفراز، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے اس گھر کا سارا سامان بیچنا ہے۔ اس کے بعد اس گھر کو فروخت کرنا ہے اور یہ کام میں تمہا نہیں کر سکتی۔“

”ظاہر ہے، یہ تم نہیں کر سکتیں۔“ سرفراز نے کہا۔ ”ویسے بھی تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ یہ جاہل لوگ تمہاری زندگی عذاب کر دیں گے۔ اس لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

اس شام امی کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں منع کر دیا۔ ”نہیں امی، آپ یہاں نہیں آئیے گا۔ محلے کی عورتیں آپ کے لیے طرح طرح کی باتیں کر رہی ہیں۔ خواجواہ آپ کا دل دکھے گا۔ اس لیے آپ کا آنا مناسب نہیں ہے۔“

”تو بیٹا، تم آ جاؤ۔“

”نہیں، میرا اس گھر میں جانا مناسب نہیں ہے۔“

میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

شمارہ فروری 2014ء کی منتخب سچ بیانیال

ہماری پیش کش.....آپ کا انتخاب

☆ اول: تلافی.....نوشاہ (لاہور)

☆ دوم: کاروان زیست.....نسرین (کراچی)

☆ سوم: نفسیاتی.....منظہر حسین (کراچی)

پہلے دہرے اور تیرے انعام کے لیے آپ منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے



عاشق

محترم معراج رسول
السلام علیکم!

میں نے زندگی میں بے شمار گناہ کیے مگر میرا آخری گناہ کسی
طور بھولے نہیں بھولتا۔ لیکن اس گناہ نے میری زندگی بدل کر رکھ
دی۔ یہ تبدیلی آئی کیسے یہ آپ بھی پڑھ لیں۔

جاوید
(کراچی)

میں اس پالے کو لے کر اپنی تجربہ گاہ میں آ گیا۔ جی
ہاں، وہ میری تجربہ گاہ ہی تھی۔ دنیا بھر کی ایسی سیدھی چیزیں
میری تجربہ گاہ میں ہوتی تھیں۔
مٹی کے برتن، شیشے کی ٹکلیاں، تلواریں، خنجر،

میرے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ یہ مجھے ایک
میدان میں پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ کیونکہ اسی
قسم کی چیزیں میرے کام کی ہوتی تھیں۔ اس کے کنارے
ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے اندر داغ دھبے تھے۔

”تو پھر میں تم سے کیسے مل سکوں گی۔“

”دو چار دن گھر جائیں۔ جب میں غزالہ کے یہاں
شفٹ ہو جاؤں تو پھر آپ آ سکتی ہیں۔“ ای خاموش
ہو گئیں۔

ایک دن اچانک عامر کا فون آ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا
کہ اس کا فون میرے پاس آیا تھا۔ ”عافیہ“ میں تم سے ملنا
چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟“ میں پھٹ پڑی تھی۔ ”آپ مجھ سے
کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ اب ملنے کے لیے رہ گیا ہے۔“
”بے وقوف لڑکی! میں تم سے ایک بہت ضروری
بات کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور اگر تم نہیں
ملیں تو ہم سبھوں کی زندگی بچ ہو جائے گی۔“
”آخر ایسی کون سی ضروری بات ہو گئی۔“

”ہے ایک بات، تم فوری ملو مجھ سے۔“
”میں اس گھر میں نہیں آ سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ
آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اوہ“ اچھا ایسا کرو۔ تم میرے دفتر آ جاؤ۔ وہاں
تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“
”ہاں، یہ میں کر سکتی ہوں۔“
”تو پھر کل صبح ہی آ جاؤ۔“

میں نے وعدہ کر لیا۔ نہ جانے ایسی کون سی ضروری
بات تھی جو وہ مجھ سے کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال میں دوسرے
دن اس کے دفتر پہنچ گئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے اس کہانی
کا آغاز ہوا تھا۔

عامر نے بہت خوش دلی سے میرا استقبال کیا تھا۔ ”بیٹھ
جاؤ۔“ اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”عافیہ، کیا تمہیں یاد ہے کہ تم یہاں آئی تھیں اور میں
نے اپنے بیٹے کی ٹیوشن آفر کی تھی۔“

”اچھی طرح یاد ہے۔ وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔“
”وہ آفر آج بھی برقرار ہے۔ آصف تمہیں بہت یاد
کرتا ہے۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے عامر صاحب؟“
”بے وقوف ہو تم، تم یہ بتاؤ کیا میں نے کبھی تم سے
محبت جتلائی۔ کیا میں نے کبھی تم سے یہ کہا کہ میں تم سے محبت
کرنے لگا ہوں۔“

”نہیں، آپ نے یہ کبھی نہیں کہا۔“

”کیا میں نے تم سے شادی کا وعدہ کیا۔ کیا شادی کی
آفر کی میں نے۔“
”نہیں، کبھی نہیں کی۔“
”تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تم سے شادی کر رہا
ہوں۔“

”وہ۔ آپ کی بہن عالیہ نے بات کی تھی۔“
”وہ تو بے وقوف لڑکی ہے۔ اس نے اپنے طور پر تم سے
بات کی اور تم نے یہ سمجھ لیا کہ اس میں میری خواہش بھی شامل
ہے۔“ عامر نے کہا۔ ”خود سوچو، ہم دونوں کے درمیان عمر کا
کتنا فرق ہے۔ میں شادی شدہ، ایک بچے کا باپ، تم سے
شادی کس طرح کر سکتا تھا۔ اسی لیے جب تمہاری امی سامنے
آئیں تو میں نے پہلی ہی نگاہ میں انہیں پسند ہی نہیں کیا بلکہ
شادی کی آفر دے دی۔ تمہاری امی نے بھی فوراً قبول کر لیا
کیونکہ انہیں بھی ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اب مجھے یہ
اندازہ نہیں تھا کہ تم میرے لیے اتنی سیریس ہو کر بیٹھ گئی ہو۔
عافیہ، تم نے جو کچھ بھی سوچا وہ تمہاری ایک طرف سوچ تھی۔ اس
میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔“

عامر کی باتیں سن کر میری آنکھوں سے جیسے پانی اترتی
جاری تھی۔ واقعی اس نے تو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔
میں ہی اس لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ عافیہ کی باتوں میں آ گئی تھی۔
میں نے عامر کی توجہ کو اس کی محبت سمجھ لیا تھا۔ جبکہ اس
کے اور میرے درمیان ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں نے
اپنا سر جھکا لیا تھا۔

”اب تم زیادہ بے وقوفی مت کرو۔“ عامر نے
کہا۔ ”تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ تمہاری امی بھی
تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی ہیں۔ جو پرانے خیالات
ہیں ان کو اپنے ذہن سے جھٹک کر نئی زندگی شروع کر دو۔
آ جاؤ ہمارے ساتھ۔“

میں یہ سوچ رہی تھی کہ خوش فہمی یا غلط فہمی نہ جانے
کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ میں نے عامر کی آفر قبول
کر لی۔

اور اب میں اسی گھر میں اپنی امی اور عامر اور آصف
کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے لیے رشتہ تلاش کیا جا رہا ہے۔
اور ہاں، میں آج بھی آصف کی سچر ہوں۔ جبکہ عالیہ بہت
شرمندہ شرمندہ سی رہتی ہے۔ زندگی کبھی بھی اس طرح بھی
مہربان ہو جاتی ہے کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

جانوروں کی کھالوں کے ٹکڑے، قلم دوات، پرانے موضوعات اور نہ جانے کیا کیا۔
یہی تجربہ گاہ میری روزی کا وسیلہ تھی۔ میں نے یہاں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

مٹی کا وہ پیالہ میں نے میز پر رکھ دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اس پر کام کرنا ہے۔ ابھی تک کوئی واضح بات ذہن میں نہیں تھی۔

میں نے چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔ اچانک اسی وقت دروازے کی ٹھنٹی بج اٹھی۔

میرے مکان میں چار کمرے ہیں۔ تین کمرے آنے جانے والوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ جبکہ چوتھے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے سوائے حارث کے جو میرا سب سے قریبی دوست ہے۔ یہی کمرہ میری تجربہ گاہ ہے۔ جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔

دروازے پر حارث ہی تھا جو برا سامنہ بنائے کھڑا تھا۔ ”اب کہاں مر گئے تھے۔ کتنی دیر سے دروازے پر کھڑا ہوں۔“

”بھائی“ میں اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ میں نے بتایا۔ ”آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں ایک نایاب چیز دکھاتا ہوں۔“ میں اسے اپنے ساتھ اپنی تجربہ گاہ میں لے آیا۔ ”وہ دیکھو۔“ میں نے مٹی کے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا ہے یہ۔“ حارث نے پیالے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”مٹی کا ایک معمولی سا پیالہ۔“

”نہیں میری جان، یہ معمولی پیالہ نہیں ہے۔ یہ وہ پیالہ ہے جس میں سکندر اعظم نے پانی پیا تھا۔“

”اب یہ ایک نئی بکواس شروع کر دی۔“
”سنئے تو جاؤ۔ یہ پیالہ ملتان کے راجا نے سکندر اعظم کو پیش کیا تھا۔ روایت کے مطابق سکندر اعظم اس وقت شکار کی تلاش میں تھا۔ اس کی فوج نے ملتان کے نواح میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اور.....“

”بس، اس سے آگے کچھ نہیں سننا۔ خدا کے بندے اس طرح کب تک لوگوں کو بے وقوف بناتے رہو گے۔“ حارث نے کہا۔

”جب تک وہ بنتے رہیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ پیالہ تمہیں ملا کہاں سے۔“

”سامنے والے میدان میں پڑا ہوا تھا۔“ میں نے بتایا۔
”اور تم اسے سکندر اعظم کا پیالہ سمجھ رہے ہو۔“

”سمجھ ہی نہیں رہا، بلکہ ثابت بھی کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”بس تھوڑی سی محنت اور کاریگری کی ضرورت ہے۔ اس پر اٹنے سیدھے روغنی نقش و نگار بنانے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرے پاس اس قسم کے کئی روغن ہیں۔“

”جاوید، تم دھوکے باز قسم کے آدمی ہو۔“
”دھوکے باز نہیں، فنکار کہو۔ پورے ملک میں مجھ جیسا فنکار تمہیں کوئی اور نہیں ملے گا۔ میں نے یہ فن بڑی محنتوں سے سیکھا ہے۔“

”لعنت ہوا ایسے فن پر۔ تم دوسروں کو دھوکے دیتے ہو۔“ میری جان تم یہ بتاؤ جو لوگ اس قسم کی چیزیں خریدتے ہیں، کیا ان کے پاس اتنے پیسے حلال کی کمائی کے ہوتے ہیں۔ ایک غریب انسان دو لاکھ کا پیالہ اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں رکھ سکتا۔ یہ بھی دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں اور میں ان کو دھوکا دے رہا ہوں۔“
”اور کسی دن اندر ہو گئے تو۔“

”نوادرات کی فیلڈ میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو مجھے چیلنج کر سکے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کوئی بھی چیز یوں ہی فروخت نہیں کر دیتا۔ اب مثال کے طور پر یہ پیالہ ہے۔ اس کو سکندر اعظم کا ثابت کرنے کے لیے میں پورا بیک گراؤنڈ بنا دوں گا۔ جیسے یہ ملتان سے ہوتا ہوا یونان گیا۔ وہاں سے استنبول کے عجائب گھر میں چلا گیا تھا۔ استنبول سے یہ لندن لے جایا گیا اور لندن سے یہ میرے پاس آ گیا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ میرے آدمی دنیا کے کئی ملکوں میں موجود ہیں۔ ان میں گورے بھی ہیں۔ اور کالے بھی۔ فرض کرو کسی نے تصدیق کے لیے یونان فون کیا تو وہاں سے یہی بتایا جائے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کم بخت تمہاری ان اوٹ پٹانگ باتوں کی تصدیق کیوں کر دیتے ہیں۔“

”اس لیے کہ ان کو حصہ ملتا رہتا ہے۔ یہ پیالہ تین لاکھ میں جائے گا۔ صرف پچاس ہزار میرے ہوں گے۔ باقی ان کے اکاؤنٹ میں تھوڑے تھوڑے کر کے جمع ہو جائیں گے۔“

”اور صدف کا کیا ہوگا۔“

”اس کا کیا ہونا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی۔ میرے خواب دیکھتی رہے گی اور جب میرے پاس پیسے آجائیں گے تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ صدف جیسی لڑکی نے تمہیں

کیوں پسند کر لیا۔“
”اب یہ سب رہنے دو تم صرف یہ دیکھو کہ میں کتنی تیزی سے اپنی منزل کی طرف جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔ کب سے کوششیں کر رہے ہو، لیکن ابھی تک تمہارا شاید اپنا بینک اکاؤنٹ بھی نہیں ہوگا جبکہ میرے پاس ابھی سے بہت کچھ ہے۔“

شاید میں اس طرح پورے معاشرے سے انتقام لے رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ والدین کی موت کے بعد میرے پاس صرف تعلیم تھی جو میرے کسی کام نہیں آ رہی تھی۔

ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا اور معمولی سا فرنیچر۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں، نہ جانے کتنے دفتروں کی خاک چھان چھان کر زندگی سے بھی بے زار ہو چلا تھا۔

ہر جگہ ایک ہی قسم کا احسان سوال کیا جاتا تھا۔ ”کیا آپ کے پاس کوئی تجربہ ہے۔“

”نہیں جناب، فی الحال تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔“
”پھر جاب کیسے مل سکتی ہے۔ ہمیں تو تجربہ کار آدمی چاہیے۔“
”ایک بات بتائیں جناب۔ اگر کسی کو سرے سے

کہیں کوئی جاب ہی نہ ملے تو اس کے پاس تجربہ کیا آسمان سے آئے گا۔“

”یہ ہم نہیں جانتے۔ ہمیں تو ہر حال میں تجربہ چاہیے۔“
اس طرح کی باتیں سن سن کر میں پاگل ہونے لگا تھا۔

زندگی میں کوئی چارم نہیں تھا۔ کوئی دل غشی نہیں تھی۔ اسی دوران صدف سے میری ملاقات ہو گئی۔

وہ ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی تھی۔ دولت ہو تو چہرے اور شخصیت سے بھی اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ یہ ایک عام سامنا ہے۔

اگر کوئی مفلس ہو تو وہ چاہے لاکھ قیمتی لباس اور جوتے وغیرہ پہن لے۔ اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ جبکہ جو دولت مند ہوتے ہیں، انہیں اپنے اظہار کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ان کا اٹھتا ہوا ہر قدم ان کی مالی حالت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

بہر حال صدف کے سلسلے میں ایسا ہی ہوا تھا۔ بالکل فلمی انداز میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جس طرح فلموں میں ہوا کرتا ہے۔ پیسے والی لڑکی اور ایک غریب نوجوان۔ دونوں اتفاق سے کسی جگہ ملتے ہیں اور یہ اتفاق عام طور پر کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ کچھ غنڈے لڑکی کو پریشان

کر رہے ہوتے ہیں کہ ہیر پھینچ کر سب کی دھنکی کر دیتا ہے اور لڑکی ہیر و سہجٹ کرنے لگتی ہے۔
ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔
ایک سڑک پر صدف کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور کچھ غنڈوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بدتمیزی کر رہے تھے کہ میں بیچ میں ٹپک پڑا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان غنڈوں کو کیا مارتا۔ انہوں نے مار مار کر میرا بھر کس نکال دیا تھا اور خود فرار ہو گئے تھے۔ میری بہت کڑکری ہوئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد صدف نے مجھ سے کہا۔ ”تم تو بہت بری طرح پٹ گئے ہو۔“

”ظاہر ہے، میں کوئی سپر مین تو ہوں نہیں کہ ان کم بختوں کو مار بھگاتا۔“

”تو پھر کیوں لڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔“

”ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ میرے سامنے کسی لڑکی کی توہین کی جائے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ کم بخت میرے بیچ میں کوڑ پڑنے کی وجہ سے بھاگ جائیں گے۔ لیکن ان کم بختوں نے میری دھنکی کر دی۔“

صدف ہنس پڑی، وہ مجھے اپنی گاڑی میں قریبی بلیک ٹیک لے گئی تھی۔ یہاں اس نے میری مرہم پٹی کروادی تھی۔ تو صدف سے اس طرح میری ملاقات ہوئی تھی۔

اس کے بعد جب اس سے ملاقاتیں ہوئی تو میں نے اپنے بارے میں اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا، بلکہ کچھ زیادہ ہی بتا دیا تھا۔ مثال کے طور پر ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار۔ نوادرات کے شورومز، اور نہ جانے کیا کیا۔

صدف اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک سیدھی سادی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے میری ہر بات کا یقین کر لیا تھا۔

وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جس کے ساتھ صرف وقت گزارنے کی بات کی جانی بلکہ وہ زندگی گزارنے کے قابل تھی۔ اور جب ایسی کوئی مل جائے تو اس کو سلیقے سے رکھنے کے لیے انتظام کی ضرورت تھی اور میں اپنے طور پر وہی کر رہا تھا۔

حارث کے چلے جانے کے بعد میں نے صدف کو فون کیا۔ کئی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میری آواز سن کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ ”ارے کہاں چلے گئے تھے تم؟“

کیا تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی پریشان ہو سکتا ہوں۔“

”اندازہ تھا میری جان لیکن میں ایک بزنس کے سلسلے میں بنگا گیا ہوا تھا۔“

”بس دنیا بھر میں گھومتے رہو اور مجھ سے ملنے کی فرصت نہیں ہے تمہارے پاس۔“

”پریشان نہ ہو۔ ہم دونوں کل مل رہے ہیں۔“

صدف سے بات کر کے فارغ ہو گیا تھا کہ امجد آگیا۔ امجد ایک گھاگ قسم کا آدمی تھا۔ وہ نوادرات کا بہت بڑا بروکر تھا اور خاص طور پر نوادرات کا۔۔۔ خدا جانے وہ کس طرح گا کوں کو پھانس لیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس بار بھی وہ ایک آفر لے کر آیا تھا۔ ”بھائی ایک پارٹی کو اشوکا کے زمانے کی زرنگی کا مجسمہ چاہیے۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت ہی شوقین لوگ ہیں۔ آسٹریلیا سے آئے ہوئے ہیں۔“

”مل جائے گا مجسمہ۔“

”کہاں سے ملے گا۔“

”یہ میرا کام ہے۔ تم اپنے کمیشن کی فکر کرو۔“

”ٹوٹنی پرسٹ۔“

”چلو ڈن ہے۔ دو چار دنوں کے بعد تمہیں فون کر کے بتا دوں گا کہ مجسمہ تیار ہے۔“

یہ فن مجھے استاد بننے سے سکھایا تھا۔ وہ ایک باکمال آدمی تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میری غربت اپنے عروج پر تھی۔ زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں استاد بننے سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ ابتداء ہی سے ایک پراسرار آدمی معلوم ہوا تھا۔

مجھے اس کے بارے میں کسی نے بتایا تھا کہ یہ شخص جعلی کاغذات وغیرہ بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن جب ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ کاغذات تو کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ تو نوادرات اور جعلی پینٹنگز وغیرہ کا بھی ماہر تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے اس کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ اسی نے مجھے ہزاروں گر سکھا دیے تھے۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھ پر بہت محنت کی تھی۔

اس نے بتایا کہ کاغذات کو کس طرح دیمک زدہ کیا جاتا ہے تاکہ بہت پرانے معلوم ہوں۔ پرانے رنگ کیسے بنائے جاتے ہیں۔ نوادرات کے لیے کون کون سا اوزار استعمال کیا جاتا ہے۔ انگلیوں سے کیسے کام لیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ اس شخص نے اپنا سارا ہنر مجھ میں منتقل کر دیا تھا۔ پھر استاد بننے کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے بعد میں

نے اپنے ہنر کو صرف نوادرات تک محدود کر رکھا تھا۔ اس رات میں نے جب صدف کو فون کیا تو اس کے موبائل میں بہت سی آوازیں شامل تھیں۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”یہ اتنا شور کیوں ہو رہا ہے۔“

”شور نہیں ہے، گھر میں میلاد ہو رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میلاد! کیا تمہارے یہاں میلاد ہوتا ہے۔“

”ہاں ڈیڈ بہت پابندی سے میلاد کرواتے ہیں۔“

صدف نے کہا۔ ”تم ایک بار ڈیڈ سے مل تو لو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ عاشق رسول کیا ہوتا ہے۔“

”کمال ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس قسم کے لوگ زیادہ مذہبی نہیں ہوتے۔“

”میرے ڈیڈ کی بات اور ہے۔“

صدف سے بات کرنے کے بعد کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کے باوجود دل کچھ بے ترتیب سا ہو رہا تھا۔ اور اس رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ یہ خواب میں برسوں سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ ایک بہت بڑا میدان ہے۔ انتہائی گھور اندھیرا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بے حد خوفزدہ ہوں۔ میں پناہ چاہتا ہوں لیکن ایسی اندھیری رات اور ویران میدان میں کوئی پناہ نہیں مل سکتی۔ اور پھر اچانک دور میدان کے آخری سرے پر ایک روشنی سی دکھائی دیتی ہے۔ شاید کوئی الاؤ روشن ہے۔ میں اس الاؤ کی طرف دوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی آوازیں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ آوازیں کوئی حمد یا نعت پڑھنے کی ہیں۔ لیکن بول سمجھ میں نہیں آتے۔ میں الاؤ کی طرف دوڑ رہا ہوں۔ لیکن الاؤ دور ہوتا جا رہا ہے۔ اور دور۔ اور دور۔ میں اس تک پہنچ نہیں پاتا اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں یہ خواب بہت عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔

خدا جانے اس خواب کے ذریعے مجھے کیا بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیا سمجھایا جا رہا ہے۔ اس دن جب حادثہ میرے پاس آیا تو میں نے اپنے خواب کا تذکرہ کیا۔ میں پہلے بھی اسے اپنے ایسے خواب کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ میری بات سن کر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”یار تم ایسا کرو، کسی عالم سے مل کر اس خواب کی تعبیر معلوم کرو۔“

”بھائی، اب اتنی فرصت کہاں ہے کہ میں کسی عالم

کے پاس جاؤں۔ اور ویسے تو خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ ان کو سیریس کیا لینا۔“

”جاوید، یہ معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم اس کو مذاق میں نہ لو۔ ابھی چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں چلوں۔“

”میرے محلے کی مسجد کے امام صاحب ایک عالم باعمل ہیں۔ ان سے مل کر تمہارے اس خواب کے بارے میں معلوم کرتے ہیں۔“

میں نے پھر انکار کر دیا لیکن حادثہ مجھے مجبور کر کے امام صاحب کے پاس لے ہی آیا تھا۔ امام صاحب ایک شفیق قسم کے انسان ثابت ہوئے تھے۔

انہوں نے پوری توجہ سے میرا خواب سنا تھا پھر بہت دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ ”میاں، تمہارا یہ خواب بہت مبارک بھی ہے اور نامبارک بھی۔“

”قبلہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسا ہی ہوا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”خواب میں میدان اور اندھیرا ہوتا ہے کہ تم گمراہیوں میں بھٹک رہے ہو۔ الاؤ اس بات کی علامت ہے کہ تمہیں ایمان اور صحیح راستے کی روشنی دکھائی جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ خواب مبارک ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ تم اس روشنی تک پہنچ نہیں پاتے۔“

”تو پھر آپ ہی بتائیں میں کیسے پہنچ سکتا ہوں۔“

”یہ راستہ تمہیں خود تلاش کرنا ہوگا۔“ امام صاحب نے کہا۔ ”تمہاری جستجو تمہیں وہاں تک لے جائے گی۔“

ہم امام صاحب کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے۔ اس دن مجھے ایک پارٹی کے لیے زرنگی کا مجسمہ تیار کرنا تھا۔ اس لیے میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے اس مجسمے کی تیاری میں اپنی پوری صلاحیت صرف کر دی تھی۔ یہ ایک مشکل لیکن نازک کام تھا۔

میرا کام صرف مجسمے کی تیاری نہیں تھا بلکہ مجھے اور بھی بہت کچھ کرنا تھا۔ قدیم مخطوطات اور کاغذات وغیرہ تیار کرنے تھے۔ تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ یہ ایک اور پینٹل مجسمہ ہے۔ یہ کاغذات ہندی اور انگریزی میں بنائے تھے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں مکمل دستاویزات کے ساتھ چیزیں فروخت کیا کرتا ہوں۔ تاکہ گاہک کو یقین ہو جائے کہ اس نے غلط سودا نہیں کیا۔

یہ سب نفسیاتی حربے ہیں۔ خدا بھلا کرے استاد بننے کا۔ انہوں نے مجھے یہ سب سکھایا تھا۔

فیبین سوسائٹی

(Fabian Society)

ایک اشتراکی جماعت 1884ء میں معرض وجود میں آئی۔ اس میں اخلاقی نظریات میں مباحثات ہوتے تھے۔ اس کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد جارج برنارڈشا، سنڈی ویب، بیٹرس ویب نے اس کی رکنیت اختیار کر لی اور جلد ہی اس کے روح رواں بن گئے۔ 1887ء کے بعد فیبین مجلس کے اراکین زیادہ تر اشتراکیت (سوشلزم) کے علمبردار تھے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کے ذریعے اشتراکیت کا پرچار شروع کیا اور وقتی مسائل پر رائے زنی کرنے لگے۔ مگر اشتراکیت کے عام حامیوں اور اس جماعت کے اراکان میں یہ فرق تھا کہ فیبین کارل مارکس کے نظریات سے اتفاق نہیں کر رکھتے تھے اور تدریجی ارتقا کے ذریعے اشتراکیت کا حصول چاہتے تھے۔ ان کے اس احتیاط پسندانہ رویے کا اظہار اس نام سے بھی ہو جاتا ہے، جو انہوں نے اپنے لیے اختیار کیا۔ مجلس کا نام فیبین دراصل ارومن جرنیل فیب لیس مٹلس کے نام پر رکھا گیا تھا جو تاریخ میں اس لیے مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ شش و پنج کے عالم میں رہتا تھا۔

مرسلہ: نصیر احمد یوسفی، کراچی

اسی شام صدف کا فون آ گیا۔ ”جاوید، تمہیں ڈیڈ سے ملنا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”سمجھا کرو نا۔ میں نے ڈیڈ سے تمہارا تذکرہ کر دیا ہے۔ وہ تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ میں مسکرا دیا۔ ”اب بتاؤ کب ملنا ہے۔“

”کل شام۔“ صدف نے بتایا۔ ”ذرا سلیقے سے آنا۔ ان سے ڈھنگ کی باتیں کرنا۔ اور اپنے بزنس کے سلسلے میں الٹی سیدھی باتیں مت کرنا۔ ورنہ وہ سمجھ جائیں گے کیونکہ وہ خود بھی بزنس مین ہیں۔“

”تم اس کی فکر مت کرو، میں بہت سلیقے سے بات

کروں گا۔“

یہ ایک خوشی کی خبر تھی۔

صدف جیسی لڑکی میری زندگی کی شریک بن جاتی تو مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے اسے پہلی بار ہی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی میری زندگی کا ساتھی ہو تو وہ صدف ہی ہو سکتی ہے۔ اب اس کے باپ نے مجھے بلایا تھا۔ وہ جو ایک بڑا بزنس مین تھا، جو میری زندگی تبدیل کر سکتا تھا۔ میرے حالات تبدیل کر سکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ میں ساری زندگی تو نوادرات کے چکر میں نہیں رہتا۔ مجھے سلیقے کا کوئی نہ کوئی کام تو کرنا تھا اور اس کے لیے صدف کا باپ میرے بہت کام آ سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں میرے ذہن میں تھیں۔

میں اس رات بہت دیر تک نرمی کے مجسمے پر کام کرتا رہا۔ بالآخر صبح ہوتے ہوتے وہ مجسمہ مکمل ہو چکا تھا۔

وہ ایسا شاہکار تھا کہ میں نے خود اپنی انگلیاں چوم لی تھیں۔ اب اس کے کاغذات تیار کرنے تھے۔ دستاویزی ثبوت کہ یہ مجسمہ کہاں کہاں سے سفر کرتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔ اپنے کام سے مطمئن ہونے کے بعد میں شام کے وقت صدف کے گھر پہنچ گیا۔

میں پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ خدا کی پناہ کیا شاندار گھر تھا اس کا۔ سب کچھ اے ون۔ مرعوب کر دینے والا۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا باپ کتنا دولت مند آدمی ہے۔ صدف اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ شاندار ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ مذہبی ٹائپ کی تھی۔

دیواروں پر مسجد نبویؐ کی بڑی بڑی تصاویر تھیں۔ آیت الکرسی وغیرہ۔ میں یہ سب حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔“ صدف نے پوچھا۔ ”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ڈیڈ کتنے مذہبی انسان ہیں۔“

”ہاں بہت زیادہ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دیکھنے میں ایسے نہیں لگتے لیکن اندر سے بہت موم ہیں۔“

کچھ دیر بعد صدف کے ڈیڈ بھی کمرے میں آ گئے۔

بہت ہی متاثر کرنے والی شخصیت تھی۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کی چمک تھی کہ میں ان سے نگاہیں نہیں ملا سکتا تھا۔ لہجہ بہت نرم اور شفقت سے بھرا ہوا۔

مجھ سے کہ میں ان سے مرعوب ہو گیا تھا۔

وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک ان کے موبائل کی گھنٹی بج گئی۔ وہ کسی سے بات کرنے لگے۔ ”ہاں بھائی۔ ارے بھائی“ میں تو اپنے آقا کے نام پر قربان ہو سکتا ہوں۔ اس شہر کی سوغات ہے۔ لے آتا میرے پاس، پیسوں کی فکر نہ کرو۔“ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد انہوں نے موبائل آف کر دیا۔ اس دوران میری پیشہ ورانہ رگ پھڑک اٹھی تھی۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی سے کوئی تبرک وغیرہ خریدنے کی بات کر رہے ہیں۔

”جناب، کیا آپ کوئی تبرک خرید رہے ہیں۔“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں بھائی، حضورؐ کے مزار مبارک کی چادر ہے۔“ میں نے دریافت کیا۔

اور اچانک میرے اندر کا کاروباری شیطان جاگ اٹھا۔ ”جناب، میرے پاس بھی ایک ایسی چیز آئی ہوئی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”وہ کیا ہے؟“

”نعلین مبارک، حضورؐ کی چلیں۔“

”کیا! وہ اچھل پڑے تھے۔“ نعلین مبارک، یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

میں نے اسی وقت ایک کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ نعلین مبارک انقرہ کے عجائب گھر سے چوری ہوئی پھر جرمن پہنچی۔ وہاں سے انگلینڈ، پھر وہاں سے ایک انگریز لے کر میرے پاس آیا ہے۔ وہ اسے فروخت کرنا چاہتا ہے۔“

”وہ کیا قیمت مانگ رہا ہے اس کی۔“ ان کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

”آٹھ لاکھ۔“ میں نے بتایا۔

”میں دس لاکھ دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے انہیں لے آؤ۔ ابھی اسی وقت۔ تم سے باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ مجھے وہ ہر حال میں چاہئیں۔ میری عاقبت ان ہی کے ذریعے سدھرے گی۔ جاؤ، لے آؤ جا کر۔“

”آپ مجھے دو دنوں کی مہلت دیں جناب۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس شخص سے رابطہ کرتا ہوں۔“

صدف اس دوران بالکل خاموش رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا ہوگا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں ان لوگوں سے اجازت لے کر اپنے گھر آ گیا۔

اب مجھے نعلین مبارک تیار کرنی تھی۔ نہ جانے کیوں

میری زبان سے یہ بات نکل گئی تھی۔ اور اب اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

میں نے دو دنوں کی مہلت اسی لیے مانگی تھی کہ اس دوران میں اسے تیار کر لوں۔۔۔۔۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

حادث بھی اسی وقت آ گیا تھا۔ میں نے جب اسے پوری کہانی سنائی تو وہ بے حد ناراض ہونے لگا۔ ”خدا کے بندے! شرم نہیں آئی اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے۔“

”یار کیا کرتا۔ میرے اندر کا کاروباری انسان جاگ اٹھا تھا۔“

”کاروباری انسان نہیں، کاروباری شیطان کہو۔“

”کچھ بھی ہو۔ اب یہ کام تو کرتا ہے۔ پورے دس لاکھ ملیں گے۔“

”ڈوب مرو کہیں جا کر۔ کس کس کو دھوکا دے رہے ہو۔“ حادث باتیں کرتا رہا۔ لیکن میں نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا۔۔۔ اور گھاس کی ڈوریوں سے بنی ہوئی نعلین تیار کرنی شروع کر دی۔

بہت احتیاط کا کام تھا۔ میرے پاس ایسی ایک شبیہ موجود تھی۔ میں اسی کی مدد سے اپنی تیاری کر رہا تھا۔ ہر بات کا خیال رکھا تھا میں نے۔ کہیں کوئی جھول نہ ہو۔ کہیں کوئی باریکی رہ نہ جائے۔ اور دو دنوں کی محنت کے بعد جو چلیں تیار ہوئیں۔ وہ بلاشبہ چودہ سو سال پرانی چلیں دکھائی دے رہی تھیں۔

مجھے اپنے اس کارنامے پر فخر تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر استاد دتے زندہ ہوتے تو وہ بھی میرا ہاتھ چوم لیتے۔ میں نے کیا کارگیری دکھا دی تھی۔ میں نے اسی وقت صدف کے ڈیڈ کو فون کر کے یہ خوش خبری سنا دی۔

”بیٹے ابھی آ جاؤ، اسی وقت۔“ ان کی آواز کا پنے لگی تھی۔ ”اب یہ سن کر برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ میں ابھی تمہیں چیک دے رہا ہوں۔“

میں نے شیشے کے ایک انتہائی نفیس قسم کے چھوٹے سے بکس میں ان چپلوں کو رکھا۔ اوپر سے پرفوم کا اسپرے کر دیا اور وہ بکس لے کر صدف کے ڈیڈ کے پاس پہنچ گیا۔

اس شخص کی بے تابی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ بار بار انہیں چوم رہے تھے۔ سر پر رکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے لگا رہے تھے۔

انہوں نے اسی وقت مجھے دس لاکھ کا چیک دے دیا تھا۔

میں کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔ اس دوران میں ان کا والہانہ پن دیکھتا رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں۔ یہ پہلا سودا تھا جس کی کامیابی کے بعد مجھے شرمندگی اور ندامت سی ہو رہی تھی۔

دکھ ہو رہا تھا کہ میں نے ایک عاشق رسول کو دھوکا دیا ہے۔ وہ ساری رات اسی طرح کروٹیں لیتے ہوئے گزر گئی۔ بالکل بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

دوسری صبح اٹھ کر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہے وہ لوگ مجھے کچھ بھی سمجھیں۔ میں یہ چیک واپس کر دوں گا۔

صدف کے ڈیڈ گھر پر ہی تھے۔ میں نے چیک ان کے سامنے رکھ دیا۔ ”معاف کیجئے جناب، آپ یہ چیک واپس لے لیں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے۔“ میں نے صاف صاف بتا دیا۔

”یہ میں جانتا ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ جانتے ہیں۔“

”ہاں، میں نے پہلی نظر میں ہی یہ جان لیا تھا کہ یہ مصنوعی چلیں ہیں۔ جھٹی ہیں۔“

”تو پھر۔۔۔ آپ کی وہ عقیدت، وہ چومنا، وہ سر پہ رکھنا۔“

”بے وقوف انسان، میری یہ عقیدت تمہاری جھٹی چپلوں سے نہیں تھی۔ بلکہ اس مبارک نام کی محبت سے تھی۔ میں چپلوں کو نہیں بلکہ اسم محمد کو چوم رہا تھا اور اس کے لیے دس لاکھ تو کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“

اور میں رو پڑا۔ بری طرح رو پڑا۔

اس سچے عاشق رسول کے سامنے میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور وہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہے تھے۔

اور اس رات میرا خواب مکمل ہو گیا تھا۔

میں اس روشنی کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ گونجتی ہوئی آواز قصیدہ بردہ شریف کی تھی۔ جواب بالکل واضح ہو چکی تھی۔

اور ایک بات اور بتا دوں کہ میں اور صدف بہت خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ صدف کے ڈیڈ نے مجھے معاف کرتے ہوئے صدف سے میری شادی کرا دی تھی

اور میں ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔



روحوں کے شکاری

محترم معراج رسول صاحب
السلام علیکم!

میں نے یہ واقعہ سرگزشت کے خاص شمارے پراسرار نمبر کے لیے لکھا تھا لیکن مخلصے میں رہا کہ اتنے بڑے پرچے میں میری تحریر شامل ہوسکے گی یا نہیں۔ دل کڑا کر کے بالآخر بھیج رہا ہوں اگر شائع کردیں گے تو حوصلہ افزائی ہوگی۔
جنید
(کراچی)



وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ میں راحیلہ کو اپنے ساتھ سمندر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی۔ ”سینس، میں چاندنی رات میں سمندر کو دیکھنا چاہتی ہوں، سنا ہے بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

”ہاں، بہت خوبصورت!“ میں نے اس کی تائید کی۔
”میں تو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی دکھائیں۔“ اس نے کہا۔

راحیلہ میری بیوی تھی۔ ہم نے محبت کی شادی کی تھی اور

شادی کے تین برس بعد بھی ہماری محبت پہلے اور پہلی رات کی طرح تروتازہ اور خوبصورت تھی۔

وہ شروع ہی سے رومانٹک مزاج کی لڑکی تھی۔

خوبصورتی سے اسے عشق تھا۔ خوبصورت پھول، خوبصورت

نظارے، خوبصورت پرندے اور خوبصورت بچے اسے اپنی

طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ چاندنی راتیں اس کا جنون

بڑھادیتیں۔ وہ کسی دیومالائی کہانی کے دیومالائی کردار کی

طرح تھی۔

گرمیوں میں جب چاندنی اپنے شباب پر ہوتی تو وہ

چھت پر بستر بچھا کر اس پر سفید چادر ڈال کر بیٹھتا اور مویجے

کے سفید پھول بھیج دیتی اور خود بھی سفید لباس پہن کر چھت پر

بیٹھی چاندنی کو دیکھتی رہتی۔ اس وقت واقعی وہ کوئی افسانوی

کردار ہی دکھائی دیتی تھی۔

میں اسے حاصل کرنے کے بعد خود کو بہت خوش قسمت

تصور کیا کرتا تھا۔

بہر حال تو ہم اس رات چاند کو دیکھنے سمندر کی طرف

چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی سفید گاڑی کنارے کی طرف

بہت آگے لے جا کر کھڑی کی تھی جہاں بہت کم لوگ ہوا

کرتے ہیں اور اس رات اتفاق سے وہاں ہم دونوں کے

علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

ہم ساحلی پٹے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ گئے۔

راحیلہ نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تھا۔ ہم آسمان پر

تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے جا رہے تھے کہ اچانک ہم دونوں

کی نگاہ دور سمندر کی طرف گئی۔ شاید سفید پرندوں کا بہت بڑا

خول تو ہوا پرواز کرتا ہوا خشکی کی طرف آ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خول کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ

آہستہ آہستہ اڑتا ہوا ہماری ہی طرف آ رہا تھا اور چاندنی میں

بہت واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں حیران ہو کر اس خول کی طرف دیکھتے رہے

تھے جو بہت قریب آ چکا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ پرندوں کا

خول نہیں تھا بلکہ وہ انسان تھے۔

انسان، سفید لبادے پہنے ہوئے۔ ان کے لبادے ہوا

سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے

کر رکھے تھے اور جیسے فضاؤں میں تیرتے ہوئے ہماری

طرف آرہے تھے۔

ہم دونوں انتہائی خوف زدہ اور مبہوت ہو کر ان کی

طرف دیکھنے جا رہے تھے۔ وہ اتنی کم بلندی پر تھے کہ تیز

چاندنی میں ان کے چہرے بھی واضح طور پر دکھائی دے

رہے تھے۔

ان میں کچھ مرد تھے اور کچھ عورتیں۔ ان کے چہروں پر

اداسی تھی اور وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ

آگے کیے ہوئے فضا میں تیر رہے تھے۔

پھر وہ اسی طرح تیرتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر

سے گزر گئے اور آہستہ آہستہ وہ غول مشرق کی طرف جاتے

جاتے معدوم ہو گیا۔

ہم دونوں پر چپکی طاری تھی۔ راحیلہ خوف زدہ ہو کر مجھ

سے لپٹ گئی تھی ”جنید! کیا تھا یہ؟“ اس نے وحشت زدہ ہو کر

پوچھا ”کون لوگ تھے یہ؟“

”خدا ہی جانتا ہے۔ چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔“ میں

نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ گاڑی کی طرف جاتے

ہوئے ہم دونوں کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ خدا ہی جانتا ہے

کہ ہم کس طرح واپس آئے تھے۔

راحیلہ تو اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے بخار آ گیا تھا۔ میں

نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا۔

میں نے اپنے کئی دوستوں سے اس حیرت انگیز واقعے کا

ذکر کیا۔ وہ بھی سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکے

تھے۔

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ میں راحیلہ کو اپنے ساتھ

سمندر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی۔

”سینس، میں چاندنی رات میں سمندر کو دیکھنا چاہتی ہوں، سنا

ہے بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

”ہاں، بہت خوبصورت!“ میں نے اس کی تائید کی۔

”میں تو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی دکھائیں۔“ اس نے کہا۔

راحیلہ میری بیوی تھی۔ ہم نے محبت کی شادی کی تھی اور

شادی کے تین برس بعد بھی ہماری محبت پہلے اور پہلی رات کی

طرح تروتازہ اور خوبصورت تھی۔

وہ شروع ہی سے رومانٹک مزاج کی لڑکی تھی۔

خوبصورتی سے اسے عشق تھا۔ خوبصورت پھول، خوبصورت

نظارے، خوبصورت پرندے اور خوبصورت بچے اسے اپنی

طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ چاندنی راتیں اس کا جنون

بڑھادیتیں۔ وہ کسی دیومالائی کہانی کے دیومالائی کردار کی

طرح تھی۔

گرمیوں میں جب چاندنی اپنے شباب پر ہوتی تو وہ

چھت پر بستر بچھا کر اس پر سفید چادر ڈال کر بیٹھتا اور مویجے

کے سفید پھول بھیج دیتی اور خود بھی سفید لباس پہن کر چھت پر

بیٹھی چاندنی کو دیکھتی رہتی۔ اس وقت واقعی وہ کوئی افسانوی

کردار ہی دکھائی دیتی تھی۔

میں اسے حاصل کرنے کے بعد خود کو بہت خوش قسمت

تصور کیا کرتا تھا۔

بہر حال تو ہم اس رات چاند کو دیکھنے سمندر کی طرف

چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی سفید گاڑی کنارے کی طرف

بہت آگے لے جا کر کھڑی کی تھی جہاں بہت کم لوگ ہوا

کرتے ہیں اور اس رات اتفاق سے وہاں ہم دونوں کے

علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

ہم ساحلی پٹے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ گئے۔

راحیلہ نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تھا۔ ہم آسمان پر

تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے جا رہے تھے کہ اچانک ہم دونوں

کی نگاہ دور سمندر کی طرف گئی۔ شاید سفید پرندوں کا بہت بڑا

خول تو ہوا پرواز کرتا ہوا خشکی کی طرف آ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خول کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ

آہستہ آہستہ اڑتا ہوا ہماری ہی طرف آ رہا تھا اور چاندنی میں

بہت واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں حیران ہو کر اس خول کی طرف دیکھتے رہے

تھے جو بہت قریب آ چکا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ پرندوں کا

خول نہیں تھا بلکہ وہ انسان تھے۔

انسان، سفید لبادے پہنے ہوئے۔ ان کے لبادے ہوا

سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے

کر رکھے تھے اور جیسے فضاؤں میں تیرتے ہوئے ہماری

طرف آرہے تھے۔

ہم دونوں انتہائی خوف زدہ اور مبہوت ہو کر ان کی

طرف دیکھنے جا رہے تھے۔ وہ اتنی کم بلندی پر تھے کہ تیز

چاندنی میں ان کے چہرے بھی واضح طور پر دکھائی دے

رہے تھے۔

ان میں کچھ مرد تھے اور کچھ عورتیں۔ ان کے چہروں پر

اداسی تھی اور وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ

آگے کیے ہوئے فضا میں تیر رہے تھے۔

پھر وہ اسی طرح تیرتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر

سے گزر گئے اور آہستہ آہستہ وہ غول مشرق کی طرف جاتے

جاتے معدوم ہو گیا۔

ہم دونوں پر چپکی طاری تھی۔ راحیلہ خوف زدہ ہو کر مجھ

سے لپٹ گئی تھی ”جنید! کیا تھا یہ؟“ اس نے وحشت زدہ ہو کر

پوچھا ”کون لوگ تھے یہ؟“

”خدا ہی جانتا ہے۔ چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔“ میں

نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ گاڑی کی طرف جاتے

ہوئے ہم دونوں کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ خدا ہی جانتا ہے

کہ ہم کس طرح واپس آئے تھے۔

راحیلہ تو اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے بخار آ گیا تھا۔ میں

نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا۔

میں نے اپنے کئی دوستوں سے اس حیرت انگیز واقعے کا

ذکر کیا۔ وہ بھی سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکے

تھے۔

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ میں راحیلہ کو اپنے ساتھ

سمندر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی۔

”سینس، میں چاندنی رات میں سمندر کو دیکھنا چاہتی ہوں، سنا

ہے بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

”ہاں، بہت خوبصورت!“ میں نے اس کی تائید کی۔

”میں تو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی دکھائیں۔“ اس نے کہا۔

راحیلہ میری بیوی تھی۔ ہم نے محبت کی شادی کی تھی اور

شادی کے تین برس بعد بھی ہماری محبت پہلے اور پہلی رات کی

طرح تروتازہ اور خوبصورت تھی۔

وہ شروع ہی سے رومانٹک مزاج کی لڑکی تھی۔

خوبصورتی سے اسے عشق تھا۔ خوبصورت پھول، خوبصورت

نظارے، خوبصورت پرندے اور خوبصورت بچے اسے اپنی

طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ چاندنی راتیں اس کا جنون

بڑھادیتیں۔ وہ کسی دیومالائی کہانی کے دیومالائی کردار کی

طرح تھی۔

گرمیوں میں جب چاندنی اپنے شباب پر ہوتی تو وہ

چھت پر بستر بچھا کر اس پر سفید چادر ڈال کر بیٹھتا اور مویجے

کے سفید پھول بھیج دیتی اور خود بھی سفید لباس پہن کر چھت پر

بیٹھی چاندنی کو دیکھتی رہتی۔ اس وقت واقعی وہ کوئی افسانوی

کردار ہی دکھائی دیتی تھی۔

میں اسے حاصل کرنے کے بعد خود کو بہت خوش قسمت

تصور کیا کرتا تھا۔

بہر حال تو ہم اس رات چاند کو دیکھنے سمندر کی طرف

چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی سفید گاڑی کنارے کی طرف

بہت آگے لے جا کر کھڑی کی تھی جہاں بہت کم لوگ ہوا

کرتے ہیں اور اس رات اتفاق سے وہاں ہم دونوں کے

علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

ہم ساحلی پٹے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ گئے۔

راحیلہ نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا تھا۔ ہم آسمان پر

تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے جا رہے تھے کہ اچانک ہم دونوں

کی نگاہ دور سمندر کی طرف گئی۔ شاید سفید پرندوں کا بہت بڑا

خول تو ہوا پرواز کرتا ہوا خشکی کی طرف آ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خول کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ

آہستہ آہستہ اڑتا ہوا ہماری ہی طرف آ رہا تھا اور چاندنی میں

بہت واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں حیران ہو کر اس خول کی طرف دیکھتے رہے

تھے جو بہت قریب آ چکا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ پرندوں کا

خول نہیں تھا بلکہ وہ انسان تھے۔

انسان، سفید لبادے پہنے ہوئے۔ ان کے لبادے ہوا

سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے

کر رکھے تھے اور جیسے فضاؤں میں تیرتے ہوئے ہماری

طرف آرہے تھے۔

ہم دونوں انتہائی خوف زدہ اور مبہوت ہو کر ان کی

طرف دیکھنے جا رہے تھے۔ وہ اتنی کم بلندی پر تھے کہ تیز

چاندنی میں ان کے چہرے بھی واضح طور پر دکھائی دے

رہے تھے۔

ان میں کچھ مرد تھے اور کچھ عورتیں۔ ان کے چہروں پر

اداسی تھی اور وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ

آگے کیے ہوئے فضا میں تیر رہے تھے۔

پھر وہ اسی طرح تیرتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر

سے گزر گئے اور آہستہ آہستہ وہ غول مشرق کی طرف جاتے

جاتے معدوم ہو گیا۔

ہم دونوں پر چپکی طاری تھی۔ راحیلہ خوف زدہ ہو کر مجھ

سے لپٹ گئی تھی ”جنید! کیا تھا یہ؟“ اس نے وحشت زدہ ہو کر

پوچھا ”کون لوگ تھے یہ؟“

”خدا ہی جانتا ہے۔ چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔“ میں

نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ گاڑی کی طرف جاتے

ہوئے ہم دونوں کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ خدا ہی جانتا ہے

کہ ہم کس طرح واپس آئے تھے۔

راحیلہ تو اتنی خوف زدہ تھی کہ اسے بخار آ گیا تھا۔ میں

نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا۔

میں نے اپنے کئی دوستوں سے اس حیرت انگیز واقعے کا

ذکر کیا۔ وہ بھی سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکے

تھے۔

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔ میں راحیلہ کو اپنے ساتھ

سمندر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی۔

”سینس، میں چاندنی رات میں سمندر کو دیکھنا چاہتی ہوں، سنا

ہے بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

”ہاں، بہت خوبصورت!“ میں نے اس کی تائید کی۔

”میں تو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی دکھائیں۔“ اس نے کہا۔

راحیلہ میری بیوی تھی۔ ہم نے محبت کی شادی کی تھی اور

شادی کے تین برس بعد بھی ہماری محبت پہلے اور پہلی رات کی

طرح تروتازہ اور خوبصورت تھی۔

وہ شروع ہی سے رومانٹک مزاج کی لڑکی تھی۔

خوبصورتی سے اسے عشق تھا۔ خوبصورت پھول، خوبصورت

نظارے، خوبصورت پرندے اور خوبصورت بچے اسے اپنی

طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ چاندنی راتیں اس کا جنون

بڑھادیتیں۔ وہ کسی دیومالائی کہانی کے دیومالائی کردار کی

طرح تھی۔

گرمیوں میں جب چاندنی اپنے شباب پر ہوتی تو وہ

چھت پر بستر بچھا کر اس پر سفید چادر ڈال کر بیٹھتا اور مویجے

کے سفید پھول بھیج دیتی اور خود بھی سفید لباس پہن کر چھت پر

فج کر نکل آنے والے ہر شخص کا یہی مشاہدہ تھا۔
خدا جانے یہ کیا بھید تھا، وہ کون لوگ تھے جن کا مشاہدہ
میں اور راحیلہ اپنی جانتی آنکھوں سے کر چکے تھے۔
میں نے راحیلہ کو بھی وہ کتاب پڑھنے کے لیے دے دی
تھی۔ وہ بھی بہت حیران ہوئی تھی۔ میں نے اسی کے مشورے
پر ایک معروف عالم دین سے رابطہ کیا۔ ان سے ملاقات
کر کے میں نے پہلے تو اپنا اور راحیلہ کا مشاہدہ بتایا پھر وہ
کتاب ان کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا ”محترم! آخر یہ
سب کیا ہے؟ وہ کون لوگ تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ وہ پرواز کرتے ہوئے لوگ صرف ان کو دکھائی دیتے ہیں
جو ممکنہ موت کے حملے سے باہر نکل آئے ہوں۔ پھر ہم دونوں
نے کیسے دیکھ لیا جبکہ ہمارے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“
”کبھی بھی خدا کچھ لوگوں کی بصیرت کو بہت کشادہ
کر دیتا ہے۔“ عالم دین نے فرمایا ”وہ ایسی باتیں بھی دیکھ
لیتے ہیں جو عام مشاہدے میں نہیں آتیں۔“
”محترم، دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں؟“ میں
نے پوچھا۔

”اس سلسلے میں زیادہ کرید نہ کرو تو بہتر ہے۔“ انہوں
نے کہا ”کوئی ضروری نہیں ہے کہ خدا کا ہر معاملہ انسان کی سمجھ
میں آجائے۔ تم اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھو۔“
میں ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔
راحیلہ ان دنوں امید سے تھی۔ بہت عرصے کے بعد
ہمارے گھر خوشی کی خبر آنے والی تھی۔ ویسے تو وہ اپنی اس
زندگی سے خوش اور مطمئن تھی لیکن کبھی کبھی کسی بچے کی ضرورت
محسوس ہوتی تھی اور اب وہ کی پوری ہونے والی تھی۔
میں نے شہر کی ایک بہترین گائنا کالوجسٹ کو راحیلہ کے
لیے مقرر کر لیا تھا۔ ہر ہفتے پابندی کے ساتھ اس کا چیک اپ
ہوا کرتا تھا۔

ایک رات راحیلہ نے بہت تکلیف محسوس کی۔ وہ ساری
رات درد سے تڑپتی رہی تھی۔ دوسری صبح میں اسے گاڑی میں
بٹھا کر اسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر
دو چار ٹیسٹ لکھ کر دے دیے تھے۔ رپورٹ دیکھنے کے بعد
اس نے بتایا ”جنید صاحب! بہت ممکن ہے کہ آپ کی وائف
کے یہاں ڈیوری آپریشن سے ہو۔ وہ بھی میجر آپریشن!“
”میرے خدا! وہ کیوں؟“ میں یہ سن کر پریشان ہو گیا
تھا۔

”بچے کی کنڈیشن ہی ایسی ہے۔“ اس نے بتایا ”پھر بھی

ہماری کوشش ہوگی کہ ایسا نہ ہو۔“

لیکن وہی ہوا جو مقدر میں لکھا ہوا تھا۔ آپریشن ہوا اور
راحیلہ اس آپریشن کو برداشت نہیں کر سکی۔ دونوں مر گئے
تھے۔ ماں بھی اور اس کی کوکھ میں جنم لیتا ہوا بچہ بھی۔
مجھ پر جیسے قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے راحیلہ سے
کتنی محبت کی تھی، میری زندگی کے لیے وہ کتنی ضروری تھی،
میں تو بالکل ہی خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں رہا تھا
میرے پاس! راحیلہ اپنے ساتھ میری ہر خوشی لے کر چلی گئی
تھی۔ میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ طویل چھٹی لے کر دور دراز
علاقوں کی طرف نکل گیا۔

یہ مشورہ میرے دوستوں اور رشتے داروں نے دیا تھا
کہ میں کچھ عرصے کے لیے کہیں چلا جاؤں کیونکہ اس شہر سے،
اس محلے سے اور اس گھر سے راحیلہ کی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ
یادیں جو مجھے پاگل کیے دے رہی تھیں۔

میں نے اپنا مختصر سامان ساتھ لیا اور پہاڑی علاقوں کی
طرف چلا آیا۔ راحیلہ تو یہاں بھی موجود تھی۔ ہم سال میں
ایک بار ان علاقوں کی سیر کے لیے ضرور آیا کرتے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ راحیلہ ایک آرٹسٹک مزاج کی لڑکی
تھی۔ اسے فطرت کا حسن بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ پہروں دور
نظر آنے والے پہاڑوں کی طرف دیکھتی رہتی۔
خوبصورت وادیوں میں کسی تلی کی طرح اڑتی رہتی۔

ہمارا پسندیدہ ایک ریست ہاؤس تھا۔ عام طور پر ہم اسی
ریست ہاؤس میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کے دالان اور
کمروں سے پوری وادی کی کھلی ہوئی کتاب کی طرح دکھائی
دیا کرتی تھی۔

میں جب وہاں پہنچا تو وہاں کانگراں نبی بخش پہلے کی
طرح موجود تھا۔ وہ مجھے تہہ دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔

”کیا بات ہے صاحب! بی بی جی اس بار ساتھ نہیں
آئیں؟“ اس نے میرا سوٹ کیس سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اب کبھی ساتھ نہیں آئیں گی نبی بخش!“ میں
دھیرے سے بولا ”انہوں نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ
چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے پاس واپس چلی
گئی ہیں۔“

”اوہ، صاحب جی، یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”ہاں نبی بخش! اب میں تمہارے گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”شہر میں ہر طرف اس کی یادیں تھیں اسی لیے میں خود کو
بھلانے کے لیے یہاں آ گیا ہوں لیکن یہاں بھی تو ہر طرف

اس کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ تم خود بتاؤ، میں کہاں
جاؤں؟“

”آپ کہیں بھی جائیں صاحب! یہ یادیں آپ کے
ساتھ رہیں گی کیونکہ یادوں کا رشتہ جگہوں سے نہیں ہوتا، دل
سے ہوتا ہے۔“ نبی بخش نے بہت گہری بات کہہ دی تھی۔

”ٹھیک کہتے ہو نبی بخش!“ میں نے ایک گہری سانس
لی ”واقعی یادوں کا تعلق دل ہی سے ہوتا ہے۔“

”میں آپ کا پرانا کمراسیٹ کر دیتا ہوں۔“ نبی بخش
نے کہا ”وہ بہت آرام دہ کمراسیٹ ہے۔“

وہ کمر راحیلہ کی یادوں سے بھرا ہوا تھا جیسے پورے
کمرے میں اس کی سرگوشیاں گونج رہی ہوں۔ نبی بخش
میرے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔ پھر کھانے کا بندوبست
کرنے چلا گیا۔

میں چائے کی پیالی لے کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ سب
کچھ پہلے کی طرح تھا۔ وہی کھڑکی، وہی کمر، وہی مناظر۔
وہی رات کے اندھیرے میں جگمگاتے ہوئے بے شمار جگنو۔

سب کچھ تو وہی تھا سوائے راحیلہ کے۔ میرے خدا! یہاں
آ کر میری بے چینی میں تو اور بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔

”جنید!“ کسی نے مجھے آواز دی۔

میں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی تو نہیں
تھا لیکن میں نے اپنا نام واضح طور پر سنا تھا اور وہ آواز راحیلہ
کی تھی۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ تو ہر وقت
میرے کانوں میں گونجا کرتی تھی لیکن یہ یادوں والی آواز
نہیں تھی اور نہ ہی میں کسی واسطے میں تھا۔ بلکہ یہ واقعی راحیلہ
ہی کی آواز تھی جو ایک بار پکار کر خاموش ہو گئی تھی۔

مجھے احساس ہے کہ میں اس وقت خوف زدہ بھی ہو گیا
تھا۔ یہ ایک ان ہونی سی بات تھی۔ راحیلہ تو مر چکی تھی، میں
نے خود اسے ڈھیروں مٹی تلے دبا دیا تھا۔ پھر وہ مجھے آواز
کیسے دے سکتی تھی۔ یہ میرا واہمہ ہی ہو سکتا تھا۔

نبی بخش کھانا لے کر آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس وقت
ریسٹ ہاؤس میں کوئی غیر ملکی ٹھہرا ہوا تھا۔ نبی بخش اس سے
کچھ خوف زدہ معلوم ہوتا تھا ”صاحب! وہ تو بہت عجیب آدمی
ہے۔“

”کیا خاص بات ہے اس میں؟“

”صاحب، وہ اندھیری راتوں میں بھی دور دور نہ
جانے کہاں کہاں بھٹکنے کے لیے چلا جاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”اسے کسی چیز سے ڈر بھی نہیں لگتا۔“

”تو اس میں ایسی کون سی بات ہوگئی۔“ میں نے کہا۔
”ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنہیں ڈر نہیں لگتا۔“
”وہ تو ٹھیک ہے صاحب، لیکن جب آپ اسے دیکھیں
گے تو خود ہی کہیں گے کہ وہ عجیب آدمی ہے۔“

اس رات اس ایک واسطے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں
ہوئی۔ بہت دیر تک جاگتے رہنے کے بعد مجھے نیند بھی آ گئی
تھی۔ دوسری صبح میں نے اس آدمی کو بھی دیکھ لیا جس کے
بارے میں نبی بخش نے بتایا تھا۔

وہ کوئی بنگالی یا برمی معلوم ہوتا تھا۔ دبلا پتلا جسم، طوطے
کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی ناک اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔
اس کے چہرے میں یقیناً کوئی ایسی خاص بات تھی جو خوف
زدہ کر دیتی تھی۔

میں اس وقت دالان میں بید کی کرسی پر بیٹھا چائے پی
رہا تھا کہ وہ بھی میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا ”صبح بخیر!“ اس
نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرا نام چلیاس ہے۔“
اس نے بتایا۔

عجیب نام تھا چلیاس! اور اس کی اردو بہت صاف
تھی ”میں جنید ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔

”میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔“ اس نے بتایا ”بہت
خوبصورت جگہ ہے۔“

”کیا آپ کا تعلق پاکستان سے نہیں ہے؟“ میں نے
پوچھا۔

”نہیں، میرا تعلق سری لنکا سے ہے۔“ اس نے بتایا۔
”آوارہ گرد قسم کا انسان ہوں۔ برسوں ہندوستان میں بھٹکتا
رہا۔ اب پاکستان میں بھٹک رہا ہوں اسی لیے میری اردو اتنی
اچھی ہو گئی ہے۔“

میں یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ اور بولے۔ اپنے بارے میں
کچھ اور بتائے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس سے کچھ دلچسپی محسوس
ہونے لگی تھی۔ ایک تو اس کا نام ہی عجیب تھا، پھر اس کی
شخصیت اور بھی عجیب تھی۔ کچھ پراسراری۔

اس نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا ”کیا آپ
یہاں پہلی بار آئے ہیں؟“

”نہیں چلیاس صاحب! میں ہر سال یہاں آتا
ہوں۔“ میں نے بتایا ”لیکن اس بار اکیلا آیا ہوں کیونکہ میں
ہر سال اپنی بیوی کے ساتھ آتا تھا لیکن اس بار وہ اس دنیا میں
نہیں رہی۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”اوہ!“ وہ اچانک اس طرح آگے جھک آیا جیسے اسے

میری بیوی کی موت کا سن کر بہت مسرت سی ہوئی ہو۔ پتا نہیں یہ بھی شاید میرا وہم ہی ہوگا کہ میں نے واضح طور پر اس کو مسکراتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی پراسرار آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ کیوں، یہ میں خود نہیں جانتا۔

”مسٹر جنید! بتائیں، آپ کی بیوی کا انتقال کب ہوا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔
”کس طرح، میرا مطلب ہے کیا ہوا تھا آپ کی وائف کو؟“

”مسٹر چلیاس! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو میری بیوی کی موت سے کیا دلچسپی ہوگئی ہے۔“ میرا لہجہ روکھا تھا۔
”آپ برا نہ مانیں۔“ وہ جلدی سے بولا ”میں اس کی وجہ بتا دیتا ہوں۔ میں موت پر ریسرچ کر رہا ہوں یعنی لوگ کن حالات میں مرتے ہیں۔ کیا وجوہات ہوتی ہیں۔ بیماریوں سے، حادثوں سے یا کسی اور سبب سے؟ قدرتی موت، حادثاتی موت وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنی ڈائری میں سب تحریر کرتا جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھتا ہوں کہ مرنے والے کی موت کے بعد کیا اس مرحوم کے گھر والوں کے ساتھ کوئی واقعہ تو نہیں ہوا جیسے بہت سے لوگوں کو اپنے مرحومین زندہ چلتے پھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سوں کو مرنے والوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ میرا سبیکٹ ہے اسی لیے میں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا۔“

میرا دل چاہا کہ اسے یہ بتا دوں کہ میں نے آج ہی اپنی بیوی کی آواز سنی تھی یا کم از کم مجھے ایسا محسوس ہوا تھا لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے اور ایسی ریسرچ سے اس کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ شام کے وقت ریٹ ہاؤس سے نکل کر یوں ہی گھومتا رہا۔ ہر اس جگہ گیا جہاں میں اور راحیلہ بیٹھا کرتے تھے۔

رات کھانے سے فارغ ہو کر میں پھر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ نبی بخش سونے چلا گیا تھا۔ اس وقت اس ریٹ ہاؤس میں صرف دو ہی افراد تھے، ایک میں اور دوسرا وہ چلیاس۔

شاید رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے جب سامنے کی طرف سے اندھیرے میں کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی آمد کا اندازہ اس کے ہاتھ میں دہی ہوئی ٹارچ سے ہو رہا تھا جس کو وہ کبھی کبھی روشن کر دیتا تھا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ چلیاس ہی تھا جو اتنی رات گئے نہ جانے کس طرف سے چلا آ رہا تھا۔

وہ مجھے برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا تھا۔
”کیا بات ہے مسٹر جنید! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟“ اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، نیند نہیں آرہی تھی۔“ میں نے بتایا ”لیکن آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟“
”مسٹر جنید! بات یہ ہے کہ میں.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”بتائیں، کیا کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”مسٹر جنید! میں نے آپ کو اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ میں روحوں کا شکاری بھی ہوں۔“ اس نے کہا۔
”کیا کہا، روحوں کا شکاری.....!“

”جی ہاں، روحوں کا شکاری۔ اس علاقے میں بہت سی روچیں بھٹکتی رہتی ہیں اور میں ان کا شکار کرتا ہوں۔“
”بہت خوب!“ میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ ”پھر تو آپ دنیا کے سب سے بڑے شکاری ہوئے؟“

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔“ اس کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ وہ آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ اس کے لہجے میں تحکم بھی شامل ہو گیا تھا۔ ”یہ مذاق نہیں ہے مسٹر جنید! اگر تم کہو تو میں تمہاری بیوی کی روح کو بھی حاضر کر سکتا ہوں۔“

میں نے اس بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اسے حضرات کا علم کہتے ہیں لیکن میں نے ایسی باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔

”بتاؤ، کیا میں تمہاری بیوی کی روح کو حاضر کر دوں؟“
”مجھے ایسی فضولیات پر یقین نہیں ہے مسٹر چلیاس!“ میں نے کہا۔

”تم تجربہ تو کر کے دیکھو۔ اگر میں ناکام ہوا تو میرا مذاق اڑاتے رہنا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“

میں بھی تاؤ میں آ گیا تھا ”چلو ٹھیک ہے، بلاؤ میری بیوی کی روح کو۔“ میں بھی آپ سے تم پر آ گیا تھا۔
”اب مجھے اپنی بیوی کے بارے میں بتاؤ۔ اس کا نام“

اس کی عمر، اس کی صورت شکل، اور اگر اس کی کوئی تصویر تمہارے پاس ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“
”اس کی ایک تصویر ہر وقت میرے پاس ہی رہتی ہے۔“ میں نے بتایا۔
”دکھاؤ مجھے!“ اس نے کہا۔

میں نے راحیلہ کی تصویر برس سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کچھ دیر تک تصویر کو گھورنے کے بعد مجھے واپس کر دی تھی۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر کے کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔

سچ یہ ہے کہ اس وقت خود میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ کیا واقعی یہ شخص راحیلہ کی روح کو بلا سکتا ہے اگر وہ واقعی آگئی تو کس روپ میں ہوگی؟ کیا وہ مجھ سے باتیں کر سکے گی؟ کیا واقعی میں اسے دیکھ سکوں گا؟ کیا یہ سب ممکن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات اور خیالات اس وقت میرے ذہن میں تھے۔

وہ بہت دیر تک کچھ پڑھتا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ”مسٹر جنید! میں ناکام ہو گیا ہوں۔“ اس نے کہا ”تمہاری بیوی کی روح میرے قابو میں نہیں آرہی ہے۔“

میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے ہنسا شروع کر دوں۔ اس کا مذاق اڑاؤں۔ اسے بتاؤں کہ وہ ایک جھوٹا آدمی ہے۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔

لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور وہ میرے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شاید وہ اتنا شرمندہ تھا کہ اس نے مجھ سے پھر کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا اور میں نے ایک بار پھر راحیلہ کی آواز سنی۔ اس بار یہ آواز بہت واضح تھی ”جنید، مجھے بچاؤ۔“

میں خوف اور حیرت سے کانپ کر رہ گیا تھا۔ وہ آواز سونی صدر راحیلہ کی تھی۔ اس بار مجھے کوئی وہم نہیں ہوا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، مجھے بچاؤ۔ کس سے بچانے کے لیے کہہ رہی تھی، کیوں کہہ رہی تھی، کیا ہوا تھا اس کو؟

پھر رات بھر مجھے نیند نہیں آ سکی۔ خوف تو بس ایک لمحے کا تھا۔ اس کے بعد انتظار کی کیفیت تھی کہ شاید وہ آواز دوبارہ سنائی دے۔

لیکن پھر رات بھر کچھ بھی نہیں ہوا۔

واقعہ باللہ

صحت مند، حسین و جمیل انسان۔ عباسیہ عہد کا خلیفہ جس کا نام ابو جعفر ہارون اور لقب واقعہ باللہ ہے۔ ایک صاحب عقل انسان، صاحب ذوق شاعر بھی تھا۔ 20 شعبان 196ھ کو قرطین نامی رومی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اپنے باپ مقسم باللہ کے عہد خلافت ہی میں ولی عہد مقرر ہو گیا تھا۔ رجب الاول 227ھ میں والد کی وفات کے بعد عنان حکومت سنبھالی۔ خلاف معمول ترکوں کی مخالفت مول لینے کی بجائے اس نے ان پر لطف و کرم کی بارش کر دی۔ ان کو بڑے بڑے مناصب دیے۔ مراد اشاس نامی ترکی کو نائب السلطنت کا عہدہ جلیلہ دیا۔ اس سے قبل کسی خلیفہ نے اپنا نائب مقرر نہ کیا تھا۔ اس کے عہد کی ابتدا میں قلعیوں نے فتنہ و شر کی آگ پھیلائی۔ اس نے رجا بن ایوب کو فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا جس نے ڈیڑھ ہزار قلعیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر امن قائم کیا اور..... مہر قح نامی تخریب پسند کو گرفتار کر لیا۔

مرسلہ: سلطان اختر، دام

دن بھی یوں ہی گزر گیا۔ راحیلہ کو یاد کرتے ہوئے، مختلف مقامات کی سیر کرتے اور نبی بخش سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے۔ البتہ وہ روحوں کا شکاری مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ نبی بخش نے اس کے بارے میں بتایا کہ وہ تو آج صبح ہی کہیں چلا گیا۔

اتفاق تھا کہ دوسری رات بھی میں برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا جب چلیاس کہیں سے آیا تھا۔ اس رات اس نے رومی طور پر مجھ سے سلام دعا کی اور سیدھے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے چارہ اپنے تجربے کی ناکامی پر شرمندہ ہو رہا ہوگا۔

اس رات پھر راحیلہ کی آواز آئی ”جنید، مجھے بچاؤ، تم سنتے کیوں نہیں؟“

بہت ہی صاف آواز، بہت واضح۔ جیسے راحیلہ میرے قریب، بہت ہی قریب کھڑی ہو۔ میں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر وہ آواز، اتنی واضح آواز میرا وہم نہیں ہو سکتی تھی؟

اور اگر وہ نہیں تھی تو پھر یہ سب کیا تھا۔ راحیلہ یہاں کیسے آگئی تھی۔ اگر اس کی روح مخاطب تھی تو کیا ہوا تھا اس کی روح کے ساتھ۔ وہ کس سے بچانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ کون اسے پریشان کر رہا تھا۔

میں اب خوف زدہ نہیں تھا لیکن بے چینی حد سے زیادہ ہوگئی تھی۔ راحیلہ کی ساری یادیں جیسے ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوگئی تھیں۔ وہ شاید میرا مطلب ہے اس کی روح کسی مصیبت میں تھی۔ وہ میری محبت تھی، میری بیوی تھی۔ میں نے اس سے پیار کیا تھا اسی لیے وہ پریشان ہو کر مجھے پکار رہی تھی۔ میرے خدا! میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟

کچھ بھی نہیں، اس کا تعلق تو اب کسی اور دنیا سے تھا۔ وہ کہیں اور جا چکی تھی۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ مجھے مدد کے لیے کیوں کہہ رہی تھی۔ کیا اس کی روح کو یقین تھا کہ میں اس کی مدد کر سکتا ہوں؟

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں اس آواز کے انتظار میں تھا۔ یہ ایک ان نچرل سی بات تھی، بالکل انہونی۔ ایسا کہاں ہوا کرتا ہے۔ اس کے باوجود ایسا ہو رہا تھا۔

اس رات میں نے دوبارہ اس کی آواز نہیں سنی۔ البتہ دوسری صبح چلپاس مجھے مل گیا۔ وہ تیزی سے باہر جا رہا تھا۔ مجھے برآمدے میں دیکھ کر وہ اسی تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ ”مسٹر جنید! میں روجوں کے شکار کے لیے جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا ”کیا تم میرے ساتھ چل رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں مسٹر چلپاس! اس قسم کا شوق تم ہی کو مبارک ہو۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک حقیر آمیز طنز یہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پھر وہ مجھے بائی بائی کرتا ہوا اسی تیزی سے باہر چلا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے اس آدمی سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد نبی بخش میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا اور بار بار اس طرف دیکھنے لگتا جس طرف چلپاس گیا تھا۔

”کیا بات ہے نبی بخش! تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”صاحب! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ڈر لگ رہا ہے، کس سے؟“

”اسی آدمی سے صاحب!“ اس نے بتایا۔

”کیوں، تمہیں اس سے ڈر کیوں لگ رہا ہے؟“ میں

نے پوچھا۔

”صاحب، میں نے رات بھر اس کے کمرے سے کسی لڑکی کے رونے کی آوازیں سنی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیا!“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”سچ کہہ رہا ہوں صاحب! میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پتا نہیں، کون ہے بے چاری! رات بھر روتی رہی ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیا اس نے کسی لڑکی کو بند کر رکھا ہے؟“

”پتا نہیں صاحب! لیکن ایسا ہو تو نہیں سکتا۔ میں تو ہر روز کئی بار اس کے کمرے میں جاتا ہوں۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔“

”پھر وہ رونے والی کون ہے؟“

”پتا نہیں صاحب! وہ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ صاحب، کیوں نہ اس کے کمرے میں چل کر دیکھیں۔ کیا پتا کسی کو باندھ کر رکھا ہوا ہو۔“

”نبی بخش! اگر وہ واپس آ گیا..... اور اس نے دیکھ لیا تو؟“

”وہ اس وقت کہاں آتا ہے صاحب! وہ تو رات ہی کو آئے گا۔“

چونکہ مجھے بھی کچھ تجسس سا ہو گیا تھا اس لیے میں نے نبی بخش کے ساتھ چلپاس کے کمرے میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کمرے کی ایک چابی نبی بخش کے پاس بھی تھی۔

لیکن کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ کتابیں تھیں جو شاید سوا حلی زبان کی تھیں، ایک سوٹ کیس تھا۔ پانی کا ایک جگ اور کچھ مرتبانوں کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

نبی بخش نے بستر کے نیچے بھی جھانک کر دیکھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ ”نہیں صاحب! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے کہا ”لیکن میں نے خود لڑکی کے رونے کی آوازیں سنی ہیں۔“

”پتا نہیں کیا چکر ہے، چلو اب باہر نکلو۔“

ہم کمرے سے باہر آنے لگے اور اسی وقت میری نگاہ دیوار کے ایک کونے کی طرف گئی۔ فرش پر ایک چیز پڑی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اس کونے تک گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چیز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی عورت کے پاؤں کی سینڈل تھی۔ صرف ایک، ایک پیر کی۔ میں اس سینڈل کو بہت اچھی طرح پچھانتا تھا۔ وہ سینڈل راحیلہ کی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اسے منفرد ڈیزائن کی وجہ سے راحیلہ کو وہ سینڈل بہت پسند آ گیا تھا۔ اس نے میرے ہی ساتھ جا کر خرید لیا تھا اور اس کو بہت عزیز رکھتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس کی موت کے بعد میں نے سینڈل کا وہ جوڑا بہت احتیاط سے اس کی یادگار کے طور پر اپنے گھر میں رکھ لیا تھا اور اب ایک پاؤں کی سینڈل یہاں دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر اسرار شخص کے کمرے میں، خدا جانے یہ سب کیا تھا۔

”کیا ہوا صاحب، آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟“ نبی بخش کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”یہ سینڈل نبی بخش!“ میں نے سینڈل دکھاتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں کیا بات ہے صاحب، یہ تو زنانہ سینڈل ہے لیکن اس کمرے میں کہاں سے آگئی۔ کہیں وہ اسی لڑکی کی تو نہیں ہے جو رات بھر روتی رہتی ہے لیکن وہ لڑکی ہے کہاں؟ وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

”نبی بخش! میرا دل ڈوب رہا ہے۔ تم مجھے سہارا دے کر میرے کمرے میں لے چلو۔ ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔“

”آجائیں صاحب!“ نبی بخش نے اپنا ہاتھ سہارے کے لیے بڑھا دیا۔

اس نے مجھے میرے کمرے تک پہنچا دیا تھا۔ میں بستر پر گر پڑا تھا۔ ذہن میں آنندھیاں چل رہی تھیں۔ کیا تھا یہ سب۔ کیا محض اتفاق تھا؟

ہو سکتا ہے کہ وہ سینڈل بھی اسی طرح کا ہو جس طرح کا میں نے راحیلہ کے لیے خریدا تھا۔ تو پھر مجھے دوبار راحیلہ کی آوازیں کیوں سنائی دی تھیں؟ وہ مجھ سے بچانے کے لیے کیوں کہہ رہی تھی۔

اور اگر وہ راحیلہ ہی کی سینڈل تھی تو پھر یہاں اس کمرے میں کہاں سے آگئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خود راحیلہ نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی ہو لیکن کس طرح؟

خدا جانے یہ سب کیا تھا؟

ویسے اس وقت میرے دل کی عجب حالت ہو رہی تھی۔ میں رونا چاہ رہا تھا۔ راحیلہ پوری شدت کے ساتھ یاد آ رہی تھی۔ شاید وہ میرے آس پاس ہی تھی لیکن کہاں؟

کچھ دیر بعد نبی بخش میرے لیے چائے بنا کر لے آیا

تھا۔ اس نے میرا یہ حال دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے صاحب! آپ مجھے بتائیں، کیا ہوا ہے آپ کو؟ شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں؟“

اور اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل جاہا کہ میں نبی بخش کو سب کچھ بتا دوں۔ شاید اس میں خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میں نبی بخش کو ساری کہانی سنا دوں۔

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ راحیلہ سے محبت، شادی، پھر اس کی موت۔ اپنی بے زاری اور بے چینی اور یہاں آنے کے بعد راحیلہ کی آوازیں۔ پھر راحیلہ کی سینڈل کا اس آدمی کے کمرے میں پایا جانا۔ میں نے نبی بخش کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

”یہ تو عجیب کہانی ہے صاحب!“ اس نے کہا ”مجھے آپ کے دکھ کا اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کو کیسا لگ رہا ہوگا لیکن آپ پریشان نہ ہوں، آپ میرے ساتھ چلیں، ابھی اسی وقت۔“

”کہاں چلوں؟“

”کشمیری صاحب کے پاس۔“ اس نے بتایا۔

”کون کشمیری صاحب؟“

”ایک بزرگ ہیں صاحب! جنگلوں میں رہتے ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں چونکہ یہ معاملہ کچھ اور ہے، اس لیے میں آپ کو ان کے پاس لے جا رہا ہوں۔“

میں نے نبی بخش کی بات مان لی اور اس کے ساتھ ہولیا۔

ہم جنگل کی طرف چل پڑے۔ نہ جانے کتنی دیر کے سفر کے بعد نبی بخش مجھے ایک جھونپڑی کے پاس لے آیا تھا۔

”کشمیری صاحب اسی جھونپڑی میں رہتے ہیں صاحب! خدا کرے وہ مل جائیں۔“

کشمیری صاحب مل گئے تھے۔

وہ کوئی عامل بابا وغیرہ نہیں تھے بلکہ ایک خوبصورت، تندرست انسان تھے۔ پچاس اور پچپن کے درمیان۔ نبی بخش کے تعارف کروانے کے بعد مجھ سے بہت تپاک سے ملے تھے۔

”جنید صاحب! میں ایک بڑھا لکھا شخص ہوں۔“

انہوں نے بتایا ”میں نے ماسٹر کر رکھا ہے لیکن میری دلچسپی شروع ہی سے روحانیت کی طرف رہی ہے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے کہ میں اس ویرانے میں کیوں آ کر رہنے لگا ہوں۔ اس وقت مسئلہ آپ کا ہے، آپ مجھے بتائیں، کیا کہانی ہے؟“

پارو

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!

یہ میری اپنی کہانی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے گمشدہ اوراق کو کہانی کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عورت واقعی ایک پھیلی ہے، اس کا اندازہ میری آپ بیٹی سے بخوبی ہو جائے گا۔

سجاد حسن
(لاہور)



کشمیری صاحب مجھے اپنی جھونپڑی سے باہر لے آئے تھے جہاں دور دور تک کھلا ہوا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی شے سفید لبادے میں دونوں ہاتھ آگے کیے، میرے سر سے ذرا فاصلے پر پرواز کرتے ہوئے ایک طرف جارہی تھی، بہت آہستہ آہستہ۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میری بیوی تھی، میری راحیلہ۔ اس وقت اس کے چہرے پر سکون تھا، بلا کا سکون۔

اس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی جیسے وہ مجھے تسلی دے رہی ہو۔ پھر وہ پرواز کرتی چلی گئی، پرواز کرتی چلی گئی۔

اس وقت میں رو رہا تھا، بہت بری طرح۔ کشمیری صاحب نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، بس، اب اس کی روح کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگو۔ اور اس آدمی سے الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ ایسے لوگ بہت کینے ہوا کرتے ہیں۔ میری مانتو تو شہر واپس چلے جاؤ۔

میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا نئی بخش کے ساتھ واپس آ گیا۔

خلاف توقع ریٹ ہاؤس میں چلیاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ نئی بخش تو اسے دیکھ کر ہی کترا کر کسی طرف چلا گیا تھا۔

چلیاں نے میرے قریب آ کر کہا ”مسٹر جنید! میں نے تم سے غلط نہیں کہا تھا کہ میں روحوں کا شکاری ہوں۔ لیکن کبھی کبھی شکار ہاتھ سے نکل بھی جاتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، کوئی اور سہی۔“

میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اسی رات شہر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ گھر آتے ہی میں نے سب سے پہلے سینڈل کے اس جوڑے کو دیکھا۔ صرف ایک پیر کا سینڈل وہاں رکھا ہوا تھا۔

دوسرا اس شخص کے پاس تھا۔ اس کے پاس کیسے پہنچا۔ یہ ایسا بھید ہے جو آج تک ٹھل نہیں سکا ہے اور ہاں، اگر آپ راہ چلتے ہوئے اپنے سر کے اوپر پرندوں کو گزرتے ہوئے محسوس کریں تو یہ نہ سمجھیں کہ وہ پرندے ہی ہوں گے۔

وہ آپ کے دوست، رشتے دار یا آپ کی محبت بھی ہو سکتے ہیں۔



میں نے ایک بار پھر پوری کہانی دہرا دی۔ کشمیری بابا بہت دھیان سے سنتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ”معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ آپ مجھے دس منٹ دیں۔ میں Meditation کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کشمیری صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی جھونپڑی میں خاموشی تھی، مکمل خاموشی۔ صرف سانسوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس دوران میری بے چینی میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔

کیا جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی کوئی توجیہ پیش کی جاسکتی تھی؟ لیکن کبھی کبھی اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

کشمیری صاحب نے دس منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر دھیرے سے بولے ”جنید صاحب! اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے دھیان سے سنیں اور اس پر عمل کریں۔“

”جی فرمائیں، کیا کرنا ہوگا مجھے؟“

”جنید صاحب! بد قسمتی سے آپ کی چھٹی مرحومہ بیوی کی روح اسی شخص کے قبضے میں ہے۔“ انہوں نے بتایا ”اس نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی بیوی کی روح اس کے قابو میں نہیں آرہی ہے۔ اس نے تو اسی وقت اس پر قابو پایا تھا جب آپ نے اس کی تصویر دکھائی تھی۔“

”میرے خدا! کیا یہ!..... یہ سب کچھ ہو سکتا ہے؟“

”ہاں، سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں ایسی ایسی شیطانی طاقتیں ہیں کہ آپ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

انہوں نے کہا ”اور آپ نے اپنی بیوی کی جو آوازیں سنیں، وہ آپ کا وہم نہیں تھا۔ وہ واقعی آپ کو پکار رہی تھی۔“

”آپ بتائیں، میں اس کے لیے کیا کروں؟“

”آپ کچھ نہ کریں۔“ انہوں نے کہا ”آپ کی بیوی کی روح کو میں اس کے چنگل سے آزاد کر رہا ہوں۔ کیسے، کس طرح، آپ ان چکروں میں نہ پڑیں۔“

”کشمیری صاحب! کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟“

”ہاں، ایسا ہی ہوگا۔“ وہ بہت یقین سے بولے ”آپ کو خود اس کی آزادی کا احساس ہو جائے گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ شاید دس بارہ منٹ کے بعد میں نے ایک آواز سنی۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز۔ اس وقت

بھول چکا ہوتا تھا کہ اس نے کس خواہش سے آغاز کیا تھا۔ وہ میرے چاچے کی لڑکی تھی، ہم ایک ہی گھر میں رہے اور پہلے بڑھے، ایک ساتھ اسکول میں داخل ہوئے، پھر وہ مڈل کر کے گھر بیٹھ گئی اور میں نے میٹرک میں داخلہ لے لیا۔ ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول صرف مڈل تک تھا البتہ لڑکوں کے لیے میٹرک کی سہولت تھی۔ جس روز ہم رات کی تاریکی میں چھپ کر فرار ہوئے میرا میٹرک کا نتیجہ آیا تھا۔ ابا نے خوش ہو کر پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی تھی۔

اتفاق سے ہم دونوں ہی ابا اور چاچے کی ایک ہی اولاد تھے۔ ابا اور چاچے ایک دوسرے کے رشتے دار تھے۔ گاؤں میں دور پرے کے بہت رشتے دار تھے مگر خون کے رشتے بس ان دو بھائیوں تک محدود رہ گئے تھے۔ ابا چاچے سے دو سال بڑے تھے اور گاؤں میں یہ خاص بڑائی شمار نہیں ہوتی ہے اس لیے دونوں میں بڑے اور چھوٹے بھائی کے بجائے دوستوں کا سناٹا تھا۔ دونوں کی شادی بھی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ دادی ماں نے مرنے سے پہلے یہ آخری کام کیا تھا اور اپنی اولاد کی اولاد دیکھے بغیر دنیا سے چلی گئیں۔ اماں کی گود دو سال بعد بھری اور چاچے کی گود پہلے ہی سال بھر گئی تھی۔ ایک سال تک پارو اکلوتی رہی تھی اس لیے سب کی محبتیں وہی سمیٹتی رہی۔ پھر دوسرے سال میں پیدا ہوا اور لڑکا تھا اس لیے ساری توجہ میری طرف منتقل ہو گئی اور میری آؤ بھگت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ پارو سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔

بچپن میں اس نے میری بہت پٹائی کی اور ایک بار تو تقریباً ماری دیا تھا۔ اس نے مجھے کنویں میں ڈھکیل دیا تھا۔ ابانے مجھے اپنے قریب کنویں کی منڈیر پر بٹھایا ہوا تھا۔ اس وقت میں مشکل سے سال بھر کا تھا۔ نیچے کھڑی پارو نے اچانک ہی میرے پاؤں پکڑ کر الٹ دیا اور میں سر کے بل کنویں میں جانے والا تھا کہ ابانے لپک کر میری ٹانگ پکڑ لی۔ اس روز چاچے نے پارو کو پہلی بار بہت مارا۔ بیتی تو وہ پہلے بھی رہی تھی مگر اس دن چاچے نے صبح سے مارا تھا۔ اگر ماں جی نہ بچا تیں تو وہ مزید مار کھاتی۔ اصل میں چاچے کو بیٹے کی خواہش تھی اور یہ پوری نہیں ہوئی۔ جب میں پیدا ہوا تو ماں جی کے ساتھ چاچے کا بھی لاڈ لا ہوا تھا۔ اس پر ہی پارو مجھ سے چلتی تھی۔ وہ بچپن سے تیز طرار تھی۔ ایک بار پٹ کر اس نے سبق سیکھ لیا اور اس کے بعد مجھے ایسے تکلیف دیتی یا چوٹ لگاتی تھی کہ اس پر الزام نہ آئے۔ اس کے برعکس میں بے

وقوف تھا۔ روتا دھوتا لیکن کسی کو بتا نہیں پاتا تھا کہ مجھے اصل تکلیف پارو سے پہنچی ہے۔

پارو کی دادا گیری کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اس سے ڈرنے اور اس کا ہر حکم ماننے لگا۔ مجھے یاد ہے میں ماں جی یا ابا کی بات اس طرح نہیں مانتا تھا لیکن جب پارو کہتی تو میں ووڑ کر وہی کام کرتا۔ ماں جی کبھی ہنس کر کہتیں کہ لگتا ہے میری اصل ماں پارو ہے۔ جب پانچ سال کا ہوا تو صورت حال بدل گئی۔ میری سادگی اور جی حضور نے پارو کا دل میری طرف سے نرم کر دیا۔ اب وہ مجھے تکلیف نہیں دیتی تھی لیکن مجھ سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ ہم ایک ساتھ اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت میں چار سال کا تھا۔ پارو گھر سے نکلتے ہی اپنی تختی مجھے تھما دیتی تھی۔ آج سے کوئی چالیس سال پہلے گاؤں کے سرکاری اسکول میں تیسری جماعت تک سختی ہی چلتی تھی۔ کتاب کی شکل کوئی چوبھی جماعت میں جا کر نظر آتی تھی۔ اسکول میں بھی میں اس کے کاموں میں لگا رہتا۔ وہ کہتی تو بھاگ کر اس کے لیے پانی لاتا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھلتی اور میں اس کی چیزیں سنہالتا تھا۔

اسکول سے واپسی میں کھیتوں میں گھس کر اور درختوں پر چڑھ کر اس کے لیے پھل یا کچی سبزی لاتا تھا۔ ایک بار مجھے کتے نے کاٹ بھی لیا تھا۔ کسان فصل کے زمانے میں حفاظت کے لیے کتے رکھتے ہیں۔ یہ سبزی کا کھیت تھا جس میں مولی لگی ہوئی تھی۔ پارو نے مجھے مولی لانے کا حکم دیا اور میں سوچے سمجھے بغیر کھیت میں اتر گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب کتے نے بے خبری میں میری ٹانگ دیوچ لی۔ میری چیخ و پکار سن کر پارو موقع سے فرار ہو گئی اور جس کا کھیت تھا اس نے آکر مجھے کتے سے چھڑایا مگر اس وقت تک وہ میرے پاؤں پر کئی بار کاٹ چکا تھا۔ ہلدی اور ہینگ کے مسلسل لپ سے زخم ایک ہفتے میں جا کر ٹھیک ہوئے تھے۔ شکر ہے مجھے ری بینز نہیں ہوا۔ اس وقت صرف پاگل کتے کے کاٹنے پر ٹیکے لگوانے کی زحمت کی جاتی تھی۔ پارو نے گھر پہنچ کر بھی کسی کو نہیں بتایا۔ وہ تو کسان مجھے لے کر پہنچا تو گھر والوں کو پتا چلا۔ پارو صاف مگر گئی تھی کہ اسے نہیں معلوم کہ میں کب راستے میں اس سے الگ ہو گیا۔ حسب معمول میں اپنی سادگی میں بتا نہیں پایا تھا۔

البتہ اس بار میں پارو سے خفا ہو گیا۔ خفگی اس بات پر تھی کہ جب کتے نے مجھ پر حملہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ مگر یہ خفگی چند دن سے زیادہ برقرار نہیں رہی تھی۔ پارو

نے مجھ سے چند میٹھی میٹھی باتیں کیں، سہلایا اور چکارا تو میں سب بھول گیا تھا۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا۔ میری کے درخت پر بیٹھتے ہوئے پارو نے غلطی سے بھڑوں کے چھتے پر پھر مارا اور منہ میرا سوج گیا کیونکہ جب بھٹائی ہوئی بھڑیں نکلیں تو پارو نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔ نہر پر نہاتے ہوئے وہ کنارے سے ذرا آگے گئی اور ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو خود تو کنارے آگئی اور میں گہرے پانی میں غوطے کھانے لگا۔ بابا خوشے کی دکان سے مٹھائی چراتے ہوئے میں پکڑا گیا تو پارو نے مرمت لگاتے بابا خوشے کی ہمت افزائی کی حالانکہ مٹھائی میں اس کے کہنے پر چرا رہا تھا۔ اگر ایسے واقعات لکھنے بیٹھوں تو یہ چند صفحات ان سے ہی بھر جائیں۔

ہاں ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جب میں نے پارو کو مارا۔ اسکول سے آتے ہوئے وہ اچانک غائب ہوئی تو میں آس پاس دیکھتا ہوا درختوں کے اس جھنڈ تک آیا جہاں فضل کو پارو کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ فضل بڑا لڑکا تھا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ قد کاٹھ بھی خوب تھا۔ پارو نے بارہ سال کی عمر میں اچھا قد نکال لیا تھا اس کا جسم بھر گیا تھا۔ مجھے غصہ اس پر نہیں آیا تھا کہ فضل نے اسے لپٹا لیا ہوا تھا بلکہ اس بات پر آیا تھا کہ وہ خود بھی اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ میں نے دھاڑ ماری تو وہ جلدی سے فضل سے الگ ہو گئی۔ خود فضل کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر سنگین صورت حال سے دوچار ہو سکتا ہے۔ گاؤں دیہات میں آج بھی ایسی باتوں پر لاشیں گر جانا معمولی سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت تو ماحول ہی الگ تھا۔ اگرچہ گیارہ سالہ لڑکے کی دھاڑ کیا ہوگی۔ مگر وہ اس سے بھی خوف زدہ ہو گیا تھا اور فوراً وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نے سہی کھڑی پارو کو ایک زوردار پھپر سید کیا۔

”بے غیرت یہ کیا کر رہی تھی؟“
”کچھ نہیں... میں گرنے لگی تھی تو اس نے پکڑ لیا۔“
میں پھر بے وقوف بنا دینا اس سے پوچھتا کہ کیا ایسے پکڑتے ہیں اور یہ فضلوعین موقع پر کہاں سے آگیا تھا؟ مجھے فکر لگ گئی کہ وہ کیوں گر رہی تھی؟ اس نے یہاں کیا کیا اس کے پاؤں میں مویج آگئی تھی۔ حالانکہ وہ بالکل ٹھیک تھا کہ اس نے اس سے معافی بھی مانگی کہ میں نے اسے مارا تھا۔ اس نے فراغ دلی سے معاف کر دیا کیونکہ اسے میری خوشنودی درکار تھی کہ میں کہیں گھر جا کر یہ بات نہ پھوٹ دوں۔ میں احمق تھا گھر والے تو نہیں تھے۔ اس نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے قسموں اور وعدوں کی زنجیروں میں

مجھے ایسے جکڑا کہ میں نے اس پر ہونٹ سی لیے۔ مجال ہے جو کبھی اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا ہو۔ اس تجربے کے بعد پارو بھی محتاط ہو گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی اور نے دیکھ لیا تو پھر اس کی جان نہیں چھوٹے گی۔

یہ چالاکی نہیں تو اور کیل ہے کہ جس عمر میں لڑکیاں سادہ اور انجان ہوتی ہیں، وہ بغیر سوچے سمجھے جذبات میں بہہ جاتی ہیں۔ تازہ تازہ جوانی کا احساس انہیں ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ پارو پوری طرح ہوشیار تھی۔

وہ جوان ہو گئی تھی اور اس کا جسم بھی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ بچپن سے وہ ذرا تیز نشوونما رہتی تھی۔ کھانے پینے اور جسمانی سرگرمیوں میں تیزی اس کا اثر اس کی بڑھوتری پر بھی پڑا تھا۔ دس سال میں وہ تقریباً چاچے جتنی اونچی ہو چکی تھی۔ بارہ برس میں وہ چودہ پندرہ سال کی لگتی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ فضل اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ پتا نہیں ان کے درمیان تعلق کہاں تک پہنچا تھا اور وہ چھپ چھپ کر کتنی ملاقاتیں کر چکے تھے۔ مگر اس وقت میں اس کی باتوں میں آگیا اور یقین کر لیا کہ یہ سب اتفاق سے ہوا تھا اور اگر اس میں نیت کی کوئی خرابی بھی تھی تو وہ فضل کی طرف سے تھی۔ ان دنوں وہ اور میں ساتویں جماعت میں تھے۔ چاچے اس کی طرف سے فکر مند تھے اور اسے ابھی سے گھر بٹھانا چاہتی تھی مگر پارو نے باپ سے اجازت حاصل کر لی کہ اسے کم سے کم مڈل تکسٹریڈ ہونے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ ایک ہی سال کی بات تھی اس لیے چاچا مان گئے اور چاچے سر پیٹ کر رہ گئیں انہوں نے چاچا سے کہا۔

”اس کی حرکتیں دیکھی ہیں، سر پر دوپٹے کا ہوش ہوتا نہیں ہے، چلتی ایسے ہے کہ پورا پنڈا اہلتا ہے۔ اسے تو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملے اور تم اسکول میں پڑھا رہے ہو۔“
”بچی ہے ابھی، ذرا بڑی ہوگی تو خود سمجھ لے گی۔“ چاچا نے بے پروائی سے کہا۔ اتفاق سے میں پاس ہی تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے غور کیا کہ پارو کس طرح چلتی تھی اور اس کا جسم کیسے حرکت کرتا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ چاچے ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ جب وہ چلتی تو اس کا جسم جیسے رقص کرتا تھا۔ ایک ایک بوٹی تھرتی تھی۔ اس کے گہرے سنہری مائل ریشمی بال لہراتے تھے۔ آنکھیں چمکتی تھیں اور رخساروں پر جیسے گلاب کیلنے لگے۔ یہ سارے استعارے میں ابھی استعمال کر رہا ہوں ورنہ اس وقت تو مجھے بس اتنا پتا چلا کہ وہ چلتے ہوئے بہت ہلتی ہے اور بہت اچھی لگتی

ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی پارو کو غور سے دیکھے اور اسے خبر نہ ہو۔ اس نے بھانپ لیا۔ اس روز ہم اسکول سے آرہے تھے کہ اس نے پوچھا۔
”سجاد کیا بات ہے آج کل تو مجھے بہت گھور گھور کر دیکھتا ہے؟“

میں شرمندہ ہو گیا۔ ”مجھے پتا چل گیا، میں تو چوری چوری دیکھتا ہوں۔“

اس نے آنکھیں گھمائیں اور ہنسی۔ ”یہ تو چوری چوری دیکھتا ہے.... پتا ہے جب دیکھتا ہے تو پاگلوں کی طرح منہ کھول کر دیکھتا ہے۔“

میں مزید شرمندہ ہو گیا۔ ”سچ کہہ رہا ہوں مجھے تو پتا نہیں تھا۔“

”چل چھوڑ تو نے بتایا نہیں دیکھتا کیوں ہے؟“

میں نے اسے چاچی اور چاچا کی بات بتائی۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ چلتے ہوئے تیرا جسم کیسے ہلتا ہے۔“

پارو بہت بے باک تھی۔ اسے مشکل سے ہی شرم آتی تھی اور وہ اس بات پر کئی بار چاچی سے پٹ چکی تھی۔ وہ اسے دیدہ بچی کہتی تھی۔ مگر میری سادگی سے کبھی بات پر وہ شرمائی۔ اس نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”سجاد کیسے کہہ رہا ہے بے شرم۔“

”لو میں کیوں بے شرم ہوا، ہلتی تم ہو یا میں؟“

”اچھا چپ۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”کچھ لڑکیاں پاس آرہی تھیں۔“ اب کسی کے سامنے یہ بات مت کہنا۔“

”ٹھیک ہے نہیں کہوں گا۔“ میں نے سعادت مندی سے اس کی بات مان لی۔ ان دنوں ہم آٹھویں میں تھے۔ پارو کے لیے آخری سال تھا۔ مجھے ابا نے کہہ دیا تھا کہ مجھے آگے پڑھنا تھا اور صرف میٹرک نہیں کرنا تھا بلکہ اس سے آگے جانا تھا۔ ہمارے علاقے میں لڑکوں کا کالج منظور ہو گیا تھا اور اس کی عمارت کی تعمیر جاری تھی۔ امید تھی کہ جب تک میں میٹرک کروں گا... وہاں انٹر کی کلاسز کا آغاز ہو جائے گا۔ اس روز کے بعد سے میں نے پھر اس پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں میں اسکول سے زیادہ گاؤں کے اکھاڑے کے چکر لگا رہا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا پہلوان گاؤں کے لڑکوں کو پہلوانی کی تربیت دیتا تھا۔ میں بھی وہاں جا کر زور آزمائی کرنے لگا۔ ایک سال تو کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا مگر جب میں نویں میں آیا تو یکا یک ہی میرا قد بڑھ گیا اور جسم پر ماس بھی چڑھنے لگا۔ ہماری دس

بارہ ایکڑ زمین تھی۔ دو بھینسیں اور درجن بھر بکریاں بھی پٹی ہوئی تھیں۔ گھر کی مرغیاں اور انڈے ہوتے تھے۔ کھانا پینا کھلاتا اس کا بھی اثر ہوا تھا۔ پہلے میں پارو کے سامنے دبا دبا سا لگتا تھا مگر اس ایک سال میں جیسے میں اس سے ڈبل ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے سامنے چھوٹی لگتی تھی۔ ایک بار اس نے اکیلے میں کہا۔

”سجاد کیا ہو گیا ہے، تو تو ابالگنے لگا ہے۔“

”اب اتنا بڑا بھی نہیں ہوں۔“

”ذرا دیکھ تو....“ وہ مجھے پکڑ کر آئینے کے سامنے لے آئی۔ ”خود کو دیکھ اور مجھے دیکھ۔“

میں اب تک اسے خود سے بڑا سمجھتا تھا۔ دراصل میں اس سے دیتا تھا اور خود کو اس سے چھوٹا سمجھتا تھا اس لیے میں نے کبھی غور نہیں کیا، اس نے آئینہ دیکھا یا تو صبح میں وہ واقعی۔

میرے سامنے اب چھوٹی لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ پہلے کے مقابلے میں بڑی ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بھر گیا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تو بھی بڑی ہو گئی ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے شوق سے کہا۔ ”بھلا کہاں سے بڑی ہوئی ہوں۔“

میں نے سادگی سے بتا دیا کہ وہ کہاں کہاں سے بڑی ہوئی تھی۔ وہ شرمائی۔ اس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”آہستہ بول کسی نے سن لیا تو دونوں مار کھائیں گے۔“

”مار کیوں پڑے گی؟“

”سجاد پاگل اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔“

اس کے بعد سے پارو میرے آگے پیچھے ہونے لگی تھی۔ میرا خیال رکھتی اور میرے کام بھاگ بھاگ کر کرتی تھی۔ اگرچہ اپنے کام بھی کرتی تھی۔ مگر پہلے صرف اپنے کام کرتی تھی، خود سے مل کر کچھ نہیں کرتی تھی۔ پر اب اس نے میرے کام بھی شروع کر دیئے تھے۔ باہر سے آتا تو لسی پانی دیتی۔ کھانا نکال کر لاتی۔ کبھی کبھی میرے کپڑے دھو دیتی۔ گھر کے سارے کام ماں جی اور چاچی کرتی تھیں۔

پارو ایک نمبر کی کام چور تھی۔ چاچی اگر زبردستی کوئی کام دیتیں تو بس جان چھڑاتی تھی۔ اپنے کام تک نہیں کرتی تھی اس لیے جب اس نے میرے کچھ کام شروع کیے تو ماں جی اور چاچی معنی خیز ہو گئیں۔ ایک رات ہم محن میں سو رہے تھے تو

میں نے چاچی اور ماں جی کو باتیں کرتے سنا۔ ماں جی کہہ رہی تھیں۔ ”اچھا ہے گھر کی کڑی گھر میں رہے۔“
چاچی بولیں۔ ”اس کے چھن بھی کہاں ہیں کون لے کر جائے گا؟“

”ایسا نہ کہہ سیرا۔“ ماں جی بولیں۔ ”بے پروا ہے پر سر پر پڑے گی تو سب کر لے گی۔“

میں نیند میں تھا اور ایسی باتوں کی سمجھ بھی نہیں تھی اس لیے توجہ نہیں دی البتہ یہ سمجھ گیا کہ پارو کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ مڈل کے بعد وہ گھر بٹھالی گئی تھی اور اب چاچی نے اس کے بلاوجہ باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی بہانے نکل جاتی تھی اور اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ گاؤں بھر میں گھومتی پھرتی تھی۔ جب وہ چھٹی میں تھی تو اسے پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس کی ایک سہیلی جس کی شادی صرف چودہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اس کا شوہر اسے شہر سے رسالے لا کر دیتا تھا۔ پارو اس سے لے آتی اور گھر میں چھپ کر پڑھتی یا دیکھتی تھی۔ اس میں تصویروں والے رسالے بھی ہوتے تھے۔ میں نے دو تین بار اسے پڑھتے دیکھا۔ وہ مجھ سے نہیں چھپاتی تھی۔ پھر میں نویں میں آیا اور میرا اسکول قریبی بڑے قصبے میں تھا تو وہ مجھ سے وہاں سے رسالے منگواتی تھی۔

اسے کہانیوں کا شوق تھا مگر اصل دل چسپی تصویری رسالوں سے تھی۔ اس زمانے میں ایسے رسالے بہت کم اور فلم یا شو بزنس سے متعلق ہوتے تھے۔ پارو نے مجھے پیسے دیئے تھے کہ میں اس کے لیے کچھ نئے رسالے لے آؤں۔ پہلے میں اکثر پہلے سے پڑھے یا دیکھے رسالے لے آتا تھا، مجھے اتنا پتا نہیں تھا۔ پھر پارو نے یہ ترکیب اختیار کی کہ وہ مجھے دکھاتی تھی۔ تصویر یا کسی نشانی سے میں جان جاتا کہ یہ رسالے وہ پڑھ چکی ہے۔ میں دیکھ کر لے آتا تھا۔ لیکن جو رسالے وہ اپنی سہیلی سے لاتی تھی وہ مجھے نہیں دکھاتی تھی بلکہ بہت چھپ چھپا کر اندر کونھری میں پڑھتی تھی۔

ایک دن میں اسکول سے آیا تو ماں جی اور چاچی کسی میت میں گئی ہوئی تھیں۔ ابا اور چاچا زمین پر تھے۔ پارو محن میں نیم تلے چار پانی پر رسالہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے دروازہ بجایا تو وہ جلدی سے چھپ کر آئی اور مجھے دیکھ کر پھر نکال لیا۔ وہ الٹی لیٹی کہنیوں کے نیچے رسالہ رکھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس دن نہ جانے مجھے کیا خیال آیا میں نے جھانک کر دیکھ لیا اور پھر دنگ رہ گیا۔ یہ نیم عریاں لڑکیوں کی رنگین تصویریں

تھیں۔ پارو کو احساس ہوا کہ میں دیکھ رہا ہوں تو اس نے جلدی سے رسالہ بند کیا اور اسے اوڑھنی تلے چھپا لیا۔ ”کیا دیکھ رہا ہے؟ جانا یہاں سے۔“

”پارو یہ تو کیا دیکھ رہی ہے۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ ”میں تو ایسا کوئی رسالہ نہیں لایا۔“

”یہ میں صاحبان سے لائی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

میں جانتا تھا اس قسم کے رسالے ہوتے ہیں، میرے اسکول میں کئی لڑکے اس قسم کے رسالے رکھتے تھے اور یوں فخر سے دوسرے لڑکوں کو دکھاتے جیسے یہ ان کی ایجاد ہوں۔ کئی بار میں نے بھی دیکھے تھے اور میرا خیال تھا کہ یہ بس لڑکے ہی دیکھتے ہیں۔ مگر پارو نے میرا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔ میں نے جھپکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”پارو تو کیوں دیکھ رہی ہے؟“

”میں کیوں نہ دیکھوں اور تو کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تو کیوں دیکھ رہی ہے جب کہ تو خود لڑکی ہے۔“

”سجاد میں دیکھتی ہوں کہ ان لڑکیوں میں کیا خاص بات ہے جو ان کی ایسی تصویریں چھپتی ہیں۔ ان سے زیادہ خوب صورت تو میں ہوں۔ ذرا دیکھ اسے۔“ اس نے رسالہ کھول کر ایک تصویر میرے سامنے کی، میں جھینپ گیا مگر کن آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نہ ہونے کے برابر لباس میں ایک کم عمر لڑکی کی تصویر تھی۔ ”اسے دیکھ اور مجھے دیکھ کر بتا کیا میں اس سے کم ہوں۔“

میں نے غور کیا تو واقعی وہ خاص نقش نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی رنگت پارو جیسی دکتی تھی۔ جسمانی لحاظ سے تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ پارو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین تھی۔ حالانکہ وہ پہنے اوڑھے ہوئے تھی اس کے باوجود مجھے اس لڑکی سے زیادہ اچھی لگی اور میں نے اسے بتا بھی دیا۔ وہ شرمائی اور پھر بولی۔ ”بڑھو.... میں کہہ رہی ہوں کہ اس کی جگہ میری تصویر نہیں ہو سکتی تھی۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ”ایسے.... بغیر کپڑوں کے؟“

”تو اور کیا؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”یہ جو فلم ایکٹریس ہوتی ہیں، ان کو پہلے ایسے ہی نوٹو کھنچوانے پڑتے ہیں پھر کہیں جا کر ان کو فلموں میں کام ملتا ہے۔“

”لعنت ہوا ایسے کام پر۔“ میں نے رسالہ پھینک دیا۔ ”پر سوچ نا فلم میں کام کرنے والیوں کو سارا ملک

جانتا ہے ان کے پاس کتنا پیسا اور چیزیں ہوتی ہیں، یہ دیکھ۔“ اس نے رسالہ کھول کر ایک پرانی اداکارہ کا انٹرویو دکھایا جس میں اس کے گھر اور سامان کی تصویریں بھی تھیں۔

”کیا نہیں ہے اس کے پاس۔“

”ہوگا۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ”اگر چاچی کو پتا چل گیا نہ تو ایسے رسالے دیکھتی ہے تو تیری ہڈیاں توڑ دے گی۔“

”لے اسے کیسے پتا چلے گا، میں چھپا کر رکھتی ہوں۔“ وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولی۔ ”سچ بتا سچاؤ میں تجھے اس لڑکی سے زیادہ اچھی لگی ہے۔“

”ہاں تو میرے چاچے کی بیٹی ہے۔“

”پاکل“ میں پوچھ رہی ہوں کہ میں اس سے زیادہ خوب صورت ہوں؟

”ہاں تاہم تو تیرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اچھا اسے مار گولی۔“ اس نے رسالہ پھینک دیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بتا میں تجھے کیسی لگتی ہوں؟“

”اچھی لگتی ہے۔“ میں ذرا گھبرا گیا کیونکہ وہ پاس آگئی تھی۔ اگرچہ وہ پہلے بھی پاس آتی رہی تھی۔ ہمارے درمیان بے تکلفی تھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ شرارت میں ایک دوسرے کے بال کھینچ لیتے تھے یا ہاتھ مار دیتے تھے۔ مگر اس وقت اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔

”بب.... بہت اچھی لگتی ہے۔“

”سجاد تو بڑا ہو گیا ہے تجھے کوئی لڑکی اچھی لگی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر مجھے کوئی لڑکی اچھی لگی ہوتی تو میں تجھے نہ بتاتا۔“

وہ اور نزدیک آئی تھی اور اس کی سانس تیز ہونے لگی تھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے مرعش لہجے میں کہا۔ ”سجاد میں تیرے چاچے کی لڑکی ہوں، تو مجھے اچھا لگتا ہے۔“

اس نے کہتے ہی ایک ایسی حرکت کی کہ میں سن کھڑا رہ گیا۔ وہ حرکت کر کے جا بھی چکی تھی مگر میں اسی لمحے میں رہ گیا تھا جب اس کے لب میرے گال پر لگے تھے۔ جہاں ابھی ہلکا سا رواں اگنا شروع ہوا تھا۔ اس دن اور اس لمحے سے پارو میرے لیے کچھ اور ہو گئی۔ اب وہ صرف میرے چاچے کی لڑکی نہیں رہی تھی۔ ہمارے درمیان ایک دوسرا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ گھر والے اس کھیل سے بے خبر

تھے۔ ممکن ہے اگر پارو اتنی چالاک نہ ہوتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا مگر اس کھیل میں غالب فریق وہی تھی۔ وہ مجھے سمجھاتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا ہے۔ ماں جی، ابا، چاچا اور چاچی کے سامنے ہم آپس میں کزن بنے رہتے تھے بلکہ ان کے سامنے میں پارو کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرتا تھا کہ کہیں میرے تاثرات سے کوئی بھانپ نہ جائے۔ جب ہم اکیلے ہوتے یا موقع ہوتا تو بات کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو چھو لیتے تھے۔ مگر اس سے زیادہ کا نہ کبھی سوچا اور نہ ہی کوشش کی۔ حالانکہ پارو تجربے کا رکھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ مرد و عورت کا تعلق کیا ہوتا ہے مگر اسے سب اچھی طرح علم تھا۔ میرا دل پڑھائی میں کم لگتا تھا مگر میں نے نویں پاس کر لی۔ البتہ میں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ اب میں آگے نہیں پڑھوں گا میں زمین پر کام کروں گا اور پہلوانی کروں گا۔ اس دور میں گاؤں دیہات میں یہ فن زندہ تھا اور جگہ جگہ اکھاڑے ہوتے تھے۔ میں اسکول کی ٹیم میں بھی شامل تھا اور اس وجہ سے مجھے پڑھائی میں رعایت ملتی تھی۔ کم عمری کی وجہ سے اب تک باقاعدہ کشتی میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ استاد کا کہنا تھا کہ ابھی مجھے دو سے تین سال اور لگیں گے۔ میں دیکھتا تھا کہ لڑکوں کو چھ سال ہو گئے تھے اور اب تک انہیں مقابلہ نہیں ملا تھا اس لیے میں صبر سے کام لیتا تھا البتہ ہر جمعے کی شام ہونے والے اکھاڑے کے مقابلوں میں حصہ لیتا تھا۔ استاد نے ہم لڑکوں کی دو ٹولیاں بنائی ہوئی تھیں جو آپس میں مقابلہ کرتی تھیں۔ استاد ہم جوان ہوتے لڑکوں کو خاص طور سے سمجھاتا تھا کہ لڑکیوں اور عورتوں سے دور رہنا ہے۔ یہ صحت پر برباد کر دیتی ہیں۔ شاید اس لیے بھی میں پارو کے زیادہ قریب نہیں ہوتا تھا۔

میں میٹرک میں آیا تو پارو نے باتوں باتوں میں شہر کا ذکر شروع کر دیا۔ وہ مجھے بتاتی کہ شہر کتنی بڑی اور خوب صورت جگہ ہوتی ہے۔ وہاں بہت سارے گھر اور گاڑیاں ہوتی ہیں۔ وہاں پکی سڑکیں اور اونچی اونچی عمارتیں ہوتی ہیں۔ وہاں بہت سا پیسا ہوتا ہے، مانو جیسے درختوں پر اگتا ہے۔ اس کا تو میں بھی قائل تھا۔ ہمارے گاؤں سے جو فرد شہر چلا جاتا اس کے انداز ہی بدل جاتے تھے۔ وہ آتا تو پیسا یوں لٹاتا جیسے سچ سج درختوں سے توڑ کر لایا ہو۔ گاؤں میں کتنی کے چند بکے مکانات تھے اور ان میں زیادہ تر ان لوگوں کے تھے جو شہر چلے گئے تھے۔ گاؤں میں کوئی پکی سڑک نہیں تھی۔ چند ایک دکانیں تھیں باقی ہفتے کے ہفتے کچا

بازار لگتا تھا جس میں سامان مل جاتا تھا ورنہ خریداری کے لیے نزدیکی قصبے جاتے تھے۔ پکی سڑک بھی وہیں تھی۔ جی ٹی روڈ ہمارے گاؤں سے کوئی بیس میل کی دوری سے گزرتی تھی لیکن میں نے آج تک جی ٹی روڈ نہیں دیکھی تھی۔ پارو بتاتی تو میرا دل چاہتا تھا کہ شہر جاؤں اور وہاں سے ڈھیروں پیسے کما کر لاؤں۔ اگرچہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں سے پیسے کیسے کمائے جاتے ہیں۔ جس طرح مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پارو پار شہر کا ذکر اس طرح لپچا دینے والے انداز میں کیوں کرتی ہے۔

میٹرک کے امتحانات آئے تو زیادہ وقت پڑھنے میں گزرتا تھا۔ میں نے بتایا کہ مجھے شوق نہیں تھا مگر میں جس اسکول میں پڑھتا تھا وہاں تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا اور استاد بھی مخلص اور محنت کرنے والے تھے۔ امتحانات کے قریب ہماری اضافی کلاسز ہوتی تھیں۔ جن میں سارا کورس دہرایا جاتا تھا۔ اس میں اکثر شام ہو جاتی تھی۔ دوپہر میں ہمیں کھانے کے لیے ایک گھنٹا ملتا تھا۔ بھانگم بھاگ گھر آ کر کھانا کھاتا اور دوبارہ چلا جاتا تھا۔ یہ معمول امتحانات تک جاری رہا، پھر ہمارا سینئر تقریباً پندرہ میل دور ایک اور قصبے میں پڑا تھا کیونکہ وہاں سے روز آنا جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اسکول کے اساتذہ کے ساتھ سارے لڑکے جو نویں دسویں کے پرچے دے رہے تھے بارہ دن کے لیے وہیں جا کر رہے۔ یہ پہلا موقع تھا میں گھر سے دور رہا۔ یہ قصبہ چھوٹا سا شہر تھا۔ اگرچہ ماحول یہاں بھی گاؤں والا تھا مگر سہولتوں کے لحاظ سے یہ ہمارے علاقے سے بہت آگے تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی شہر جانے کا خیال آنے لگا۔ ویسے بھی اپنے طور پر میں بہت پڑھ گیا تھا۔ اس وقت گاؤں میں میٹرک ہونا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔

پارو سے دور رہا اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ اس کے ذہن میں کیا ہانڈی پک رہی ہے؟ امتحان ہوئے تو میں نے سکون کا سانس لیا کہ اب ذرا آرام کروں گا اور پھر صبح شام اکھاڑے جاؤں گا۔ اتنے دن اکھاڑے سے بھی دور رہا تھا۔ پارو سوچ میں گم رہتی تھی۔ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ البتہ اس کا چھپ چھپ کر رسالے پڑھنے اور دیکھنے کا معمول برقرار رہا تھا۔ وہ چاہتی بھی تو مجھ سے نہیں چھپا سکتی تھی کیونکہ میں خود ہی اسے لا کر دیتا تھا اور خاص تصاویر والے رسالے وہ صاحبان سے لاتی تھیں۔ یہ ہفتے بعد کی بات تھی میں شام کو اکھاڑے سے تھکا ہوا آیا۔ کنویں

سے پانی نکال کر نہایا اور چارپائی پر بیٹھا تھا کہ پارو سی لے آئی۔ ابا اور چاچا فصل کے چکر میں زمین پر تھے۔ ماں جی اور چاچی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ پارو نے میرے سامنے بیٹھ کر آہستہ سے کہا۔ ”سجاد میں نے ایک بات سوچی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے لسی پیتے ہوئے پوچھا۔

”ہم شہر بھاگ چلتے ہیں۔“

مجھے اچھو لگ گیا تھا۔ میں گلاس رکھ کر کھانے لگا۔ ”کیا... کیا کہا تو نے؟“

”آہستہ بول.... میں کہہ رہی ہوں ہم دونوں شہر چلتے ہیں۔“

”لگتا ہے آج تجھے خول سو جہر ہا ہے۔“

”نہیں سجاد میں سنجیدہ ہوں.... ہم دونوں یہاں ضائع ہو رہے ہیں۔“ پارو نے پڑھے لکھوں کے سے انداز میں کہا۔ میں ہنسا۔

”ہم کوئی سبزی ہیں جو ضائع ہو رہے ہیں؟“

”ہاں تو سوچ، کیا تیرا دل نہیں چاہتا کہ تو شہر جائے اور وہاں جا کر خوب کھوے پھرے۔“

”ہاں دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔

”تو چل نا پیسے ہوں گے تو ہم دونوں مرے سے وہاں رہیں گے۔“

”ہم دونوں اور اماں ابا، چاچا چاچی؟“

”وہ یہاں مرے سے رہیں گے۔“

”میں اماں ابا کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

”پاکل ہمیشہ کے لیے کون جا رہا ہے، بس کچھ عرصے کے لیے جائیں گے اور کچھ پیسے کما کر واپس آ جائیں گے۔ گھوم پھریں گے۔“

”پر وہاں جانے کے لیے بھی تو پیسے چاہیے ہوں گے، سنا ہے شہر بہت مہنگا ہوتا ہے۔“

”میرے پاس ہیں، میں نے جمع کیے ہوئے ہیں۔“ اس نے کہا اور مجھے اندر لائی۔ اس نے سامان والی کوٹھری اندر سے بند کر کے گریبان سے چابی نکال کر اپنے صندوق کا تالا کھولا اور پھر اس میں سے ایک تھیلی نکالی جس میں بے شمار نوٹ اور سکے تھے۔ سکے پچاس پیسے کے تھے جب کہ نوٹ پانچ اور دس روپے کے تھے۔ اس نے فخر سے کہا۔ ”پورے چار سو پچاس روپے ہیں۔“

آج سے کوئی تیس سال پہلے یہ خاصی بڑی رقم ہوتی

تھی۔ کچھ لیس شہر میں ایک متوسط گھرانہ اس سے پورا مہینہ گزار لیتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تو نے کیسے جمع کیے؟“

اس وقت ہمیں روز کے پچیس پیسے ملتے تھے اور یہ بھی خاصی رقم تھی۔ کبھی ڈبل ہو جاتے تھے تو پچاس پیسے مل جاتے تھے اور ہم سے یہ ہی خرچ نہیں ہوتے تھے کیونکہ کھانے پینے کی جو چیزیں ملتی تھیں وہ نہایت سستی ہوتی تھیں۔ نوٹ ہمیں عید پر ملتے یا دور سے کوئی مہمان آتا تو وہ دے جاتا تھا۔ پارو میرا سوال ٹال گئی کہ اس نے کیسے جمع کیے کیونکہ میں نے اسے کبھی بچاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے لیے چیزیں لے لیتی تھی۔ یہی نہیں چاچا اور چاچی سے بھی رقم پورنی رہتی تھی اور جب کہیں سے نہیں ملتے تو میرا سہارا لیتی تھی۔ میں کہیں نہ کہیں سے اسے لادیتا تھا۔ اس نے تھیلی رکھ کر صندوق بند کیا اور میرے پاس آکر بولی۔ ”سجاد میرے ساتھ چل تو میرے چاچے کا پتر ہے ہم ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ادھر بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا میں خط لکھ جاؤں گی کہ ہم خالہ نذیراں کے ہاں جا رہے ہیں۔“

میں نے نقطہ اٹھایا۔ ”وہ خالہ نذیراں کے ہاں پوچھیں گے۔“

”اتنی جلدی تھوڑی پوچھیں گے۔ ہو سکتا ہے تب تک ہم واپس آجائیں۔“

میں ہمیشہ کی طرح اس کی باتوں میں آ رہا تھا۔ میری عقل محدود تھی اور مجھے بہت سی باتیں سمجھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”پر ہم رہیں گے کہاں؟“

”ادھر بہت سے ہوٹل ہوتے ہیں، ان میں سے کسی میں رہ لیں گے چار پانچ دن گھومیں گے اور پھر واپس آجائیں گے۔“

مجھے سوچنا دیکھ کر اس نے جان لیا کہ میں نیم راضی ہو گیا ہوں۔ اس وقت اس نے ایسی حرکت کی کہ میں بوکھلا گیا۔ وہ اچانک مجھ سے لپٹ گئی اور دونوں ہاتھوں سے مجھے جکڑ کر بولی۔ ”جب تک تو مانے گا نہیں میں ایسے ہی پکڑے رہوں گی چاہے کوئی آجائے۔“

اول تو کوئی آنہیں سکتا تھا کیونکہ دروازہ اندر سے بند تھا اور دوسرے میں چاہتا تو ایک ہی جھکے میں خود کو جھڑا سکتا تھا مگر اس کے بدن کے لمس نے میری سٹی گم کر دی تھی۔ میری رہی سہی عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی۔ میں نے جلدی سے اقرار کر لیا۔ اگرچہ میرا دل چاہ رہا تھا میں بھی نہ

مانوں اور وہ مجھے اسی طرح جکڑے رہے۔ وہ خوش ہو گئی اور اس نے پھر میرے گال پر پیار کیا۔ ”سجاد تو بہت اچھا ہے۔“

”پر اماں ابا کو پتا چل گیا تو۔۔۔۔۔“

”نہیں پتا چلے گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”میں نے سب سوچ لیا ہے بس جیسے جیسے میں کہوں ویسا کرنا تو سب ٹھیک رہے گا۔“

مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ سب پارو نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس کے باوجود میری حالت خراب تھی۔ اماں ابا کے سامنے آتا تو ہاتھ پاؤں کا پھنے لگتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا جیسے انہیں ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا ہے۔ اس لیے میں زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ لڑکا تھا اس لیے کسی نے توجہ بھی نہیں دی۔ سارا دن اکھاڑے میں اور آوارہ گردی میں گزار کر شام ڈھلے گھر آتا اور پھر کھانا کھا کر جلدی لیٹ جاتا تھا۔ کوئی بات کرتا تو مختصر سا جواب دیتا۔ خود کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پارو نے منصوبہ بنالیا ہے اور ہم چند دن میں گھر سے شہر کے لیے روانہ ہوں گے۔ مگر وہ نہایت اطمینان سے رہ رہی تھی اور اس کے انداز میں بالکل بھی غلط نہیں تھی۔ کبھی بھی موقع پا کر اس سے پوچھتا تو وہ کہتی۔ ”آرام سے سجاد آرام سے۔۔۔ صبر کر ہم ایسے نہیں جاسکتے۔“

یونہی انتظار کرتے کرتے دو مہینے گزر گئے اور میرا نتیجہ آ گیا۔ اس وقت دیہات میں نتیجہ براہ راست اسکول میں آ جاتا تھا۔ میں پاس ہو گیا تھا۔ بہت اچھے نمبر تو نہیں آئے تھے مگر برے بھی نہیں تھے۔ سیکنڈ ڈویژن بنی تھی۔ میں اور اماں ابا خوش ہو گئے تھے۔ ابا نے پھر زور دیا کہ میں کالج میں داخلہ لے لوں۔ مگر مجھے تو پارو کے ساتھ شہر جانا تھا۔ ان ہی دنوں فصل کٹ گئی۔ ابا اور چاچا فصل بیج کر گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ پارو نے مجھ سے چپکے سے کہا۔ ”تیار رہنا آج رات نکلنا ہے۔“

اس رات پارو نے کھانا بنایا پھر اس نے سب کو چائے بنا کر دی۔ کیونکہ پارو نے بنائی تھی اس لیے سب نے پی لی اور کچھ دیر میں سب سو گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ ابا اور چاچا دیر تک باتیں کرتے پھر سوتے تھے۔ ماں جی اور چاچی بھی اتنی جلدی نہیں سوتی تھیں میں اور پارو جاگ رہے تھے۔ پارو اٹھ کر اندر گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ابا کے سوٹ کیس سمیت نکلی یہ ابا کا ایک دینی پلٹ دوست ساتھ لایا تھا۔ اس نے ابا کو دے دیا تھا وہ ایسے ہی پڑا تھا۔ پارو نے کہا۔ ”میں نے اپنے اور تیرے کچھ

اچھے کپڑے رکھ لیے ہیں۔“

”اور رقم؟“

”وہ بھی ہے تو فکر نہ کر۔“

اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ وہ صرف یہ رقم ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ لے کر جا رہی ہے۔ میں بے چین تھا کہ اب ہمیں نکل جانا چاہیے، کوئی اٹھ نہ جائے۔ مگر پارو اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ یہی نہیں وہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈرایا۔ ”ابھی کوئی جاگ جائے گا۔“

”کوئی نہیں اٹھے گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”میں نے چائے میں دوا دی ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ ”دوا دی ہے؟“

”ہاں نیند کی دوا ہے۔ سوئی کی یاں کوٹا نگ میں درد ہوا تھا تو ساری ساری رات شور کرتی تھی، اس کا ابا لے آیا تھا۔ میں اس میں سے ایک پتا چرا کر لے آئی تھی کسی کو دو گولیاں دے دو تو صبح سے ہلے کروٹ بھی نہیں لیتا ہے۔ جب تک یہ انھیں گے ہم لاہور پہنچ چکے ہوں گے۔“

”لاہور؟“ میں نے کہا۔ میں نے یہ تک نہیں سوچا تھا کہ ہم جائیں گے کہاں کیونکہ ہمارا گاؤں جہلم کے پاس تھا۔

”لاہور ہی تو شہر ہے باقی سب تو پنڈ ہیں بس ذرا بڑے ہیں۔“ پارو بولی۔ ”ہم چار بجے نکلیں گے اور سورج نکلنے تک جی ٹی روڈ پہنچ جائیں گے وہاں سے بس لے کر لاہور جانا کون سا مشکل کام ہے۔“

ایسا لگ رہا تھا پارو نے سب سوچا ہوا تھا۔ اس نے مجھے میری اکلوتی پیٹنٹ شرٹ نکال کر دی۔ یہ ابا لے کر آیا تھا جب میں میٹرک کے پرچے دینے جا رہا تھا۔ خود پارو نے شہری عورتوں جیسا سوٹ پہنا تھا یہ اس نے خود سیا تھا۔ گھر کا یہ واحد کام تھا جو اسے خوب آتا تھا۔ چار بجے سے ذرا پہلے ہم گھر سے نکلے۔ میرا دل دکھ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ اماں ابا کو یہ اچھا نہیں لگے گا وہ بہت رو میں گئے اور مجھے گالیاں دیں گے۔ مگر میری ٹیکل پارو کے ہاتھ میں تھی۔ سوٹ کیس میں نے لیا اور ابا کی لائیں بھی لے لی۔ تاکہ اگر راستے میں کوئی جانور یا چور ڈاکو مل جائے تو کام آئے۔ میں میل کا فاصلہ ہم نے ساڑھے تین گھنٹے میں طے کر لیا تھا اور جب سڑک تک پہنچے تو سورج بلند ہو گیا تھا۔ ہم تھکے ہوئے تھے، خوش قسمتی سے فوراً ہی ایک بس مل گئی اور ہم لاہور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

میں حوالات میں بیٹھا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور

اس سے زیادہ شدت سے گلا دکھ رہا تھا بلکہ چیخ کر بیٹھ گیا تھا۔ دو دن بلکہ دو راتوں میں مجھ پر جو گزری تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہمیں لاہور آئے ہوئے یہ تیسرا ہی دن تھا۔ جب ہم بس اڑے پر اترے تو پہلی بار میرے ذہن میں خیال آیا کہ اب ہم کہاں جائیں گے؟ میں ہراساں ہو گیا مگر پارو بالکل مطمئن تھی۔ اس پورے سفر میں یوں مطمئن رہی جیسے اس کے لیے کچھ بھی نیا نہ ہو اور وہ پہلے بھی کئی بار سفر کر چکی ہو حالانکہ وہ بھی پہلی بار گاؤں سے نکلی تھی۔ اس نے بس سے اتر کر کہا۔ ”سجاد کوئی ٹیکسی دیکھ۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے؟“ میں نے ایک طرف کھڑی ٹیکسیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”ابھی بتائی ہوں۔“ وہ بولی۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے چلنے کو کہا تو اس نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”بھائی ادھر جانا ہے۔“ پارو نے ایک رسالے کا پتلا ہوا ٹکڑا اس کے سامنے کیا اس وقت میں دیکھ نہیں سکا کہ اس پر کیا تھا مگر جب ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور وہ چلی تو میں نے پوچھا۔

”یہ کس کا پتا بتایا ہے تو نے؟“

”ادھر رسالے کے دفتر کا۔“ پارو نے جواب دیا۔ وہ دل چسپی سے لاہور کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے لیے یہ سب انوکھا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں اور سڑکیں، اس زمانے میں اتنی زیادہ ٹریفک نہیں ہوتی تھی مگر پھر بھی اہم سڑکوں پر بہت زیادہ ٹریفک اور دھواں تھا۔ ٹیکسی والے نے ہمیں مشہور لکشمی چوک اتارا۔ میں نے راستے میں ایک دو بار پارو سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ رسالے کے دفتر کیوں جا رہی تھی اور کون سے رسالے کے دفتر جا رہی تھی مگر اس نے ٹال دیا۔ رسالے کا دفتر ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا اور اس کے باہر بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہم اندر آئے، ایک آدمی نے روک لیا۔ اس نے آنکھوں میں ڈھیروں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ بڑے اشائل سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے راکھ جھاڑی اور بولا۔ ”کون ہو بھی کس سے ملنا ہے۔“

پارو نے اب تک چادر اوڑھی ہوئی تھی لیکن اوپر آتے ہوئے اس نے چادر اتار کر ہاتھ میں لے لی میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس نے بہت چست لباس پہنا ہوا تھا۔ قمیص کا گریبان خاصا کشادہ تھا اور دوپٹا چھوٹا سا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”پارو چادر اوڑھ لے۔“

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عنبر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (جڑی)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

”وہ نکاح نامہ مانگتے اور وہ ہمارے پاس ہے نہیں۔“
”تو یہ سہاٹی صاحب....“
”وہی بتا رہی ہوں.... مجھے خیال آیا کہ میں ان سے مدد مانگوں، میں ان کا رسالہ پڑھتی رہی ہوں، مجھے معلوم ہے یہ بہت اچھے اور ہمدرد انسان ہیں، تم نے دیکھا وہ فوراً ہماری مدد کے لیے تیار ہو گئے۔“
”اچھا پر وہ کل سے کیا کوشش کرنے کو کہہ رہے تھے؟“

”تیرے اور میرے لیے کام تلاش کرنے کا کہہ رہے تھے اگر ہمیں ملازمت مل گئی تو پھر ہم یہیں رہیں گے اور کوئی مکان کرائے پر لے لیں گے۔“
”پارو ایسے رہتا ٹھیک نہیں ہے پھر ہم شادی کر لیں گے۔“ اس بار میں خوش ہو گیا۔
”ہاں.... ٹھیک ہے۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ”پر پہلے کوئی بندوبست تو ہو جائے رہنے کا۔“
اگلے روز صبح سویرے سہاٹی صاحب نازل ہو گئے۔ میں نشست گاہ میں سو رہا تھا اور پارو سونے والے کمرے میں تھی۔ انہوں نے آتے ہی آواز لگائی۔ ”اد پارو جی.... تیار ہو جانا ہے۔“
میرا خیال تھا کہ پارو سو رہی ہوگی مگر.... وہ ایک منٹ بعد ہی تک سک سے تیار اندر سے برآمد ہوئی تو میں دنگ رہ گیا۔ ”تیار ہوں سہاٹی صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بہت اچھی۔“ سہاٹی صاحب بولے۔ ”میں سجاد کے لیے ناشتا لے آیا ہوں آپ کا ناشتا وہیں ہوگا۔“
”تم کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے پارو سے پوچھا۔
”آج ملازمت کے لیے مجھے جانا ہے۔“ پارو بولی۔
”دیر ہو رہی ہے۔“ سہاٹی صاحب بولے۔ انہوں نے ایک لفٹن میز پر رکھا۔ ”اس میں ناشتا ہے چائے بنانے کا سامان یاور چچی خانے میں ہے۔“

پارو تیار تھی۔ وہ دونوں نکل گئے، میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پارو مجھ سے چھپا کر کچھ کر رہی ہے۔ اس نے مجھ سے سہاٹی صاحب کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا اس سے ان کی پرانی جان پہچان تھی۔ کل رسالے کے دفتر میں ان دونوں نے جو الگ سے ملاقات کی تھی اس میں جو کچھ طے ہوا تھا، مجھے اس

آگئی۔ اس کے ساتھ ایک اویجنر عمر اور سفید ہوتے بالوں والا شخص تھا۔ اس کے ہونٹ پان سے سرخ ہو رہے تھے۔ پارو نے اس سے کہا۔ ”سہاٹی جی.... یہ میرا کزن ہے سجاد کریم۔“
اس نے بادل ناخواستہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور وہ دیکھ تو پارو کی طرف رہا تھا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی.... اے مظفر.... بی بی کو لے جاؤ.... میرے فلیٹ پر چھوڑ آؤ۔“
”دس نمبر والے فلیٹ پر؟“ چہرہ اسی مظفر نے تصدیق چاہی۔

”ہاں اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ سہاٹی صاحب نے چابی اچھالی اور پارو کی طرف دیکھا۔ ”کوئی تکلیف نہیں ہوگی.... میں کل سے ہی کوشش شروع کرتا ہوں۔“
”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔“ پارو نے یوں ادا سے کہا کہ میں حیران رہ گیا اس کا انداز اور لہجہ تک بدل گیا تھا۔
.... سہاٹی صاحب کا چہرہ چمکنے لگا تھا وہ بولے۔ ”ارے نہیں اس میں شکریہ کی کیا بات ہے کچھ لوگ ہوتے ہیں جو پہلی ملاقات میں اپنے ہو جاتے ہیں۔“

مظفر ہمیں لے کر روانہ ہوا۔ فلیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور ایک چار منزلہ عمارت میں تھا۔ باہر سے تو فلیٹ ایسا ہی تھا مگر اندر سے بہت اچھا سا ہوا تھا۔ دو کمرے تھے۔ ایک سونے کے لیے تھا اور دوسرا مہمانوں کے لیے تھا۔ مظفر نے فلیٹ دکھایا۔ چھوٹے سے کچن میں چائے بنانے کے لوازمات تھے اور کچھ نہیں تھا۔ اب وہ ہم سے ذرا الگ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے پارو پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”صبر صبر.... بتاتی ہوں ممکن سے برا حال ہے۔“
وہ لہرا کر بستر پر گئی ممکن ہے کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے دیکھتا رہ جاتا مگر اس وقت مجھے غصہ آ رہا تھا۔ پارو نے محسوس کر لیا اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اے بے باگل یہ شہر ہے یہاں ایسے ہی کوئی منہ اٹھا کر نہیں چلا آتا ہے۔ کسی ہوٹل میں جاتے تو دس سوال کیے جاتے۔ ہمارے پاس تو شناختی کارڈ تک نہیں ہے۔ ہم کیا بتاتے کہ ہم کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ ہوٹل والے پولیس بلا لیتے۔“

میں ڈر گیا۔ ”پولیس.... کیوں ہم نے کیا کیا ہے؟“
”پاگل پولیس بغیر نکاح کے ساتھ رہنے کے الزام میں پکڑ لیتی.... ہم میاں بیوی تو نہیں ہیں۔“
”تو ہم بول دیتے کہ ہیں۔“

مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ یہ دفتر کا چہرہ اسی تھا۔ پارو نے آگے آ کر کہا۔ ”مجھے سہاٹی صاحب سے ملنا ہے۔“
چہرہ اسی نے معنی خیز اور ٹٹولنے والی نظر سے پارو کو دیکھا اور بولا۔ ”صرف تمہیں....“
”ہاں صرف مجھے۔“ پارو نے بھی معنی خیز انداز میں کہا تھا۔
”ادھر بیٹھو میں سہاٹی صاحب کو بتاتا ہوں۔“ اس نے ایک طرف رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔

میں نے بیٹھتے ہی اس سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”یہ سہاٹی صاحب کون ہیں اور تو کیوں ملنے آئی ہے؟“
”تو چپ کر کے دیکھ۔“ پارو نے پھر مجھے چپ کرا دیا۔ شہر آنے اور یہاں گھومنے پھرنے کے سارے منصوبے میں اس نے ایک بار بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ اس کے پروگرام میں کسی رسالے کے دفتر جا کر کسی سہاٹی صاحب سے ملاقات بھی شامل تھی۔ جب کہ وہ سیدھی یہیں آئی تھی۔ پانچ منٹ بعد چہرہ اسی اندر سے آیا اور اس نے پارو کو اشارہ کیا۔ ”چلو بی بی تمہیں سہاٹی صاحب بلارہے ہیں۔ بڑے بھاگ ہیں تمہارے ورنہ وہ تو بڑے بڑے لوگوں سے نہیں ملتے ہیں۔“

”میں بھی چلوں گا۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
”اوہ نہیں میاں صرف بی بی کی اجازت ہے۔“
”تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“ پارو نے کہا اور اندر چلی گئی۔ وہ جاتے ہوئے چادر وہیں چھوڑ گئی اور میں بیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کیونکہ چہرہ اسی اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پارو کو اس کی پروا ہی نہیں تھی۔ اسے گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ دس، بیس اور تیس منٹ گزر گئے پارو واپس نہیں آئی۔ جب میری بے چینی برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نے چہرہ اسی سے کہا۔ ”پارو ابھی تک نہیں آئی۔“

”آجائے گی میاں۔“ اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ ”سہاٹی صاحب سے اچھی طرح مل رہی ہوگی۔“
”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے غصے سے کہا اور کھڑا ہوا گیا تھا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں میرا قد وقامت اس تیس سال کے مرد سے زیادہ تھا۔ وہ ڈر گیا۔
”غصے کیوں ہوتے ہو میاں جی۔“

اس سے پہلے میں کچھ اور کہتا دروازہ کھلا اور پارو باہر

کا علم نہیں تھا۔ ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور پارو کے لیے ملازمت نکل آئی تھی۔ پھر وہ جس طرح سے تیار ہو کر گئی تھی، وہ بھی شک والی بات تھی۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے ناشائیں زہر مار کیا۔ میں فلیٹ میں اکیلا تھا اور سوچ رہا تھا کیا کروں کہ ساسی صاحب کا چہرہ اسی مظفر آیا۔ اس نے کہا۔ ”اومیاں جی لاہور کیا گھر میں بیٹھے آئے ہو جاؤ گھومو پھرو۔“

”میں کہاں جاؤں؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔
”مجھے کیا پتا۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”کوئی چیز لینی ہے تو لے لو میں فلیٹ بند کر رہا ہوں اب شام کو ساسی صاحب آئیں گے تو کھلے گا۔“

”تب تک میں باہر رہوں گا؟“
”تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے سامان جھاڑنا شروع کر دیا۔ مجبوراً میں باہر نکل آیا۔ میٹرھیوں سے نیچے آکر سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو پیسے ہی نہیں تھے میں واپس اوپر آیا تو مظفر تالا لگا کر جا چکا تھا۔ مجبوراً میں نیچے آیا۔ کچھ دیر میٹرھیوں پر بیٹھا رہا، پھر یہ عجیب سالگا تو اٹھ کر گلیوں میں ٹپکنے لگا۔ جب تھک گیا تو واپس آکر میٹرھیوں پر بیٹھ گیا اور پھر یہ سلسلہ شام تک چلتا رہا۔ میں دور جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ راستہ نہ بھول جاؤں۔ مجھے یہاں سارے راستے اور عمارتیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ پارو اور ساسی صاحب شام ڈھلے آئے۔ جب روشنیاں جل اٹھیں۔ وہ ایک رکشے سے اترے۔ پارو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساسی صاحب سے کہا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میری اتنی مدد کریں گے۔“

”اصل فن تو تم میں ہے۔“ وہ بے تکلفی سے بولے۔ ”تمہارا حسن اور صلاحیت ہی تمہاری مددگار ہے۔“
”نہیں یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ بولی اور تب اس کی نظر مجھ گئی۔ میٹرھیوں پر اندھیرا تھا اور اسے قریب آنے پر ہتھکڑی میں وہاں موجود تھا۔ ”سجاد تو یہاں...؟“
”تو اور کہاں جاتا۔“ میں نے ناراضی سے کہا۔ ”مظفر فلیٹ بند کر گیا۔“

”عجیب احمق آدمی ہے اسے کہا تھا کہ فلیٹ کی صفائی کر دے اور اس نے تمہیں باہر نکال دیا۔“
”اس نے کہا کہ آپ نے فلیٹ بند کرنے کو کہا

”دماغ خراب ہے اس کا، میں ابھی جا کر ٹھیک کرتا ہوں۔“ ساسی صاحب بولے اور جیب سے چابی نکال کر فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”تم نے دن بھر میں کچھ کھایا؟“
”نہیں پیسے بھی پارو کے پاس تھے۔“
”وہ میں اپنی میں چھوڑ گئی تھی۔“ پارو نے جلدی سے کہا۔

”نم لوگ آرام سے بیٹھو، میں کھانا بھجواتا ہوں۔“ ساسی صاحب نے کہا اور چلے گئے۔ تنہائی ملتے ہی میں پارو پر پھٹ پڑا تھا۔
”پارو یہ سب کیا ہے، تو جھوٹ بول کر مجھے یہاں لائی ہے یقیناً پہلے سے اس شخص کو جانتی تھی اور تو نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”اللہ کی قسم... سجاد میں تو صرف نام جانتی تھی کہ ان کا رسالہ پڑھتی تھی۔“ پارو نے کہا۔ ”میرا یقین کر میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔“
”پھر یہ کیا ہے تو دوسرے دن اس کے ساتھ بن سنور کر چلی گئی۔ ہم یہاں گھومنے آئے ہیں یا صرف تجھے گھومنا ہے؟“

”میں گھومنے نہیں ملازمت کے لیے گئی تھی۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے انٹرویو دینے۔“

پارو کے لہجے نے مجھے نرم کیا تھا مگر میرا شک ختم نہیں ہوا۔ ”آپنی تیار ہو کر گئی تھی۔“

”بالکل یہ شہر ہے یہاں آدمی کو ایسے ہی تیار ہو کر جانا پڑتا ہے، اگر تجھے ملازمت کے لیے جانا ہوا تو ایسے ہی تیار ہو کر جانا پڑے گا۔“

میں ایک ہی دن میں گھبرا گیا تھا۔ مجھے اماں ابا اور گھر یاد آ رہا تھا۔ میں نے پارو سے کہا۔ ”چھوڑ ملازمت کو ہم واپس چلتے ہیں۔“

”بالکل ہوا ہے، اب ہم واپس نہیں جاسکتے۔ مجھے تو وہ ماردیں گے۔ ہم نے گھر سے بھاگ کر ان کے منہ پر کا لک لی ہے۔“

”پر ہم تو شہر دیکھنے کے لیے آئے تھے۔“

”ہاں پر ان کو تو نہیں معلوم نا، گاؤں والے ابا اور تائے کو طعنے دیں گے تو وہ کب تک برداشت کریں گے۔ سجاد ہم واپس نہیں جاسکتے تو بھی نہیں جاسکتا۔“

میرادل ڈوبنے لگا۔ ”پھر ہم یہیں رہیں گے؟“
”ہاں واپسی کا مت سوچ اور ملازمت تلاش کر۔“

”میں کیسے تلاش کروں۔“

”میں ساسی صاحب سے کہتی ہوں وہ تیرے لیے بھی کوئی ملازمت دیکھتے ہیں۔ ہم دونوں کام کریں گے تو اتنا کمائیں گے کہ مزے سے رہیں۔“

پارو کی باتوں میں ایسی تاثیر تھی کہ میں سب بھول گیا اور ان خوابوں میں گم ہو گیا جو پارو مجھے دکھا رہی تھی۔ ان کی تعبیر کیسی نکلے گی اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگلے روز صبح سویرے پھر ساسی صاحب نازل ہوئے اور کل کی طرح پارو کو لے گئے۔ جب پارو نے ان سے میری ملازمت کا کہا تو وہ بولے۔ ”فکر نہ کرو پہلے تمہارا کام ہو جائے اس کے بعد اسے بھی ملازمت دلاؤں گا، یہ میرا ذمہ ہے۔ تم آرام کرو میں نے مظفر کو جھاڑا تھا اب وہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

آج بھی ساسی صاحب میرے لیے ناشائیں لائے تھے۔ میں ناشائیں کر کے لینا اور بے خبر سو گیا۔ اس میں کچھ ملا ہوا تھا ورنہ میں ساری رات سویا تھا اور دن میں سونے کی عادت بھی نہیں تھی۔ پھر کسی نے بے دردی سے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ ”اٹھ اوئے لاٹ صاحب... کیسے پڑا ہے۔“

میرا سر گھوم رہا تھا اور بڑی مشکل سے میں نے آنکھیں کھولیں اور پھر پولیس دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ فلیٹ میں کئی پولیس والے تھے۔ ایک نے مجھ پر پانی لا کر پھینکا تو میں بالکل ہوش میں آ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور میں ہکلا ہکلا کر وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں ساسی صاحب کا مہمان ہوں۔ مگر وہ پہلے لا تعلقی سے سنتے رہے اور پھر اچانک مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ لاٹوں، ٹکوں اور اپنی رائفل کے بوٹوں سے بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ اسی طرح مارتے پیتے وہ مجھے نیچے لائے اور پیدل ہی علاقے کے تھانے کی طرف لے جانے لگے۔ میرے ہاتھوں میں جھنجھڑیاں ڈال دی تھیں اور مار پیٹ کا سلسلہ راستے میں بھی جاری رہا۔ اس میں انہوں نے کوئی رعایت نہیں کی تھی مگر تھانے میں میرے ساتھ جو ہوا یہ تو اس کا صرف ٹریلر تھا۔ وہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ میں چور ہوں اور چوری کی نیت سے ساسی صاحب کے فلیٹ میں گھسا تھا۔ میں نے گڑگڑا کر بتایا کہ میں کون ہوں اور میری کزن کو ساسی صاحب نوکری دلانے لے گئے تھے۔ میں ان کے فلیٹ میں مہمان ہوں مگر میری کسی نے نہیں سنی تھی۔ مجھے حوالات میں پھینک دیا گیا۔

رات کو مجھے وہاں سے نکالا گیا اور اس مشہور عالم

ڈرائنگ روم میں لے گئے جس کی میں نے کہانیاں سنی تھیں مگر اس رات خود وہاں مہمانی بھگتی۔ مجھے الٹا لٹکا کر نیچے سے مریچوں کی دھونی دی گئی۔ میری پشت پر چڑے سے بنے لٹر مارے گئے۔ پھر زخموں پر نمک اور مریچ ملا ہوا پانی چھڑکا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ساسی صاحب کے گھر میں چوری کی نیت سے گھسنے کا جرم مان لوں مگر میں بے وقوفوں کی طرح اپنی بے گناہی برڈٹا ہوا تھا۔ صبح جب مجھے حوالات میں پھینکا گیا تو مجھ میں ہلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ میں جہاں گرا وہیں بے ہوشی کی نیند سو گیا تھا۔ سارا دن بے ہوش رہا پھر شام کو اٹھا کر مجھے زبردستی چائے روٹی کے ساتھ درد کی دوا دی گئی۔ مجھے امید ہوئی کہ شاید میری بات مان لی گئی ہے اور اب مجھے جانے دیا جائے مگر رات ہوتے ہی یہ امید پھر ڈرائنگ روم کی دہشت ناک تاریکی میں ڈوب گئی۔ ایک اور عذاب ناک رات گزار کر صبح جب دو ساسی مجھے بازوؤں سے پکڑ کر لے جا رہے تھے تو میں نے راستے میں کسی کو بولتے سنا۔

”کون ہے یہ؟“
”چور ہے جی مان کر نہیں دے رہا۔“

”میں چور نہیں ہوں جی...“ میں نے نیم بے ہوشی میں تردید۔ ”ہوتا تو اتنی مار کھا کر مان نہ لیتا۔“

اس بار مجھے دو پہر میں ہی اٹھالیا گیا۔ اٹھانے والے مجھے ایک کمرے میں لائے۔ انہوں نے مجھے صاف کیا اور میرے کپڑے پہنائے جو تھانے آتے ہی میرے جسم سے اتار لیے گئے تھے۔ پرس میں چند روپے اور میرے میٹرک کی مارشٹ تھی۔ وہ بھی مجھے دے دی البتہ میری کلائی سے گھڑی اتار لی تھی، وہ مجھے نہیں ملی۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے جہاں ایک کالا کوٹ والا شخص موجود تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں گل راز خان ہوں۔ وکیل ہوں اور تمہاری ضمانت لی ہے۔“

”میں شکر گزار ہوں جی آپ کو پارو نے بھیجا ہے۔“
”کون پارو... میں نے صبح تمہیں دیکھا تھا جب تمہیں لا رہے تھے۔ مجھے لگا تم بے گناہ ہو اس لیے تمہاری ضمانت لی ہے۔ تم کہاں رہتے ہو؟“

میں نے وکیل صاحب کو تفصیل سے بتایا کہ میں کہاں سے اور کیسے آیا ہوں اور یہاں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس نے سن کر کہا۔ ”تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔“

اس کی عدم موجودگی میں میرے لیے چائے اور بسکٹ آئے۔ وکیل صاحب کچھ دیر بعد آئے اور

بولے۔ ”تمہارے بارے میں ساہی صاحب نے رپورٹ کرائی کہ ان کے فلیٹ میں کوئی چور گھسا ہوا ہے۔“
”وہ جھوٹ بولتا ہے، میری کزن اس کے ساتھ ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

مگر وکیل صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ساہی صاحب ایک صحافی ہیں اور ان کا پولیس اور انتظامیہ پر بہت اثر و رسوخ ہے۔ اگر میں ان کی شکایت کروں گا تو کوئی میری بات نہیں سنے گا۔ اس لیے میں شکایت کے بجائے اپنی کزن کو واپس لینے کی کوشش کروں۔ مگر جب میں ساہی صاحب کے سامنے گیا تو انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور پارو کے وجود سے بھی انکار کیا۔ وکیل صاحب میرے ساتھ تھے انہوں نے بھی بات کی مگر کچھ نہیں ہوا۔ مجھے پارو کی فکر تھی۔ پھر وکیل صاحب کے دفتر میں جہاں میں رہ رہا تھا پارو کا فون آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے بھول جاؤں اور واپس چلا جاؤں۔ وہ اب مجھ سے کبھی نہیں ملے گی۔ پارو کی بات سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گری تھی۔ وکیل صاحب نے کہا کہ میرے ساتھ جو ہوا اس میں پارو بھی شامل تھی۔ مجھے ان کی بات کا یقین آ گیا تھا۔

میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ ابا اور چاچا مجھے مار دیتے۔ اس لیے میں نے شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وکیل صاحب نے مجھے دفتر میں ملازم رکھ لیا۔ میں ایک طرح سے چہرہ اسی بھی تھا اور چوکیدار بھی، رات وہیں سو جاتا تھا۔ کھانا نزدیک کے ہوٹلوں میں کھا لیتا۔ دوپہر میں البتہ وکیل صاحب کے ساتھ کھاتا تھا۔ تنخواہ کے علاوہ بھی وہ کبھی رقم اور کبھی سامان دیتے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے آگے بڑھنے کا مشورہ دیا اور شام کے ایک کالج میں داخلہ دلا دیا۔ انٹر کے بعد میں پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ اس کا انتظام بھی وکیل صاحب نے کیا تھا۔ ستم ظریفی دیکھیں اے ایس آئی بن کر پہلی تعیناتی اسی تھانے میں ہوئی جہاں دوران مجھ پر تشدد ہوا تھا اور تشدد کرنے والے اب مجھے سلوٹ کرتے تھے کیونکہ میں ان کا افسر تھا۔ بیس سال کی عمر میں اے ایس آئی بن گیا تھا۔ مگر گاؤں کا وہ احمق اور سادہ سجاد میرے اندر سے نہیں نکلا تھا اس نے کبھی مجھے حرام کھانے اور غلط کام کرنے نہیں دیا۔ اس لیے بیس سال بعد جب میرے ساتھ کے لوگ ایس ایس پی کے عہدے تک جا پہنچے ہیں میں بہ مشکل ڈی ایس پی ہوں۔

ان بیس سالوں میں کبھی پارو سے سامنا نہیں ہوا۔ ہاں پتا چلتا رہا تھا کہ وہ پہلے فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرتی رہی۔ پھر فلموں پر زوال آیا تو اسٹیج ڈانسر بن گئی اور اس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔ آخری اطلاع دس سال پہلے کی تھی۔ ملازمت کے پانچ سال بعد میں جا کر ماں جی اور ابا کو شہر لے آیا۔ چاچی نے خودکشی کر لی تھی اور چاچا اس کے غم میں کھل کھل کر مر گیا تھا۔ میں چاچا کے مرنے کے بعد گیا تھا۔ ابا نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مجھے بہت مارا تھا۔ ماں جی بس روتی رہی لیکن اس نے مجھے پیار نہیں کیا۔ اسے بھی چاچی اور چاچا کا دکھ تھا۔ میں نے اقرار جرم کر لیا انہیں سب بتا دیا۔ گاؤں میں ان کی کوئی زندگی نہیں تھی سب سے منہ چھپا کر رہتے تھے۔ ابا نے زمین تھے پردے دی۔ ابا کے بعد میں نے زمین بیچ دی۔ اس کی اچھی قیمت مل گئی۔ اس رقم سے لاہور کی ایک اچھی آبادی میں تین منزلہ مکان خرید لیا۔ ایک فلور پر خود رہتا ہوں اور دو کرائے پر۔۔۔ دیے ہوئے ہیں۔ اماں ابا کو لانے کے بعد شادی کر لی تھی۔ میرے چار بچے ہیں۔ کرائے کی آمدنی سے ان کو پڑھا رہا ہوں۔ ورنہ ڈی ایس پی کی تنخواہ سے تو صرف گھر چلتا ہے۔

چند مہینے پہلے ڈیوٹی پر اسلام آباد گیا۔ ایک سیاست دان کے حفاظتی اسکواڈ میں شامل تھا جو ایک سیاسی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور سے اسلام آباد گیا تھا۔ اس تقریب میں میں نے پارو کو دیکھا۔ وہ ایک درمیانے درجے کے ابھرتے سیاست دان کی بیوی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت اور ماڈرن ہو گئی ہے۔ میں نے اس تقریب میں اس کی تقریر بھی سنی اور اس نے اتنی مہارت سے اردو انگریزی میں ملی جلی تقریر کی کہ کوئی اسے گاؤں کی مڈل پاس پارو تسلیم کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں تین دن اسلام آباد رہا اور اس دوران میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ابھرتا ہوا سیاست دان خاندانی دولت مند ہے۔ اب وہ بزنس بھی کر رہا ہے اور سیاست بھی۔ دونوں میں پارو جس کا نام بھی کچھ اور ہو گیا ہے اس کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے جلد وہ اس سے آگے نکل جائے گی کیونکہ وہ انسانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی ہے جو آگے بڑھنے اور سب سے اوپر رہنے پر یقین رکھتی ہے چاہے اس کے لیے اسے دوسرے انسانوں کو میسر ہی کیوں نہ بنانا پڑے۔

